مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ

جس نے رسول کی اطاعت کی تو بیشک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔(نساء 80)

مشعلِ راہ

رسول کریم ﷺ کی احادیثِ صحیحہ کا مجموعہ

زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تعلیماتِ نبوی ﷺ کا نچوڑ

جمع وترتیب:

مفتی نثار محمد

امام وخطیب جامع مسجد بیت المکرم فیوچر کالونی

فہرستِ مضامین

نوٹ

اظہارِ تشکر

اللہ تعالی نے یہ سعادت بخشی کہ امامت کی ذمہ داری ملنے کے ساتھ درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کردیا جس کا مقتدی حضرات کو بہت فائدہ ہوا وقتاً فوقتاً مقتدی حضرات اسکا اظہار بھی کرتے تھے کہ ہمیں اس سلسلہ درسِ حدیث سے بہت فائدہ ہورہا،اور ساتھ ہی ڈھیر ساری دعائیں بھی دے دیا کرتے تھے،اس سے اللہ تعالی نے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اگر علم حِدیث کی عوامی انداز میں انتہائی آسان طرز پر خدمت کرکے عوام الناس کے فائدے کے لئے شائع کردی جائے تو اللہ تعالی کی ذات سے امید ہے کہ عوام الناس کو فائدہ بھی بہت ہوگا اور مجھ ناچیز کے لئے صدقہ جاریہ کا بھی ذریعہ ہوجائے گا بس اللہ تعالی کا نام لیکر اس پر کام شروع کردیا،ترتیب یہ اپنائی ہے کہ مشکوۃ المصابیح سے مختصر احادیث کا انتخاب کرکے مظاہرِ حق سے مختصر تشریح بھی لکھ دی تاکہ عوام الناس کو زیادہ فائدہ ہو،اللہ تعالی کی مدد ہر قدم پر شامل حال رہی اور یہ کام خیروعافیت سے پایہ تکمیل تک پہنچا اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر میرے لئے صدقہ جاریہ ثابت فرمائے

۔

ابوصہیب نثار عفی عنہ
۲/۵/۱۴۴۳
03212881695

ایمان کا بیان

ایمان کا مطلب

ایمان کا مطلب" ایمان" کے معنی ہیں، یقین کرنا، تصدیق کرنا، مان لینا۔ اصطلاح شریعت میں " ایمان" کا مطلب ہوتا ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرنا اور ماننا کہ اللہ ایک ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود اور پروردگار نہیں، اس کے تمام ذاتی و صفاتی کمالات برحق ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں، ان کی ذات صادق و مصدوق ہے اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتاب وسنت کی صورت میں اللہ کا جو آخری دین و شریعت لے کر اس دنیا میں آئے اس کی حقانیت وصداقت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ تکمیل ایمان : محدثین کے نزدیک" ایمان" کے تین اجزاء ہیں : " تصدیق بالقب" یعنی اللہ کی وحدانیت، رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور دین کی حقانیت پر دل سے یقین رکھنا اور اس یقین و اعتماد پر دل و دماغ کا مطمئن رہنا۔" اقرار باللسان" یعنی اس دلی یقین واعتقاد کا زبان سے اظہار، اعتراف اور اقرار کرنا۔" اعمال بالجوارح" یعنی دین وشریعت کے احکام وہدایات کی جسمانی بجا آوری کے ذریعہ اس دلی یقین و اعتقاد کا عملی مظاہرہ کرنا۔ ان تینوں اجزاء سے مل کر" ایمان" کی تکمیل ہوتی ہے اور جو آدمی اس ایمان کا حامل ہوتا ہے اس کو" مومن ومسلمان" کہا جاتا ہے۔ ایمان اور اسلام : کیا ایمان اور اسلام میں کوئی فرق ہے یا یہ دونوں لفظ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں ؟ اس سوال کا تفصیلی جواب، تفصیلی بحث کا متقاضی ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ خلاصہ کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ظاہری مفہوم ومصداق کے اعتبار سے تو یہ دونوں لفظ تقریباً ایک ہی

مفہوم کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ" ایمان" سے عام طور پر تصدیق قلبی اور احوال باطنی مراد ہوتے ہیں جب کہ" اسلام" سے اکثر و بیشتر ظاہری اطاعت و فرمان برداری مراد لی جاتی ہے اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ" وحدانیت، رسالت اور شریعت کو ماننے اور تسلیم کرنے" کا جو باطنی تعلق دل و دماغ سے قائم ہوتا ہے اس کو " ایمان" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس باطنی تعلق کا جو اظہار عمل جوارح کے ذریعہ ظاہری احوال سے ہوتا ہے اس کو" اسلام" سے تعبیر کرتے ہیں، ایک محقق کا قول ہے تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح" اعضاء" پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام" اسلام" ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو" ایمان" کے نام موسوم ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حقیقت ایک ہے مواطن کے اعتبار سے اس کو کبھی" ایمان" کہا جاتا ہے اور کبھی" اسلام" اسی لیے ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں، نہ تو ایمان کے بغیر اسلام معتبر ہوگا اور نہ اسلام کے بغیر ایمان کی تکمیل ہوگی۔ مثلاً کوئی آدمی پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھے، ہر سال زکوۃ بھی ادا کرے، استطاعت ہو تو حج بھی کر ڈالے اور اسی طرح دوسرے نیک کام کر کے اپنی ظاہری زندگی کو" اسلام" کا مظہر بنائے ہوئے ہو مگر اس کا باطن" قلبی تصدیق و انقیاد" سے بالکل خالی ہو اور کفر و انکار سے بھرا ہوا ہو تو اس کے یہ سارے اعمال بیکار محض قرار پائیں گے اسی طرح اگر کوئی آدمی ایمان یعنی قلبی تصدیق و انقیاد تو رکھتا ہے مگر عملی زندگی میں اسلام کا مظہر ہونے کے بجائے سرکشی و نافرمانی کا پیکر اور کافرانہ و مشرکانہ اعمال کا مجسمہ بنا ہوا ہے تو اس کا ایمان فائدہ مند نہیں ہوگا۔ بعض اہل نظر نے" ایمان اور اسلام" کی مثال" شہادتین" سے دی ہے یعنی جیسے کلمہ شہادت میں دیکھا جائے تو شہادت وحدانیت الگ ہے اور شہادت رسالت الگ ہے۔ لیکن ان دونوں کا ارتباط و اتحاد

اس درجہ کا ہے کہ شہادت رسالت کے بغیر شہادت وحدانیت کارآمد نہیں اور شہادت وحدانیت کے بغیر شہادت رسالت کا اعتبار نہیں۔ٹھیک اسی طرح" ایمان" اور" اسلام" کے درمیان دیکھا جائے تو بعض اعتبار سے فرق محسوس ہوتا ہے لیکن ان دونوں کا ارتباط و اتحاد اس درجہ کا ہے کہ اعتقاد باطنی (یعنی ایمان) کے بغیر صرف اعمال ظاہرہ (اسلام) کھلا ہوا نفاق ہیں اور اعمال ظاہرہ کے بغیر اعتقاد باطن کفر کی ایک صورت ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں کے مجموعہ کا نام" دین" ہے۔ایمان کا مدار" جاننے" پر نہیں" ماننے" پر ہے : ایمان کے بارے میں اس اہم حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تصدیق یعنی ماننے کا نام ایمان ہے نہ کہ محض علم یا معرفت یعنی جاننے کا۔مطلب یہ کہ ایک آدمی جانتا ہے کہ" اللہ" ہے اور اکیلا ہے وہی پروردگار اور معبود ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے سچے بندے اور اس کے رسول ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس دین وشریعت اور تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ مبنی بر حقیقت و صداقت ہے۔مگر وہ آدمی دل سے ان باتوں کو نہیں مانتا، ان پر اعتقاد نہیں رکھتا، اس کا قلب ان باتوں کے اذعان و قبول سے خالی ہے تو اس آدمی میں" ایمان" کا وجود نہیں مانا جائے گا اس کو مومن نہیں کہا جائے گا۔مومن تو وہی آدمی ہوسکتا ہے جو ان باتوں کو سچ اور حق بھی جانے اور دل سے مانے اور تسلیم بھی کرے۔جب داعی حق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسلام کی دعوت پیش کی تو تمام اہل عرب بالخصوص اہل کتاب (یہود ونصاری) الوہیت کے بھی قائل تھے اور یہ بات بھی خوب جانتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے سچے اور آخری رسول ہیں اور جو دین وشریعت پیش کر رہے ہیں وہ حق اور سچ ہے۔مگر ان میں سے جو لوگ حسد وعناد رکھنے کے سبب ان حقائق کو مانتے اور تسلیم نہیں کرتے تھے ان کے دل و دماغ میں

ایمان کا نور داخل نہیں ہوسکا اور وہ کافر کے کافر ہی رہے، ان حقائق کا" جاننا" ان کے کسی کام نہ آیا۔ بعض صورتوں میں" اقرار باللسان" کی قید ضروری ہے : جن حقائق کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کا زبان سے اقرار کرنا گو وجود ایمان کے لیے ضروری ہے لیکن بعض حالتوں میں یہ زبانی اقرار (اقرار باللسان) ضروری نہیں رہتا۔ مثلاً اگر کوئی آدمی گونگا ہے اور اس کے قلب میں تصدیق تو موجود ہے لیکن زبان سے کوئی لفظ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے تو ایسے آدمی کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس کا ایمان زبانی اقرار کے بغیر بھی معتبر مانا جائے گا، اسی طرح کوئی آدمی جانی خوف یا کسی واقعی مجبوری کی بنا پر زبان سے اپنے ایمان کا اقرار نہیں کرسکتا تو اس کا ایمان بھی زبانی اقرار کے بغیر معتبر ہوگا۔" اعمال" کی حیثیت : وجود ایمان کی تکمیل کے لیے" اعمال" بھی لازمی شرط ہیں کیونکہ تصدیق قلب اور زبانی اقرار کی واقعیت و صداقت کا ثبوت" اعمال" ہی ہیں ۔ یہی عملی ثبوت ظاہری زندگی میں اس فیصلہ کی بنیاد بنتا ہے کہ اس کو مومن و مسلمان کہا جائے اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ اگر کوئی آدمی دعوائے ایمان و اسلام کے باوجود ایسے اعمال کرتا ہے جو خالصتاً کفر کی علامت اور ایمان و اسلام کے منافی ہیں، یا جن کو اختیار کرنے والے پر کافر ہونے کا یقین ہوتا ہے تو وہ آدمی کافر ہی شمار ہوگا اس کے اور ایمان و اسلام کا دعوی غیر معتبر مانا جائے گا۔

ایمان کے شعبے

حدیث:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "الْإِيمَانُ بضع وَسَبْعُونَ شُعْبَة فأفضلها :قول لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَدْنَاهَا :إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ والحيا شُعْبَة من

الایمان"»

......

ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ (آپ کا اصل نام عبدالرحمن بن صخر ہے کنیت ابو ہریرہ ہے۔)۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ اوپر ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ کی شاخ زبان ودل سے اس بات کا اقرار واعتراف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے کم درجہ کی شاخ کسی تکلیف دینے والی چیز کا راستہ سے ہٹا دینا ہے نیز شرم وحیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

تشریح:

اس حدیث میں ایمان کے شعبوں اور شاخوں کی تعداد بتائی گئی ہے یعنی وہ چیزیں مل کر کسی کو ایمان واسلام کا مکمل پیکر اور خوشنما مظہر بناتی ہیں۔ یہاں تو صرف ان شعبوں اور شاخوں کی تعداد بتلائی گئی ہے لیکن بعض احادیث میں ان کی تفصیل بھی منقول ہے اور وہ اس طرح ہے : پہلی چیز تو بنیادی ہے یعنی اس حقیقت کا دل ودماغ میں اعتقاد ویقین اور زبان سے اقرار واظہار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس کی ذات وصفات برحق ہیں۔وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، بقاء اور دوام صرف اسی کی ذات کے لیے ہے جب کہ کائنات کی تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں، ایسے ہی اللہ کے رسولوں، اس کی کتابوں اور فرشتوں کے بارے میں اچھا اعتقاد اور حسن یقین رکھنا اور ان کو برحق جاننا، آخرت کا عقیدہ رکھنا کہ مرنے کے بعد قبر میں برے اور گناہ گار لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اچھے نیک بندوں پر اس کا انعام واکرام ہوتا ہے۔قیامت آئے گی اور اس کے بعد حساب وکتاب کا مرحلہ ضرور آئے گا، اس وقت ہر ایک کے اعمال ترازو میں

تو لے جائیں گے جن کے زیادہ اعمال اچھے اور نیک ہوں گے ان کو پروانہ جنت دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جن کے زیادہ اعمال برے ہوں گے، ان کی فرد جرم ان کے بائیں ہاتھ میں تھما دی جائے گی۔ تمام لوگ پل صراط پر سے گزریں گے۔ مومنین صالحین ذات باری تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ نیک اور اچھے لوگ بہشت میں پہنچائے جائیں گے اور گنہگاروں کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔ جس طرح جنتی (مومن) بندے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور اس کی خوشنودی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اسی طرح دوزخی لوگ (کفار) ہمیشہ ہمیشہ اللہ کے مسلط کئے ہوئے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ ایمان کے شعبوں اور شاخوں میں سے یہ بھی ہے کہ بندہ اللہ سے ہر وقت لو لگائے رہے اور اس سے محبت رکھے اگر کسی غیر اللہ سے محبت کرے تو اللہ کے لیے کرے یا کسی سے دشمنی رکھے تو اللہ کے لیے رکھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کامل محبت اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت و برتری اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کو رواں دینا اور پھیلانا بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت رکھنے کی دلیل ہے۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کی علامت اس طرح رچ بس جائے کہ اس محبت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی بھی چیز اور کسی بھی رشتہ کی محبت کوئی اہمیت نہ رکھے۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کی علامت اتباع شریعت ہے۔ اگر کوئی آدمی اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کی تعمیل کرتا ہے اور شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کرتا ہے لیکن جو آدمی اللہ اور رسول کے احکام و فرمان کی تابعداری نہ کرتا ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ اس کا دل اللہ و رسول کی پاک محبت

سے بالکل خالی ہے۔ یہ بھی ایمان کی ایک شاخ ہے کہ جو عمل کیا جائے خواہ وہ بدنی ہو یا مالی، قولی ہو یا فعلی اور یا اخلاقی وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے ہو، نام و نمود یا کسی دنیاوی غرض سے نہ ہو پس جہاں تک ہو سکے اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ نفاق اور ریا کا اثر عمل کے حسن و کمال اور تاثیر کو ختم کر دے گا۔ مومن کا دل ہمہ وقت خوف اللہ اور خشیت الٰہی سے بھرا ہوا اور اس کے فضل و کرم اور رحمت کی امیدوں سے معمور رہنا چاہیے، اگر بتقاضائے بشریت کوئی بری بات یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر فوراً خلوص دل سے توبہ کے بعد آئندہ کے لیے گناہوں سے اجتناب کا عہد کرے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے اور اپنے اچھے عمل اور نیک کام میں اللہ کی رحمت اور اس کے انعام و اکرام کی آس لگائے رہے۔ درحقیقت یہ ایمان کا ایک بڑا تقاضہ ہے کہ جب کبھی کوئی گناہ جان بوجھ کر یا نادانستہ سرزد ہو جائے تو فوراً احساس ندامت و شرمندگی کے ساتھ اللہ کے حضور اپنے گناہ سے توبہ کرے اور معافی و بخشش کا طلبگار ہو، اس لیے کہ ارتکاب گناہ کے بعد توبہ کرنا شرعاً ضروری اور لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے اگر اس نے اولاد عنایت فرمائی ہو تو فوراً عقیقہ کرے، اگر نکاح کیا ہو تو ولیمہ کرے، اگر قرآن مجید حفظ یا ناظرہ ختم کیا ہو تو خوشی و مسرت کا اظہار کرے، اللہ نے اگر مال دیا ہے تو زکوٰۃ ادا کرے۔ عید الفطر کی تقریب میں صدقۃ الفطر دے اور بقر عید میں قربانی کرے۔ یہ بھی ایمان کا تقاضہ ہے کہ وعدہ کرے تو اسے پورا کرے، مصیبت پر صبر کرے، اطاعت و فرمان برداری کے لیے ہر مشقت برداشت کرے، گناہوں سے بچتا رہے۔ تقدیر اور اللہ کی مرضی پر راضی رہے، اللہ پر توکل کرے، بڑوں اور بزرگوں کی تعظیم و احترام، چھوٹوں اور بچوں سے شفقت و محبت کا معاملہ کرے اور کبر و غرور، نخوت و تکبر کو چھوڑ کر کسر نفسی و تواضع اور حلم

وبردباری اختیار کرے۔"حسن اسلام" اور"تکمیل ایمان" کے مدارج میں سے یہ بھی ہے کہ برابر کلمہ توحید وشہادت کا ورد رکھے۔قرآن شریف پڑھے اگر جاہل ہو تو عالم سے علم کی دولت حاصل کرے اگر عالم ہو تو جاہلوں کو تعلیم دے اپنے مقاصد میں کامیابی کے لیے اللہ سے مدد کا طلب گار ہو اور دعا مانگے اور اس کا ذکر کرتا رہے اپنے گناہوں سے استغفار کرے اور فحش باتوں سے بچتا رہے، ہر وقت ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک رہے۔نمازوں کا پڑھنا خواہ فرض ہوں یا نفل اور وقت پر ادا کرنا، روزہ رکھنا، چاہے نفل ہو یا فرض، ستر کا چھپانا، صدقہ دینا خواہ نفلی ہو یا لازمی، غلاموں کو آزاد کرنا، سخاوت وضیافت کرنا، اعتکاف میں بیٹھنا، شب قدر اور شب برأت میں عبادت کرنا، حج وعمرہ کرنا، طواف کرنا۔ دارالحرب یا ایسے ملک سے جہاں فسق و فجور، فحش و بے حیائی اور منکرات و بدعات کا زور ہو، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جانا، بدعتوں سے بچنا اپنے دین کو بری باتوں سے محفوظ رکھنا، نذروں کا پورا کرنا، کفاروں کا ادا کرنا، حرام کاری سے بچنے کے لیے نکاح کرنا۔اہل وعیال کے حقوق پورے طور پر ادا کرنا، والدین کی خدمت کرنا اور ہر طرح ان کی مدد کرنا اور خبر گیری رکھنا، اپنی اولاد کی شریعت کے مطابق تربیت کرنا اپنے ماتحتوں سے حسن سلوک کرنا اپنے حاکموں، افسروں اور مسلمان سرداروں کی تابعداری کرنا بشرطیکہ وہ خلاف شرع چیزوں کا حکم نہ دیں۔غلام اور باندی سے نرمی اور بھلائی سے پیش آنا، اگر صاحب اقتدار اور حاکم وجج ہو تو انصاف کرنا، لوگوں میں باہم صلح صفائی کرانا، اسلام سے بغاوت کرنے والوں اور دین سے پھرنے والوں سے قتل وقتال کرنا، اچھی باتوں کی تبلیغ کرنا، بری باتوں سے لوگوں کو روکنا، اللہ کی جانب سے مقرر کی ہوئی سزاؤں کا جاری کرنا، دین و اسلام میں غلط باتیں پیدا کرنے والوں اور اللہ و رسول کا انکار کرنے والوں سے حسب قوت و استطاعت خواہ ہتھیار سے

خواہ قلم و زبان سے جہاد کرنا، اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، امانت کا ادا کرنا، مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرنا، وعدے کے مطابق فرض پورا کرنا، پڑوسی کی دیکھ بھال کرنا اور اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا، لوگوں کے ساتھ بہترین معاملہ کرنا، حلال طریقہ سے مال کمانا اور اس کی حفاظت کرنا، مال و دولت کو بہترین مصرف اور اچھی جگہ خرچ کرنا۔ فضول خرچی نہ کرنا، سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا، جب کسی کو چھینک آئے تو ”یرحمک اللہ“ کہنا، خلاف تہذیب کھیل کود اور برے تماشوں سے اجتناب کرنا، لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا اور راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا تاکہ راہ گیروں کو تکلیف و نقصان نہ پہنچے، یہ سب ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں ہیں۔ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کے ہٹانے کا یہ مطلب ہے کہ اگر راستے میں پتھر یا کانٹے پڑے ہوں جس سے راہ گیر کو تکلیف پہنچ سکتی ہو یا نجاست و غلاظت پڑی ہو یا ایسی کوئی بھی چیز پڑی ہو جس سے راستے پر چلنے والوں کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو مومن کا یہ فرض ہے کہ انسانی و اخلاقی ہمدردی کے ناطے اس کو ہٹا دے اور راستہ صاف کر دے۔ اور اسی طرح خود بھی ایسی کوئی چیز راستے میں نہ ڈالے جو راستہ چلنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو اور عارفین کی رمز شناس نگاہوں نے تو اس سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے صاف کر لے جو توجہ الی اللہ اور معرفت کے راستہ کی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اور اپنے قلب سے برائی و معصیت کے خیال تک کو کھرچ کر پھینک دے۔ بہرحال یہ تمام باتیں ایمان کے شعبے ہیں جن پر مومن کا عمل کرنا نہایت ضروری ہے اس لیے کہ ایمان کی تکمیل اور اسلام کا حسن ان ہی چیزوں سے پیدا ہوتا ہے اگر کوئی آدمی ان باتوں سے خالی ہے اور اس کی زندگی ان کی شعاعوں سے منور نہیں ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوئی اس

کو چاہیے کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق چاہ کر ان اہم باتوں کو اختیار کرے۔

کامل مسلمان کی نشانی:

....

حدیث:

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ« هَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ :"إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :أَيُّ الْمُسْلِمِينَ خَيْرٌ؟ قَالَ :مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ من لِسَانه وَيَده"

......

ترجمہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص جلیل القدر صحابی، رفیع المرتبت عالم، بلند پایہ مجاہد اور بڑے مرتبہ کے متقی و عابد تھے آپ مہاجر ہیں۔)۔راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذا) سے مسلمان محفوظ رہیں اور اصل مہاجر وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے یہ الفاظ صحیح البخاری کے ہیں اور مسلم نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ایک آدمی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ (کے ضرر) سے مسلمان محفوظ رہیں۔(بخاری ومسلم)

......

تشریح:

حدیث کے پہلے جزء میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ" مومن اور مسلمان" محض اس چیز کا نام

نہیں ہے کہ کوئی آدمی صرف کلمہ پڑھ لے اور کچھ متعین اعمال و ارکان ادا کرلے بلکہ اسلامی شریعت اپنے پیروؤں سے ایک ایسی بھرپور زندگی کا تقاضا کرتی ہے جس کا حامل ایک طرف عقائد و اعمال کے لحاظ سے اللہ کا "حقیقی بندہ" کہلانے کا مستحق ہو تو دوسری طرف وہ انسانیت کے تعلق سے پوری طرح امن و آشتی کا نمونہ اور محبت و مروت کا مظہر ہو، امن و امانت، اخلاق و رواداری، ہمدردی و خیرسگالی کا اپنی عملی زندگی میں اس طرح اظہار کرے کہ دنیا کا ہر انسان اس سے خوف زدہ رہنے کے بجائے اس کو اپنا ہمدرد، بہی خواہ اور مشفق سمجھے اور کیا مال کیا جان و آبرو، ہر معاملہ میں اس پر پورا اعتماد اور اطمینان رکھے۔ اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کی تخصیص اس لیے ہے کہ عام طور پر ایذا رسانی کے یہی دو ذریعے ہیں ورنہ یہاں ہر وہ چیز مراد ہے جس سے تکلیف پہنچ سکتی ہے خواہ وہ ہاتھ ہوں یا زبان یا کوئی دوسری چیز۔ حدیث کے دوسرے جزء میں "حقیقی مہاجر" کی تعریف کی گئی ہے یوں تو مہاجر ہر اس آدمی کو کہیں گے جس نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن، اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑ کر دارالاسلام کو اپنا وطن بنالیا ہو، اس قربانی کو اسلام عزت وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس مہاجر کو بیشمار جزاء و انعام کا حقدار مانتا ہے لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا اس ہجرت کے علاوہ ایک ہجرت اور ہے جس کا زندگی کے ساتھ دوامی تعلق رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے مومن ان سے پرہیز کرتا رہے اور اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نفسانی خواہشات کو بالکل ترک کرکے پاکیزہ نفسی اختیار کرے، پس ایسا آدمی حقیقی مہاجر کہلانے کا مستحق ہے۔

محبتِ رسول ﷺ جزوِ ایمان ہے؛

حدیث؛

وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» :لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ«

ترجمہ؛

حضرت انس بن مالک (حضرت انس بن مالک بن نضر انصاری ہیں اور مدینہ کے اصل باشندے تھے۔) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

تشریح؛

محبت" ایک تو طبعی ہوتی ہے جیسے اولاد کو باپ کی یا باپ کو اولاد کی محبت۔ اس محبت کی بنیاد طبعی وابستگی و پسند اور فطری تقاضہ ہوتا ہے۔ اس میں عقلی یا خارجی ضرورت اور دباؤ کا دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف ایک محبت عقلی ہوتی ہے جو کسی طبعی وفطری وابستگی اور تقاضے کے تحت نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی عقلی ضرورت ومناسبت اور خارجی وابستگی کے تحت کی جاتی ہے۔ اس کی مثال مریض اور دوا ہے یعنی بیمار آدمی دوا کو اس لیے پسند نہیں کرتا کہ دوا لینا اس کا طبعی اور فطری تقاضہ ہے بلکہ یہ دراصل عقل کا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر بیماری کو ختم کرنا ہے اور صحت عزیز ہے تو دوا استعمال کرنی ہوگی خواہ اس دوا کی تلخی اور کڑواہٹ کا طبیعت پر کتنا ہی بار کیوں نہ ہو، اسی طرح اگر کسی آدمی کے جسم کا کوئی حصہ پھوڑے پھنسی کے فاسد مادہ سے بھر گیا ہو تو وہ آپریشن کے لیے

اپنے آپ کو کسی ماہر جراح اور سرجن کے حوالہ اس لیے نہیں کرتا کہ اس کی نظر میں آلات جراحی کی چمک دمک اچھی لگتی ہے یا اس کی طبیعت اپنے جسم کے اس حصہ پر نشتر زنی کو پسند کرتی ہے، بلکہ یہ عقل و دانائی کا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر جسم کو فاسد مادہ سے صاف کرنا ہے تو خود کو اس جراح یا سرجن کے حوالے کر دینا ضروری ہے۔ کسی چیز کو عقلی طور پر چاہنے اور پسند کرنے کی وہ کیفیت جس کو "عقلی محبت" سے تعبیر کرتے ہیں، بعض حالات میں اتنی شدید، اتنی گہری اور اتنی اہم بن جاتی ہے کہ بڑی سے بڑی طبعی محبت اور بڑے سے بڑے فطری تقاضے پر بھی غالب آجاتی ہے۔ پس یہ حدیث ذات رسالت سے جس محبت اور وابستگی کا مطالبہ کر رہی ہے وہ علماء ومحدثین کے نزدیک یہی "عقلی محبت" ہے لیکن کمال ایمان ویقین کی بنا پر یہ "عقلی محبت" اتنی پر اثر، اتنی بھرپور اور اس کی قدر جذباتی وابستگی کے ساتھ ہو کہ "طبعی محبت" پر غالب آجائے۔ اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کسی ہدایت اور کسی شرعی حکم کی تعمیل میں کوئی خونی رشتہ جیسے باپ کی محبت، اولاد کا پیار یا کوئی بھی اور طبعی تعلق رکاوٹ ڈالے تو اس ہدایت رسول اور شرعی حکم کو پورا کرنے کے لیے اس خون کے رشتے اور طبعی تقاضا ومحبت کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیے، ایمانیات اور شریعت کے نقطہ نظر سے بہت بڑا مقام ہے اور یہ مقام اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب ایمان واسلام اور حب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعوی کرنے والا اپنے نفس کو احکام شریعت اور ذات رسالت میں فنا کر دے اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رضا وخوشنودی کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد حیات نہ ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان جاری ہوتا ہے کہ اہل ایمان جہاد کے لیے نکلیں، اس حکم کی تعمیل میں اہل ایمان، دشمنان دین سے لڑنے کے لیے میدان جنگ میں

پہنچتے ہیں۔ جب دونوں طرف سے صف آرائی ہوتی ہے اور حریف فوجیں آمنے سامنے آتی ہیں تو کسی مسلمان کو اپنا لڑکا دشمن کی صف میں نظر آتا ہے اور کسی کو اپنا باپ۔ اب ایک طرف تو وہ طبعی محبت ہے، جو کیسے گوارا کرلے کہ اس کی تلوار اپنے باپ یا اپنی ہی اولاد کے خون سے رنگی جائے، دوسری طرف حکم رسول ہے کہ دشمن کا کوئی بھی فرد تلوار کی زد سے امان نہ پائے چاہے وہ اپنا باپ یا بیٹا کیوں نہ ہو، تاریخ کی ناقابل تردید صداقت گواہی دیتی ہے کہ ایسے نازک موقع پر اہل ایمان پل بھر کے لیے بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتے، ان کو یہ فیصلہ کرلینے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی کہ حکم رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے نہ باپ کی محبت کوئی معنی رکھتی ہے نہ اولاد کی۔ اور پھر میدان جنگ میں باپ کی تلوار بے دریغ اپنی اولاد کا خون بہاتی نظر آتی ہے اور بیٹا اپنے باپ کو موقع نہیں دیتا کہ بچ کر نکل جائے۔ بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تکمیل ایمان کا مدار حب رسول پر ہے جس آدمی میں ذات رسالت سے اس درجہ کی محبت نہ ہو کہ اس کے مقابلہ پر دنیا کے بڑے سے بڑے رشتے، بڑے سے بڑے تعلق اور بڑی سے بڑی چیز کی محبت و چاہت بھی بے معنی ہو، وہ کامل مسلمان نہیں ہوسکتا، اگرچہ زبان اور قول سے وہ اپنے ایمان و اسلام کا کتنا ہی بڑا دعوی کرے۔ حضرت عمر فاروق کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے جب یہ حدیث سنی تو عرض کیا" یارسول اللہ! دنیا میں صرف اپنی جان کے علاوہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں"یعنی دنیا کے اور تمام رشتوں اور چیزوں سے زیادہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت رکھتا ہوں مگر اپنی جان سے زیادہ نہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میری جان ہے تم اب بھی کامل مومن نہیں ہوئے اس لیے کہ یہ مرتبہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ میں تمہیں

اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا ہو جاؤں"۔ ان الفاظ نبوت نے جیسے آن واحد میں حضرت عمر فاروق کے دل و دماغ کی دنیا تبدیل کر دی ہو، وہ بے اختیار بولے۔" یارسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری جان قربان آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر ان کو خوشخبری سنائی کہ اے عمر! اب تمہارا ایمان کامل ہوا اور تم پکے مومن ہو گئے۔" اور صرف عمر فاروق ہی نہیں، تمام صحابہ اسی کیفیت سے معمور اور حب رسول سے سرشار تھے، ان کی زندگیوں کا مقصد ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک اشارہ ابرو پر اپنی جانوں کو نچھاور کر دینا تھا، بلاشبہ دنیا کا کوئی مذہب اپنے راہنما اور پیروؤں کے باہمی تعلق اور محبت کی ایسی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس بلاشک صحابہ کے لیے شمع کی سی تھی جس پر وہ پروانہ وار نچھاور ہونا ہی اپنی سعادت وخوش بختی تصور کیا کرتے تھے۔ اسلام کے اس دور کی شاندار تاریخ اپنے دامن میں بیشمار ایسے واقعات چھپائے ہوئے ہے جو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صحابہ کرام اجمعین کی جذباتی وابستگی اور والہانہ محبت و تعلق کی شاندار غمازی کرتے ہیں۔ غزوہ احد کا واقعہ ہے۔ میدان جنگ میں جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور حق کی مٹھی بھر جماعت پر باطل کے لشکر جرار نے پوری قوت اور طاقت سے حملہ کیا تو دیکھا گیا ہے کہ ایک انصاری عورت کے شوہر، باپ اور بھائی تینوں نے جام شہادت پیا اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات پر دیوانہ وار فدا ہو گئے، یہ دل دہلا دینے والی خبر اس عورت کو بھی پہنچائی گئی مگر اللہ پر ایمان کی پختگی اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کا اثر کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت اپنے لواحقین کی شہادت پر نالہ وشیون اور ماتم وفریاد کرتی اس نے سب سے پہلے سوال کیا: " خدارا مجھے یہ بتاؤ

کہ میرے آقا اور سردار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری جان قربان) تو بخیر ہیں؟" لوگوں نے کہا۔ ہاں" آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سلامت ہیں" مگر اس سے اس کی تسکین نہ ہوئی اور بے تابانہ کہنے لگی : "اچھا چلو! میں اپنی آنکھوں سے دیدار کرلوں تو یقین ہوگا" اور جب اس نے اپنی آنکھوں سے چہرہ انور کی زیارت کرلی تو بولی : کل مصیبۃ بعدک جلل ۔جب آپ زندہ سلامت ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔" ایک مرتبہ ایک آدمی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یارسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے اپنے اہل وعیال اور مال سب سے زیادہ محبوب ہیں، مجھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک کہ یہاں آکر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روئے انور کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈی نہیں کرلیتا۔ مگر اب تو یہی غم کھائے جاتا ہے کہ وفات کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ ہوں گے، وہاں میری آنکھیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دیدار کیسے کرسکیں گی۔ جب ہی یہ آیت نازل ہوئی : وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۔ (النساء ۶۹) "جو لوگ اللہ ورسول کا کہنا مانتے ہیں وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام ہیں یعنی نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی صحبت بڑی غنیمت ہے۔" آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس صحابی کو یہ خوشخبری سنادی۔ عبداللہ بن زید بن عبدربہ جو صاحب اذان کے لقب سے مشہور تھے اپنے باغ میں کام کررہے تھے کہ اسی حالت میں ان کے صاحبزادہ نے آکر پریشانی والی خبر سنائی کہ سرورِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وصال فرماگئے۔ عشق نبوی سے سر

نثار اور محبت رسول سے سرمست، یہ صحابی اس جان گداز خبر کی تاب ضبط نہ لا سکے، بے تابانہ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور زبان سے یہ حسرت ناک الفاظ نکلے : خداوندا اب مجھے بینائی کی دولت سے محروم کر دے تاکہ یہ آنکھیں جو سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دیدار سے مشرف و منور ہوا کرتی تھیں اب کسی دوسرے کو نہ دیکھ سکیں (ترجمہ السنۃ)۔ان واقعات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت و تعلق کا وہی مقام حاصل تھا جو اس حدیث کا منشاء ہے اس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ ایمان کی سلامتی اور اپنے اسلام میں مضبوطی پیدا کرنا چاہتا ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت وعقیدت سے اپنے دل کو معمور کرے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے ہی کو مدار نجات جانے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کا معیار اتباع شریعت اور اتباع رسول ہے جو آدمی شریعت پر عمل نہیں کرتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات پر نہیں چلتا، وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نعوذ باللہ اسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت نہیں ہے۔

خواتین کو رسول اللہ ﷺ کی نصیحت؛
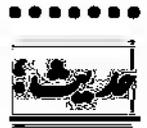
-[18] (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَضْحًى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُصَلَّى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرجل الحازم من إحدا كن قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ

أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذَلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عقلها
أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تَصِلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذَلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا

......

ترجمہ

ابوسعید خدری (آپ کا اصل نام سعد بن مالک بن شیبان ہے، ابوسعید آپ کی کنیت ہے اور خدری کی نسبت سے مشہور ہیں ۔ ۷۴ میں جمعہ کے روز ۸۴ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا)۔ راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (ایک مرتبہ) عید الفطر یا بقر عید کی نماز کے لیے عیدگاہ تشریف لائے تو عورتوں کی ایک جماعت کے پاس بھی تشریف لے گئے ۔ (جو نماز کے لیے ایک الگ گوشہ میں جمع تھیں) اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا" اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ وخیرات کرو کیونکہ میں نے تم سے اکثر کو دوزخ میں دیکھا ہے" (یہ سن کر) ان عورتوں نے کہا، یارسول اللہ! اس کا سبب؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" تم لعن وطعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کی نافرمانی و ناشکری کرتی رہتی ہو اور میں نے عقل و دین میں کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بیوقوف بنا دینے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا" (یہ سن کر) ان عورتوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : کیا ایک عورت کی گواہی آدھے مرد کی گواہی کے برابر نہیں ہے (یعنی کیا ایسا نہیں ہے ۔ کہ شریعت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر سمجھی جاتی ہے) انھوں نے کہا، جی ہاں ایسا ہی ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس کی وجہ عورت کی عقل کی کمزوری ہے اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، انھوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے آپ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ یہ اس کے دین میں نقصان کی وجہ ہے۔"
(صحیح البخاری وصحیح مسلم)

......

تشریح:

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ہی مسجد میں نماز ادا کرتی تھیں اس لیے عید الفطر یا بقر عید کی نماز کے لیے بھی عورتیں عید گاہ آئیں تھیں اور چونکہ وہ الگ ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور خطبہ کی آواز ان تک نہیں پہنچی تھی، اس لیے ضروری ہوا کہ احکام اور دینی ضروریات کی باتیں ان تک پہنچائی جائیں، چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو وعظ ونصیحت سے مشرف فرمایا۔ اکثر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں ایک دو مل کر بیٹھیں، کسی تقریب یا عورتوں کے مجمع میں پہنچیں بس ایک دوسرے کی غیبت کرنا، دنیا بھر کی برائی وبھلائی بیان کرنا اور لعن وطعن کی بوچھاڑ کرنا شروع کر دیتی ہیں اور پھر ان کا زیادہ تر وقت ان خرافاتی باتوں میں گزرتا ہے۔ اسی طرح یہ بڑا روگ بھی ان عورتوں میں پایا جاتا ہے کہ ان کا شوہر ان کی آسائش اور ان کے راحت وآرام کے لیے کتنے ہی پاپڑ بیلے، کتنی ہی مشقت ومحنت کر کے ان کی ضروریات کی تکمیل کرے۔ اور ان کو خوش رکھنے کے لیے کتنی ہی مصیبتیں اٹھائے مگر ان کی زبان سے کبھی بھی شوہروں کا شکر ادا نہیں ہوتا، ہمیشہ ناشکری ہی کے الفاظ ان کی زبان سے نکلتے ہیں، رہی شوہروں کی نافرمانی کی بات تو یہ برائی بھی عورتوں میں کچھ کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں عورتوں کے ایک بہت بڑے عیب کی غمازی کرتی ہیں۔ جس سے ان کے آخرت تباہ ہوتی ہے اور جو ان کو اللہ کے عذاب کا مستوجب بناتا ہے، اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے اس خاص عیب کی نشان دہی

فرمائی اوران سے فرمایا کہ تمہارے اندر اس قسم کی جو باتیں ہیں ان کو ہلاکت جانو، بلکہ یہ وہ گناہ ہیں جن کی وجہ سے اللہ کا عذاب تم پر ہوگا اور تم قہر خداوندی میں گرفتار ہو کر دوزخ میں دھکیل دی جاؤ گی اور تمہاری ان ہی باتوں کے سبب دوزخ میں تم عورتوں کی تعداد مردوں کی بنسبت زیادہ ہوگی، لہٰذا تم صدقہ وخیرات کرتی رہا کروتا کہ ایک طرف تو اس کی برکت سے تمہارے اندر ان باتوں کی کمی آئے اور یہ عیب جاتا رہے دوسری طرف اللہ کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہو اور تمہارے گناہوں کی بخشش ہو۔لعن (طعن) کے معنی ہیں، اللہ کی رحمت سے دور کرنا، حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کو لعن طعن کرنا انتہائی بری حرکت ہے چنانچہ شریعت کا حکم ہے کہ کسی آدمی کو متعین کر کے اس پر لعنت نہ بھیجی جائے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔کسی متعین کافر پر لعنت بھیجنے کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ کب اس کو ایمان واسلام کی توفیق ہو جائے اور وہ کفر وشرک کی لعنت سے نکل کر اللہ کی رحمت کے سایہ میں آجائے۔ ہاں جو آدمی کفر کی حالت میں مر گیا ہو اور اس کا کفر پر مرنا یقینی طور پر معلوم ہو تو اس پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے اسی طرح نفس برائی پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ کفر پر اللہ کی لعنت یا یہ کہ کافروں پر اللہ کی لعنت۔عورتوں میں "عقل کی کمی" یا ان کے" دینی نقصان" کا اظہار عورتوں کی تحقیر کے لیے ہرگز نہیں ہے بلکہ قدرت کے اس تخلیقی توازن کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے جو مردوں اور عورتوں کے درمیان جسمانی وطبعی فرق صنفیت کی بنیاد ہے اور یہ فرق صنفیت دراصل فطرت کا تقاضا ہے جس کے بغیر نوع انسانی کا ذاتی ومعاشرتی نظام زندگی برسر اعتدال نہیں رہ سکتا، خالق کائنات نے جسمانی، طبعی، عقلی اور دینی طور پر مرد کو عورت کی بہ نسبت جو برتر درجہ دیا ہے اور جس کا ثبوت اس حدیث سے واضح ہے وہ انسانی معاشرہ کے اعتدال وتوازن کی برقراری کے لیے

ہے نہ کہ شرف انسانیت میں کسی فرق کے اظہار کے لئے، اس شرف میں مرد وعورت دونوں کی یکساں حیثیت ہے اور دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

نیکی پر خوش ہونا ایمان کی نشانی ہے؛

حدیث؛

وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » :مَا الْإِيمَانُ قَالَ إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ يَارَسُولَ اللّٰهِ فَمَا الْإِثْمُ قَالَ إِذَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ « .رَوَاهُ أَحْمد

ترجمہ؛

حضرت ابوامامہ راوی ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا :(یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ) ایمان کی سلامتی کی علامت کیا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! جب تمہاری نیکی تمہیں بھلی لگے ۔اور تمہاری برائی تمہیں بری لگے تو (سمجھو کہ) تم (پکے) مومن ہو، پھر اس آدمی نے پوچھا، یارسول اللہ! گناہ (کی علامت) کیا ہے؟ آنحضور صلی اللہ عنہ نے فرمایا! جب کوئی بات تمہارے دل میں کھٹک اور تردد پیدا کرے (تو سمجھو کہ وہ گناہ ہے) لہٰذا اس کو چھوڑ دو۔" (مسند احمد بن حنبل)

تشریح؛

سوال کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسی واضح علامت بتادی جائے جس کے ذریعہ ایمان کی سلامتی و استقامت کا اندازہ کیا جاسکے۔ چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر تم اپنے اندر یہ کیفیت پاؤ کہ جب کوئی اچھا کام کرتے ہر تو تمہارا قلب و دماغ اس کام کی بھلائی کو خود محسوس کرتا

ہے اور ایک خاص قسم کی طمانیت اور آسودگی پاتا ہے۔ احساس وشعور کی دنیا اللہ کی طرف سے نیکی کی توفیق اور مدد پانے پر فرحاں وشاداں اور رب کریم کی خوشنودی وقربت کی طلب گاری و امیدواری سے معمور ہو جاتی ہے۔ یا یہ کہ جب بتقضائے بشریت تم سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جاتا ہے جو واضح طور پر گناہ ومعصیت کا کام سمجھا جاتا ہے تو فوراً تمہارا دل اللہ کے خوف سے بھر جاتا ہے اور پروردگار کی ناراضگی کا احساس کر کے شرمسار و نادم ہو جانا تو سمجھ لو کہ ایمان تمہارے دل و دماغ میں رچ بس گیا ہے اور تم پکے مومن ہو گئے۔ کیونکہ نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز کرنا اور ثواب اور گناہ کا احساس وشعور پیدا کرنا صرف ایمان کے خلاصہ ہے۔ اخروی جزا اور سزا اعتقاد جو قلب مومن میں ہوتا ہے، وہ غیر مومن کے قلب میں نہیں ہوتا۔ دوسرے سوال کا مطلب دراصل یہ تھا کہ مومن کو اپنی روزمرہ زندگی میں بعض ایسی چیزوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے جن کے بارے میں واضح طور پر علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ چیز شرعی نقطہ نظر سے برائی کے حکم میں ہے اور اس سے کوئی گناہ لازم آتا ہے یا اس کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے تو ایسے مشتبہ عمل کی برائی یا بھلائی کو پہچاننے کی علامت کیا ہے؟ اس کے جواب میں سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ سچے اور پاکباز مومن کا قلب دراصل فطرت کی ایسی پاکیزہ لوح ہے جس پر صرف اسلامی اطاعت وفرمان برداری اور نیکی وبھلائی ہی کے نقوش ابھر سکتے ہیں، اگر گناہ ومعصیت کا ہلکا سا دھبہ بھی وہاں پہنچتا ہے تو اس کو کوئی جگہ نہیں ملتی اور وہ کھٹک وتردد کی صورت میں منڈلاتا پھرتا ہے پس کسی بھی عمل اور چیز کے بارے میں اگر یہ کیفیت ظاہر ہو کہ فطرت سلیم اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی، قلب اس کا بوجھ محسوس کرتا ہے اور دماغ میں خلش وتردد پیدا ہو گیا ہے تو جانو کہ وہ عمل برائی کا حامل ہے اور گناہ ومعصیت کو لازم کرنے والا

ہے اور نجات وفلاح اسی میں ہے کہ اس چیز کو فوراً چھوڑ دیا جائے یہی وجہ ہے کہ ارباب باطن اور اولیاء اللہ قلب و دماغ کی صفائی اور پاکیزگی کی بناء پر کسی عمل کی پوشیدہ ترین برائی کو بھی پہچان لیتے ہیں اور کسی بھی ایسی چیز کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے جو گناہ معصیت کا ہلکا سا شائبہ بھی رکھتا ہو۔ ان کے ہاں "مشتبہ عمل" سے بھی اس درجہ کا اجتناب برتا جاتا ہے، جتنا اجتناب وہ کھلے ہوئے برے اعمال سے کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا دل و دماغ برائی کے شائبہ کو بھی بھانپ لیتا ہے اور ان کا اطمینان قلب اور عمل کا سرور صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ان کا کوئی قدم راہ مستقیم سے ہٹا ہوا نہیں ہوتا اور ان کا کوئی کام دین و شریعت کی روح کے منافی نہیں ہوتا۔

گناہ کا بیان

"گناہ کبیرہ" کے معنی ہیں۔ بڑے گناہ! چنانچہ اصطلاح شریعت میں "گناہ کبیرہ" اس بڑے فعل کو فرماتے ہیں جس کا ارتکاب کرنے والا حد یعنی شریعت کی متعین کردہ سزا کا موجب ہوتا ہے، یا جس کے ارتکاب پر قرآن و حدیث میں سخت وعید و تنبیہ مذکورہ ہو، یا جس کے ارتکاب کو شریعت نے بطور مبالغہ ارتکاب کفر سے تعبیر کیا ہو (جیسے قصداً نماز ترک کرنے پر حدیث میں یہ وعید آئی ہے (حدیث من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر) یعنی جس آدمی نے نماز قصداً ترک کر دی وہ کافر ہو گیا) یا جس کا فساد و نقصان گناہ کبیرہ کے فساد و نقصان کے برابر یا اس سے زیادہ ہو، یا جس کی ممانعت دلیل قطعی کے ساتھ ثابت ہو اور جس کا اختیار کرنا حرمت دین کی ہتک کا موجب ہو پس جس فعل اور بات میں ان میں سے کوئی بھی چیز پائی جائے گی اس کو گناہ کبیرہ یعنی بڑا گناہ کہیں گے اور جس فعل یا بات میں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جائے گی اور وہ اسلامی

تعلیمات اور دینی تقاضا کے خلاف ہوگی اس کو گناہ صغیرہ یعنی چھوٹا گناہ کہا جائے گا یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بعض اعتبار سے اگرچہ گناہ کبیرہ کے مختلف درجات ہیں کہ بعض کبیرہ گناہ تو بہت ہی برے اور نہایت ہی قابل نفرت ہیں اور بعض گناہ نسبۃً کچھ ہلکے درجہ کے ہیں لیکن شریعت کی نظر میں قابل مواخذہ و گرفت اور موجب عذاب ہونے کے اعتبار سے سب یکساں نوعیت رکھتے ہیں۔احادیث میں ایک جگہ تمام کبیرہ گناہوں کا تعین اور تفصیل کے ساتھ ذکر موجود نہیں ہے، بلکہ موقع محل کی مناسبت یا کسی سائل کو جواب میں آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے بیان کردہ کبیرہ گناہوں کی جو فہرست مرتب کی ہے وہ مختصراً یوں ہے۔(۱) اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا یعنی کسی کو اس کی عبادت یا اس کی صفات میں شریک کرنا مثلاً استعانت (مدد چاہنے) میں، علم میں، قدرت میں، تصرف میں، تخلیق میں، پکارنے میں، نام رکھنے میں، ذبح کرنے میں، نذر ماننے میں اور لوگوں سے امور سونپنے میں کسی کو بھی وہ درجہ اور حیثیت دینا جو صرف اللہ تعالیٰ کی سزاوار ہے۔(۲) گناہ پر اصرار و دوام کی نیت رکھنا۔(۳) ناحق کسی کو قتل کرنا (۴) زنا کرنا۔ (۵) لواطت کرنا۔(۶) چوری کرنا۔(۷) جادو سیکھنا اور جادو کرنا (۸) شراب پینا اور نشہ آور اشیاء کا استعمال کرنا۔(۹) محارم یعنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، نانی اور خالہ وغیرہ سے نکاح کرنا۔(۱۰) جوا سیکھنا اور جوا کھیلنا (۱۱) دارالحرب سے ہجرت نہ کرنا۔(۱۲) دشمناں دین سے ناروا دوستی اور تعلق رکھنا۔(۱۳) طاقت و قوت اور غالب حیثیت رکھنے کے باوجود دشمنان دین سے جہاد نہ کرنا۔ (۱۴) سود کھانا۔(۱۵) خنزیر اور مردار کے گوشت کا استعمال کرنا۔(۱۶) نجومی اور کاہن کی تصدیق کرنا۔(۱۸) ناحق کسی کا مال ہڑپ کر لینا۔(۱۸) پاکباز مرد یا پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت دھرنا۔(۱۹) جھوٹی گواہی دینا۔(۲۰) کسی عذر شرعی کے بغیر قصداً رمضان کا روزہ نہ رکھنا یا روزہ

توڑنا۔(۲۱) جھوٹی قسم کھانا۔(۲۲) قطع تعلق کرنا۔(۲۳) ماں باپ کو ستانا اور ان کی نافرمانی کرنا۔(۲۴) جنگ کے موقع پر دشمنانِ دین کے مقابلہ سے فرار اختیار کرنا۔(۲۵) یتیموں کا مال ناحق کھانا۔(۲۶) ناپ تول میں خیانت کرنا۔(۲۷) نماز کو وقت پر نہ پڑھنا۔(۲۸) مسلمانوں سے ناحق لڑنا جھگڑنا۔(۲۹) ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جھوٹا الزام لگانا۔ (۳۰) رسول، کتاب اللہ اور فرشتوں کا انکار کرنا یا ان کا مذاق اڑانا۔(۳۱) احکام دین اور مسائل شریعت کا انکار کرنا۔(۳۲) فرائض پر عمل نہ کرنا یعنی نماز نہ پڑھنا، زکوۃ ادا نہ کرنا، رمضان کے روزے نہ رکھنا اور استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا۔ (صحابہ یا کسی صحابی کو برا کہنا۔(۳۴) بالعذر کتمان شہادت کرنا۔(۳۵) رشوت لینا۔(۳۶) میاں بیوی کے درمیان نفاق ڈلوانا۔(۳۷) حاکم کے سامنے کسی کی چغل خوری کرنا۔(۳۸) غیبت کرنا۔(۳۹) اسراف میں مبتلا ہونا۔(۴۰) رہزنی کا ارتکاب کرنا۔(۴۱) دین کے نام پر یا کسی دنیوی غرض کے تحت روئے زمین پر فتنہ و فساد پھیلانا۔(۴۲) گناہ صغیرہ پر اصرار و دوام اختیار کرنا۔(۴۳) کسی کو گناہ کی طرف راغب کرنا یا گناہ کے ارتکاب میں مدد دینا۔(۴۴) ہارمونیم، طبلہ اور دوسرے ممنوع باجوں کے ساتھ گانا۔ (۴۵) نہاتے وقت دوسروں کے سامنے ستر کھولنا۔(۴۶) مالی مطالبات و واجبات کی ادائیگی میں بخل کرنا۔(۴۷) خودکشی کرنا۔(۴۸) اپنے اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو ضائع کرنا اور تلف کردینا۔(۴۹) منی اور پیشاب کی گندگی سے صفائی اور پاکی حاصل نہ کرنا۔(۵۰) تقدیر کو جھٹلانا۔ (۵۱) اپنے سردار اور حاکم سے عہد شکنی کرنا۔(۵۲) کسی کی ذات اور نسب میں طعنہ زنی کرنا۔ (۵۳) غرور اور تکبر کے تحت پائنچے لٹکانا۔(۵۴) لوگوں کو گمراہی کی طرف بلانا۔(۵۵) میت پر نوحہ کرنا۔(۵۶) برے طریقے اور بیہودہ رسمیں رائج کرنا۔(۵۷) دھار دار آلہ سے کسی مسلمان کی طرف

اشارہ کرنا۔(۵۸) کسی کو خصی کر دینا۔(۵۹) اپنے بدن کے کسی حصہ کو کاٹنا۔مثلاً داڑھی منڈانا یا ناک وغیرہ تھوڑی سی کاٹ ڈالنا۔(۶۰) اپنے محسن سے احسان فراموشی کرنا۔(۶۱) حدود حرم میں ان کاموں کو کرنا جن کی ممانعت ہے۔(۶۲) حدود حرم میں جاسوسی کرنا۔(۶۳) نرد کھیلنا یا ایسا کوئی بھی کھیل کھیلنا جو بالا تفاق حرام ہو۔(۶۴) کسی مسلمان کو کافر کہنا یا اس کو کسی ایسے الفاظ سے مخاطب کرنا جو صرف کافر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔(۶۵) اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان باری میں عدل نہ کرنا۔(۶۶) جلق کرنا (مشت زنی کرنا)۔(۶۷) غلہ وغیرہ کی گرانی سے خوش ہونا۔(۶۸) جانوروں کے ساتھ بدفعلی کرنا۔(۶۹) عالم کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا۔ (۷۰) دنیا کی محبت میں مبتلا ہونا۔(۷۱) امرد پر بری نظر رکھنا۔(۷۲) دوسروں کے گھر میں جھانکنا۔(۷۳) صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر کے اندر داخل ہونا۔(۷۴) دیوثی اور قرم ساقی کرنا۔(۷۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی اچھے کاموں کی تبلیغ وتلقین اور برے کاموں سے روکنے) کا فریضہ باوجود قدرت کے انجام نہ دینا۔(۷۶) پڑھنے کے بعد قرآن مجید کو بھلا دینا۔(۷۷) جانوروں کو آگ میں جلانا (۷۸) عورت کا بغیر عذر شرعی اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا۔(۷۹) مرد کا عورت پر ظلم کرنا۔(۸۰) اللہ کی رحمت ومغفرت سے ناامید ہونا۔(۸۱) اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونا۔(۸۲) علماء اور حفاظ کی توہین وتحقیر کرنا۔(۸۳) بیوی سے ظہار کرنا۔بعض علماء نے کبائر کی فہرست میں کچھ اور گناہوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہاں اختصار کی پیش نظر اسی فہرست پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تباہ کرنے والے گناہ؛

حدیث؛

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللہِ وَمَا ھُنَّ قَالَ اَلشِّرْكُ بِاللہِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَکْلُ الرِّبٰو وَاَکْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔ (صحیح البخاری و صحیح مسلم)

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (لوگو) سات ہلاک کردینے والی باتوں سے بچو، پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی باتیں کون سی ہیں؟ فرمایا (۱) کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ (۲) جادو کرنا۔ (۳) جس جان کو مار ڈالنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا۔ (٤) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا۔ (٦) جہاد کے دن دشمن کو پیٹھ دکھانا۔ (۷) پاکدامن ایمان والی اور بے خبر عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔" (بخاری ومسلم

تشریح؛

اسلامی اعتقادت ونظریات اور بدیہی مسلمات کو دل سے ماننا، زبان سے اقرار کرنا اور عائد شدہ فرائض پر عمل کرنا ایمان ہے اوران پر بدیہی مسلمات میں سے کسی ایک بات کا انکار کردیا جائے خواہ بقیہ سب کا اقرار موجود ہے تو بھی کفر عائد ہوجاتا ہے پھر علماء کی تصریح ہے کہ کفر صرف قول ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض افعال بھی موجب کفر ہوسکتے ہیں، چنانچہ فقہاء ایسے افعال پر بھی کفر

کا حکم لگا دیتے ہیں جو قلبی و اعتقادی کفر کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ یوں تو کفر کی ہر قسم انسانیت کے دامن پر سب سے بدنما داغ ہے لیکن اس کی جو قسم سب سے بدتر ہے وہ شرک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کی عبادات اور اس کی حدود عظمت میں کسی کو شریک بنا لینا نہ صرف اعتقادی حیثیت سے ایمان و اسلام سے صریح بیزاری کا اظہار ہے، بلکہ فطرت پر ایک بہت بڑا ظلم اور عقل و دانش سے سب سے بڑی بغاوت بھی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کر کے اس کی فطرت کو کفر و شرک کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھا ہے، اب اگر انسان اپنی فطرت کو شرک کی نجاست سے ملوث کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی فطرت اور اپنے خمیر کی صداقت آمیز آواز کا گلا گھونٹ کر مذہب و انسانیت دونوں حیثیت سے تباہی و بربادی کے غار میں گرتا ہے۔ اس لیے پروردگار عالم کا اٹل فیصلہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں ہر کوتاہی ولغزش قابل معافی ہو سکتی ہے۔ مگر شرک کا جرم ہرگز معافی نہیں ہوگا جس کی سخت سزا مشرک کو بھگتنی ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی پاک جنت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے :اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔(القرآن الحکیم، النساء ۱۱۶)” بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس جرم کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے وہاں اس کے سوا اور جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔“ چونکہ شرک انسانی فطرت سے سعادت و نیک بختی کا تخم جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی کی تمام استعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے نیز خود قرآن کی نظر میں شرک اللہ تعالیٰ پر سب سے بڑا افتراء اور سب سے بڑے کر بے دلیل اور خلاف ضمیر بات اور نفس انسان کے لیے ابدی موت ہے اس لیے حدیث میں جن ہلاکت خیز باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں شرک کا جرم سرفہرست ہے۔ شرک کی

تعریف اور اقسام اس موقعہ پر مناسب ہے کہ شرک کی تعریف اور اس کی اقسام کی کچھ تفصیل بیان کر دی جائے، شرح عقائد میں ہے کہ اصطلاح شریعت میں شرک، اسے فرماتے ہیں کہ خدائی اختیارات میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرائے جیسا کہ مجوسی اہرمن ویزداں کو مانتے ہیں یا اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی پرستش وعبادت کے لائق جانے جیسا کہ بت پرست عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ شرک کفر کی ایک قسم ہے اور اسی لیے شریعت میں شرک کفر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق نے اپنے ترجمہ مشکوٰۃ میں شرح عقائد کی بیان کردہ شرک کی ان دونوں قسموں کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد کفر ہے، خیالی میں بھی اس کی تصریح ہے اور مولانا عصمۃ اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں "شرک" اسے فرماتے ہیں کہ جو صفات خاص باری تعالیٰ عزاسمہ کے ساتھ مختص ہیں ان کو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے میں بھی ثابت کرے۔ جیسے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی عالم الغیب جانے۔ یا جس طرح دنیا کی ہر چیز پر اللہ کو قادر مانتا ہے کسی دوسرے کو بھی قادر جانے، یا جیسے اللہ تعالیٰ کو اپنے ارادہ کے ساتھ دنیا کی تمام چیزوں پر متصرف جانتا ہے، ایسے ہی کسی دوسرے کو بھی متصرف جانے۔ مثلاً کسی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ فلاں نے نظر کرم کے ساتھ مجھ سے برتاؤ کیا اس لیے مجھ کو مال وزر کی وسعت اور خوشی حاصل ہوگئی یا فلاں نے مجھ کو پھٹکار دیا تھا تو اس کے سبب میں بیمار ہوگیا یا میرا مقدر پھوٹ گیا، وغیرہ وغیرہ۔ اللہ کی ذات اور صفات اور خدائی اختیارات میں شرک کے علاوہ تفسیر عزیزی میں شرک کی اور جو اقسام ذکر کی گئی ہیں۔ ان میں ایک تو یہی ہے کہ عبادت میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جائے، یا کسی کا نام تقرب وفضیلت کے طریقہ پر اللہ کے نام کی طرح لیا

جائے اور اس کو اللہ کا ہمسر قرار دیا جائے۔ مثلاً کسی کو اُٹھتے بیٹھتے و مصائب و مشکلات میں اس کا نام لے کر اسے یاد کرے ایسے ہی کسی کا نام بجائے عبداللہ یا عبدالرحمن کے بندہ فلاں یا عبد فلاں رکھا جائے اس کو" شرک فی التسمیہ" فرماتے ہیں یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے اور اس کی نذر مانی جائے، یا بلا وجہ شر کے دفعیہ اور حصول منفعت کے لیے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارا جائے اور ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ یا علم و قدرت میں اللہ کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جائے جیسے کوئی کہے ماشاء اللہ وشئت یعنی جو اللہ چاہے اور تم چاہو وہی ہوگا۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی ناواقف نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اسی طرح کے الفاظ کہے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت فروختہ ہوئے اور فرمایا کہ تم نے مجھے اللہ کا شریک ٹھہرا دیا اور فرمایا کہ اس طرح کہو :مَاشَآءَ اُ وَحدَ ہٗ" یعنی جو صرف اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔" بعض کبیرہ گناہوں کو بھی شرک کہا گیا ہے، جیسے حدیث میں وارد ہے کہ جس آدمی نے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی قسم کھائی اور اس نے یقیناً شرک کیا، یا کہا جاتا ہے کہ بدشونی لینا شرک ہے یا منقول کہ ریاکاری شرک ہے، یا اسی طرح منقول ہے کہ جو عورت اپنے خاوند کی محبت کے لیے ٹوٹ کہ کرے شرک ہے گویا یہ گناہ اپنے مہلک اثرات کی بنا پر شرک کی طرح ہیں اس لیے ان سے اجتناب بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا شرک سے۔ اسی طرح وہ افعال جو اگرچہ شرک حقیقی یعنی کفر کے دائرے میں تو نہ آتے ہوں لیکن مشرکین اور بت پرستوں کے افعال و اعمال کے مشابہ اور ان کے ہم مثل سمجھے جاتے ہیں تو ان سے بھی شرک ہی کی طرح پرہیز ضروری ہے، جیسے علماء اور بادشاہ کے آگے جبین سائی کرنا یا ان کے سامنے آ کر زمین کو چومنا یا ان کو سجدہ تعظیم کرنا۔ چونکہ یہ افعال حرام اور گناہ کبیرہ ہیں اس لیے ان کا ارتقاب کرنے والا بھی گناہ گار اور

مستوجب عذاب ہوگا اور جو لوگ اس طرح کے افعال سے خوش ہوں گے اور قدرت کے باوجود ان افعال کے ارتکاب کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے وہ بھی گناہ گار ہوں گے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر علماء یا بادشاہ پیروں کے آگے جبین سائی کرنا اور زمین کو بوسہ دنیا عبادت و تعظیم کی نیت سے ہوگا تو اس کو صریحا کفر کہا جائے گا اگر عبادت و تعظیم کی نیت سے نہیں بلکہ محض اظہار ادب کے لیے ہوگا تو اس پر کفر کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن گناہ کبیرہ ضرور کہلائے گا۔ اس حدیث میں دوسرا ہلاکت خیز فعل سحر بتایا گیا ہے۔ سحر کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح سحر اور جادو کرنا حرام اور ہلاکت خیز چیز ہے اسی طرح جادو سیکھنا اور سحر کا علم حاصل کرنا بھی حرام ہے، جو آخرت میں ہلاکت کا موجب بنے گا، شرح عقائد کے حاشیہ" خیالی" میں لکھا ہے کہ سحر کرنا کفر ہے اور صحابہ وغیرہ کی ایک جماعت تو اس پر متفق ہے کہ ساحر کو فوراً مار ڈالنا چاہیے۔ جب کہ بعض کی رائے یہ ہے کہ اگر ساحر اس طرح کا ہو جس سے کفر لازم آتا ہو اور ساحر اس سے توبہ نہ کرے تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ اسی طرح نجوم، کہانت رمل اور شعبدہ بازی کی تعلیم حاسل کرنا، ان چیزوں کو اختیار کرنا اور ان سے روزی اور پیسہ کمانا اور نجومی و کاہن وغیرہ سے سوالات کرنا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتقاد رکھنا بھی حرام ہے۔ حدیث میں دشمن کے مقابلہ سے راہ فرار اختیار کرنے کے مذموم فعل کو بھی ہلاکت کا موجب بتایا گیا ہے اس لیے کہ جس آدمی نے اتنی بزدلی اور پست ہمتی دکھائی کہ عین اس موقع پر جب کہ اس کی ایمانی شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑا ہو وہ دراصل اپنی اس مذموم حرکت کے ذریعہ اہل اسلام کی رسوائی کا سبب بنا لہٰذا اس کو آخرت کے عذاب اور ہلاکت کا مستوجب گردانا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جہاں تک تفصیلی مسئلہ کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کے

مقابلہ میں دو کافر ہوں تو اس کو ان کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے ہاں اگر مقابلہ پر دشمن دو سے زیادہ کی تعداد میں ہوں تو پھر بھاگنا حرام
نہیں ہے بلکہ جائز ہے مگر اس میں اولیٰ اور بہتر یہی ہے کہ وہ اس صورت میں بھی پیٹھ نہ دکھلائے بلکہ مقابلہ کرے خواہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

منافق کی علامات؛

حدیث؛

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللہ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ زَادَ مُسْلِمٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (صحیح مسلم)

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! منافق کی تین علامتیں ہیں، اس کے بعد مسلم نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا" اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے" اس کے بعد صحیح البخاری و صحیح مسلم دونوں متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" (صحیح البخاری و صحیح مسلم)

تشریح؛

جب بھی کوئی اصلاحی تحریک انقلابی رفتار سے آگے بڑھنے لگتی ہے اور معاشرہ پر اس کا تسلط پھیلتا جاتا ہے تو اس کے متفقین اور مخالفین کے درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ایک

تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک کے مکمل ہمنوا بن جاتے ہیں اور کامل ذہنی و جسمانی وابستگی کے ساتھ اس کے دائرہ اثر و اطاعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقابلہ پر دوسرا طبقہ مخالفین کا ہوتا ہے جو تحریک کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے اور اپنی پوری طاقت اور تمام تر وسائل کے ساتھ علانیہ طور پر تحریک کے داعیوں اور حامیوں کے مدمقابل رہتا ہے اور ان دونوں کے درمیان جو تیسرا طبقہ پیدا ہوتا ہے وہ ان روباصفت لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ اس تحریک کے دل سے حامی بنتے ہیں اور نہ کھلم کھلا مخالفت پر خود کو قادر پاتے ہیں اس طرح کے لوگ اپنی ذہنی قلبی وابستگی اپنے سابقہ عقائد و نظریات ہی کے تئیں رکھتے ہیں لیکن جسمانی طور پر حامیان تحریک کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں، یہی صورت حال اسلام کو بھی پیش آئی پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے بعد جب مدنی زندگی کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ دعوت اسلام کی تحریک انقلابی رفتار سے آگے بڑھنے لگی اور اہل اسلام کو بھی طاقت و شوکت میسر آنے لگی تو یہ تیسرا طبقہ پیدا ہو گیا۔ پہلے مکہ میں ایک طرف تو وہ خوش نصیب لوگ تھے جنہوں نے کامل صدق و اخلاص کے ساتھ دعوت اسلام کو قبول کیا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے فدا کار خادم بنے۔ یہ خوش نصیب تعداد میں بھی کم تھے اور مادی وسائل و ذرائع سے محروم بھی تھے، ان کے مقابلہ پر اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس پر بس نہ کر کے دعوت اسلام کی بھرپور مخالفت پر کمربستہ تھے، ان لوگوں کو طاقت و شوکت بھی حاصل تھی اور تمام تر مادی وسائل و ذرائع کی پشت پناہی بھی۔ چنانچہ یہاں ان کو اسلام کی کھلم کھلا دشمنی سے کوئی امر مانع نہیں تھا اور اہل اسلام کی مخالفت سماجی طور پر کسی خطرہ یا نقصان کا باعث بھی نہیں تھی۔ لیکن اب مدینہ آنے کے بعد دعوت اسلام کا ماحول دوسرا ہو گا، تحریک کامیابی سے آگے بڑھتی رہی، منفقین اور

ہمنواؤں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔طاقت وشوکت بھی بڑھنے لگی اور سماجی طور پر اہل اسلام کو غلبہ بھی ملنے لگا۔لہٰذا اب اسلام کے مخالفین اور معاندین کو بھی عداوت کی شکل بدل دینی پڑی۔انھوں نے یہ مستقل پالیسی بنالی کہ بظاہر تو اسلام کے نام لیوا بن جاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگو۔مگر اندرونی طور پر مخالفین اسلام یعنی کافروں کے ہمنوا رہو اور خفیہ معاندانہ کاروائیوں کے ذریعہ دعوت اسلام کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہو، چنانچہ یہی سے" نفاق کی بنیاد قائم ہوئی اور اس طرح کے لوگوں کو اسلام میں" منافق" کہا گیا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح کسی بھی تحریک کے لیے" نفاق" سب سے بڑا گھن ثابت ہوتا ہے اسی طرح اسلام کے حق میں یہ طبقہ منافقین سب سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوا، ابتداء میں تو ان منافقین کا مکروہ چہرہ مسلمانوں کے سامنے چھپا رہا، جب ان کی منافقانہ پالیسی اور عیارانہ کاروائیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچانا شروع کیا اور اسلام کے خلاف ان کی خفیہ نقل وحرکت کا علم ہونے لگا تو ان کی شخصیتیں سامنے آنے لگیں اور پھر تو اس طبقہ کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ اس کے نام پر مستقل ایک سورت" المنافقین" نازل کی گئی، اس کے علاوہ بھی قرآن کریم میں جا بجا منافقوں سے خبردار کیا گیا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور تباہ کاریوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا۔

نفاق کی قسمیں:

جس طرح ایمان اور کفر کی مختلف قسمیں اور صورتیں ہیں اسی طرح" نفاق" کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک تو اعتقادی نفاق ہے اور یہی حقیقی نفاق ہے یعنی بظاہر اللہ کی توحید، رسالت، فرشتے اور حشر ونشر کے اعتقاد رکھنے کا دعوی کرنا مگر اندر ان تمام اعتقادی مسلمات کا پورا پورا انکار وانحراف مضمر ہونا۔یہی وہ نفاق ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور میں تھا۔اسی نفاق کو قرآن

مجید نے کفر بھی کہا ہے اور اسی نفاق کے بارے میں یہ وعید آئی ہے کہ دوزخ میں منافقین کا ٹھکانا کافروں سے بھی نیچے ہوگا، پھر یہ ہوا کہ ان منافقین کے جو عادات وخصائل اور طور طریقے تھے ان پر بھی نفاق کا اطلاق کیا جانے لگا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر باتیں وہی ہیں جو انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی کو عیب دار بنا دیتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات، اعلیٰ انسانی اقدار اور امانت و دیانت کے صریح منافی ہونے کے سبب ایمان واسلام سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی دینی زندگی میں انحطاط کا دور آیا اور انھوں نے ان باتوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا جو منافقین اسلام کا خاصہ تھیں تو ارباب اصطلاح نے نفاق کی ایک اور قسم متعین کی اور اس کا نام "عملی نفاق" رکھا۔ پس حدیث بالا میں جس چیز کے خلاف تنبیہ کرنا مقصود ہے اس سے یہی "عملی نفاق" مراد ہے۔ مطلب یہ کہ بات چیت میں دروغ گوئی اختیار کرنا، وعدہ کا پورا نہ کرنا اور امانتوں میں خیانت کرنا ان بری عادتوں میں سے ہیں جو ایک منافق میں تو پائی جاتی ہیں لیکن کسی مومن میں ان کا پایا جانا عجوبہ سے کم نہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان دانستہ یا نادانستہ طور پر ان میں سے کسی بری عادت کا شکار ہے تو اس کو فوراً اپنا احتساب کرنا چاہیے اور اس بری عادت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے ورنہ آخرت میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔

وسوسہ کا بیان:

وسوسہ کا معنی:

"وسوسہ" گناہ یا کفر سے متعلق اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں گزرے یا شیطان دل و دماغ میں ڈالے اس کے مقابلہ پر "الہام" اس اچھے اور نیک خیال کو فرماتے ہیں جو اللہ کی طرف سے

دل و دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔ وسوسہ کی قسمیں وسوسہ کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے علماء نے اس کی الگ الگ قسمیں متعین کی ہیں چنانچہ وسوسہ کی ایک قسم تو" ضروری یعنی اضطراری" ہے اور دوسری قسم" اختیاری" ہے۔ ضروری یا اضطراری وسوسہ اس کو فرماتے ہیں کہ کسی گناہ کا یا ایمان ویقین کے منافی کسی بات کا خیال اچانک اور بے اختیار دل و دماغ میں گزر جائے اس کو اصطلاحی طور پر" ہاجس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس (ہاجس) کی معافی گزشتہ امتوں میں بھی رہی ہے اور اس امت میں بھی ہے اور اگر وہی برا خیال دل و دماغ میں ٹھہر جائے اور خلجانی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو" خاطر" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ (خاطر) بھی امت سے معاف ہے۔" اختیاری وسوسہ" اس کو فرماتے ہیں کہ کسی گناہ یا ایمان ویقین کے منافی کسی بات کا خیال دل و دماغ میں پیدا ہو، ٹھہرا رہے، لگا تار رہے۔ مستقل خلجان کرتا رہے، طبیعت کی خواہش بھی اس کے کرنے کی ہو اور ایک گونہ لذت و محبت بھی اس کے تئیں محسوس ہو۔ اختیاری وسوسہ کی یہ صورت" ہم" کہلاتی ہے اور یہ بھی صرف اس امت سے معاف ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور جب تک یہ عملی صورت اختیار نہ کرے اس پر کوئی گناہ نامہ اعمال میں نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اگر عمل کا قصد ہو جائے اور پھر اپنے آپ کو عمل سے باز رکھے تو اس کے عوض نیکی لکھی جاتی ہے۔" ہم" کے مقابلہ پر اختیاری وسوسہ کی دوسری صورت کا نام عزم ہے یعنی انسانی طبیعت اور نفس کا کسی برے خیال اور بری بات کو اپنے اندر کرنا اور جما لینا اور نہ صرف یہ کہ اس خیال سے نفرت و کراہیت نہ ہو بلکہ اس پر عمل کرنے کا ایسا پختہ ارادہ کر لینا کہ اگر کوئی خارجی مانع نہ ہو اور اسباب و ذرائع مہیا ہوں تو وہ یقینی طور پر عملی صورت اختیار کر لے وسوسہ کی یہ صورت ایسی ہے جو قابل مواخذہ ہے لیکن اس مواخذہ کی نوعیت عملی طور پر ہونے والے مواخذہ سے ہلکی

ہوگی، مطلب یہ کہ وسوسہ جب تک اندر رہے گا اس پر کم گناہ ہوگا اور جب اندر سے نکل کر عملی صورت اختیار کرے گا تو گناہ زیادہ ہوگا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وسوسہ کی مذکورہ بالا تقسیم ان افعال واعمال کی نسبت سے ہے جن کے وقوع اور صدور کا تعلق ظاہری اعضاء جسم سے جیسے زنا اور چوری وغیرہ وغیرہ جو باتیں دل و دماغ کا فعل کہلاتی ہیں جیسے برا عقیدہ اور حسد وغیرہ وغیرہ تو وہ اس تقسیم میں داخل نہیں ہیں ان کے

ہمیشہ استمرار پر بھی مواخذہ ہوتا ہے

وسوسوں کی معافی؛

حدیث؛

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ص قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِہٖ صُدُوْرُھَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِہٖ اَوْتَتَکَلَّمْ۔ (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

ترجمہ؛

حضرت ابو ہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان وسوسوں کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اور ان کو زبان پر نہ لائیں۔" (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح؛

وسوسہ" گناہ یا کفر سے متعلق اس خیال کو کہتے ہیں جو دل میں گزرے یا شیطان دل و دماغ میں ڈالے اس کے مقابلہ پر" الہام" اس اچھے اور نیک خیال کو فرماتے ہیں جو اللہ کی طرف سے دل

و دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔ وسوسہ کی قسمیں وسوسہ کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے علماء نے اس کی الگ الگ قسمیں متعین کی ہیں چنانچہ وسوسہ کی ایک قسم تو" ضروری یعنی اضطراری" ہے اور دوسری قسم" اختیاری" ہے۔ ضروری یا اضطراری وسوسہ اس کو فرماتے ہیں کہ کسی گناہ کا یا ایمان ویقین کے منافی کسی بات کا خیال اچانک اور بے اختیار دل و دماغ میں گزرجائے اس کو اصطلاحی طور پر" ہاجس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس (ہاجس) کی معافی گزشتہ امتوں میں بھی رہی ہے اور اس امت میں بھی ہے اور اگر وہی برا خیال دل و دماغ میں ٹھہر جائے اور خلجانی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو" خاطر" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ (خاطر) بھی امت سے معاف ہے۔" اختیاری وسوسہ" اس کو فرماتے ہیں کہ کسی گناہ یا ایمان ویقین کے منافی کسی بات کا خیال دل و دماغ میں پیدا ہو، ٹھہرا رہے، لگا تار رہے۔ مستقل خلجان کرتا رہے، طبیعت کی خواہش بھی اس کے کرنے کی ہو اور ایک گونہ لذت ومحبت بھی اس کے تئیں محسوس ہو۔ اختیاری وسوسہ کی یہ صورت" ہم" کہلاتی ہے اور یہ بھی صرف اس امت سے معاف ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور جب تک یہ عملی صورت اختیار نہ کرے اس پر کوئی گناہ نامہ اعمال میں نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اگر عمل کا قصد ہو جائے اور پھر اپنے آپ کو عمل سے باز رکھے تو اس کے عوض نیکی لکھی جاتی ہے۔" ہم" کے مقابلہ پر اختیاری وسوسہ کی دوسری صورت کا نام عزم ہے یعنی انسانی طبیعت اور نفس کا کسی برے خیال اور بری بات کو اپنے اندر کرنا اور جما لینا اور نہ صرف یہ کہ اس خیال سے نفرت و کراہیت نہ ہو بلکہ اس پر عمل کرنے کا ایسا پختہ ارادہ کر لینا کہ اگر کوئی خارجی مانع نہ ہو اور اسباب و ذرائع مہیا ہوں تو وہ یقینی طور پر عملی صورت اختیار کرلے وسوسہ کی یہ صورت ایسی ہے جو قابل مواخذہ ہے لیکن اس مواخذہ کی نوعیت عملی طور پر ہونے والے مواخذہ سے ہلکی ہوگی،

مطلب یہ کہ وسوسہ جب تک اندر رہے گا اس پر کم گناہ ہوگا اور جب اندر سے نکل کر عملی صورت اختیار کرے گا تو گناہ زیادہ ہوگا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وسوسہ کی مذکورہ بالا تقسیم ان افعال واعمال کی نسبت سے ہے جن کے وقوع اور صدور کا تعلق ظاہری اعضاء جسم سے جیسے زنا اور چوری وغیرہ وغیرہ جو باتیں دل و دماغ کا فعل کہلاتی ہیں جیسے برا عقیدہ اور حسد وغیرہ وغیرہ تو وہ اس تقسیم میں داخل نہیں ہیں ان کے ہمیشہ استمرار پر بھی مواخذہ ہوتا ہے

شیطانی خیالات سے اللہ تعالی کی پناہ مانگو؛

....

حدیث؛

-[3] (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :"يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ :مَنْ خلق كَذَا؛ مَنْ خَلَقَ كَذَا؛ حَتَّى يَقُولَ :مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؛ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ وَلْيَنْتَهِ"

......

ترجمہ؛

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ تا آنکہ پھر وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب نوبت یہاں تک آجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور اس سلسلہ کو ختم کردے۔" (البخاری و مسلم)

تشریح:

شیطان انسان کے روحانی ارتقاء کا سب سے بڑا دشمن ہے۔اس کا بنیادی نصب العین ہی یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو، جو اللہ کی ذات وصفات پر ایمان ویقین رکھتے ہیں، ورغلانے اور بہکانے میں لگا رہے ہیں، یہی نہیں کہ وہ فریب کاری کے ذریعہ انسان کے نیک عمل اور اچھے کاموں میں رکاوٹ اور تعطل پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے بلکہ اس زبردست قدرت کے بل پر کہ جو حق اللہ تعالیٰ نے تکوینی مصلحت کے تحت اس کو دی ہے۔وسوسہ اندازی کے ذریعہ انسان کی سوچ فکر اور خیالات کی دنیا میں مختلف انداز کے شبہات اور برائی بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے،لیکن جن لوگوں کی سوچ' فکر اور خیالات کے سرچشموں پر ایمان ویقین کی مضبوط گرفت ہوتی ہے وہ اپنے ایمان کی فکری اور شعوری طاقت سے شیطان کے وسوسوں کو ناکارہ بنادیتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں جہاں بعض شیطانی وسوسوں کی نشان دہی کی گئی ہے وہیں اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو ان وسوسوں کو غیر موثر اور ناکارہ بنانے سے تعلق رکھتا ہے۔فرمایا گیا ہے کہ پہلے تو شیطان اللہ کی مخلوقات اور موجودات کے بارے میں وسوسہ اندازی کرتا ہے،مثلاً فکر وخیال میں یہ بات ڈالتا ہے کہ انسان کو وجود کس نے بنایا، یہ زمین وآسمان کی تخلیق کس کا کارنامہ ہے،چونکہ اللہ کی ذات وصفات پر ایمان رکھنے والوں کی عقل سلیم کائنات کی تمام مخلوقات وموجودات کی تخلیقی وتکوینی نوعیت کا بدیہی شعور وادراک رکھتی ہے اس لیے مخلوقات کی حد تک شیطان کی وسوسہ اندازی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن معاملہ وہاں نازک ہوجاتا ہے جب یہ سلسلہ نازک ہوکر ذات باری تعالیٰ تک پہنچ جائے اور وسوسہ شیطانی دل و دماغ سے سوال کرے جب یہ زمین وآسمان اور ساری مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ ہیں تو پھر خود اللہ کو کس نے پیدا

کیا؟ فرمایا گیا کہ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا پنے اللہ سے پناہ مانگو اور اپنے ذہن سے اس فاسد خیال کو فوراً جھٹک دو تا کہ وسوسہ شیطانی کا سلسلہ منقطع ہو جائے اللہ کی پناہ چاہنے کا مطلب محض زبان سے چند الفاظ ادا کر لینا نہیں ہے بلکہ یہ کہ ایک طرف تو اپنے فکر وخیال کو یکسو کر کے اس عقیدہ یقین کی گرفت میں دے دو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے، وہ واجب الوجود ہے اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور دوسری طرف ریاضیت ومجاہدہ اور ذات باری تعالیٰ کے ذکر واستغراق کے ذریعہ اپنے نفس کے تزکیہ اور ذہن وفکر کے تحفظ اور سلامتی کی طرف متوجہ رہو۔ وسوسہ کی راہ روکنے کا ایک فوری موثر طریقہ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجلس بدل دی جائے۔ یعنی جس جگہ بیٹھے یا لیٹے ہوئے اس طرح کا وسوسہ پیدا ہو وہاں سے فورا ہٹ جائے اور کسی دوسری جگہ جا کر کسی کام اور مشغلہ میں لگ جائے اس طرح دھیان فوری طور پر ہٹ جائے گا اور وسوسہ کی راہ ماری جائے گی۔

تقدیر کا بیان؛

تقدیر کی حقیقت؛

تقدیر پر ایمان لانا فرض اور لازم ہے یعنی وجود ایمان کے لیے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ بندوں کے تمام اعمال خواہ وہ نیک ہوں یا بد، ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لوح محفوظ میں لکھ دیئے گئے ہیں، بندہ سے جو عمل بھی سرزد ہوتا ہے وہ اللہ کے علم واندازہ کے مطابق ہوتا ہے، لیکن اللہ نے انسان کو عقل ودانش کی دولت سے نواز کر اس کے سامنے نیکی اور بدی دونوں

راستے واضح کر دیئے ہیں اور ان پر چلنے کا اختیار دے دیا اور بتا دیا کہ اگر نیکی کے (راستہ کو) اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا جس پر جزاء و انعام سے نوازے جاؤ گے اور اگر بدی کے راستہ کو اختیار کرو گے تو یہ اللہ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا باعث ہوگا جس کی وجہ سے سزا اور عذاب کے مستحق گردانے جاؤ گے۔ اب اس واضح اور صاف ہدایت کے بعد جو آدمی نیکی و بھلائی کے راستہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ ازراہ فضل و کرم اللہ کی رحمت سے نوازا جائے گا اور اس پر اللہ کی جانب سے فلاح و سعادت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اگر کوئی عقل کا اندھا اپنے کسب و اختیار سے برائی کے راستہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ ازراہ عدل سزا کا مستوجب ہوگا اور اسے عذاب و تباہی کے غار دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ تقدیر کا مسئلہ عقل و فکر کی رسائی سے باہر ہے کیونکہ یہ اللہ کا ایسا ایک راز ہے جس کا انسانی عقل میں آنا تو درکنار اسے نہ تو کسی مقرب فرشتہ پر ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا بھید کسی پیغمبر اور رسول کو معلوم ہے۔ اس لیے اس مسئلہ میں زیادہ غور و فکر کرنا اور اس میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑانا جائز نہیں ہے بلکہ تحقیق و جستجو کے تمام راستوں سے ہٹ کر صرف یہ اعتقاد رکھنا ہی فلاح و سعادت کا ضامن ہے کہ اللہ نے یہ مخلوق پیدا کر کے ان کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک گروہ وہ ہے جو اچھے اعمال اور نیک کام کرنے کی بنا پر اللہ کی جنت اور اس کی نعمتوں کا مستحق ہوگا جو محض اس کا فضل و کرم ہوگا۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو برے اعمال کرنے کی وجہ سے دوزخ میں ڈالا جائے گا جو عین عدل ہوگا۔ منقول ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا و قدر کے بارے میں سوال کیا، حضرت علی (رض) نے فرمایا" یہ ایک بڑا راستہ ہے اس پر نہ چلو" اس آدمی نے" پھر یہی سوال کیا"" انھوں نے فرمایا" یہ ایک گہرا دریا ہے،

اس میں نہ اترو وہ آدمی نہ مانا اور اس نے پھر سوال کیا۔ آخر میں حضرت علی (رض) نے فرمایا: یہ اللہ کا ایک راز ہے جو تم سے پوشیدہ ہے اس لیے اس کی تفتیش و تحقیق میں مت پڑو"۔ لہٰذا اخروی سعادت اسی میں ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول نے جو کچھ بتایا ہے اور جن اعتقادات کو ماننے کے لیے کہا ہے اس پر عمل پیرا ہو جائے، ورنہ اپنی عقل کے تیر چلانا درحقیقت گمراہی کا راستہ اختیار کرنا اور تباہی و بربادی کی راہ پر لگنا ہے۔

نجات کا مدار خاتمہ پر ہے؛

حدیث؛

-[4] (مُتَّفق عَلَيْهِ)

عَن عبد الله بن مَسْعُود قَالَ :حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِق المصدوق» :إن أحدكم يجمع خلقه فِي بطن أمه أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثمَّ يكون فِي ذَلِك علقَة مثل ذَلِك ثمَّ يكون فِي ذَلِك مُضْغَة مثل ذَلِك ثمَّ يُرْسل الْملك فينفخ فِيهِ الرّوح وَيُؤمر بِأَرْبَع كَلِمَات بكتب رزقه وأجله وَعَمله وشقي أَو سعيد فوالذي لَا إِلَه غَيره إِن أحدكُم لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا «

ترجمہ؛

حضرت عبداللہ ابن مسعود (رض) راوی ہیں کہ صادق و مصدوق سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا۔ تم میں سے ہر آدمی کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا نطفہ

ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع رہتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا ہو جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ کو چار باتوں کے لکھنے کے لیے بھیجتا ہے، چنانچہ وہ فرشتہ اس کے عمل اس کی موت (کا وقت) اس کے رزق (کی مقدار) اور اس کا بد بخت و نیک بخت ہونا اللہ کے حکم سے اس کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تم میں سے ایک آدمی جنت والوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے آتا ہے۔ اور وہ دوزخیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور تم میں ایک آدمی دوزخیوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا سامنے آتا ہے اور وہ جنت والوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ایسا کم ہوتا ہے کہ لوگ بھلائی کے راستہ کو چھوڑ کر برائی کا راستہ اختیار کرتے ہوں لیکن اللہ کی رحمت کاملہ کے صدقے اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو لوگ بد بختی و برائی کے راستہ کو اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھلائی کی طرف آجاتے ہیں اور نیکی کے راستہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس حدیث نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ ابدی نجات و عذاب کا دارومدار خاتمہ پر ہے، اگر کسی کی پوری زندگی گناہ و معصیت یا کفر و شرک میں گزری لیکن اس نے آخر وقت میں صدق دل سے اپنی بداعمالیوں اور گمراہی پر نادم و شرمسار ہو کر نیک بختی و سعادت کے راستہ کو اختیار کر لیا تو وہ نجات پا

جائے گا۔اسی طرح اگر کوئی آدمی تمام عمر نیکی وبھلائی کرتا رہا اور اس کی تمام زندگی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت وفرمان برداری میں گزری لیکن آخر وقت میں وہ شیطان کی گمراہی یا اپنے نفس کی شرارت سے گمراہ ہوگیا اور اس نے اپنی حیات کے آخری لمحوں کو برائی و بدبختی کی بھینٹ چڑھا دیا تو وہ اپنی زندگی بھر کی نیکیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔لہٰذا اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ بھلائی و بہتری اور اخروی نجات اسی میں ہے کہ بندہ ہمیشہ اطاعت الٰہی اور فرمان نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بجا آوری میں مصروف رہے،اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی حدود شریعت سے تجاوز کرنے نہ پائے اور ہر آنے والے لمحہ کو یہ سوچ کر کہ شاید میری زندگی کا یہ آخری لمحہ ہو نیکی وبھلائی میں صرف کرتا رہے تاکہ خاتمہ بالخیر کی سعادت سے نوازا جائے۔اس موقع پر اتنی بات اور بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جو لوگ قضاو قدر کے مسئلوں کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کر بیٹھے ہیں کہ جب نجات وعذاب،نیک بختی و بدبختی اور جنت و دوزخ کا ملنا تقدیری چیز ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں چنانچہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی جو اس مسئلہ کی حقیقت کو نہیں سمجھ پائے تھے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اس قسم کی بات کہی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تم عمل کئے جاؤ کیونکہ جس کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اس کو اختیار بھی دیا گیا ہے۔یعنی قضاو قدر پر بھروسہ کر کے تمہارا عمل میں توقف کرنا یا عمل سے انکار کرنا کوئی کار آمد نہیں ہوگا اس لیے کہ احکام شارع کی جانب سے وارد ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی تم کو سوچنے سمجھنے کی قابلیت اور نیکی و بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی دی گئی ہے،نیز تمہارے اندر قصد و جہد کا مادہ بھی پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم ان اسباب کے ذریعہ عمل کرسکو،لہٰذا اب اگر تم قضاو قدر کا سہارا لے کر اسباب سے

قطع نظر کرو گے اور اعمال کو چھوڑ دو گے تو تباہی و بربادی کے غار میں جا گرو گے۔ ہاں یہ اللہ کی یقیناً کوئی مصلحت ہوگئی جس کی حقیقت وحکمت کو تو وہی جانتا ہے کہ ایک طرف تو اس نے قضا وقدر کے مسئلہ کو سامنے کر دیا دوسری طرف اعمال و افعال کے کرنے کا حکم دیا اور پھر اس مسئلہ میں تحقیق وتفتیش کرنے سے بھی منع فرما دیا اور پھر قضا وقدر کے سہارے اعمال کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو اس کا کیا جواب ہوگا کہ اللہ کی جانب سے شریعت کا اتارنا، احکام بھیجنا اور رسولوں کی بعثت جن کا مقصد احکام الٰہی پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہوتا تھا بلا وجہ ہوئی کیونکہ جب محض تقدیر پر بھروسہ ہوگا کہ جس کے مقدر میں جنت میں جانا لکھا ہوگا وہ جنت میں یقیناً جائے گا اور جس کے مقدر میں دوزخ لکھی ہوگی اور دوزخ میں یقیناً جائے گا تو ان رسولوں کی بعثت اور احکام و اعمال کی بجا آوری کی تاکید کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی، لہٰذا اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو یہ خیال غلط ثابت ہوگا۔ بہر حال جس طرح اور بہت سے اسرار الٰہی ہیں کہ ان کی بندوں کو خبر نہیں ہے اسی طرح یہ بھی ایک راز ہے، جو بندوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، اس لیے کسی کے ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ یہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے کہ (ایت یعذب من یشاء و یرحم من یشاء) (یعنی وہ جس کو چاہے (بداعمالیوں کی بنا پر) عذاب میں مبتلا کر دے اور جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے بخش دے)۔

عذابِ قبر کابیان

عذاب قبر قرآن و احادیث سے ثابت ہے اس میں کوئی شبہ اور کلام نہیں، یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہاں قبر سے مراد محض ڈیڑھ دو گز کا گڑھا نہیں ہے بلکہ قبر کا مطلب عالم برزخ ہے جو آخرت اور دنیا کے درمیان ایک عالم ہے اور یہ عالم ہر جگہ ہوسکتا ہے جیسے بعض لوگ ڈوب جاتے ہیں، جلا دیئے جاتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان پر بھی عذاب مسلط کیا جاتا ہے یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو زمین میں دفن کیا جاتا ہے صرف ان پر ہی عذاب ہوتا ہے اور جو لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں وہ عذاب سے بچ جاتے ہیں۔ عذاب قبر کی تصدیق کے درجات میں صحیح اور اولی مرتبہ اس بات کا اعتقاد و یقین رکھنا ضروری ہے کہ قبر میں دفن کرنے کے بعد اللہ کے نیک بندوں پر اللہ تعالیٰ کی بیشمار رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور جو لوگ بدکار و گناہ گار ہوتے ہیں ان پر اللہ کا سخت عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں منکر نکیر، عذاب دینے والے فرشتے اور سانپ و بچھو جو بد کردار و لوگوں پر مسلط کئے جاتے ہیں اور جن کا وجود احادیث سے ثابت ہے۔ یہ سب صحیح اور واقعی چیزیں ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ کسی چیز کو دیکھ لینا اور اس کا مشاہدہ میں آجانا ہی اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہوتا، اس لیے ان چیزوں کے بارے میں یہ بات دل میں جاگزیں کر لینا کہ جب ان چیزوں کو آنکھ سے دیکھا نہیں جاتا اور یہ مشاہدہ میں نہیں آتیں تو ان کا اعتبار کیسے کیا جائے؟ بالکل غلط اور خلاف عقل ہے، اس لیے کہ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ عالم بالا کی چیزوں کا مشاہدہ کر لینا، عالم ملکوت کو بچشم دیکھ لینا ان ظاہری آنکھوں کے بس کی بات نہیں ہے، ان کو مشاہدہ کرنے کے لیے چشم حقیقت کی ضرورت ہے ہاں یہ بات بھی ناممکن نہیں ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان دونوں ظاہری آنکھوں

سے بھی عالم ملکوت کو دکھلا سکتا ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ اسی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم بظاہر دیکھ نہیں پاتے اور نہ آنکھیں ان کا مشاہدہ کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا ادراک بھی ہوتا ہے اور اس کی حقیقت بھی تسلیم ہوتی ہے مثلاً ایک آدمی عالم خواب میں دنیا بھر کی چیزیں دیکھ اور سن لیتا ہے، ہر طرح کے غم ومصیبت اور لذت وآرام محسوس کرتا ہے لیکن دوسرا اسے نہیں دیکھ سکتا، یا اسی طرح کسی آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا اسے لذت حاصل ہوتی ہے یا وہ کسی غم وچین کا احساس کرتا ہے لیکن اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا ایک دوسرا آدمی اس سے بے خبر رہتا ہے اور وہ اس کا ادراک واحساس نہیں کر سکتا۔ نیز زمانہ نبوت میں سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس وحی آتی تھی اور حضرت جبرائیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آتے تھے لیکن وہیں مجلس میں بیٹھے ہوئے صحابہ نہیں دیکھتے تھے اور نہ ان کی ظاہری آنکھیں حضرت جبرائیل کا مشاہدہ کرتی تھیں، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام ان پر ایمان لاتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح عذاب قبر کا معاملہ ہے، وہاں جو کچھ بندے کے ساتھ ہوتا ہے اس دنیا میں اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے اسے دیکھا جا سکتا ہے، بس یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ عذاب قبر کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول نے جو کچھ بتایا ہے وہ سب مبنی برحقیقت اور یقینی چیزیں ہیں۔

قبر میں میت سے سوال؛

حدیث؛

وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ يَأْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ

فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَمَا يُدْرِيْكَ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الْاٰيَةَ قَالَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ لَهٗ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ رُوْحِهَا وَطِيْبِهَا وَيُفْسَحُ لَهٗ فِيْهَا مَدَّ بَصَرِهٖ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهٗ قَالَ وَيُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ اَنْ كَذَبَ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ اَعْمٰى اَصَمُّ مَعَهٗ مِرْزَبَّةٌ مِّنْ حَدِيْدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً يَّسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ. (رواہ مسند احمد بن حنبل و ابو داؤد)

••••••

حضرت براء بن عازب راوی ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (قبر میں) مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ " تیرا رب کون ہے؟ " وہ جواب دیتا ہے " میرا رب اللہ ہے! " پھر فرشتے پوچھتے ہیں " تیرا دین کیا ہے " وہ جواب میں کہتا ہے، " میرا دین اسلام ہے " پھر فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں، جو آدمی (اللہ کی طرف سے) تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ کون ہے؟ وہ کہتا ہے " وہ اللہ کے رسول ہیں " پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں یہ تجھے کس نے بتایا وہ کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کو سچ جانا، (یعنی جو کلام اللہ پر ایمان لائے گا وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پہلے ایمان لائے گا) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا۔ آیت (يُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ) 14۔ ابراہیم 27 :)(الآیۃ) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ثابت بات پر ایمان لائے (اخیر آیت تک) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ آسمان سے پکارنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتہ) پکار کر کہتا ہے میرے بندے نے سچ کہا لہٰذا اس کے لیے جنت کا فرش بچھاؤ اور اس کو جنت کی پوشاک پہناؤ اور اس کے واسطے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو، چنانچہ جنت کی طرف دروزاہ کھول دیا جاتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (جنت کے دروازہ سے) اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حد نظر تک اس قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اب رہا کافر! تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی موت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا کہ پھر اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں،" تیرا رب کون ہے؟" وہ کہتا ہے، ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا، پھر وہ پوچھتے ہیں" تیرا دین کیا ہے؟" وہ کہتا ہے، ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا پھر وہ پوچھتے ہیں، یہ آدمی کون ہے (جو اللہ کی جانب سے) تم میں بھیجا گیا تھا، وہ کہتا ہے" ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا، یہ جھوٹا ہے اس کے لیے آگ کا فرش بچھاؤ، آگ کا لباس اسے پہناؤ اور اس کے واسطے ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ دوزخ سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور لوئیں آتی ہیں اور فرمایا اور اس کی قبر اس کے لیے تنگ کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ ادھر کی پسلیاں ادھر اور ادھر کی پسلیاں ادھر نکل آتی ہیں، پھر اس پر ایک اندھا اور بہرا فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ

اس کو اگر پہاڑ پر مارا جائے تو پہاڑ مٹی ہو جائے اور وہ فرشتہ اس کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ (اس کے چیخنے چلانے کی آواز مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہے مگر جن و انسان نہیں سنتے اور اس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کے اندر روح ڈالی جاتی ہے۔" (مسند احمد بن حنبل و ابو داؤد)

تشریح:

فائدہ : ہاہ ہاہ ایک لفظ ہے جو عربی میں دہشت زدہ اور متحیر آدمی بولتا ہے جیسے اردو میں حیرت و دہشت کے وقت آہ، ہائے اور وائے وائے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے ہیبت ناکی سے خوف وحسرت کے الفاظ نکلتے ہیں اور وہ صحیح جواب نہیں دے پاتا اور وہ کہتا ہے کہ" میں نہیں جانتا" اس کے اس جواب پر ندائے غیب سے اس کو جھوٹا قرار دیا جاتا ہے، اس لیے کہ دین اسلام کی آواز مشرق سے لے کر مغرب تک پہنچی اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا مشن چار دانگ عالم میں پھیلایا اور تمام دنیا اس آفاقی و آسمانی مذہب سے باخبر تھی، اس کے باوجود اس کا یہ کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا یا مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا، سراسر کذب اور جھوٹ ہے۔ قبر میں عذاب کے جو فرشتے مقرر کئے جاتے ہیں وہ اندھے اور بہرے ہوتے ہیں، اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ نہ تو مردہ کے چیخنے چلانے کی آواز سن سکیں اور نہ اس کے حال کو دیکھ سکیں تاکہ رحم نہ آسکے۔ نیز اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ معذب مردہ کے جسم میں بار بار روح ڈالی جاتی ہے تاکہ اس پر عذاب شدید سے شدید ہو سکے اور یہ اس چیز کا انجام ہے کہ وہ دنیا میں عذاب قبر کا انکار کیا کرتا تھا اور اس کو جھٹلایا کرتا تھا۔ (نعوذ باللہ)۔

آیت مذکورہ میں بالقول الثابت سے مراد کلمہ شہادتے ہے یعنی جب مومن سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا پروردگار کون ہے اور تیرا پیغمبر کون ہے اور تیرا دین کیا تو ان تینوں سوالوں کا جواب اسی کلمہ شہادت میں ہے۔ آیت کے دوسرے جز کا مطلب یہ ہے جو لوگ ایمان ویقینی کی روشنی سے اپنے قلوب کو منور کر لیتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان واسلام کی حقانیت راسخ اور پختہ ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دونوں جگہ ان پر رحمت الٰہی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

دنیاوی زندگی کا اس کا فضل تو یہ ہے کہ وہ اپنے ان نیک بندوں کو کلمہ اسلام کی حقانیت کے اعتقاد پر قائم رکھتا ہے اور ان کے دل میں ایمان واسلام کی وہ روح اور طاقت بھر دیتا ہے کہ دنیاوی امتحان وآزمائش کے سخت سے سخت موقع پر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی وہ اپنی جانوں کو قربان کر دینا اور آگ میں ڈالے جانا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے ایمان واعتقاد میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ اخروی زندگی میں اس کی رحمت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی بیشمار نعمتوں سے نوازے جاتے ہیں اور عالم برزخ میں جب قبر کے اندر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ ٹھیک جواب دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کی نجات اور اکرام الٰہی کے مستحق قرار دے دیئے جاتے ہیں۔

سنت و بدعت کا بیان؛

حدیث؛ 12

عَنْ جَابِرٍ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللہِ وَخَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔
(صحیح مسلم)

ترجمہ؛

حضرت جابر (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ بعد ازاں جاننا چاہیے کہ بیشک سب سے بہتر بات اللہ کی کتاب ہے، سب سے بہترین راستہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے جس کو (دین میں) نیا نکالا گیا ہو اور ہر بدعت (اپنی طرف سے دین میں پیدا کی ہوئی نئی بات) گمراہی ہے۔" (صحیح مسلم)

تشریح؛

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خطبہ ارشاد فرما رہے ہوں گے، چنانچہ سب سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کی حمد و تعریف کی ہوگی پھر امابعد یعنی بعد ازاں کہہ کر یہ حدیث اس طرح ارشاد فرمائی۔ بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کا وجود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ مبارک میں نہ رہا بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد مختلف زمانوں میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بدعت کی دو قسمیں ہیں" بدعنت حسنہ" اور" بدعت سیہ" یعنی اگر ایسی چیزیں نکالی گئی ہیں جو اسلامی اصول و قوائد کے مطابق ہوں اور قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہوں تو ان کو بدعت

حسنہ فرماتے ہیں اور جو چیزیں منشاءِ شریعت کے برعکس اور قرآن وحدیث کے برخلاف ہوں ان کو بدعت سیہ فرماتے ہیں اور یہی بدعت گمراہی وضلالت اور خداوند کے رسول کی ناراضگی کا باعث ہے، چنانچہ حدیث میں کل بدعۃ ضلالۃ سے مراد یہی بدعت سیہ ہے ایسی بدعت سے اجتناب ضروری ہے۔ اس کے برخلاف بعض بدعات حرام ہیں مثلاً قدریہ وجبریہ کے مذاہب اوران کے افکار ونظریات جو قرآن وسنت کے بالکل برخلاف ہیں بلکہ ان کے مذاہب کا رد کرنا بدعت واجبہ ہے۔ بعض بدعات مستحب ہیں جیسے خانقاہیں قائم کرنا اور وہاں معرفت الی اللہ کے لیے لوگوں کے قلوب کو راہ حق پر لگانا، یا مدرسے قائم کرنا جہاں مسلمان بچوں کو دینی تعلیم وتربیت دینا، یا اسی طرح ایسے تمام کار خیر اور اچھی چیزیں جن کی فی الوقت ضرورت مسلم ہوا اور وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں موجود نہ رہ ی ہوں۔ کچھ بدعات مکروہ بھی ہیں مثلاً کلام اللہ اور مساجد پر نقش ونگار بنانا اوران کی تزئین وآرائش کے لیے غیر مسنون طریقے اختیار کرنا۔ بعض بدعات مباح بھی ہیں، جیسے صبح کے بعد مصافحہ کرنا لیکن یہ امام شافعی کا مذہب ہے حنفیہ کے یہاں صبح کے بعد کا مصافحہ کرنا مکروہ ہے۔ بدعت کے سلسلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں جو نئی بات پیدا کی جائے یعنی بدعت اگر وہ کتاب کے مخالف صحابہ کے اقوال کے منافی اور اجماع امت کے برعکس ہو تو وہ ضلالت وگمراہی ہے اور جو چیزیں ایسی نہ ہوں ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علم کا بیان

علم کیا ہے؟ یہ وہ عظیم وصف ہے جو انسان کو نہ صرف یہ کہ شرافت وتہذیب کا سرمایہ بخشتا ہے عزّت وعظمت کی دولت سے نوازتا ہے، اخلاق وعادات میں جلا پیدا کرتا ہے اور انسانیت کو انتہائی بلندیوں پر پہنچاتا ہے، بلکہ قلب انسانی کو عرفان الٰہی کی مقدس روشنی سے منور کرتا ہے، ذہن و فکر کو صحیح عقیدے کی معراج بخشتا ہے اور دل ودماغ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت گزاری کی راہ مستقیم پر لگاتا ہے۔ اسلام! جو انسان کے لیے ترقی وعظمت کی راہ میں سب سے عظیم مینارہ نور ہے، وہ اس عظیم وصف کو انسانی برادری کے لیے ضروری قرار دیتا ہے اور اس کے حصول کو دینی ودنیوی ترقی وکامیابی کا زینہ بناتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام ہر اس علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسلامی عقیدہ وعمل سے مزاحم ہوئے بغیر انسانی معراج کا ضامن ہو، اسلام کسی بھی علم کے حصول کو منع نہیں کرتا۔ لیکن ایسے علم سے وہ بیزاری کا اظہار بھی کرتا ہے جو ذہن وفکر کو گمراہی کی طرف موڑ دے یا انسان کو اللہ کے رسول سے نا آشنا رکھ کر دہریت کے راستہ پر لگا دے۔ یہاں (کتاب العلم) کا عنوان قائم کر کے جس علم کی ضرورت وفضیلت پر مشتمل، احادیث بیان کی جا رہی ہیں وہ "علم دین ہے" جو شریعت کی نظر میں بنیادی اور ضروری حیثیت رکھتا ہے۔ دینی علم دوسرے علوم کے مقابلے میں اسلام کی نظر میں سے سب مقدم اور ضروری ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد منقول ہے۔ الحدیث (طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ)۔ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" ظاہر ہے کہ اسلام جس زندگی کا تقاضا کرتا ہے اور انسان کو عبودیت کی معراج پر دیکھنا چاہتا ہے وہ علم دین ہی پر موقوف ہے علم دین کی بناء پر انسان، انسان بنتا ہے اور بندہ اپنی حقیقت کو پہچان

کر ذات حق کا عرفان حاصل کرتا ہے، نیز عقیدہ وعمل کی تمام راہیں اسی سے نکلتی ہیں جس پر چل کر بندہ اپنے پروردگار کا حقیقی اطاعت گزار، رسول کا فرمان بردار اور دین وشریعت کا پابند بنتا ہے۔ (علم دین) جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر مشتمل ہے۔ اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ اول (مبادی) یعنی وسائل، دوم (مقاصد) مبادی۔ اس علم کو کہتے ہیں جس کے حصول پر کتاب وسنت کی معرفت موقوف ہے، یعنی جب تک یہ علم حاصل نہ کیا جائے قرآن وحدیث کے علوم ومعارف کا عرفان حاصل نہیں ہوسکتا مثلاً لغت، صرف ونحو وغیرہ کے علوم کہ جب تک ان کو حاصل نہ کیا جائے اور ان پر نظر نہ ہو کتاب وسنت کا علم صحیح طور پر نہیں آسکتا اور نہ ان کے حقیقی منشا، ومقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مقاصد۔ وہ علم ہے جو عقائد، اعمال اور اخلاق سے متعلق ہے۔ یعنی یہی وہ علم ہے جو مقصود بالذات اور فی نفسہ ضروری ہے اور اسی کو حاصل کر کے دین وشریعت کی پابندی کا سیدھا راستہ سامنے آتا ہے۔" ان سب کو علم معاملات" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک" علم مکاشفہ" بھی ہوتا ہے۔ یہ دراصل وہ نور ہوتا ہے جو علم پر عمل کرنے سے قلب میں پیدا ہوتا ہے جس کی مقدس روشنی سے ہر چیز کی حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور احوال کی معرفت پیدا ہوتی ہے اس علم مکاشفہ کو علم حقیقت اور علم وراثت میں کہتے ہیں جیسے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔ الحدیث (مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَہُ اللہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ)۔" جو آدمی علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس چیز کا علم نصیب کرتا ہے جو نہ جانا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔" بہر حال، علم ظاہر وعلم باطن کی جو اقسام مشہور ہیں وہ یہی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور ان دونوں میں بدن و روح اور پوست ومغز کی نسبت ہے۔ نیز علم کی فضیلت میں جو آیتیں وارد ہیں، یا احادیث منقول

ہیں وہ ان تمام اقسام کو مراتب درجات کے تفاوت کے ساتھ شامل ہیں۔

علم کی فضیلت

حدیث

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ص قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا حَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَسَلَّطَہُ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا۔ (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

ترجمہ:

حضرت عبداللہ ابن مسعود (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ دو آدمیوں کے بارے میں حسد کرنا ٹھیک ہے ایک تو وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم دیا چنانچہ وہ اس علم کے مطابق حکم کرتا اور دوسروں کو سکھاتا ہے۔" (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

تشریح:

حسد اسے کہتے ہیں کہ "کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کی جائے کہ یہ نعمت میرے پاس آجائے اور اس کے پاس سے ختم ہو جائے۔" ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بری خصلت اور انتہائی ذلت نفس کی بات ہے۔ اسلام جو اخلاق، پاکیزگی کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس غیر اخلاقی اور ذلیل خصلت کو پسند نہیں کرتا اور اس سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ حسد کے مقابلہ میں غبطہ ہے۔ غِبط اسے فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کی جائے کہ جیسی نعمت اس کے پاس ہے اللہ اس نعمت سے مجھے بھی سرفراز فرمائے۔ شریعت اس کو

جائز قرار دیتی ہے مگر یہ بھی اچھی باتوں مثلاً نیک اخلاق و عادات، بہترین خصائل اور فضل و کمال کے بارے میں جائز ہے چنانچہ اس حدیث میں جس حسد کے بارے میں فرمایا گیا ہے وہ غطبہ ہے۔

تین چیزوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا ہے:

حدیث:

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْ لَهٗ۔

(صحیح مسلم)

ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ اس سے منقطع ہوجاتا ہے مگر تین چیزوں کے ثواب کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔ (۱) صدقہ جاریہ (۲) علم جس سے نفع حاصل کیا جائے (۳) صالح اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لیے دعا کرے۔" (صحیح مسلم)

تشریح:

ایسے اعمال جن کا تعلق دنیاوی زندگی سے ہوتا ہے ان کے اثرات مرنے کے بعد دنیا ہی میں ختم ہوجاتے ہیں مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان کی زندگی میں ادا ہوتے تھے گو کہ ان کا ثواب بایں طور باقی رہتا ہے کہ وہ ذخیرہ آخرت ہوجاتے ہیں اور مرنے کے بعد اس پر جزاء ملتی ہے مگر ان کا سلسلہ مرنے کے بعد آئندہ جاری نہیں رہتا۔ کیونکہ زندگی میں جب تک یہ

اعمال ہوتے تھے اس کا ثواب ملتا رہتا تھا جب زندگی ختم ہوگئی تو یہ اعمال بھی ختم ہو گئے اور جب یہ اعمال ختم ہو گئے تو اس پر جزاء سزا کا ترتب بھی ختم ہو گیا۔لیکن کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جن کے ثواب کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ زندگی میں ملتا ہے بلکہ مرنے کے بعد باقی و جاری رہتا ہے۔ایسے ہی اعمال کے بارے میں اس حدیث میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تین اعمال ایسے ہیں کہ زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کے ثواب کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور مرنے والا برابر اس سے منتفع ہوتا رہتا ہے۔پہلی چیز صدقہ جاریہ ہے،یعنی اگر کوئی آدمی اللہ کی راہ میں زمین وقف کر گیا ہے یا کنواں و تالاب بنوا گیا ہے یا ایسے ہی اللہ کی مخلوق کے فائدہ کی خاطر کوئی دوسری چیز اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے تو جب تک یہ چیزیں قائم رہیں گی اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کو برابر ثواب ملتا رہے گا۔دوسری چیز علم نافع ہے یعنی کسی ایسے عالم نے وفات پائی جو اپنی زندگی میں لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچاتا رہا اور پھر اپنے علوم و معارف کو کسی کتاب کے ذریعہ محفوظ کر گیا جو ہمیشہ لوگوں کے لیے فائدہ منداور رشد و ہدایت کا سبب بنی ہے یا کسی ایسے آدمی کو اپنا شاگرد بنا گیا جو اس کے علم کا صحیح وارث ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو زندگی ختم ہونے کے بعد اس کے لیے سرمایہ وسعادت ثابت ہوں گی اور جن کا ثواب اسے وہاں برابر ملتا رہے گا۔تیسری چیز اولاد صالح ہے ظاہر ہے کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑی سعادت اور وجہ افتخار اس کی اولاد صالح ہی ہوتی ہے اس لیے کہ صالح اولاد نہ صرف یہ کہ ماں باپ کے لیے دنیا میں سکون و راحت کا باعث بنتی ہے بلکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لیے وسیلہ نجات اور ذریعہ فلاح بھی بنتی ہے اور اس طرح سے کہ لائق و نیک لڑکا اپنے والدین کی قبروں پر جاتا ہے وہاں فاتحہ پڑھتا ہے دعائے مغفرت کرتا ہے،قرآن پڑھ کر ان کو

بخشتا ہے اور ان کی طرف سے خیرات وصدقات کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں مردہ کے لیے ثواب کا باعث ہیں جن سے وہ اخروی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔

اخلاص کے بغیر نیک اعمال بے کار ہیں؛

حدیث؛

وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسلم » :إن أول النَّاس يقْضى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا ؛ قَالَ قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِيءٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أمر بِهِ فسحب على وَجهه حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْآنَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعلم ليقال عَالِمٌ وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا ؛ قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ « .رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے دن پہلا آدمی جس پر (خلوص نیت کو ترک کر دینے کا) حکم لگایا جائے گا وہ ہوگا جسے (دنیا میں) شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ (میدان حشر میں) وہ پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی (دی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو

نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ یعنی اللہ اسے اپنی نعمتیں جتا کر الزاماً فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکرانہ میں کیا اعمال کیئے؟ وہ کہے گا میں تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے کیونکہ تو اس لیے لڑا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے چنانچہ تجھے (بہادر کہا گیا) اور تیرا اصل مقصد مخلوق سے حاصل ہوا اب مجھ سے کیا چاہتا ہے، پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچا جائے، یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، پھر (دوسرا) وہ آدمی ہو گا جس نے علم حاصل کیا، دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا چنانچہ اسے بھی (اللہ کے حضور میں) لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی پھر اللہ پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کیئے؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور تیرے ہی لیے قرآن پڑھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے تو علم محض اس لیے حاصل کیا تھا تا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا تھا تا کہ تجھے لوگ قاری کہیں، چنانچہ تجھے (عالم و قاری) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر (تیسرا) وہ آدمی ہو گا جس کو اللہ نے (معیشت میں) وسعت دی اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا۔ اس کو بھی اللہ کے حضور میں لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کیئے؟ وہ کہے گا میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں تو خرچ کرنا پسند کرتا ہو اور تیری خوشنودی کے لیے میں اس میں خرچ نہ کیا ہو، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو نے خرچ اس لیے کیا تا کہ تجھے (سخی) کہا جائے اور تجھے (سخی) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں

ڈال دیا جائے گا۔" (صحیح مسلم)

تشریح:

اعمال میں نیت کا کیا درجہ ہے؟ اور خلوص کی کتنی ضرورت ہے؟ اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے بندہ کتنا بڑے سے بڑا عمل خیر کرے، بڑی سے بڑی نیکی کر ڈالے لیکن اگر اس کی نیت بخیر نہیں ہے تو اس کا وہ عمل اور نیکی کسی کام نہیں آئے گی اللہ تعالیٰ کو وہی عمل پسند ہے جس میں محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کی نیت ہو اور جذبہ اطاعت خلوص سے بھرپور ہو، ورنہ جو بھی عمل بغیر اخلاص اور بغیر نیت خیر کیا جائے گا چاہے وہ کتنا ہی عظیم عمل کیوں نہ ہو بارگاہ الوہیت سے ٹھکرا دیا جائے گا اور اس پر کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا بلکہ الٹا اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار کیا جائے گا جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا۔

علماء کی فضیلت:

حدیث:

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » :فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ« .رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)

ترجمہ:

حضرت عبداللہ ابن عباس (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ ایک فقیہ (یعنی عالم دین) شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔" (جامع ترمذی وسنن ابن ماجہ)

تشریح:

مقابلہ کا یہ مسلم اصول ہے کہ کامیابی اس آدمی کے حصہ میں آتی ہے جو اپنے مدمقابل کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف ہو اور اس کا توڑ جانتا ہو۔ چنانچہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ مقابلہ کے اکھاڑہ میں وہ آدمی جو اپنے ظاہری قویٰ اور جسم کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اپنے اس مقابل کو پچھاڑ دیتا ہے جو جسم و بدن کے اعتبار سے اس سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ وہ جب مقابلہ میں آتا ہے تو اس کا دماغ بنیادی طور پر مقابل کے ہر وار سے بچاؤ کی شکل اور اس کے ہر داؤ کا جواب اپنے خزانہ میں رکھتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی اسی ہی سے ہوتی ہے۔ دنیا میں باطنی طور پر انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے جو اپنے مکر و فریب کی طاقت سے لوگوں کو گمراہی کی وادی میں پھینکتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو شیطان کے مکر و فریب سے واقف نہیں ہوتے اور اس کی طاقت وقوت کا جواب نہیں رکھتے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں مگر ایسے لوگ جو اس کے ہر داؤ کا جواب رکھتے ہیں اور اس کی طاقت وقوت کی شہ رگ پر ان کا ہاتھ ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ خود اس کی گمراہی سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی محفوظ رکھتے ہیں اور یہ لوگ وہی عالم ہوتے ہیں جن کے قلب و دماغ نور الٰہی کی مقدس روشنی سے متور اور ان کے ذہن و فکر علم و معرفت کی طاقت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس حدیث میں فرمایا جا رہا ہے کہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عابد جتنی طاقت رکھتے ہیں اتنی طاقت تنہا ایک عالم کے پاس ہوتی ہے کیونکہ جب شیطان لوگوں پر اپنے مکر و فریب کا جال ڈالتا ہے اور انھیں خواہشات نفسانی میں پھنسا کر گمراہی کے راستہ پر لگا دینا چاہتا ہے تو عالم اس کی چال سمجھ لیتا ہے چنانچہ وہ لوگوں پر شیطان کی گمراہی کو ظاہر کرتا ہے اور ایسی تدابیر انھیں بتا دیتا ہے جن پر عمل کرنے سے وہ شیطان کے ہر حملے سے محفوظ رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے وہ عابد جو صرف عبادت ہی عبادت کرنا جانتا

ہے اور علم و معرفت سے کوسوں دور ہوتا ہے وہ تو محض اپنی ریاضت و مجاہدہ اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اسے یہ خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ شیطان کس چور دروازے سے اس کی عبادت میں خلل ڈال رہا ہے اور اس کی تمام سعی و کوشش کو ملیا میٹ کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر وہ عبادت میں مشغول رہتا ہے، مگر لا علم ہونے کی وجہ سے وہ شیطان کے مکر و فریب میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اس لیے نہ وہ خود شیطان کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو محفوظ رکھ سکتا ہے

علم پر غرور کرنا گناہ ہے:

حدیث:

وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » :مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يصرف بِهِ وُجُوه النَّاس إِلَيْهِ أدخل الله النَّار «.
رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

ترجمہ:

حضرت کعب ابن مالک (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔ جس آدمی نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر کرے، بیوقوفوں سے جھگڑے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔ جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ ابن عمر (رض) سے روایت کیا ہے۔" (جامع ترمذی)

تشریح

علم اپنی لطافت اور نورانیت کے سبب ریاکاری، خودنمائی، غرور وتکبر اور بے جافخر ومباہات کی غلاظتوں کو برداشت نہیں کرسکتا۔ جب علم کی اوّلین کرن یہی چاہتی ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ سے ظلم و جہل کی ہر تاریکی کو دور کردے تو یہ کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے کہ ایک عالم جس کے دماغ میں علم کی مقدس روشنی بھری ہو، ان غیر اسلامی وغیر اخلاقی چیزوں کا مظاہرہ کرے۔ علم کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک انسان تہذیب وشرافت اور تعلیم وترقی کی انتہائی بلندیوں پر ہونے کے باوجود بھی سراپا انکسار متواضع بنا رہے، ریاکاری وخودنمائی سے الگ رہے اور اخلاق و احسان کی زندگی اختیار کئے رہے۔ اس لیے فرمایا جارہا ہے کہ اگر کوئی علم محض دینوی منفعت اور ذاتی وجاہت وعزت کی خاطر حاصل کرتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنے کے بعد لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں، عوام پر اپنی علم دانی کا سکّہ جما کر ان سے مال و دولت حاصل کیا جائے علم کو دنیا کے کاروبار اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے آلہ کار بنایا جائے اور نہ صرف یہ بلکہ علم حاصل کرنے کے بعد وہ علماء حق کے ساتھ غرور وتکبر کا معاملہ کرتا ہے، جاہلوں سے خواہ مخواہ الجھتا رہتا ہے، لوگوں کے سامنے بے جافخر ومباہات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تو ایسے عالم کو کان کھول کر سن لینا چاہیے کہ چاہے وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائے اور تقدیر الٰہی اس کی خواہشات اور اغراض کی سیادت و وجاہت بلکہ اس کو اس عدم اخلاص کی سزا بایں طور بھگتنی ہوگی کہ اسے جہنم کے شعلوں کے حوالے کردیا جائے گا۔ ہاں، ایسا آدمی جو پہلے اپنی نیت میں مخلص تھا، اس کے ارادہ میں کسی قسم کو کوئی کھوٹ نہیں تھا اور اس کا مقصد حاصل کرنے سے محض اعلاء کلمۃ اللہ اور رضائے مولیٰ تھا مگر بعد میں بتقضائے فطرت و انسانی جبلت اس کی

نیت میں کھوٹ پیدا ہوگیا اور اس میں نمود و نمائش اور ریاکاری کا اثر ہوگیا تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ اس معاملہ میں بہر حال وہ معذور ہے۔

دین میں عقل نہیں چلتی؛

حدیث؛18

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» :مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ «. وَفِي رِوَايَةٍ» :مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ من النَّار «رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

ترجمہ؛

حضرت عبداللہ ابن عباس (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔جس آدمی نے قرآن کے اندر اپنی عقل سے کچھ کہا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس آدمی نے بغیر علم کے قرآن میں کچھ کہا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔" (جامع ترمذی)

تشریح :

جس طرح حدیث بیان کرنے میں احتیاط سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے اسی طرح قرآن کا ترجمہ کرنے اور اس کی تفسیر بیان کرنے کے بارے میں بھی اسی احتیاط سے کام لینے کی ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ آیات کی وہی تفسیر بیان کی جائے جو احادیث سے ثابت اور علماء امت سے

منقول ہو اور جس پر نقلاً سند موجود ہو۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آیتوں کی تفسیر اور ان کے مطالب و مقاصد بیان کرنے میں اپنی عقل اور رائے کو دخل دیا جائے کیونکہ اس طرح قرآن کے معنی و مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا موجب ہے۔

قرآن میں جھگڑنا کفر ہے؛

حدیث؛

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» :الْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ«.رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُد

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم نے ارشاد فرمایا۔قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔"
(مسند احمد بن حنبل و سنن ابوداؤد)

تشریح :

ان لوگوں کا دائرہ کفر کے قریب کر دیا گیا ہے جو قرآن کے معنی و مطالب اور مقاصد و مراد کے تعیین میں جھگڑتے رہتے ہیں اور جس کی عقل میں جو آتا ہے اس کو حق اور صحیح سمجھتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز ایسے کم فہم لوگوں کو جب ظاہری طور پر قرآن کی آیتوں میں معنی و مقصد کے لحاظ سے فرق نظر آتا ہے تو وہ ان میں سے ایک آیت کو ناقابل اعتناء و ناقابل قبول اور ناقابل استشہاد قرار دے کر دوسری آیت کو راجح قرار دے دیتے ہیں۔گویا اس طرح وہ قرآن ہی کی ایک آیت سے دوسری آیت کو ساقط کر دیتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسا کرنا شرعی نقطہ نظر سے انتہائی جرم ہے بلکہ ایسی شکل میں جبکہ دو آیتوں میں باہم اختلاف و تضاد نظر آئے تو حتی

الامکان دونوں میں تطابق اور توافق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہو تو اسے یہ اعتقاد کر لینا چاہیے کہ یہ میری کم علمی اور بدفہمی کی بنا پر ہے اور حقیقی مفہوم و مراد کا علم اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سونپ دے کہ وہی بہتر جاننے والے ہیں۔ مثلاً اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ خیر اور شر سب اللہ ہی کی جانب سے ہے اور وہ اپنے اس عقیدہ کی بنیاد اس آیت پر رکھتے ہیں کہ ارشاد ربانی ہے آیت (قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ) 4۔ النساء 78 :) ''یعنی (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔'' اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ اور ان کی دلیل بالکل صحیح اور صاف واضح ہے۔ لیکن اہل قدر اس کی تردید کرتے ہیں اور اس کے برخلاف اپنا عقیدہ یہ قائم کئے ہوئے ہیں کہ خیر کا خالق اللہ ہے اور شر کا خالق اللہ نہیں ہے اور شر کا خالق خود انسان ہے اور اپنے عقیدہ کی بنیاد اس آیت پر رکھتے ہیں جو بظاہر پہلی آیت کے متضاد ہے یعنی ارشاد ربانی ہے۔ آیت (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ) 4۔ النساء 79 :) '' جو کچھ از قسم نیکی تمہیں پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ از قسم برائی تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی جانب سے ہے۔'' بہرحال اس قسم کے اختلافات اور آیتوں میں تضاد پیدا کرنا منع ہے بلکہ یہ چاہیے کہ اس قسم کی آیتوں میں ایسی آیت پر عمل کیا جائے جس پر مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہو اور دوسری آیت میں ایسی تاویل کی جائے جو شرع کے مطابق ہو، جیسا کہ انھیں دونوں مذکورہ بالا آیت میں دیکھا جائے کہ پہلی آیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ خیر و شر تمام اللہ ہی کی جانب سے ہے اور ہر چیز تقدیر الٰہی کے مطابق ہی ہوتی ہے اس پر عمل کیا جائے۔ اور دوسری آیت کی یہ تاویل کی جائے کہ دراصل اس آیت کا تعلق ما قبل کی آیت سے ہے کہ اس میں منافقین کی

برائی اوران کا عقیدہ بیان کیا جارہا ہے کہ ان منافقوں کو کیا ہوا ہے جو کہ اس چیز کو جو صحیح اور واضح ہے نہیں سمجھتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ نیکی و بھلائی تو اللہ کی طرف سے ہے اور برائی خود بندہ کے نفس کی جانب سے ہے۔

گویا اس طرح دونوں آیتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔اس طرح دیگر آیتوں میں بھی مطابقت پیدا کی جائے۔

بغیر تحقیق جواب دینا گناہ ہے؛

حدیث

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» :مَنْ أُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُهُ عَلَى مَنْ أَفْتَاهُ وَمَنْ أَشَارَ عَلَى أَخِيهِ بِأَمْرٍ يَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ فِي غَيْرِهِ فَقَدْ خانه« .رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا۔جس آدمی کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہو گا تو اس کا گناہ اس آدمی پر ہو گا جس نے اس کو (غلط) فتویٰ دیا ہے اور جس آدمی نے اپنے بھائی کو کسی ایسے کام کے بارے میں مشورہ دیا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے تو اس نے خیانت کی۔" (سنن ابوداود)

تشریح:

مثلاً ایک جاہل آدمی کسی عالم کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آیا عالم نے سائل کو اس کے سوال کا صحیح

جواب نہیں دیا بلکہ کم علمی یا کسی دوسری وجہ سے غلط مسئلہ بتادیا۔اس جاہل نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ مسئلہ غلط ہے۔اس پر عمل کرلیا تو اس کا گناہ اس جاہل آدمی پر نہیں ہوگا بلکہ اس عالم پر ہوگا جس نے اسے غلط مسئلہ بتا کر غلط عمل کرنے پر مجبور کیا لیکن شرط یہ ہے کہ عالم نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہو۔حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی آدمی نے اپنے کسی بھائی کی بدخواہی اس طرح چاہی کہ اسے اس چیز کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے بلکہ دوسرے امر میں ہے تو یہ اس کی خیانت ہے وہ اپنے غیر اخلاقی وغیر شرعی عمل کی بنا پر خائن کہلائے گا۔

عمل کم اجر زیادہ؛

حدیث؛

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :(أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللّٰہُ بِهِ الْخَطَايَا وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟" قَالُوا بَلَى يَارَسُولَ اللّٰہِ قَالَ» :إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطَى إِلَى الْمَسَاجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاة فذلكم الرِّبَاط «

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا" کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتادوں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو دور کردے اور جس کے سبب (جنت میں) تمہارے

درجات کو بلند کرے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا" ہاں یارسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مشقت کے وقت (یعنی بیماری یا سخت جاڑے میں) وضو کو پورا کرنا، مسجد کی طرف (گھر سے دور ہونے کی وجہ سے) کثرت سے قدموں کا رکھنا اور (ایک) نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ رباط ہے اور مالک بن انس کی حدیث میں" پس یہ رباط ہے پس یہ رباط ہے" دو مرتبہ ہے اور جامع ترمذی کی روایت میں تین مرتبہ ہے۔"

تشریح

اس حدیث میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے رب قدوس اپنے بندوں پر اس طرح فضل و کرم فرماتا ہے کہ ان کے نامہ اعمال سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور جنت میں ان کے مراتب و درجات میں ترقی عطا فرماتا ہے چنانچہ سب سے پہلی چیز" وضو" ہے۔ یوں تو وضو نماز کے لیے شرط اور ضروری ہے لہٰذا جو نماز پڑھے گا وہ وضو بھی کرے گا خواہ کیسا ہی موسم ہو مگر اس جگہ ایک خاص بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی سخت وقت میں مثلاً کسی بیماری کی حالت میں یا شدید سردی کے موسم میں عموماً وضو کے معاملہ میں بڑی تساہلی برتی جاتی ہے اور اول تو زبردستی اور صحت کے منافی طریقوں کو اختیار کر کے دو اور تین وقت وضو کو باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر اگر وضو کیا جاتا ہے تو ایسے طریقے سے کہ نہ تو اس میں وضو کے آداب اور اس کے سنن و مستحبات کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ وضو پورے طریقہ سے مکمل کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے سخت اور شدید وقت میں اگر وضو پورے آداب و طریقے ملحوظ رکھ کے اور تمام سنن و مستحبات کا خیال کر کے کیا جائے اور تمام اعضاء وضو پر پانی اچھی طرح پہنچایا جائے اور ان کو تین تین مرتبہ دھویا جائے تو یہ فضل الٰہی کا سبب

ہوگا۔ دوسری چیز مسجد کی طرف کثرت سے قدموں کا رکھنا ہے، یعنی ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانا جو گھر سے دور ہو اس لیے کہ جتنے زیادہ قدم مسجد کی طرف اٹھیں گے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔" نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار" یہ ہے کہ مسجد میں ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھا رہے یا اگر مسجد سے نکلے بھی تو دل وہیں دوسری نماز میں لگا رہے اس کی بہت زیادہ فضیلت و عظمت بیان فرمائی جا رہی ہے چنانچہ اس کو" رباط" کہا گیا ہے۔" رباط اسے فرماتے ہیں کہ کوئی مسلمان اسلامی مملکت کی سرحد پر دشمنان اسلام کا مقابلہ پر نگہبانی کی خاطر بیٹھے تاکہ دشمن سرحد پار کر کے اسلامی ملک میں داخل نہ ہو جائیں اس کا ثواب ہے اور بڑی فضیلت ہے جو خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے :

آیت (ی اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا) 3۔ آل عمران : 200) " اے ایمان والو! (تکلیف پر) خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لیے مستعد رہو۔" چنانچہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا اصل رباط ہے کہ جیسے وہاں تو کفار مقابلہ میں بیٹھے ہیں یہاں شیطان کے مقابلہ میں بیٹھے ہیں جو دین کا سب سے بڑا دشمن ہے اس لیے جیسی فضیلت وسعادت رباط میں ہے ویسی ہی فضیلت وسعادت نماز کے انتظار میں بیٹھنے کی ہے اس حدیث میں چونکہ" وضو" کا ذکر آگیا ہے اس لیے اس کے متعلقات کا یہاں بیان کر دینا مناسب ہے۔ وضو میں چار چیزیں فرض ہیں (۱) تمام منہ کا دھونا (۲) ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا (۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا (۴) پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے اور اسی میں ڈاڑھی بھی شامل ہے، البتہ ڈاڑھی کی تعین میں تھوڑا بہت اختلاف ہے چنانچہ متون میں لکھا ہے کہ ڈاڑھی کے ان بالوں کا مسح کرنا جو منہ کی جلد سے

ملے ہوئے ہیں فرض ہے فتاویٰ عالمگیری اور درمختار میں صحیح اور مفتی بہ قول یہ لکھا ہے کہ ڈاڑھی کے ان بالوں کا مسح کرنا جو منہ کی جلد سے ملے ہوئے ہیں فرض ہے اور لٹکی ہوئی کا دھونا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے واللہ تعالیٰ اعلم وضو میں سنت یہ چیزیں ہیں (۱) ہاتھوں کا پہنچوں تک دھونا (۲) ابتدائے وضو میں بسم اللہ کہنا (۳) مسواک کرنا (٤) کلی کرنا (٥) ناک میں پانی دینا (٦) ڈاڑھی اور انگلیوں کا خلال کرنا (۷) ہر عضو کو تین بار دھونا (۹) اسی ترتیب سے وضو کرنا جس ترتیب سے قرآن میں مذکور ہے (۱۰) تمام سر کا مسح کرنا (۱۱) اعضاء وضو کو پے در پے دوھونا (۱۲) سر کے پانی کے ساتھ ہی کانوں کا مسح کرنا (یعنی ہاتھ پر پانی ڈال کر جب سر پر مسح کیا جائے تو اسی ہاتھ سے کانوں کا مسح کیا جائے، کانوں کے مسح کے لیے الگ سے پانی کی ضرورت نہیں۔ وضو کے مستحبات یہ ہیں (۱) اعضاء وضو کو دھونے کے لیے دائیں طرف سے شروع کرنا (مثلاً پہلے دایاں ہاتھ دھویا جائے پھر بایاں) (۲) گردن کا مسح کرنا (۳) وضو کے لیے قبلہ رخ بیٹھنا (٤) اعضاء کا (دھوتے وقت) ہلکی بار ملنا (٥) غیر معذور کا وقت سے پہلے وضو کر لینا (٦) ڈھیلی انگوٹھی کو گھمانا پھرانا اسی طرح غسل میں قرط یعنی بالی کو گھمانا پھرانا لیکن اس کے بارے میں اتنی بات یاد رکھ لینی چاہیے کہ اگر غسل اور وضو کے وقت ان چیزوں کے متعلق یہ خیال ہو کہ ان کے نیچے بدن پر پانی پہنچ رہا ہے تو پھر یہ عمل مستحب ہوگا اور یہ جانے کے پانی ان کے نیچے نہیں پہنچتا تو پھر ان کو ہلا لینا فرض ہوگا (۷) خود وضو کرنا مستحب ہے کسی دوسرے سے وضو نہ کرایا جائے (۸) وضو کے وقت کوئی دیناوی گفتگو نہ کرنا چاہیے ہاں اگر کوئی مجبوری ہو کہ بغیر کلام و گفتگو کے مقصد اور حاجت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو کرسکتا ہے (۹) ہر عضو کو دھونے کے وقت اور مسح کرتے وقت بسم اللہ پڑھیے (۱۰) ان دعاؤں کا پڑھنا جو عضو کے دھونے کے وقت پڑھنے کے لیے

منقول ہیں (۱۱) وضو مکمل کرنے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود وسلام بھیجنا، مگر کتاب " زیلعی " میں لکھا ہے کہ ہر عضو کو دھونے کے بعد درود وسلام بھیجنا مستحب ہے (۱۲) وضو کے بعد شہادتین اور وہ دعائیں جو حدیث میں وارد ہیں پڑھنا (آگے حدیث میں یہ دعائیں آرہی ہیں) (۱۳) وضو کا بقیہ پانی قبلہ رخ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پینا (۱٤) بھوؤں اور مونچھوں کے نیچے، گوشہ چشم پر اور پاؤں کے کونچوں پر پانی پہنچانے کے لیے تعاہد یعنی خبر گیری کرنا کہ یہ حصے خشک نہ رہ جائیں۔ مکروہات وضو یہ ہیں :(۱) منہ پر زور سے پانی مارنا (۲) اسراف کرنا ضرورت اور حاجت سے زیادہ پانی بہانا (۳) اعضاء کو تین تین مرتبہ سے زیادہ دھونا (٤) نئے پانی سے تین مرتبہ مسح کرنا۔ اور منہیات وضو یہ ہیں :(۱) عورت کے وضو کے بچے ہوئے پانی سے وضو نہ کرنا چاہیے (۲) نجس جگہ وضو نہ کرنا چاہیے تا کہ وضو کے پانی کی بے حرمتی نہ ہو (۳) مسجد میں وضو نہ کرنا چاہیے البتہ کسی برتن میں یا اس جگہ جو وضو کے لیے خاص طور پر مقرر ہے وضو کرنا درست ہے (٤) تھوک اور رینٹھ وغیرہ وضو کے پانی میں نہ ڈالنا چاہیے۔

(نماز کا بیان)

عربی میں نماز کو صلوۃ کہا جاتا ہے، لغت میں "صلوٰۃ" دعا کو کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں صلوٰۃ چند مخصوص اقوال وافعال کو کہتے ہیں جن کی ابتداء تکبیر سے اور انتہاء سلام پر ہوتی ہے۔ صلوٰۃ کے مادہ اشتقاق کے بارے میں کئی اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ نووی نے مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ صلوٰۃ کا مادہ اشتقاق "صلوین" ہے جو سرین کی دونوں ہڈیوں کو کہتے ہیں چونکہ نماز میں ان دونوں ہڈیوں کی رکوع وسجود کے وقت زیادہ حرکت ہوتی ہے اس لیے اس مناسبت سے نماز کو صلوٰۃ کہا گیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں "صلوٰۃ" مصلی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹیڑھی لکڑی کو آگ سے سینک کر سیدھا کرنا چنانچہ نماز کو صلوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کے مزاج میں نفس امارہ کی وجہ سے ٹیڑھا پن ہے لہٰذا جب کوئی آدمی نماز پڑھتا ہے۔ تو رب قدوس کی عظمت وہیبت کی گرمی جو اس عبادت میں انتہائی قرب الٰہی کی بناء پر حاصل ہوتی ہے اس کے ٹیڑھے پن کو ختم کر دیتی ہے گویا مصلی یعنی نمازی اس مادہ اشتقاق کی رو سے اپنے نفس امارہ کو عظمت الٰہی اور ہیبت زبانی کی تپش سے سینکنے والا ہوا۔ لہٰذا جو آدمی نماز کی حرارت سے سینکا گیا اور اس کا ٹیڑھا پن نماز کی وجہ سے دور کیا گیا تو اس کو آخرت کی آگ یعنی دوزخ سے سینکنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو جس نے دنیا میں نماز کی پابندی کی اور کوئی ایسا فعل نہ کیا جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا موجب ہو تو اسے جہنم کی آگ میں نہ ڈالے گا۔ اس اصطلاحی تعریف کے بعد یہ سمجھ لیجئے کہ نماز اسلام کا وہ عظیم رکن اور ستون ہے جس کی اہمیت وعظمت کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ اثر منقول ہے کہ : " جب نماز کا وقت آتا تو ان کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ لوگوں نے

پوچھا کہ امیر المومنین ! آپ کی یہ کیا حالت ہے؟ فرماتے ہیں کہ اب اس امانت (یہ اشارہ ہے اِس آیت قرآنی کی طرف : آیت (اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَ ※ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَحۡمِلۡنَ ※ وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡ ※ وَحَمَلَ ※ الۡاِنۡسَانُ ※ اِنَّ ظَلُوۡمًا جَ ※ وۡلاً 33۔الاحزاب 72 :) کا وقت آگیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، پہاڑوں اور زمین پر پیش فرمایا تھا اور وہ سب اس امانت کے لینے سے ڈر گئے اور انکار کر دیا۔" (احیاء العلوم) نماز کی تاکید اور اس کے فضائل سے قرآن مجید کے مبارک صفحات مالا مال ہیں، نماز کو اداء کرنے اور اس کی پابندی کرنے کے لیے جس سختی سے حکم دیا گیا ہے وہ خود اس عبادت کی اہمیت و فضیلت کی دلیل ہے۔ ایمان کے بعد شریعت نے سب سے زیادہ نماز ہی پر زور دیا ہے چنانچہ قرآن کریم کی یہ چند آیتیں ملاحظہ فرمائے۔آیت (اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا) 4۔ النساء : 103) " بیشک ایمان والوں پر نماز فرض ہے وقت مقرر پر۔" آیت (حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى) 2۔ البقرة 238 :) " نمازوں کی خصوصاً درمیانی نماز (عصر) کی پابندی کرو۔" آیت (اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّ یِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ) 11۔ هود 114 :) " بیشک نیکیاں (یعنی نمازیں) برائیوں کو معاف کرا دیتی ہیں۔" آیت (اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ) 29۔ العنکبوت : 45) " بیشک نماز برے اور خراب کاموں سے انسان کو بچاتی ہے۔اور بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر کا بڑا مرتبہ بڑا اثر ہے۔" بہرحال ! نماز ایک ایسی پسند اور محبوب عبادت ہے جس کی برکتوں اور سعادتوں سے خداوند کریم نے کسی بھی نبی کی شریعت کو محروم نہیں رکھا ہے۔حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزمان سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک تمام رسولوں کی

امت پر نماز فرض تھی۔ ہاں نماز کی کیفیت اور تعینات میں ہر امت کے لیے تغیر ہوتا رہا۔ سرکار عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت پر ابتدائے رسالت میں دو وقت کی نماز فرض تھی ایک آفتاب کے نکلنے سے قبل اور ایک آفتاب ڈوبنے سے بعد۔ ہجرت سے ڈیڑھ برس پہلے جب سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معراج میں ذات حق جل مجدہ کی قربت حقیقی کا عظیم و افضل ترین شرف پایا تو اس مقدس اور باسعادت موقعہ پر پانچ وقت کی نماز کا عظیم و اشرف ترین تحفہ بھی عنایت فرمایا گیا۔ چنانچہ فجر، ظہر، مغرب، عشاء ان پانچ وقتوں کی نماز کا فریضہ صرف اسی امت کی امتیازی خصوصیت ہے اگلی امتوں پر صرف فجر کی نماز فرض تھی نیز کسی پر ظہر کی اور کسی پر عصر کی۔ اسلام کی تمام عبادات میں صرف نماز ہی وہ عبادت ہے جس کو سب سے افضل اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چنانچہ اس پر اتفاق ہے کہ نماز اسلام کا رکن اعظم ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اسلام کا دارومدار اسی عبادت پر ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہر مسلمان عاقل بالغ پر ہر روز پانچ وقت نماز پڑھنا فرض عین ہے امیر ہو یا فقیر، تندرست ہو یا مریض اور مقیم ہو یا مسافر ہر ایک کو پانچوں وقت ان آداب و شرائط اور طریقوں کے ساتھ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے نماز کے سلسلہ میں بتائے ہیں اللہ کے دربار میں حاضری دینا اور رب قدوس کی عظمت و بڑائی اور اپنی بے کسی و لاچاری اور عجز و انکساری کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے یہاں تک کہ جب میدان کارزار میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اور عورت سب سے زیادہ اور شدید تکلیف درد زہ میں مبتلا ہو تب بھی نماز کو چھوڑنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کی ادائیگی میں دیر کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہاں تک کہ جو آدمی نماز کی فرضیت سے انکار کرے وہ کافر ہے اور اس کو ترک کرنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب اور فاسق و فاجر ہے بلکہ بعض جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً حضرت عمر فاروق (رض) وغیرہ نماز

چھوڑنے والے کو کافر کہتے ہیں امام احمد (رح) کا بھی یہی مسلک ہے امام شافعی و امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ علیہما نماز چھوڑنے کو گردن زنی قرار دیتے ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ (رح) اگرچہ اس کے کفر کے قائل نہیں تاہم ان کے نزدیک بھی نماز چھوڑنے والے کے لیے سخت تعزیر ہے۔

نماز گناہوں کا صفایا کر دیتی ہے؛

حدیث؛

وَعَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :"أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهَرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا هَلْ يَبْقَى مِنْ دَرَنِهِ شَيْءٌ، قَالُوا :لَا يَبْقَى مِنْ دَرَنِهِ شَيْءٌ. قَالَ: فَذَلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَايَا"

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا: تم بتاؤ کہ جس کے دروازے کے آگے پانی کی نہر چلتی ہو اور وہ روز اس میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کا کوئی شائبہ بھی رہے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ نہیں! میل بالکل باقی نہیں رہے گا؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (تم سمجھ لو کہ) پانچوں نمازوں کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام (صغیرہ) گناہوں کو ان نمازوں کے سبب سے اسی طرح مٹا دیتا ہے (جس طرح پانی میل کو اتار دیتا ہے)۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حدیث:

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »: الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ «. رَوَاهُ مُسلم

ترجمہ:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر کوئی آدمی کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے تو پانچوں نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک اس کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیان ہوئے ہیں۔" (صحیح مسلم)

تشریح:

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھے، جمعہ کی نماز پورے آداب کے ساتھ ادا کرے اور اسی طرح رمضان کے روزے رکھے تو ان کے درمیان جو صغیرہ گناہ صادر ہوئے ہیں سب ختم ہو جاتے ہیں البتہ کبیرہ گناہ نہیں بخشے جاتے ہاں اگر اللہ چاہے تو وہ کبیرہ گناہ بھی معاف فرما سکتا ہے۔ یہاں ایک ہلکا سا خلجان واقع ہوتا ہے کہ جب ہر روز کی پانچوں وقت کی نمازیں ہی تمام گناہ مٹا دیتی ہیں تو پھر یہ جمعہ وغیرہ کون سے گناہ ختم کرتے ہیں؟ چنانچہ اس خلجان کو رفع کرنے کے لیے ملا علی قاری (رح) فرماتے ہیں کہ ان سب میں گناہوں کو مٹانے اور ختم کرنے کی صلاحیت ہے چنانچہ اگر گناہ صغیرہ ہوتے ہیں تو یہ تینوں ان کو مٹا دیتے ہیں ورنہ ان میں سے ہر ایک کے بدلے بیشمار نیکیاں لکھی جاتی ہیں جس کی وجہ سے درجات میں بلندی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (رح) نے

فرمایا کہ یہ تینوں صغیرہ گناہوں کے لیے کفارہ ہیں اوران کوختم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اگران میں سے کوئی ایک کسی گناہ کے لیے کفارہ بن سکے تو دوسرا کفارہ ہوجاتا ہے مثلاً نماز میں کسی تقصیر اور نقصان کی وجہ سے اگر وہ نماز گناہوں کے لیے کفارہ نہ ہوسکے تو ان کو جمعہ ختم کردیتا ہے اور جمعہ میں بھی کسی تقصیر کی وجہ سے کفارہ ہونے کی صلاحیت نہ رہے تو پھر رمضان ان کے لیے کفارہ ہوجاتا ہے اور اگر سب کے سب کفارہ بننے کی صلاحیت رکھیں تو یہ سب مل کر گناہوں کو اچھی طرح مٹادیتے ہیں اور کفارے کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں چنانچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کئی چراغوں کی۔ اگر کسی مکان میں ایک چراغ ہوگا تو اندھیرا تو ختم ہوجائے گا مگر روشنی کم ہوگی اور اگر چراغ زیادہ ہوں گے تو نور اور روشنی حیثیت سے زیادتی ہوگی۔

......

حدیث:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» :خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللَّهُ تَعَالَى مَنْ أَحْسَنَ وُضُوءَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لوقتهن وأتم ركوعهن خشوعهن كَانَ لَهُ عَلَى اللَّهِ عَهْدٌ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللَّهِ عَهْدٌ إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ« .رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَرَوَى مَالك وَالنَّسَائِيّ نَحوه

......

ترجمہ:

حضرت عبادہ ابن صامت (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
جس آدمی نے ان پانچوں نمازوں کے لیے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے (فرائض و مستحبات کی ادائیگی کے ساتھ) اچھی طرح وضو کیا اور ان کو وقت پر پڑھا نیز ان میں رکوع و خشوع کیا (یعنی نمازیں حضوری قلب کے ساتھ پڑھیں) تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ پر ذمہ (یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ) یہ ہے کہ وہ اس کے (صغیرہ) گناہ بخش دے گا اور جس آدمی نے ایسا نہ کیا (یعنی اس نے مذکورہ

بالا طریقے سے یا مطلق نماز نہ پڑھی) تو اللہ تعالیٰ اس کا ذمہ دار نہیں ہے چاہے تو بخش دے چاہے اسے عذاب میں مبتلا کرے۔" (مسند احمد بن حنبل، سنن ابو داوَد، مالک، سنن نسائی)

تشریح:

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز چھوڑنے والا کافر نہیں ہوتا بلکہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کو عذاب دے بلکہ اس کا دارومدار سراسر اس کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے اور اگر چاہے تو اپنے فضل و کرم سے اسے بخش دے۔ اسی طرح یہ بھی جان لیجئے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ اللہ کے حکم سے اسے جس مدت کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے گا اس کے بعد وہ اپنی سزا پوری کر کے جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہو جائے گا۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے۔

بچوں کو کب نماز کا حکم کیا جائے:

حدیث:

وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: »مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ«. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَكَذَا رَوَاهُ فِي شرح السّنة عَنهُ

ترجمہ:

حضرت عمرو ابن شعیب (رح) اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارے بچے سات برس کے ہو جائیں تو انھیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب وہ دس برس کے ہو جائیں (تو نماز چھوڑنے پر) انھیں مارو۔ نیز ان کے بستر ے علیحدہ کر دو (ابو داؤد)

"تشریح:

اس حدیث کے ذریعے مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب ان کے بچے سات برس کے ہو جائیں تو اسی وقت سے ان کو نماز کی تاکید شروع کر دی جائے تاکہ انھیں نماز کی عادت کم سنی سے ہی ہو جائے اور جب وہ بالغ ہونے کے قریب (یعنی دس سال کی عمر میں) پہنچ جائیں تو اگر وہ کہنے سننے کے باوجود نماز نہ پڑھیں تو انھیں تاکیدا مار مار کر نماز پڑھانی چاہیے۔ نیز جس طرح ان عمروں میں نماز کی تاکید کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح انھیں نماز کی شرائط وغیرہ بھی سکھانی چاہیے تاکہ انھیں ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو جائے۔ حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ جب بچے اس عمر میں پہنچ جائیں تو انھیں علیحدہ علیحدہ سلانا چاہیے یعنی اگر دو بھائی بہن یا دو اجنبی لڑکا لڑکی ایک ہی بستر میں سوتے ہوں تو اس عمر میں ان کے بستر الگ کر دینے چاہیں تاکہ وہ اکٹھے نہ سو سکیں۔

نماز ایمان کا نور ہے:

حدیث:

وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :أَنَّہُ ذَکَرَ الصَّلَاۃَ یَوْمًا فَقَالَ» :مَنْ حَافَظَ عَلَیْھَا کَانَتْ لَہُ نُوْرًا وَبُرْھَانًا وَنَجَاۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمن لم یحافظ عَلَیْھَا لم یکن لَہُ نور وَلَا برھَان وَلَا نجاۃ وَکَانَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مَعَ قَارُون وَفِرْعَوْنَ وَھَامَانَ وَأُبَیِّ بْنِ

خَلَفٍ«. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ

......

ترجمہ:

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص (رض) راوی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز کا ذکر کیا (یعنی نماز کی فضیلت و اہمیت کو بیان کرنے کا ارادہ فرمایا) چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو آدمی نماز پر محافظت کرتا ہے (یعنی ہمیشہ پابندی سے پڑھتا ہے) تو اس کے لیے یہ نماز ایمان کے نور (کی زیادتی کا سبب) اور ایمان کے کمال کی واضح دلیل ہوگی، نیز قیامت کے روز مغفرت کا ذریعہ بنے گی اور جو آدمی نماز پر محافظت نہیں کرتا تو اس کے لیے نماز نہ (ایمان کے) نور (کی زیادتی کا سبب بنے گی، نہ (کمال ایمان کی) دلیل اور نہ (قیامت کے روز) مغفرت کا ذریعہ بنے گی بلکہ ایسا آدمی قیامت کے روز قارون، فرعون، ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ (عذاب میں مبتلا) ہوگا۔" (مسند احمد بن حنبل، دارمی، بیہقی)

....

تشریح

نماز کی محافظت" کا مطلب یہ ہے کہ نماز باقاعدگی اور پوری پابندی سے پڑھی جائے۔ کبھی ناغہ نہ ہو، نیز نماز کے تمام فرائض واجبات سنن اور مستحبات اداء کئے جائیں، اس طرح جب کوئی نماز پڑھے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے نماز کی محافظت کی اور یہ مذکورہ ثواب کا حقدار ہوگا اور جو آدمی اس کے برعکس عمل اختیار کرے گا کہ نہ تو نماز باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ پڑھے اور نہ نماز کے فرائض واجبات اور سنن و مستحبات کی رعایت کرے تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ ان چیزوں کو ترک کرنے کی وجہ سے مذکورہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا غور کرنا چاہیے کہ نماز کی محافظت اور اس

پر دوام اختیار کرنے کی کس قدر تاکید ہے اس لیے اس میں کوتاہی کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔ نیز یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ جب نماز کی محافظت نہ کرنے پر اس قدر وعید ہے کہ ایسے آدمی کا حشر مذکورہ لوگوں جیسے لعین و بد بخت کفار کے ساتھ ہونے کی خبر دی جارہی ہے تو اس آدمی کا کیا حال ہوگا جو نماز ترک کرتا ہے اور کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا۔ قارون و فرعون جیسے مشہور لعین اور بدبختوں کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا ابی بن خلف وہ مشہور مشرک ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جانی دشمن تھا اور جسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ احد میں اپنے دست مبارک سے موت کے گھاٹ اتار کر جہنم رسید کیا تھا چنانچہ اسی وجہ سے اس لعین کو امت کے بدبختوں میں سے سب سے بڑا بد بخت کہا جاتا ہے۔ آخر میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو آدمی محافظت کرے گا یعنی پورے خلوص اور تمام فرائض واجبات اور سنن و مستحبات کے ساتھ نماز ہمیشہ پابندی سے پڑھتا رہے گا تو قیامت کو وہ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صلحاء کے ہمراہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نماز کی پابندی اور پورے ذوق و شوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم سب اس سعادت سے بہرہ ور ہوسکیں۔

تین کاموں میں تاخیر مت کرو؛

حدیث؛

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ :أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ» :يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا الصَّلَاةُ إِذَا أَتَتْ وَالْجِنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ وَالْأَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا« .رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

ترجمہ:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: علی! تین باتوں کے کرنے میں دیر نہ کیا کرنا۔ ایک تو نماز ادا کرنے میں جب کہ وقت ہو جائے، دوسرے جنازے میں جب تیار ہو جائے اور تیسری بے خاوند عورت کے نکاح میں جب کہ اس کا کفو (یعنی ہم قوم مرد) مل جائے۔" (جامع ترمذی)

تشریح:

لسانِ نبوت سے حضرت علی المرتضیٰ کو تین کاموں میں تاخیر نہ کرنے کی نصیحت فرمائی جا رہی ہے۔ پہلے تو نماز کے بارے میں فرمایا کہ جب نماز کا وقت مختار ہو جائے تو اس میں تاخیر نہ کرنی چاہیے بلکہ سب سے پہلے نماز پڑھو اس کے بعد کوئی دوسرا کام کرو۔ دوسرے نمبر پر جنازے کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس وقت جنازہ تیار ہو جائے تو اس کی نماز اور تدفین میں قطعاً تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ علامہ اشرف (رح) کا قول علامہ طیبی شافعی (رح) نقل کرتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جنازے کی نماز اوقات مکروہہ (یعنی آفتاب نکلنے ڈوبنے کے وقت اور نصف النہار کے وقت) میں پڑھنی مکروہ نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ صورت ہو کہ جنازہ ان اوقات سے پہلے آجائے تو پھر ان اوقات میں نماز پڑھنی مکروہ ہوگی۔ یہی سجدہ تلاوت کا حکم ہے بہرحال ان تینوں اوقات مکروہہ کے علاوہ تمام اوقات میں حتی کہ فجر کی نماز سے پہلے و بعد میں اور عصر کی نماز کے بعد بھی یہ دونوں چیزیں یعنی نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت مطلقاً مکروہ نہیں ہیں۔ تیسری چیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمائی کہ بے خاوند عورت کا کفو یعنی ہم قوم مرد جب بھی مل جائے اس کے نکاح میں تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ ایم بے خاوند عورت کو کہتے ہیں خواہ وہ کنواری

ہو یا مطلقہ، بیوہ ہو مگر علامہ طیبی (رح) فرماتے ہیں کہ" ایم" اس کو فرماتے ہیں جس کا زوج (یعنی جوڑہ) نہ ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور عورت خواہ ثیبہ ہو یا باکرہ!۔"کفو" کا مطلب یہ ہے کہ مردان جملہ اوصاف میں عورت کے ہم پلہ و برابر ہو۔ (۱) نسب۔ (۲) اسلام (۳) حریت۔ (٤) دیانت۔ (٥) مال۔ (٦) پیشہ۔ اس موقعہ پر حدیث کی مناسبت سے ایک تکلیف دہ صورت حال کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلا دینا ضروری ہے۔ آج کل یہ عام رواج سا ہوتا جارہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی میں بہت تاخیر کی جاتی ہے اکثر تاخیر تو تہذیب جدید کی اتباع اور رسم و رواج کی پابندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم و فرمان کے سراسر خلاف ہے لڑکیوں کی فطرت اور ان کے جذبات کا گلا گھونٹ کر ان پر ظلم کے مترادف بھی ہے چنانچہ اس کے نتائج آج کل جس انداز سے سامنے آرہے ہیں اسے ہر آدمی جانتا ہے کہ زنا کی لعنت عام ہوگئی ہے، بے حیائی و بے غیرتی کا دور دورہ ہے اور اخلاق و کردار انتہائی پستیوں میں گرتے جارہے ہیں۔ پھر نہ صرف یہ کہ کنواری لڑکیوں کی شادی میں تاخیر کی جاتی ہے بلکہ اگر کوئی عورت شوہر کے انتقال یا طلاق کی وجہ سے بیوہ ہوجاتی ہے تو اس کے دوبارہ نکاح کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اس طرح اس بے چاری کے تمام جذبات و خواہشات کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس کی پوری زندگی کو حرمان و یاس، رنج و الم اور حسرت و بے کیفی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ تو تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ تمام اہل سنت والجماعت کا متفقہ طور پر یہ عقیدہ ہے کہ جو آدمی کسی معمولی سنت کا بھی انکار کرے یا اس کی تحقیر کرے تو وہ کافر ہوجاتا ہے اور یہ بھی لوگ جانتے ہی کہ عورت کا نکاح کرنا پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وہ عظیم و مشہور سنت ہے جس کی تاکید بیشمار احادیث سے ثابت ہے۔ لیکن۔

افسوس ہے کہ مسلمان جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس سے محبت کا اقرار کرتے ہیں مگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس سنت پر پابندی کے ساتھ عمل کرنے کا کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ کوئی آدمی تو اپنی مجبوریوں کی آڑ لے کر لڑکیوں کی شادی میں تاخیر کرتا ہے، کوئی تہذیب جدید اور فیشن کا دلدادہ ہو کر اس سعادت سے محروم رہتا ہے اور کوئی آدمی طعن و تشنیع کے خوف سے بیوہ کی شادی کرنے سے معذوری ظاہر کرتا ہے گویا وہ لوگوں کے طعن و تشنیع کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت پر ترجیح دیتا ہے حالانکہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے گویا وہ لوگوں کے اس طعن و تشنیع کو اپنے لیے باعث سعادت اور قابل فخر جانے کہ انبیاء (علیہم السلام) اور اللہ کے نیک بندوں کے اچھے کاموں پر ہمیشہ ہی لوگوں نے طعن و تشنیع کی ہے مگر ان لوگوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت و فرمان برداری اور نیک کاموں میں کبھی کوتاہی یا قصور نہیں کیا۔ اس موقعہ پر ایک بزرگ کی دلچسپ حکایت سن لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک مرید سے جو اس لڑکی کے مناسب و لائق تھا کر دیا اور اس کی خبر کو کسی نہ کسی طرح اپنی بیوی سے بھی پوشیدہ رکھا۔ بعد میں جب ان کی بیوی کو یہ معلوم ہوا تو جز بز ہوئی اور ان سے کہنے لگی کہ آپ نے اس کا بھی خیال کیا کہ آپ کے اس طرز عمل سے آپ کی ناک کٹ گئی اور پھر جیسا کہ ان ناقص العقل والدین عورتوں کی عادت ہے اس بے چارے بزرگ کو لاکھ صلواتیں سنائیں۔ وہ بزرگ یہ سمجھ کر کہ عورتوں کے منہ لگنا خواہ مخواہ اپنی عقل خراب کرنا ہے۔ خاموش ہو گئے پھر باہر آ کر انھوں نے مریدوں سے پوچھا کہ کیوں بھائیو میرے منہ پر ناک بھی ہے یا نہیں؟ انھوں نے تعجب سے کہا کہ ہاں کیوں نہیں ہے! وہ کہنے لگے کہ میری

بیوی تو کہتی ہے کہ میری ناک کٹ گئی ۱۔ وہ عورت جس کا نکاح ہوا، مگر یا تو خاوند مرگیا یا خاوند نے طلاق دے دی ہو۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کو چاہیے کہ نیک کام کرنے میں کسی طعن وتشنیع کا خیال نہ کرے کیونکہ حقیقت میں جو بات بری نہیں ہوتی وہ کسی کے کہہ دینے سے بری نہیں ہوجاتی اور نہ اس کام کو کرنے والے کی ذات و آدمیت کو کوئی بٹہ لگتا ہے۔ حضرت مولانا الشاہ عبدالقادر (رح) نے آیت (وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ) 24۔ النور 32 :) کے ضمن میں اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : علی ! تین کاموں میں دیر نہ کرو۔ (۱) فرض نماز کی ادائیگی میں جب کہ اس کا وقت ہوجائے۔ (۲) جنازے میں جب کہ موجود ہو۔ (۳) بیوہ عورت (کے نکاح میں) جب کہ اس کی ذات (و مرتبہ) کا مرد مل جائے۔ جو شخص (بیوہ کو) دوسرا خاوند کرنے میں عیب لگائے (تو سمجھو کہ) اس کا ایمان سلامت نہیں ہے اور جو لونڈی و غلام نیک ہوں (یعنی شادی کر دینے کے بعد ان کے مفرور ہوجانے کا خوف نہ ہو اور تمہیں اعتماد ہو کہ یہ نیک بخت ہیں شادی کے بعد ہمارا کام نہیں چھوڑیں گے) تو ان کا بھی نکاح کردو۔

فجر وعصر کی فضیلت؛

حدیث؛

عَنۡ عَمَارَةَ بن روبية قَالَ :سَمِعۡتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ» :لَنۡ يَلِجَ النَّارَ أَحَدٌ صَلَّى قَبۡلَ طُلُوعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوبِهَا «يَعۡنِي الۡفَجۡرَ وَالۡعصر. (رَوَاهُ مُسلم)

ترجمہ؛

حضرت عمارہ ابن رویبہ (رض) (حضرت عمیرہ رویبہ کے صاحبزادے اور قبیلہ بنی جشم بن ثقیف

سے ہیں اور کوفی ہیں ۱۲)۔فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے سورج نکلنے اور چھپنے سے پہلے (دو نمازیں) یعنی فجر اور عصر کی پڑھیں تو وہ دوزخ میں ہرگز داخل نہیں ہوگا۔" (رواہ صحیح مسلم)

تشریح:

مطلب یہ ہے کہ جو آدمی ان دونوں نمازوں کو پابندی سے پڑھتا رہے تو وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو آدمی ان دونوں نمازوں پر مداومت کرے گا، وہ دوسری نمازوں کو چھوڑنے یا دوسرے گناہوں کے صدور کے سبب دوزخ میں داخل نہیں کیا جائے گا حالانکہ جمہور علماء کرام کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ نمازیں صغیرہ گناہوں کا کفارہ تو ہوجاتی ہیں۔کبیرہ گناہوں کا نہیں ہوتیں۔ چنانچہ علامہ طیبی نے اس حدیث کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ صبح کا وقت عام طور پر آرام کا ہوتا ہے اسی طرح شام کا تجار وغیرہ کی مشغولیت کا ہوتا ہے لہٰذا جو آدمی ان دونوں موانع کے باجود ان دونوں نمازوں کی محافظت کرتا ہے تو وہ بزبان حال اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دوسرے اعمال میں بھی کمی زیادتی کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ آیت (اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ) 29۔ العنکبوت 45 :)(بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے) لہٰذا اس بناء پر وہ بخشش کی سعادت سے نوازا جائے گا اور دوزخ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔اور ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث سے ان دونوں نمازوں کی فضیلت و عظمت کے بیان میں مبالغہ مراد ہے کہ ان دونوں نمازوں کی فضیلت و عظمت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کی محافظت کرنے والا آدمی دوزخ میں داخل نہ کیا جائے گا اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے ہر عمل پر

جزاء وسزا کا ترتب کرتا ہے مگر وہ چاہے تو ان دونوں نمازوں کے ادا کرنے کے سبب وہ گناہ جو اس کے بندوں سے سرزد ہوئے ہوں بخش سکتا ہے

نمازی کے لئے فرشتوں کی گواہی؛

حدیث؛

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وسلم قَالَ» :يَتَعَاقَبُونَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ وَيَجْتَمِعُونَ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِينَ بَاتُوا فِيكُمْ فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي فَيَقُولُونَ تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يصلونَ وأتيناهم وهم يصلونَ«

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے پاس (آسمان سے) فرشتے رات دن آتے رہتے ہیں (جو تمہارے اعمال لکھتے ہیں اور انھیں بارگاہ الوہیت میں پہنچاتے ہیں) اور فجر وعصر کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور جو فرشتے تمہارے پاس رہتے ہیں وہ (جس وقت) آسمان پر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بندوں کے احوال جاننے کے باوجود ان سے (بندوں کے احوال واعمال) پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حالت میں چھوڑا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ پروردگار! ہم نے تیرے بندوں کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا ہے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تو اس وقت بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔" (صحیح البخاری وصحیح مسلم)

تشریح:

ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کو لکھنے اور انھیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کے لیے (فرشتوں کی دو جماعتیں بندوں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ایک جماعت تو دن کے اعمال لکھتی ہے اور پھر عصر کے بعد واپس جا کر بارگاہ الوہیت میں اپنی رپورٹ پیش کر دیتی ہے۔ دوسری جماعت رات کے اعمال لکھتی ہے۔ یہ فجر کی نماز کے بعد واپس جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کے رات کے اعمال کی رپورٹ دیتی ہے چنانچہ دن اور رات میں دو وقت ایسے ہوتے ہیں جب کہ یہ دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں۔ایک مرتبہ تو فجر کے وقت جب کہ رات کے فرشتے واپس جاتے ہیں اور دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پر اتے ہیں۔اسی طرح دوسری مرتبہ ان دونوں جماعتوں کا اجتماع عصر کے وقت ہوتا ہے جب کہ دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس جاتے ہیں اور رات کے فرشتے اپنے کام پر حاضر ہوتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور اس کا علم زمین و آسمان کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔وہ زمین و آسمانوں کے رہنے والوں کے ایک ایک عمل کو جانتا ہے مگر جب فرشتے بندوں کے اعمال کی رپورٹ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو ان سے پوچھتا ہے کہ جب تم اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو بتاؤ کہ اس وقت میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ اور اس کا یہ پوچھنا (نعوذ باللہ) علم حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس سوال سے اس کا مقصد فرشتوں کے سامنے اپنی بندوں کی فضیلت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو بھیجنا چاہا تھا اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ پروردگار کیا تو ایسی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں فساد اور خون ریزی و

غارت گری کا بازار گرم کرے گی۔اور پھر انھوں نے اپنی برتری و بڑائی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ تیری عبادت کے لیے تو ہم ہی کافی ہیں اور ہم ہی تیری عبادت و پرستش کر بھی سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ سوال کر کے ان پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دیکھو! جس مخلوق کے بارے میں تمہارا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا میں سوائے فتنہ وفساد پھیلانے کے اور کوئی کام نہیں کرے گی اب تم خود دیکھ آئے ہو کہ وہ میری عبادت اور میری پرستش کس پابندی اور کس ذوق وشوق سے کرتی ہے۔بہر حال !اس حدیث کے ذریعے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو رغبت دلا رہے ہیں کہ ان دونوں اوقات میں ہمیشہ پابندی سے نماز پڑھتے رہو تا کہ وہ فرشتے اللہ کے سامنے تمہارے اچھے اور بہتر اعمال ہی پیش کرتے رہیں اور رب قدوس تمہاری فضیلت و بڑائی اسی طرح فرشتوں کے سامنے ظاہر کرتا رہے۔

فجر و عشا کی فضیلت؛

حدیث؛

وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی الله عَلَيْهِ وسلم» :مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْل كُله« .رَوَاهُ مُسلم

ترجمہ؛

حضرت عثمان غنی (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو گویا اس نے نصف رات کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور جس

آدمی نے صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لی تو گویا اس نے تمام رات کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔"
(صحیح مسلم)

تشریح:

اگر حدیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صبح کی نماز کا ثواب عشاء کی نماز کے ثواب سے زیادہ ہے کہ جب ہی تو کہا گیا ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھنے والا، نصف رات تک نماز پڑھنے والے کے برابر ہوتا ہے اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے والا پوری رات تک نماز پڑھنے والے کے برابر ہوتا ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی تو اسے آدھی رات تک نماز پڑھنے کا ثواب ملا پھر فجر کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلی تو بقیہ نصف رات تک کا ثواب مل گیا اس طرح دونوں نمازوں کے پڑھنے سے پوری رات تک عبادت کرنے والے کے ثواب کا وہ حقدار ہوگیا۔

مسلمان کے مسلمان پر حقوق:

حدیث:

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"حق المسلم على المسلم خمس :رد السلام وعيادة المريض واتباع الجنائز وإجابة الدعوة وتشميت العاطس"

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (ایک)

مسلمان کے (دوسرے) مسلمان پر پانچ حق ہیں۔(۱) سلام کا جواب دینا(۲) بیمار کی عیادت کرنا(۳) جنازہ کے ساتھ جانا(٤) دعوت قبول کرنا(٥) چھینکنے والے کا جواب دینا۔" (بخاری ومسلم)

مذکورہ بالا پانچوں چیزیں فرض کفایہ ہیں۔سلام کرنا سنت ہے اور وہ بھی حقوق اسلام میں سے ہے جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوگا۔مگر سلام کرنا ایسی سنت ہے جو فرض سے بھی افضل ہے کیونکہ اسے کرنے سے نہ صرف یہ کہ تواضع وانکساری کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ اداءسنت واجب کا سبب بھی ہے۔بیمار کی عیادت اور جنازہ کے ساتھ جانے کے حکم سے اہل بدعت مستثنیٰ ہیں۔ یعنی روافض وغیرہ کی نہ تو عیادت کی جائے اور نہ ان کے جنازہ کے ساتھ جایا جائے۔" دعوت قبول کرنے" سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مدد کے لیے بلائے تو اس کی درخواست قبول کی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ" دعوت قبول کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مہمانداری اور ضیافت کے لیے مدعو کرے تو اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کی طرف سے دی گئی ضیافت میں شرکت کی جائے بشرطیکہ ضیافت کسی بھی حیثیت سے ایسی نہ ہو جس میں شرکت گناہ کا باعث ہو جیسا کہ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو ضیافت محض از راہ مفاخرت اور نام ونمود کی خاطر ہو اس میں شرکت نہ کی جائے چنانچہ سلف یعنی صحابہ (رض) اور پہلے زمانہ کے علماء کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایسی ضیافت کو ناپسند کرتے تھے۔" چھینکنے والے کا جواب دینے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر چھینکنے والا " الحمدللہ" کہے تو اس کے جواب میں" یرحمک اللہ' کہا جائے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اسلام کے ان تمام حقوق کا تعلق تمام مسلمانوں

سے ہے خواہ نیک مسلمان ہوں یا بد۔ یعنی ایسے مسلمان ہوں جو گناہ گار تو ہوں مگر مبتدع (بدعتی) نہ ہوں اس احتیاط اور امتیاز کو مدنظر رکھا جائے کہ بشاشت یعنی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا اور مصافحہ کرنا صرف نیک مسلمان ہی کے ساتھ مختص ہونا چاہیے فاجر یعنی ایسے بد اور گناہ گار مسلمان کے ساتھ جو علی الاعلان معصیت و گناہ میں مبتلا رہتا ہے بشاشت و مصافحہ ضروری نہیں ہے۔

بیماری مومن کے گناہوں کا کفارہ ہے؛

حدیث؛

وعن عامر الرام قال :ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الأسقام فقال :"إن المؤمن إذا أصابه السقم ثم أعفاه الله منه كان كفارة لما مضى من ذنوبه وموعظة له فيما يستقبل. وإن المنافق إذا مرض ثم أعفي كان كالبعير عقله أهله ثم أرسلوه فلم يدر لم عقلوه ولم يدر لم أرسلوه". فقال رجل يا رسول الله وما الأسقام ؟ والله ما مرضت قط فقال :"قم عنا فلست منا". رواه أبو داود

ترجمہ؛

حضرت عامر رامی (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (ایک مرتبہ) بیماریوں کا ذکر کیا، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ" مومن جب کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری سے نجات دیتا ہے تو وہ بیماری (نہ صرف یہ کہ) اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے (بلکہ) زمانہ آئندہ کے لیے باعث نصیحت (بھی) ہوتی ہے۔ یعنی بیماری اسے متنبہ کرتی ہے۔ (چنانچہ وہ آئندہ گناہوں سے بچتا ہے) اور جب منافق بیمار ہوتا ہے اور پھر اسے بیماری سے نجات دی جاتی ہے تو اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہوتی

ہے جسے اس کے مالک نے باندھا اور پھر چھوڑ دیا اور اونٹ نے یہ نہ جانا کہ مالک نے اسے کیوں باندھا تھا اور کیوں چھوڑ دیا؟ (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بیماری کیا چیز ہے؟ میں تو کبھی بھی بیمار نہیں ہوا! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا! ہمارے پاس سے اٹھ کھڑے ہو! تم ہم میں سے نہیں ہو!

تشریح:

مؤمن بیماری سے صحت پانے کے بعد متنبہ ہو جاتا ہے چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوا تھا اس لیے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے گزشتہ گناہوں پر نادم شرمسار ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے بلکہ آئندہ گناہوں سے بھی بچتا ہے اس کے برعکس منافق کا حال یہ ہے کہ جب بیماری سے صحت یاب ہوتا ہے تو اس کی مثال بالکل اس اونٹ کی سی ہوتی ہے کہ جسے اگر اس کا مالک باندھ دے تو یہ نہ جانے کہ مجھے باندھا کیوں ہے اور اگر چھوڑ دے تو یہ نہ سمجھے کہ مجھے چھوڑا کیوں ہے۔ چنانچہ منافق بیماری کی وجہ سے متنبہ نہیں ہوتا نہ تو وہ نصیحت وعبرت پکڑتا ہے اور نہ گناہوں پر نادم وشرمسار ہو کر توبہ کرتا ہے اسی لیے اس کی بیماری نہ تو اس کے گزشتہ گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے اور زمانہ آئندہ میں اس کے لیے باعث نصیحت وعبرت ہوتی ہے کہ وہ گناہوں سے بچ سکے (رض) (فاولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغافلون)۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد گرامی "تم ہم میں سے نہیں ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے اہل طریقہ میں سے نہیں ہو، کیونکہ جس طرح ہم بیماری اور بلاؤں میں مبتلا ہوئے ہیں اس طرح تم مبتلا نہیں ہوئے ہو۔

یہودی لڑکے پر رسول ﷺ کی شفقت؛

حدیث؛

عن أنس قال :کان غلام یهودی یخدم النبی صلی الله علیه وسلم فمرض فأتاه النبی صلی الله علیه وسلم یعوده فقعد عند رأسه فقال له :"أسلم ". فنظر إلی أبیه وهو عنده فقال :أطع أبا القاسم. فأسلم. فخرج النبی صلی الله علیه وسلم وهو یقول :"الحمد لله الذی أنقذه من النار ". رواه البخاری

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت کیا کرتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس تشریف لے گئے چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی عیادت کی اور اس کے سر کے قریب بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا کہ "تم مسلمان ہو جاؤ" لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اس کے باپ نے کہا" ابوالقاسم (یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم مانو"۔ چنانچہ وہ لڑکا مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ فرماتے ہوئے باہر نکلے کہ "حمد وثنا اس اللہ کی جس نے اس لڑکے کو (اسلام کے ذریعہ) آگ سے نجات دی"۔ (بخاری)

تشریح؛

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافر ذمی سے خدمت لینی اور اگر کوئی کافر ذمی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا جائز ہے۔ کتاب خزانہ میں لکھا ہے کہ یہود کی عیادت کے لیے جانے میں کچھ

مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں مجوسیوں کی عیادت کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔اسی طرح فاسق کی عیادت کے بارے میں بھی اگرچہ علماء نے اختلاف کیا ہے لیکن صحیح تر یہ ہے کہ فاسق کی عیادت کے لیے جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ حدیث نابالغ کے اسلام قبول کرنے کے بارے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ (رح) کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام موصوف فرماتے ہیں کہ نابالغ کا اسلام قبول کرنا صحیح ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ یہاں حدیث میں جس یہودی لڑکے کا ذکر کیا جارہا ہے اس کا نام عبدالقدوس ہے۔

عیادت کا سنت طریقہ؛

حدیث؛

وعن أنس قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :" العيادة فواق ناقة "

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" عیادت کا افضل مرتبہ اونٹنی کے دو مرتبہ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے بقدر ہے اور حضرت سعید بن میسب کی روایت کے جو بطریق ارسال منقول ہے یہ الفاظ ہیں کہ" بہترین عیادت وہی ہے جس میں عیادت کرنے والا جلد اٹھ کھڑا ہو"۔(بیہقی)

تشریح؛

پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اونٹنی کا دودھ دو مرتبہ یا تین مرتبہ کرکے دوہتے ہیں جن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ دودھ دوہا پھر ذرا رک گئے اور بچوں کو تھنوں سے لگا دیا تاکہ دودھ خوب اترے پھر اس کے بعد دودھ دوہنا شروع کر دیتے ہیں۔اس طرح دونوں مرتبہ کا درمیانی وقفہ

بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا عیادت کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔ جب کوئی کسی مریض کے پاس عیادت کے لیے جائے تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ مریض کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھے بلکہ دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے بقدر بیٹھے تاکہ مریض کو تکلیف نہ ہو۔ کتابوں میں ایک شخص کا واقعہ منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت سری سقطی (رح) کی عیادت کو گئے جب کہ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ہم ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے اس وقت ان کے پیٹ میں بہت درد ہو رہا تھا ہم نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے لیے دعا فرمائیے۔ انھوں نے فرمایا کہ" اے اللہ! ان لوگوں کو مریض کی عیادت کرنے کے آداب وطریقے سکھا! گویا انھوں نے اس دعا سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ مریض کے پاس جب عیادت کے لیے جائے تو زیادہ دیر تک نہ بیٹھے بلکہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور عیادت کر کے چلا آئے۔ ہاں اگر کوئی عیادت کرنے والا یہ جانے کہ بیمار پر اس کا زیادہ دیر تک بیٹھنا گراں نہیں گزر رہا ہے بلکہ دوست ہونے کی حیثیت سے یا برکت حاصل کرنے کی غرض سے اور یا خدمت دلداری کی وجہ سے مریض کی خواہش یہ ہے کہ وہ اس کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھے تو اس صورت میں مریض کے پاس سے جلدی اٹھ کھڑا ہونا افضل نہیں ہوگا۔

موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے:

حدیث:

وعن عبادة بن الصامت قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه ومن كره لقاء الله كره الله لقاءه" فقالت عائشة أو بعض أزواجه :إنا لنكره الموت قال :"ليس ذلك ولكن المؤمن إذا حضره الموت بشر برضوان الله وكرامته فليس شيء أحب إليه مما أمامه فأحب لقاء الله وأحب الله لقاءه وإن الكافر إذا حضر بشر بعذاب الله وعقوبته فليس شيء أكره إليه مما أمامه فكره لقاء الله وكره الله لقاءه"

ترجمہ:

حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا ہے" (یہ سن کر) ام المومنین حضرت عائشہ (رض) نے یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات میں سے کسی اور زوجہ مطہرہ نے عرض کیا کہ ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (یہ مراد) نہیں بلکہ (مراد یہ ہے کہ) جب مومن کی موت آتی ہے تو اس بات کی خوشخبری دی جاتی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے اور اسے بزرگ رکھتا ہے چنانچہ وہ اس چیز سے جو اس کے آگے آنے والی ہے (یعنی اللہ کے ہاں اپنے اس فضیلت و مرتبہ سے) زیادہ کسی چیز (یعنی دنیا اور دنیا کی چمک دمک) کو محبوب نہیں رکھتا، اس لیے بندہ مومن اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ اور جب کافر کو موت آتی ہے تو اسے (قبر

میں) اللہ کے عذاب اور (دوزخ کی سخت ترین) سزا کی خبر دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس چیز سے جو اس کے آگے آنے والی ہے (یعنی عذاب و سزا) سے زیادہ کسی اور چیز کو ناپسند نہیں کرتا اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے (یعنی اسے اپنی رحمت اور مزید نعمت سے دور رکھتا ہے) اس روایت کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہ (رض) کی روایت میں منقول ہے کہ " موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہے"۔

تشریح:

مشہور تو یہی ہے کہ لقاء مولیٰ (یعنی اللہ کی ملاقات) سے مراد موت ہے، لیکن اس بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ لقاء مولیٰ سے " موت " مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آخرت کی طرف متوجہ ہونا، حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور اس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہونا، دنیا کی طرف مائل نہ ہونا اور دنیا و آخرت کی محبت میں گرفتار نہ ہونا۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا ترک کی اور دنیا اور اس کی چیزوں کو ناپسند کیا اس نے گویا لقاء مولیٰ کو پسند کیا! اور جس شخص نے دنیا کو اختیار کیا، دنیا کی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوا اور دنیا کی طرف اپنا میلان رکھا اس نے گویا لقاء مولیٰ کو ناپسند رکھا! یہی وجہ ہے کہ لقاء مولیٰ کا اشتیاق موت کی محبت اور اس کے اشتیاق کو لازم ہے یعنی جو شخص لقاء مولیٰ کو پسند کرے گا وہ موت کو بھی پسند کرے گا کیونکہ لقاء مولیٰ کے لیے موت وسیلہ ہے۔ ام المومنین چونکہ یہی سمجھیں تھیں کہ لقاء مولیٰ سے مراد موت ہے اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ارشاد " لیس الامر کذالک " کے ذریعہ وضاحت فرمائی کہ لقاء مولیٰ سے مراد موت نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ بتقاضائے جبلت طبعی موت سے محبت ہو اور بالفعل موت کی آرزو کرنی چاہیے بلکہ مراد

یہ ہے کہ جو شخص رضاء حق کا طالب ہو اور لقاء مولیٰ کا شائق ہوتا ہے وہ لقاء مولیٰ کے لیے وسیلہ ہونے کی وجہ سے موت کو ہمیشہ عقلی طور پر محبوب رکھتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب زندگی کا وقت پورا ہونے لگتا ہے اور موت کا وقت قریب آتا ہے اور اسے حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خوشخبری دیدی جاتی ہے تو پھر اس وقت وہ موت کو طبعی طور پر پسند کرتا ہے اور لقاء مولیٰ کا اشتیاق اس کی طبعی خواہش کی آواز بن جاتا ہے چنانچہ حدیث کے الفاظ ولکن المؤمن الخ (یعنی جب مومن کو موت آتی ہے تو اس بات کی خوشخبری دی جاتی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے الخ) اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ (رض) کی روایت کے الفاظ" موت اللہ کی ملاقات سے پہلے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار موت سے پہلے ممکن نہیں ہے بلکہ موت کے بعد ہی یہ شرف حاصل ہوتا ہے یا پھر یہ مراد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے وہ موت کو بھی پسند کرتا ہے کیونکہ اس عظیم شرف و سعادت کا حصول موت کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ لقاء الٰہی کا وجود موت کے وجود سے پہلے متصور نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ لقاء الٰہی اور موت دنوں ایک چیز نہیں ہیں بلکہ دونوں الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا حیا کا حق ہے؛

حدیث؛

وعن ابن مسعود أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ذات یوم لأصحابه :"استحیوا من اللہ حق الحیاء" قالوا :إنا نستحیی من اللہ یا نبی اللہ والحمد للہ قال :"لیس ذلك ولکن من استحیی من اللہ حق الحیاء فلیحفظ الرأس وما وعی ولیحفظ البطن وما حوی ولیذکر الموت والبلی ومن أراد الآخرۃ ترك زینة الدنیا فمن فعل ذلك فقد استحیی من اللہ حق الحیاء". رواہ أحمد والترمذی وقال :ھذا حدیث غریب

حضرت ابن مسعود (رض) راوی ہیں کہ ایک روز نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے صحابہ (رض) سے فرمایا کہ" اللہ سے حیاء کرو جیسا کہ حیاء کا حق ہے (یعنی جس طرح اللہ سے حیاء کرنی واجب ہے) اور جس حیاء کا وہ لائق ہے اس حیاء کا حق ادا کرو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا جو حق ہے اس حق کو ادا کرو) صحابہ (رض) نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ! ہم بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہیں (بایں طور کہ فی الجملہ اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرتے ہیں) اور تعریف اللہ کے لیے ہے (یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی ہے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" حیاء کا حق یہ نہیں ہے جسے تم یہ کہتے ہو کہ ہم اللہ سے حیاء کرتے ہیں بلکہ (حیا کا حق تو یہ ہے کہ) جو شخص اللہ سے حیاء کرنے میں حیاء کا حق ادا کرے تو اسے چاہیے وہ سر کی اور جو کچھ سر کے ساتھ ہے اس کی محافظت کرے اور پیٹ کی اور جو کچھ پیٹ کے ساتھ ہے اس کی محافظت کرے اور اسے چاہیے کہ موت کو اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کو یاد رکھے اور جو شخص آخرت کی بھلائی کا ارادہ کرتا ہے وہ دنیا کی زینت وآرائش کو چھوڑ دیتا ہے لہٰذا جس شخص نے یہ (مذکورہ بالا ہدایت پر عمل) اس نے اللہ تعالیٰ سے حیاء کی اور حق حیاء ادا کیا" احمد وترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح:

سر کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ سر جسے اللہ نے شرف مکرمت سے نوازا ہے اللہ کے علاوہ کسی اور کے کام نہ آئے۔ سر کو جسے اللہ نے انسانی تقدس عطا فرمایا ہے انسان کے ہاتھوں تراشے گئے فانی بتوں اور خود انسانوں کے سامنے سجدہ ریز کر کے ذلیل نہ کیا جائے اور لوگوں کو دکھانے کے

لیے اور اپنی دینداری کا سکہ جمانے کے لیے نماز نہ پڑھی جائے۔ سر کو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جھکایا نہ جائے اور سر کو از راہ غرور و تکبر بلند نہ کیا جائے۔" سر کے ساتھ" کی چیزوں سے مراد ہیں۔ زبان، آنکھ اور کان اور ان چیزوں کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء کو گناہ سے بچایا جائے، جیسے زبان کو غیبت میں مبتلا نہ کیا جائے اور نہ جھوٹ بولا جائے آنکھ سے نامحرم اور گناہ کی چیزیں نہ دیکھی جائیں اور کان سے کسی کی غیبت اور جھوٹ مثلاً کہانی وغیرہ نہ سنی جائے۔" پیٹ کی محافظت" کا مطلب یہ ہے کہ حرام اور مشتبہ چیزیں نہ کھائی جائیں۔" پیٹ کے ساتھ" کی چیزوں سے جسم کے وہ حصے اور اعضاء مراد ہیں جو پیٹ سے ملے ہوئے ہیں، جیسے ستر، ہاتھ پاؤں اور دل وغیرہ، مطلب یہ ہے کہ جسم کے ان اعضاء اور حصوں کو بھی گناہ سے محفوظ رکھا جائے مثلاً ستر کو حرام کاری میں مبتلا نہ کیا جائے، گناہ و فواحش کی جگہ جیسے میلے، تماشے، ناچ گانے میں نہ جایا جائے کہ اس طرح پاؤں معصیت سے محفوظ رہیں گے ہاتھوں سے کسی کو کسی بھی طرح کی ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ جیسے نہ کسی کو مارے پیٹے، نہ کسی کا مال چوری کر کے یا چھین کرلے اور نہ نامحرم کو ہاتھ لگائے، اسی طرح دل کو برے عقیدوں، گندے خیالات اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی یاد سے پاک رکھا جائے۔ آخر میں انسان کے جسم خاکی کے فانی ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ آخرت کا ایک نہ ایک دن اس دنیا سے تعلق ہو جائے گا اور یہ فانی جسم خواہ کتنا ہی حسین و جمیل اور با عظمت کیوں نہ ہو قبر کی آغوش میں سلا دیا جائے گا جہاں گوشت تو گوشت ہڈیاں تک بوسیدہ و خاک ہو جائیں گی۔ پھر اس کے بعد آیت (ومن اراد الآخرۃ) الخ فرما کر ایک ضابطہ بیان فرما دیا گیا ہے کہ جو شخص جانتا ہے کہ دنیا فانی ہے وہ دنیا اور دنیا کی لذات و خواہشات کو ترک کر دیتا ہے، نیز یہ کہ جو شخص آخرت کے ثواب اور وہاں کی

ابدی نعمتوں اور سعادتوں کی خواہش رکھتا ہے وہ دنیا کی ظاہری زیب و زینت چھوڑ دیتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں پورے کمال کے ساتھ کسی ایک شخص میں یہاں تک کہ اولیاء میں بھی جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس حدیث کو لوگوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ بیان کرنا، اس کی اشاعت کرنا اور اس کے مفہوم و مطالب سے عوام کو باخبر کرنا بڑی سعادت اور فضیلت کی بات ہے، چنانچہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو کثرت کے ساتھ ذکر و بیان کرنا مستحب ہے۔

صبر پر اجر ہے:

حدیث:

وعن أم سلمة قالت :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"ما من مسلم تصيبه مصيبة فيقول ما أمره الله به :(إنا لله وإنا إليه راجعون)
اللهم آجرني في مصيبتي واخلف لي خيرا منها إلا أخلف الله له خيرا منها" .فلما مات أبو سلمة قالت :أي المسلمين خير من أبي سلمة ؛أول بيت هاجر إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم إني قلتها فأخلف الله لي رسول الله صلى الله عليه وسلم .رواه مسلم

ترجمہ:

حضرت ام سلمہ (رض) فرماتی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جب کوئی مسلمان کسی (چھوٹی یا بڑی) مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ الفاظ کہتا ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی طرف ہم کو واپس جانا ہے۔ دعا (اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا) اے اللہ! میری مصیبت پر مجھے ثواب دے (اور اس مصیبت میں) جو چیز میرے ہاتھ سے گئی ہے اس کا نعم البدل عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اسے اس چیز

کا بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے حضرت ام سلمہ (رض) فرماتی ہیں کہ جب ابوسلمہ (رض) (یعنی میرے پہلے شوہر) کا انتقال ہوا تو میں نے کہا کہ ابوسلمہ سے بہتر کون مسلمان ہوگا وہ ابوسلمہ جنہوں نے سب سے پہلے مع اہل وعیال کے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہجرت کی اور پھر میں نے مذکورہ بالا کلمات کہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہ کے بدلے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمایا' یعنی میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نکاح میں آئی ۔ (مسلم)

......

تشریح:

انا للہ وانا الیہ راجعون کا مطلب یہ ہے کہ ہم اور جو چیزیں کہ ہماری کہلاتی ہیں سب اللہ ہی کی ملکیت اور اس کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ہم لوٹ کر اسی طرف جانے والے ہیں گویا اس آیت میں یہ تسلیم واقرار ہے کہ خود ہماری جان اور ہماری ذات اور وہ چیزیں جن کا ہم اپنے کو مالک سمجھتے ہیں اور وہ ہمارے اختیار میں ہیں اور ہماری طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ سب کی سب حقیقت میں اللہ ہی کی ملکیت میں ہے ہمارے پاس تو وہ صرف عاریتا ہیں۔ اللہ ہی کی طرف سے ہماری ابتداء ہوئی اور اس کی طرف ہماری انتہا بھی ہے۔ لہٰذا جو شخص اس مضمون کو اپنے قلب و دماغ میں راسخ کرے اور جس مصیبت میں وہ مبتلا ہو اس مصیبت پر صبر و رضا کے دامن کو پکڑے رہے تو اس کے لیے وہی مصیبت کی ہر مصیبت آسان وسہل ہو جاتی ہے لیکن اتنی بات جان لینی چاہیے کہ مصیبت و بلاء پر جزع وفزع کے ساتھ اس آیت کو محض زبان سے ادا کرنا چنداں مفید نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ اشکال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیت وکلمات کے پڑھنے کا حکم بیان نہیں فرمایا تو پھر ارشاد گرامی کے اس جزء، فیقول ما امرہ اللہ بہ (اللہ تعالیٰ کے حکم کے

مطابق یہ کہے) کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہوگا کہ جب اس آیت اور مذکورہ بالا کلمات کے پڑھنے والے کی فضیلت بیان فرمادی تو گویا یہ حکم ہی فرمایا گیا ہے۔ لفظ" اجرنی " ہمزہ (الف) کے جزم اور جیم کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اور ہمزہ کے زبر اور جیم کے زیر کے ساتھ بھی منقول ہے مگر دونوں کا معنی و مراد ایک ہی ہے۔ حضرت ام سلمہ (رض) کے اس ارشاد فلما مات ابوسلمہ (جب ابوسلمہ کا انتقال ہوا الخ) کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ حدیث مبارکہ پہلے سے سن رکھی تھی، چنانچہ جب میرے خاوند ابوسلمہ (رض) نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے وفات پائی تو آپ کے حکم کی بجا آوری کی خاطر اور فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے میں نے چاہا کہ یہی کلمات پڑھو مگر میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ حضرت ابوسلمہ سے بہتر اور کون شخص ہوسکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ابوسلمہ کے بدلہ میں مجھے بطور خاوند عطا فرمائے گا۔ چنانچہ ام سلمہ حضرت ابوسلمہ کی فضیلت بیان کرتی ہیں کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے۔ ان میں حضرت ابوسلمہ (رض) ہی وہ سب سے پہلے مرد حق آگاہ تھے جنہوں نے اپنے اہل وعیال سمیت ہجرت کی اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پھر یہ کہ حضرت ابوسلمہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی بھی تھے اس کے بعد حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ باوجود اس خلجان کے میں نے مذکورہ کلمات پڑھے جس کے سبب سے مجھے دنیا و آخرت کی سب سے عظیم سعادت و فضیلت حاصل ہوئی یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نکاح میں آئی جو افضل البشر ہیں۔

مومن کی موت خود اس کی راحت کا ذریعہ ہے اور فاجر کی موت دنیا والوں کی راحت کا سبب ہے

حدیث

وعن أبي قتادة أنه كان يحدث أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر عليه بجنازة فقال
:"مستريح أو مستراح منه" فقالوا :يارسول الله ما المستريح والمستراح منه؟ فقال:
"العبد المؤمن يستريح من نصب الدنيا وأذاها إلى رحمة الله والعبد الفاجر يستريح منه
العباد والبلاد والشجر والدواب"

ترجمہ؛

حضرت ابوقتادہ (رض) یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے ایک جنازہ لایا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ' یہ راحت پانے والا ہے، یا یہ کہ اس سے دوسروں کو راحت نصیب ہوئی ؟" صحابہ نے عرض کیا کہ راحت پانے والا کون ہے؟ اور وہ کون ہے جس سے دوسروں کو راحت نصیب ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا" بندہ مومن اپنی موت کے ذریعہ دنیا کے رنج وایذاء سے راحت پاتا ہے اور اللہ کی رحمت کی طرف جاتا ہے اور بندہ فاجر (یعنی گنہگار) کی موت کے ذریعہ اس کے شر فساد سے بندے، شہر، درخت اور جانور (سب ہی) راحت پاتے ہیں" (بخاری ومسلم)

تشریح؛

مطلب یہ ہے کہ جب بندہ مومن وفات پاتا ہے تو وہ دنیا کے رنج سے بایں طور راحت پاتا ہے کہ دنیا میں اعمال واحوال کی وجہ سے وہ جس مشقت ومحنت میں مبتلا تھا اس سے نجات مل جاتی ہے

اور دنیا کی ایذاء سے بایں طور راحت پاتا ہے کہ وہ دنیاوی تکلیف و پریشانی مثلاً گرمی سردی، تنگدستی و مفلسی وغیرہ سے یا یہ کہ اہل دنیا کی ایذاء رسانی سے اسے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ اسی لیے مسروق (رح) نے کہا ہے کہ مجھے کسی چیز پر بھی کسی چیز کے سبب اتنا رشک نہیں آتا جتنا رشک اس مومن پر آتا ہے جو قبر میں سلا دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے عذاب سے مامون ہو جاتا ہے اور دنیا سے راحت و سکون پالیتا ہے۔ نیز ابو داؤد (رح) فرماتے ہیں کہ میں اپنے رب کے پاس جانے کے شوق میں موت کو پسند کرتا ہوں۔ گناہ کے کفارہ کے لیے مرض کو پسند کرتا ہوں۔ اور اپنے رب کے سامنے تواضع و انکساری کی خاطر فقر کو پسند کرتا ہوں۔ جب بندہ فاجر یعنی گناہ گار مرتا ہے تو اس سے بندے تو یوں راحت پاتے ہیں کہ جب وہ اپنی زندگی میں خلاف شرع باتیں کرتا اور لوگ اسے منع کرتے تو وہ انھیں ایذاء پہنچاتا اور اگر سکوت و خاموشی اختیار کرتے تو اپنے دین اور اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتے۔ اور جب وہ گناہ گار مر گیا تو لوگوں نے اس سے چھٹکارا پایا۔ اور شہر و درخت وغیرہ اس کے مرنے سے بایں طور راحت پاتے ہیں کہ گناہ و ظلم ہونے کی وجہ سے عالم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ ارکان دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ گنہگار و ظالم کو مبغوض رکھتا ہے لہٰذا اس کی وجہ سے زمین اور وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں نقصان اٹھاتی ہیں پھر یہ کہ اس کی شومی گناہ کے سبب اللہ تعالیٰ بارش نہیں برساتا، اب جب کہ مرا تو بادلوں نے اپنے منہ کھول دیئے اور زمین کا شجر و پودا ہرا بھرا ہو گیا اور اس طرح سب ہی نے راحت پائی۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"أكثروا ذكر هاذم اللذات الموت". رواه الترمذي والنسائي وابن ماجه

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" (دنیا کی) لذتوں کو کھو دینے والی چیز کو، کہ جو موت ہے کثرت سے یاد کرو"۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح؛

صحیح یہی ہے کہ لفظ" ہاذم" ذال کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں قطع کرنے والا، چنانچہ جن لوگوں نے دال کے ساتھ یعنی لفظ" ہادم" بمعنی ڈھالنے والا جو نقل کیا ہے صحیح نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ اس بارے میں کسی راوی سے چوک ہوگئی ہو۔ بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا چاہیے کیونکہ موت کو یاد کرنے سے غفلت جو نیک اعمال کے راستہ میں رکاوٹ بنتی ہے دور ہوتی ہے، موت کی یاد دنیا (کے برے کاموں) کی مشغولیت سے باز رکھتی ہے اور موت کو یاد کرنے والا طاعات و عبادات کی طرف متوجہ رہتا ہے جو توشہ آخرت ہے۔ نسائی نے اس روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کیئے ہیں۔ فانہ لا یذکر فی کثیر الا قللہ ولا فی قلیل الا کثرہ (ترجمہ) جب مال کی زیادتی میں موت یاد آتی ہے تو وہ مال کو کم کر دیتی ہے (یعنی موت یاد آجانے کی وجہ سے مال کی طرف کوئی رغبت نہیں رہتی اور مال کو فانی سمجھنے لگتا ہے اس لیے اس وقت زیادہ مال بھی نظروں میں حقیر ہو جانے کی وجہ سے کم ہی محسوس ہوتا ہے) اور جب

مال کی کمی میں موت یاد آجاتی ہے تو وہ مال کو زیادہ کر دیتی ہے (یعنی جب موت یاد آتی ہے تو دنیا کو فانی سمجھ کر کم مال پر قناعت کرتا ہے اس لیے تھوڑا مال بھی زیادہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

مومن اور کافر کی روح قبض ہونے کا بیان

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :الميت تحضره الملائكة فإذا كان الرجل صالحا قالوا :اخرجي أيتها النفس الطيبة كانت في الجسد الطيب اخرجي حميدة وأبشري بروح وريحان ورب غير غضبان فلا تزال يقال لها ذلك حتى تخرج ثم يعرج بها إلى السماء فيفتح لها فيقال :من هذا؛ فيقولون :فلان فيقال :مرحبا بالنفس الطيبة كانت في الجسد الطيب ادخلي حميدة وأبشري بروح وريحان ورب غير غضبان فلا تزال يقال لها ذلك حتى تنتهي إلى السماء التي فيها الله فإذا كان الرجل السوء قال :اخرجي أيتها النفس الخبيثة كانت في الجسد الخبيث اخرجي ذميمة وأبشري بحميم وغساق وآخر من شكله أزواج فما تزال يقال لها ذلك حتى تخرج ثم يعرج بها إلى السماء فيفتح لها فيقال :من هذا؛ فيقال :فلان فيقال :لا مرحبا بالنفس الخبيثة كانت في الجسد الخبيث ارجعي ذميمة فإنها لا تفتح له أبواب السماء فترسل من السماء ثم تصير إلى القبر " . رواه ابن ماجه

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جو شخص قریب المرگ ہوتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آتے ہیں اور اگر وہ نیک وصالح ہوتا ہے تو (اس کی روح سے رحمت کے) فرشتے کہتے ہیں کہ اے پاک جان جو پاک بدن میں تھی! اس حال

میں (جسم سے) نکل کہ (خدا اور مخلوق کے نزدیک) تیری تعریف کی گئی ہے اور تجھے خوشخبری ہو دائمی راحت وسکون کی، جنت کے پاک رزق کی اور اللہ سے ملاقات کی جو (تجھ پر) غضبناک نہیں ہے۔ قریب المرگ کے سامنے فرشتے برابر یہی بات کہتے ہیں یہاں تک کہ روح (خوشی خوشی) باہر نکل آتی ہے اور پھر فرشتے اسے آسمان کی طرف لے جاتے ہیں، آسمان کا دروازہ اس کے لیے (فرشتوں کے کہنے سے یا پہلے ہی سے) کھول دیا جاتا ہے (آسمان کے دربان) پوچھتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے؟ اسے لے جانے والے فرشتے (اس کا نام ونسب بتا کر) کہتے ہیں کہ یہ فلاں شخص (کی روح) ہے۔ پس کہا جاتا ہے کہ آفرین ہو اس جان پاک کو جو پاک بدن میں تھی اور (اے پاک جان آسمان میں) داخل ہو اس حال میں کہ تیری تعریف کی گئی اور خوشخبری ہو تجھے راحت کی، پاک رزق کی اور پروردگار سے ملاقات کی جو غضبناک نہیں ہے۔ اس روح سے برابر یہی بات کہی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس آسمان پر (یعنی عرش پر) پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اللہ رب العزت کی رحمت خاص جلوہ فرما ہے!۔ اور اگر وہ برا (یعنی کافر) ہوتا ہے تو ملک الموت کہتے ہیں کہ اے خبیث جان جو پلید بدن میں اس حال میں (جسم سے) باہر نکل کہ تیری برائی کی گئی ہے اور یہ بری خبر سن لے کہ گرم پانی، پیپ اور ان کے علاوہ دوسری طرح کے عذاب تیرے منتظر ہیں۔ اس بدبخت قریب المرگ کے سامنے بار بار یہی کہا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح (بادل نخواستہ) باہر نکل آتی ہے پھر اسے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے (تاکہ اس کی ذلت وخواری اس پر ظاہر کردی جائے) جب اس کے لیے آسمان کے دروازے کھلوائے جاتے ہیں تو دربانوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کون شخص ہے؟ جواب دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص! پس کہا جاتا ہے کہ نفریں ہو اس خبیث جان پر جو پلید جسم میں تھی

اور (اے خبیث جان) واپس چلی جا اس حال میں کہ تیری برائی کی گئی ہے اور تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ چنانچہ اسے آسمان سے پھینک دیا جاتا ہے اور وہ قبر کی طرف آجاتی ہے“۔ (ابن ماجہ) تشریح اس کے پاس فرشتے آتے ہیں، سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قریب المرگ کے پاس اس کی روح قبض کرنے کے لیے رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں آتے ہیں، اگر قریب المرگ نیک و صالح ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے اپنا کام کرتے ہیں اور قریب المرگ بدکار ہوتا ہے تو پھر عذاب کے فرشتے اپنا کام کرتے ہیں۔ ”نیک و صالح“ سے یا عمومی طور پر مومن مراد ہے یا پھر وہ نیک بخت مراد ہے جو حقوق اللہ حقوق العباد دونوں ادا کرتا ہے اور اس کی زندگی اطاعت و فرمان برداری کی راہ پر گزری ہو۔ حدیث میں نیک و صالح اور کافر کی روح قبض کرنے کے بارے میں تو تفصیل بتائی گئی ہے لیکن ”فاسق“ کے بارے میں بالکل سکوت اختیار کیا گیا کیونکہ فاسق کے بارے میں کتاب و سنت کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے تا کہ وہ خوف و رجاء کے درمیان رہے۔ مومن اور کافر کی روح کے درمیان اس امتیاز اور فرق کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کافر کی روح تو آسمان سے دھتکار دی جاتی ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے اسفل السافلین میں قید کر دیا جاتا ہے بخلاف مومن صالح کی روح کے کہ اسے آزادی حاصل ہوتی ہے اور آسمان و زمین میں جہاں چاہتی ہے سیر کرتی ہے، جنت میں میوے کھاتی ہے، عرش کے نیچے قندیلوں کی طرف اپنی جگہ اختیار کرتی ہے۔ پھر یہ کہ اسے قبر اپنے جسم کے ساتھ بھی تعلق رہتا ہے بایں طور کہ مردہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے سکوت و راحت سے لطف اندوز ہوتا ہے، دولھا کی نیند سوتا ہے اور اپنے اپنے حسب مراتب و درجات جنت میں اپنا مسکن دیکھتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ

میں یہ بات ملحوظ رہے کہ روح کا معاملہ اور برزخ کے احوال اگرچہ خوارق عادات میں سے ہیں کہ ہماری دنیاوی زندگی ان سے مانوس و متعارف نہیں لیکن اس امور کے وقوع کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

وعن البراء بن عازب قال :خرجنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازة رجل من الأنصار فانتهینا إلی القبر ولما یلحد فجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجلسنا حوله كأن علی رؤوسنا الطیر وفی یده عود ینكت به فی الأرض فرفع رأسه فقال :" استعیذوا باللہ من عذاب القبر "مرتین أو ثلاثا ثم قال :"إن العبد المؤمن إذا كان فی انقطاع من الدنیا وإقبال من الآخرة نزل إلیه من السماء ملائكة بیض الوجوه كأن وجوههم الشمس معهم كفن من أكفان الجنة وحنوط من حنوط الجنة حتی یجلسوا منه مد البصر ثم یجیء ملك الموت حتی یجلس عند رأسه فیقول :أیتها النفس الطیبة اخرجی إلی مغفرة من اللہ ورضوان" قال :"فتخرج تسیل كما تسیل القطرة من فی السقاء فیأخذها فإذا أخذها لم یدعوها فی یده طرفة عین حتی یأخذوها فیجعلوها فی ذلك الكفن وفی ذلك الحنوط ویخرج منها كأطیب نفحة مسك وجدت علی وجه الأرض" قال: "فیصعدون بها فلا یمرون -یعنی بها- علی ملأ من الملائكة إلا قالوا :ما هذه الروح الطیب فیقولون :فلان بن فلان بأحسن أسمائه التی كانوا یسمونه بها فی الدنیا حتی ینتهوا بها إلی سماء الدنیا فیستفتحون له فیفتح له فیشیعه من كل سماء مقربوها إلی السماء التی تلیها حتی ینتهی بها إلی السماء السابعة- فیقول اللہ عز وجل :اكتبوا كتاب عبدی فی علیین وأعیدوه إلی الأرض فإنی منها خلقتهم وفیها أعیدهم ومنها أخرجهم تارة أخری قال :"فتعاد روحه فیأتیه ملكان فیجلسانه فیقولون له :من ربك؟ فیقول: ربی اللہ فیقولون له :ما دینك؟ فیقول :دینی الإسلام فیقولان له :ما هذا الرجل الذی بعث فیكم؟ فیقول :هو رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیقولان له :وما علمك؟

فیقول :قرأت کتاب اللہ فآمنت بہ وصدقت فینادی منادمن السماء أن قد صدق فأفرشوہ من الجنة وألبسوہ من الجنة وافتحوا لہ بابا إلی الجنة" قال :"فیأتیہ من روحھا وطیبھا ویفسح لہ فی قبرہ مد بصرہ" قال :"ویأتیہ رجل حسن الوجہ حسن الثیاب طیب الریح فیقول :أبشر بالذی یسرک ھذا یومک الذی کنت توعد فیقول لہ :من أنت ؛فوجھک الوجہ یجیء بالخیر فیقول :أنا عملک الصالح فیقول :رب أقم الساعة رب أقم الساعة حتی أرجع إلی أھلی ومالی". قال :"وإن العبد الکافر إذا کان فی انقطاع من الدنیا وإقبال من الآخرة نزل إلیہ من السماء ملائکة سود الوجوہ معھم المسوح فیجلسون منہ مد البصر ثم یجیء ملک الموت حتی یجلس عند رأسہ فیقول :أیتھا النفس الخبیثة اخرجی إلی سخط من اللہ" قال :"فتتفرق فی جسدہ فینتزعھا کما ینتزع السفود من الصوف المبلول فیأخذھا فإذا أخذھا لم یدعوھا فی یدہ طرفة عین حتی یجعلوھا فی تلک المسوح ویخرج منھا کأنتن ریح جیفة وجدت علی وجہ الأرض فیصعدون بھا فلا یمرون بھا علی ملأ من الملائکة إلا قالوا :ما ھذا الروح الخبیث؛ فیقولون :فلان بن فلان-بأقبح أسمائہ التی کان یسمی بھا فی الدنیا-حتی ینتھی بھا إلی السماء الدنیا فیستفتح لہ فلا یفتح لہ" ثم قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (لا تفتح لھم أبواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط) فیقول اللہ عز و جل :اکتبوا کتابہ فی سجین فی الأرض السفلی فتطرح روحہ طرحا ثم قرأ :(ومن یشرک باللہ فکأنما خر من السماء فتخطفہ الطیر أو تھوی بہ الریح فی مکان سحیق) فتعاد روحہ فی جسدہ ویأتیہ ملکان فیجلسانہ فیقولان لہ :من ربک :فیقول :ھاہ ھاہ لا أدری فیقولان لہ :ما دینک؛ فیقول :ھاہ ھاہ لا أدری فیقولان لہ :ما ھذا الرجل الذی بعث فیکم ؛فیقول :ھاہ ھاہ لا أدری فینادی منادمن السماء أن کذب عبدی فأفرشوا لہ من النار وافتحوا لہ بابا إلی النار فیأتیہ حرھا وسمومھا ویضیق علیہ قبرہ حتی تختلف فیہ أضلاعہ ویأتیہ رجل قبیح الوجہ قبیح الثیاب منتن الریح فیقول أبشر بالذی یسوؤک ھذا یومک الذی کنت توعد فیقول :من أنت؛ فوجھک الوجہ یجیء بالشر فیقول :أنا عملک الخبیث فیقول :رب لا تقم الساعة وفی روایة نحوہ وزاد فیہ :إذا

خرج روحه صلى عليه كل ملك بين السماء والأرض وكل ملك في السماء وفتحت له أبواب السماء ليس من أهل باب إلا وهم يدعون الله أن يعرج بروحه من قبلهم . وتنزع نفسه يعني الكافر مع العروق فيلعنه كل ملك بين السماء والأرض وكل ملك في السماء وتغلق أبواب السماء ليس من أهل باب إلا وهم يدعون الله أن لا يعرج روحه من قبلهم ". رواه أحمد

......

ترجمہ

حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ ہم) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ ایک انصاری شخص کے جنازہ کے ساتھ چلے ہم قبر پر پہنچے (قبر تیار نہ ہونے کی وجہ سے) ابھی جنازہ سپرد خاک نہیں ہوا تھا۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک جگہ تشریف فرما ہوگئے ہم بھی آپ کے گرداگرد (اس طرح) بیٹھ گئے گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے ہیں (یعنی ہم بالکل خاموش سر جھکائے بیٹھے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ جس سے آپ زمین کرید رہے تھے (جس طرح کہ کوئی شخص انتہائی تفکر واستغراق کے عالم میں ہوتا ہے) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور (ہمیں مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو یا تین بار فرمایا۔ اور پھر فرمایا" جب بندہ مومن دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے کو ہوتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے (یعنی مرنے کے قریب ہوتا ہے) تو اس کے پاس آسمان سے نہایت روشن چہرے والے فرشتے اترتے ہیں (جن کے چہرہ کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے) گویا کہ ان کے چہرے آفتاب ہیں، ان کے ہمراہ جنت کا (یعی ریشمی کپڑے کا) کفن اور جنت کی خوشبو (یعنی مشک وعنبر وغیرہ کی خوشبو) ہوتی ہے اور وہ (بسبب کمال ادب اور روح نکلنے کے انتظار

میں) اس کے سامنے اتنی دور کہ جہاں تک کہ اس کی نگاہ پہنچ سکے، بیٹھ جاتے ہیں، پھر ملک الموت (علیہ السلام) آتے ہیں اور اس کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتے ہیں کہ" اے پاک جان! اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے مغفرت و بخشش اور اس کی خوشنودی کی طرف پہنچنے کے لیے جسم سے نکل! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ (یہ سن کر) بندہ مومن کی جان (اس کے جسم سے) اس طرح (یعنی آسانی اور سہولت سے) نکل آتی ہے جس طرح کہ مشک سے پانی کا قطرہ بہ نکلتا ہے۔ چنانچہ ملک الموت اس کو لے لیتے ہیں، جب ملک الموت اسے لے لیتے ہیں تو دوسرے فرشتے اس جان کو ملک الموت کے ہاتھ میں پلک جھپکنے کے بقدر بھی نہیں چھوڑتے یعنی غایت اشتیاق کی بنا پر فوراً اس جان کو ملک الموت کے ہاتھوں سے (اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اس کو اس کفن میں اور اس خوشبو میں کہ جسے وہ اپنے ہاتھ میں لائے تھے رکھ لیتے ہیں اور اس جان سے بہترین وہ خوشبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر (زمین کے پیدا ہونے سے لے کر اس کی فنا تک) پائی جانے والی مشک کی بہترین خوشبوؤں کے مانند ہوتی ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ" پھر وہ فرشتے اس جان کو لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں، چنانچہ جب وہ فرشتے اس جان کو لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں تو (زمین و آسمان کے درمیان موجود) فرشتوں کی کسی بھی جماعت کے قریب سے گزرتے ہیں تو وہ جماعت پوچھتی ہے کہ یہ پاک روح کون ہے؟ وہ فرشتے جو اس روح کو لے جا رہے ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں کا بیٹا (یعنی اس کی روح) ہے اور وہ فرشتے اس کو بہترین نام و لقب (اور اس کے اوصاف) بتاتے ہیں جن کے ذریعہ اہل دنیا اس کا ذکر کرتے ہیں اسی طرح سوال و جواب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ فرشتے اس کو لے کر آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان

تک) پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں جو ان کے لیے کھول دیا جاتا ہے (اسی طرح ہر آسمان کا دروازہ اس کے لیے کھولا جاتا ہے) اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے دوسرے آسمان تک اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں تک (اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ) پہنچا دیا جاتا ہے۔ پس اللہ عزوجل (فرشتوں سے) فرماتا ہے کہ اس بندہ کا نامہ اعمال علیین میں رکھو اور اس جان کو زمین کی طرف یعنی اس کے بدن میں جو زمین میں مدفون ہے واپس لے جاؤ (تاکہ یہ اپنے بدن میں پہنچ کر قبر کے سوال و جواب کے لیے تیار رہے) کیونکہ بیشک میں زمین ہی سے جسموں کو پیدا کیا ہے اور زمین ہی میں ان کو (یعنی اجسام و ارواح کو) واپس بھیجتا ہوں اور پھر زمین ہی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے بعد وہ جان اپنے جسم میں پہنچا دی جاتی ہے پھر اس کے پاس دو فرشتے (یعنی منکر نکیر) آتے ہیں جو اسے بٹھلاتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ بندہ مومن جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے پھر وہ پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے پھر وہ پوچھتے ہیں کہ یہ (یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون ہیں؟ جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے وہ جواب دیتا ہے کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم نے کیسے جانا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب کو پڑھا، اس پر ایمان لایا۔ اور دل سے اسے سچ جانا (جس کی وجہ سے مجھے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رسول ہونا معلوم ہوا پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے (یعنی اللہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ) میرا بندہ سچا ہے اس کے لیے جنت کا بستر بچھاؤ اسے جنت کا لباس پہناؤ اور اس کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چنانچہ اس کی طرف جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اسے جنت کی ہوا اور خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر اس کی قبر کو حد نظر تک کشادہ کر دیا جاتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے بعد اس کے پاس ایک خوبصورت شخص اچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ خوشخبری ہو تجھے اس چیز کی جو تجھے خوش کرنے والی ہے۔ یعنی تیرے لیے وہ نعمتیں تیار ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا آج وہ دن ہے جس کا (دنیا میں) تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ بندہ مومن اس سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ حسن وجمال میں کامل ہے اور تم بھلائی کو لائے ہو اور اس کی خوشخبری سناتے ہو وہ شخص جواب دیتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں (جو اس شکل وصورت میں آیا ہوں) آج وہ دن ہے جس کا (دنیا میں) تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا بندہ مومن (یہ سن کر) کہتا ہے اے میرے پروردگار قیامت قائم کر دے! قیامت قائم کر دے قیامت قائم کر دے تاکہ میں اپنے اہل وعیال کی طرف جاؤں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اور جب بندہ کافر دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے اور آخرت کی طرف جانے کو ہوتا ہے (یعنی اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے) تو اس کے پاس سے آسمان سے (عذاب کے) کالے چہرے والے فرشتے آتے ہیں ان کے ساتھ ٹاٹ ہوتا ہے اور وہ اتنی دور کہ جہاں تک نگاہ پہنچ سکے بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتا ہے کہ اے خبیث جان! اللہ کی طرف سے عذاب (مبتلا کئے جانے کے لیے جسم سے باہر) نکل! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (کافر کی روح یہ سن کر) اس کے جسم میں پھیل جاتی ہے (یعنی روح کافر جب عذاب الٰہی کے آثار دیکھتی ہے تو اس کے خوف سے اپنے جسم سے نکلنے کے لیے تیار نہیں بلکہ پورے جسم

میں چھپی چھپی پھرتی ہے بخلاف مومن کی روح کے کہ وہ انوار الٰہی اور پروردگار کے کرم کے آثار دیکھ کر جسم سے خوشی خوشی نکل آتی ہے) چنانچہ ملک الموت اس روح کو سختی اور زور سے باہر نکالتا ہے جیسا کہ ترصوف سے آنکڑا کھینچا جاتا ہے (یعنی جس طرح ترصوف سے آنکڑا بڑی سختی اور مشکل سے کھینچا جاتا ہے اور اس سختی سے کھینچنے کی وجہ سے صوف کے کچھ اجزاء اس آنکڑا سے لگے ہوئے باہر آجاتے ہیں تو یہ حال ہوتا ہے کہ جیسے کہ روح کے ساتھ رگوں کے کچھ اجزاء لگے ہوئے باہر آگئے ہیں) جب ملک الموت اس روح کو پکڑ لیتا ہے دوسرے فرشتے اس روح کو ملک الموت کے ہاتھ پلک جھپکنے کے بقدر بھی نہیں چھوڑتے بلکہ اسے لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں، اس روح میں سے ایسے (سڑے ہوئے) مردار کی بدبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر پایا جائے۔ وہ فرشتے اس روح کو لے کر آسمان کی طرف چلتے ہیں چنانچہ جب وہ فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ جماعت پوچھتی ہے کہ یہ کون ناپاک روح ہے؟ وہ فرشتے جو اسے لے جارہے ہوتے ہیں جواب دیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا ہے (یعنی فلاں شخص کی روح ہے) اور اس کے برے نام برے اوصاف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ جن نام و اوصاف سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اسے آسمان سے دنیا تک پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا جاتا ہے تو اس کے واسطے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے استدلال کے طور پر یہ آیت پڑھی :(لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ) 7۔ الاعراف 40 :)۔ ان کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے

ناکے میں داخل ہو جائے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس روح کا اعمال نامہ سجین میں لکھ دو جو سب سے نیچے کی زمین ہے۔ چنانچہ کافر کی روح (نیچے) پھینک دی جاتی ہے، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (استدلال کے طور پر) یہ آیت تلاوت فرمائی (وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ) 22۔الحج 31 :)۔جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ ایسا ہے جیسے آسمان سے (یعنی ایمان و توحید کی بلندی سے کفر و شرک کی بستی میں) گر پڑا۔ چنانچہ اسے پرندے اچک لیتے ہیں (یعنی وہ ہلاک ہو جاتا ہے) یا ہوا اسے (اڑا کر) دور پھینک دیتی ہے (یعنی رحمت الٰہی سے دور ہو جاتا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسے شیطان نے گمراہی میں ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ مقام قرب سے دور جا پڑا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا) اس کی روح اس کے جسم میں آجاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ! میں نہیں جانتا۔ پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ! میں نہیں جانتا پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ یہ "شخص (یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ! میں نہیں جانتا! (اس سوال و جواب کے بعد) پکارنے والا آسمان کی طرف سے پکار کر کہتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے لہٰذا اس کے لیے آگ کا بچھونا بچھاؤ اور اس کے لیے دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو!۔ چنانچہ (اس کے لیے دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے) جس سے اس کے پاس دوزخ کی گرمی اور اس کی گرم ہوا آتی رہتی ہے اور اس کے لیے اس کی قبر اس پر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ

(دونوں کنارے مل جانے سے) اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر نکل جاتی ہیں۔ پھر اس کے پاس ایک بدصورت شخص آتا ہے جو برے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا ہے اور اس سے بدبو آتی رہتی ہے اور وہ اس سے کہتا ہے کہ تو وہ بری خبر سن، جو تجھے رنج وغم میں مبتلا کردے، آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے (دنیا میں وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ تو کون ہے؟ تیرا چہرہ انتہائی برا ہے جو برائی لیے ہوئے آیا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ تیرا برا عمل ہوں (یہ سن کر) مردہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار قیامت قائم نہ کیجیے۔ ایک اور روایت میں اسی طرح منقول ہے مگر اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب مومن کی روح (اس کے جسم سے) نکلتی ہے تو ہر وہ فرشتہ جو آسمان وزمین کے درمیان ہے اور ہر وہ فرشتہ جو آسمان میں ہے اس پر رحمت بھیجتا ہے۔ اس لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور (ہر آسمان کا) ہر دروازے والا (فرشتہ) اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرتا ہے کہ اس مومن کی روح اس کی طرف سے آسمان پر لے جائی جائے (تاکہ وہ اس مومن کی روح کے ساتھ چلنے کا شرف حاصل ہوسکے) اور کافر کی روح رگوں کے ساتھ نکالی جاتی ہے چنانچہ زمین وآسمان کے درمیان تمام فرشتے اور وہ فرشتے جو (پہلے آسمان کے) ہیں اس پر لعنت بھیجتے ہیں اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور پہلے آسمان کے تمام دروازے والے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ (اس کافر) کی روح ان کی طرف سے نہ چڑھائی جائے" (احمد)

تشریح:

حدیث کے الفاظ فتخرج تسیل کما تسیل القطرۃ من السقاء سے تو یہ معلوم ہوا کہ بندہ کی جان بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ نکلتی ہے جب کہ ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جان نکلنے

کے معاملہ میں مومن بھی بڑی سختی اور کرب میں مبتلا ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے کہ مومن کی روح تو جسم سے نکلنے سے پہلے سختی میں مبتلا ہوتی ہے اور جسم سے نکلنے کے وقت آسانی وسہولت سے باہر آجاتی ہے مگر بخلاف کافر کی روح کے کہ اس کی روح جسم سے نکلتے وقت بھی بڑی سختی اور کرب میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس حدیث میں بتایا ہے کہ مومن کی روح ساتویں آسمان تک پہنچائی جاتی ہے جب کہ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ روح مومن عرش تک پہنچائی جاتی ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بعض روحین ساتویں آسمان تک پہنچائی جاتی ہوں اور بعض روحوں کو عرش تک لے جایا جاتا ہو۔ ”علیین“ ایک جگہ کا نام ہے جو ساتویں آسمان پر واقع ہے اور جس میں نیک لوگوں کے اعمال نامے رہتے ہیں۔ حدیث میں منکر نکیر کا تیسرا سوال اس طرح نقل کیا گیا ہے” یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے کون ہیں؟ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں سے تو اسی طرح سوال کیا جاتا ہو اور بعض لوگوں سے اس طرح پوچھا جاتا ہو کہ تمہارا نبی کون ہے؟ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں منقول ہے۔ حتی ارجع الی اھلی ومالی (تاکہ میں اپنے اہل وعیال کی طرف جاؤں) میں اہل سے مراد حوریں اور خدام ہیں اور مال سے محل جنت کے باغ اور وہاں کی از قسم مال دوسری چیزیں مراد ہیں یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اہل سے مراد مومن کے اہل قرابت اور مال سے مراد حور وقصور وغیرہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ ”سجین“ ساتویں زمین کے نیچے دوزخ کی گہرائیوں کا ایک جگہ کا نام ہے جہاں دوزخیوں کے نامہ اعمال رکھے جاتے ہیں چنانچہ حدیث کے الفاظ اکتبوا کتابہ فی سجین فی الارض السفلی میں اس طرف اشارہ ہے کہ دوزخ ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ اللہ کے باغی اور سرکش لوگوں کو اپنی آغوش میں قبر کس دردناک طریقہ سے بھینچتی ہے؟ یہ تو

آپ کو اس حدیث سے معلوم ہوا لیکن بعض مومنین بلکہ اکابر موحدین یعنی اولیاء اللہ کے لیے بھی ضغط یعنی قبر کا بھینچنا ثابت ہے مگر اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی بلکہ مومن کے لیے قبر اپنے دونوں کنارے اس طرح ملاتی ہے جیسے کوئی ماں انتہائی اشتیاق و محبت کے عالم میں اپنے بچے کو گلے سے لگاتی ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ" کافر کی روح رگوں کے ساتھ نکالی جاتی ہے" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کافر کی روح اپنا جسم بہت مشکل اور بڑی سختی سے چھوڑتی ہے۔ چونکہ اسے اپنے جسم سے کمال تعلق ہوتا ہے اور وہ جسم سے نکلنا نہیں چاہتی اس لیے موت کا فرشتہ اسے کھینچ کر باہر نکالتا ہے۔

زبان خلق نقارہ خدا

حدیث

وعن أنس قال :مروا بجنازة فأثنوا عليها خيرا .فقال النبي صلى الله عليه وسلم :" وجبت" ثم مروا بأخرى فأثنوا عليها شرا .فقال :"وجبت" فقال عمر :ما وجبت؟ فقال :"هذا أثنيتم عليه خيرا فوجبت له الجنة وهذا أثنيتم عليه شرا فوجبت له النار أنتم شهداء الله في الأرض" .وفي رواية :"المؤمنون شهداء الله في الأرض"

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) فرماتے ہیں کہ صحابہ (رض) کا ایک جنازہ پر گزر ہوا تو اس کی تعریف کرنے لگے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کی زبان میت کی تعریف سن کر فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ اس طرح صحابہ کا ایک دوسرے جنازہ پر گزر ہوا تو اس کی برائی بیان کرنے لگے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کی زبان سے میت کی برائی سن کر فرمایا کہ واجب ہوگئی۔

حضرت عمر (رض) نے پوچھا کہ کیا چیز واجب ہوگئی؟ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جس شخص کی تم نے تعریف بیان کی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور اب جس شخص کی تم برائی بیان کر رہے ہو اس کے لیے دوزخ واجب ہوگئی اور (پھر فرمایا کہ) تم زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔ (بخاری ومسلم) ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مومن اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں۔

تشریح:

جنت واجب ہوگئی، کا مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تعریف بیان کر رہے ہو اگر اس کی وہ تعریف صحیح اور سچ ہے یا یہ کہ اس کی موت اسی خیر و بھلائی کی حالت میں ہوئی ہے جیسے تم بیان کر رہے ہو تو اس کے لیے جنت کی سعادت ثابت ہوگئی۔ اسی طرح" دوزخ واجب ہوگئی۔ کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس شخص کی تم برائی بیان کر رہے ہو۔ اگر اس کی وہ برائی صحیح اور واقعی ہے یا یہ کہ اس کی موت اسی برائی کی حالت میں ہوئی ہے جسے تم بیان کر رہے ہو تو اس کے لیے دوزخ کی سزا ثابت ہوگئی۔ مظہر کا قول ہے کہ یہ حکم عام طور پر ہر شخص کے لیے نہیں ہے کہ جس کسی بھی شخص کے بارے میں لوگ خیر و بھلائی کا ذکر کریں تو اس کے لیے جنت لازم ہی ہو جائے بلکہ جس شخص کے بارے میں لوگ اچھے اور نیک خیالات کا اظہار کریں اور اس کی تعریف بیان کریں تو اس لے لیے جنت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کے بارے میں لوگ برے خیالات کا اظہار کریں اور زبان خلق اس کی برائی میں مصروف ہو تو اس کے بارے میں یہ خوف ہو سکتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائے اب رہی یہ بات کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلے شخص کے لیے جنت اور دوسرے شخص کے لیے دوزخ کو واجب کیوں کہا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پہلے شخص کے جنتی ہونے اور دوسرے شخص کے دوزخی ہونے کے فیصلہ سے مطلع کر دیا تھا۔ زین عرف فرماتے ہیں کہ کسی شخص کا خیر و بھلائی اور شر و برائی کے ساتھ ذکر کرنا اس کے لیے جنت و دوزخ کو واجب نہیں کرتا بلکہ درحقیقت کسی شخص کے بارے میں زبانِ خلق کا بھلا یا برا تاثر صرف اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کی علامت ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اس تعریف اور اس برائی کا اعتبار ہوگا جس کی نیک بخت لوگوں اور متقی و پرہیزگار بندوں کی زبانیں گواہی دیں کیونکہ اللہ کے نیک بخت و متقی بندوں کی زبان اس کے قلب سلیم کی ہمنوا ہوتی ہے لہٰذا وہ جس شخص کی تعریف کریں گے یا جس شخص کی برائی کریں گے اس میں کسی خارجی دباؤ یا نفس کے کسی غلط تقاضا کا قطعی دخل نہیں ہوگا بلکہ ان کے زبانی اثرات اور حقیقت کے صالح قلب کے صحیح فیصلہ کے غماز ہوں گے چنانچہ کسی شخص کے بارے میں ان کے تعریف اس شخص کے جنتی ہونے کی علامت ہوگی اور کسی شخص کے بارے میں ان کی بیان کی ہوئی برائی اس شخص کے دوزخی ہونے کی علامت ہوگی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اگر کوئی فاسق اور دنیادار شخص نفس کے غلط تقاضا اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر کسی برے اور بدکار شخص کی تعریف بیان کرے اور اس کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کرے یا اسی طرح کسی نیک بخت اور مرد مومن کی برائی بیان کرے تو نہ اس کی تعریف کا اعتبار ہوگا اور نہ اس کی بیان کی ہوئی برائی کی کوئی حیثیت ہوگی بلکہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ یہ اپنے نفس کا غلام اور ضمیر فروش ہے جو محض ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر اس شخص کو تو اچھا کہہ رہا ہے جس کی برائی اور بدکاری عیاں تھی اور اس نیک بخت کو برا کہہ رہا ہے جس کی نیک بختی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ انتم شہداء اللہ تم (اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو) آنحضرت (صلی اللہ علیہ

واٰلہ وسلم) کا یہ ارشاد اکثر کے اعتبار سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص جیسا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی زبان سے اسے ویسا ہی کہلواتا ہے یعنی اگر کوئی شخص نیک ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں کی زبان سے نیک ہی کہلواتا ہے۔ اور کوئی شخص بدکار ہوتا ہے تو اللہ اپنے بندوں کی زبان سے اس کی بدکاری ہی کی شہادت دلواتا ہے چنانچہ بندہ کی یہ شہادت درحقیقت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ جس کے بارے میں جس تاثر کا اظہار کر رہے ہیں وہ واقعۃً ایسا ہی ہے۔

مردوں کی برائیاں ذکر نہ کرو

حدیث؛

وعن ابن عمر قال :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :"اذکروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویھم". رواہ أبو داود والترمذی

ترجمہ؛

حضرت ابن عمر (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم) نے فرمایا" تم اپنے مرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہی ذکر کرلیا کرو اور ان کی برائیوں کے ذکر سے بچتے رہو"۔ (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح؛

مرے ہوئے لوگوں کے نیک اعمال اور ان کی بھلائیوں کو اس لیے یاد اور بیان کرنا چاہیے کہ نیک اور نیکی کے ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ مردوں کی نیکیوں کو ذکر کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے وہ استحباب کے طور پر ہے لیکن ان کی برائیوں کے ذکر سے بچنے کا جو

حکم دیا جا رہا ہے وہ وجوب کے طور پر ہے یعنی ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کی برائیاں ذکر نہ کرے اور اس فعل سے بچتا رہے چنانچہ حجۃ الاسلام نے لکھا ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کی غیبت زندہ لوگوں کی غیبت سے کہیں زیادہ قابل نفریں ہے۔کتاب ازہار میں علماء کا یہ قول لکھا ہوا ہے کہ" میت کو نہلانے والا اگر میت میں کوئی اچھی علامت دیکھے مثلاً میت کا چہرہ روشن اور منور ہو یا میت میں سے خوشبو آتی ہو تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا مستحب ہے اور اگر کوئی بری علامات دیکھے مثلاً (نعوذ باللہ) میت کا چہرہ یا بدن سیاہ ہو گیا ہو یا اس کی صورت مسخ ہو گئی ہو تو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنا حرام ہے۔

قبروں کے بارے میں چند احکام

حدیث:

وعن أبي مرثد الغنوي قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"لا تجلسوا على القبور ولا تصلوا إليها" .رواه مسلم

ترجمہ:

حضرت ابو مرثد غنوی کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ قبروں کی طرف نماز پڑھو" (مسلم)

تشریح:

محقق ابن ہمام فرماتے ہیں کہ قبروں پر بیٹھنا اور ان کو روندنا مکروہ ہے لہٰذا بعض لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے قبرستان میں اپنے کسی عزیز و متعلق کی قبر تک پہنچنے کے لیے درمیان کی قبروں کو بلا تکلف روندتے ہوئے چلتے ہیں یہ انتہائی غلط بات ہے۔ ہاں ضرورت و حاجت کے

وقت مثلاً قبر کھودنے کے لیے یا میت کو دفن کرنے کے لیے قبروں پر پاؤں رکھ کر چلنا جائز ہے۔ قبرستان میں ننگے پاؤں چلنا مستحب ہے قبر کے نزدیک یا قبر کو تکیہ بنا کر سونا مکروہ ہے قبروں کے پاس استنجا کرنا تو انتہائی کراہت کی بات ہے، قبرستان آنے جانے کے بارے میں ہر وہ چیز مکروہ جو معہود یعنی سنت سے ثابت نہیں اس بارے میں صرف قبروں پر جانا اور وہاں کھڑے کھڑے دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں منقول ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب جنت البقیع تشریف لے جاتے تو وہاں یہ فرماتے دعا

(السلام علیکم دار قوم مومنین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون واسأل اللہ لی ولکم العافیہ)۔ یعنی اے مومنین کے گھر تجھ پر سلامتی ہو، اے مومنو! انشاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے امن وعافیت مانگتا ہوں۔ (ملا علی قاری) کے ان الفاظ سے اگر یہ اشکال پیدا ہوا کہ یہاں تو یہ ثابت ہوا کہ زیارت قبور کے سلسلے میں صرف قبروں پر جانا اور وہاں دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے جیسا کہ خود ملا علی قاری نے ابھی اس باب کی تیسری فصل کی ایک حدیث کو جو حضرت ابن عمر (رض) سے منقول ہے کی تشریح کے ضمن میں وہ احادیث نقل کی ہیں تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی تلاوت دعا میں شامل ہے اس لیے کہ تلاوت قرآن کریم بھی حکما دعا ہی ہے لہٰذا وہ مکروہ نہیں ہے۔ حدیث کے آخری الفاظ ولا تصلوا الیہا (اور نہ قبروں کی طرف نماز پڑھو) کی روشنی میں علماء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قبر یا صاحب قبر کی تعظیم کی خاطر قبر کی طرف نماز پڑھتا ہے تو یہ صریح کفر ہے اگر قبر یا صاحب قبر کی تعظیم پیش نظر نہ ہو تو تب بھی قبر کی طرف نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہی حکم

جنازہ کا بھی ہے جب کہ وہ نمازی کے سامنے رکھا ہوا ہو بلکہ اس میں تو اور بھی زیادہ کراہت ہے حاصل یہ کہ نمازی کے سامنے قبر یا جنازہ نہ ہونا چاہیے۔

نوحہ کی برائی

حدیث:

وعن أبي مالك الأشعري قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"أربع في أمتي من أمر الجاهلية لا يتركونهن :الفخر في الأحساب والطعن في الأنساب والاستسقاء بالنجوم والنياحة". وقال :"النائحة إذا لم تتب قبل موتها تقام يوم القيامة وعليها سربال من قطران ودرع من جرب". رواه مسلم

ترجمہ:

حضرت ابو مالک اشعری (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" زمانہ جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنہیں میرے امت کے (کچھ) لوگ نہیں چھوڑیں گے۔ (۱) حسب پر فخر کرنا، (۲) نسب پر طعن کرنا (۳) ستاروں کے ذریعہ پانی مانگنا (٤) نوحہ کرنا، نیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" نوحہ کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے جسم پر قطران اور خارش کا کرتا ہوگا۔ (مسلم)

تشریح"

حسب" ان خصلتوں کو کہتے ہیں جو اگر کسی مسلمان کے اندر موجود ہوں تو وہ ان کی موجودگی کی وجہ سے اپنے کو بہتر و اچھا سمجھتا ہے جیسے شجاعت و بہادری اور فصاحت وغیرہ۔"نسب پر طعن کرنے"

کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے نسب میں اس طرح عیب جوئی کی جائے کہ فلاں شخص کا باپ برا تھا اور فلاں شخص کا دادا کمتر تھا۔ چونکہ حسب پر فخر کرنے اور نسب پر طعن کرنے کی وجہ سے اپنی تعظیم و بڑائی اور دوسرے لوگوں کی حقارت لازم آتی ہے اس لیے یہ دونوں چیزیں ہی مذموم ہیں ہاں اسلام و کفر کے امتیاز کی بناء پر ان دونوں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان و اسلام کی وجہ سے اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا جانے اور کسی کافر کو اس کے کفر کی وجہ سے حقیر و کمتر سمجھے تو یہ جائز ہے۔ "ستاروں کے ذریعہ پانی مانگنے" سے مراد یہ ہے کہ ستاروں کی تاثیر پر بارش کی امید رکھنا یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اگر فلاں ستارہ منزل میں داخل ہو جائے تو بارش ہوگی۔ اس بارے میں مسلہ یہ ہے کہ اعتقاد رکھنا کہ فلاں ستارے کے فلاں منزل میں داخل ہونے کی وجہ سے بارش ہوگی، حرام ہے بلکہ جب بارش ہو تو یہ کہنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں بارش سے سیراب کیا ہے۔ "نوحہ کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے تو اس پر واویلا کیا جائے اور میت کی اچھی خصلتیں رو رو کر اس طرح بیان کی جائے کہ ہائے وہ کتنا بہادر تھا، ہائے وہ ایسا تھا ہائے وہ ویسا تھا۔ "قطران" کو لتار کی مانند ایک دوا کا نام ہے جو سیاہ اور بدبودار ہوتی ہے اور "ابہل" درخت سے کہ جو ہوبر بھی کہا جاتا ہے نکلتی ہے اس اونٹ کے جسم پر ملتے ہیں جسے خارش ہو جاتی ہے چونکہ اس کے اندر حرارت اور گرمی زیادہ ہوتی ہے اس لیے اونٹ کی خارش کو جلا دیتی ہے اس کا ایک خاص اثر یہ بھی ہے کہ آگ کا اثر بہت جلد قبول کرتی ہے اور جلدی ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ ارشاد گرامی کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ نوحہ کرنے والی عورت اپنے برے فعل سے توبہ کئے بغیر مرگئی تو قیامت کے روز اس کے جسم پر خارش مسلمط کی جائے گی پھر اس پر قطران ملی جائے گی تاکہ اس کی خارش

میں اورزیادہ سوزش وجلن پیدا ہواور وہ زیادہ ایذاء پائے۔

مومن کی موت پرزمین وآسمان روتے ہیں

حدیث

وعن أنس قال :قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم :"ما من مؤمن إلا وله بابان: باب یصعد منه علمه وباب ینزل منه رزقه. فإذا مات بکیا علیه فذلك قوله تعالی :(فما بکت علیھم السماء والأرض) رواہ الترمذی

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" ہر مسلمان کے لیے دو دروازے ہیں ایک دروازہ تو وہ ہے جس سے اس کے نیک اعمال اوپر آجاتے ہیں اور دوسرا دروازہ وہ ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے چنانچہ جب کوئی مومن مرتا ہے تو اس کے دونوں دروازے روتے ہیں اس بات کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جاسکتا ہے کہ آیت (فما بکت علیھم السماء والارض) یعنی (کافروں) کے لیے کہ آسمان رو یا نہ زمین روئی (ترمذی)

تشریح؛

مطلب یہ ہے کہ ایک دروازہ تو وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ مومن کے نیک اعمال جو زمین پر اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاچکے ہیں آسمان پر جاتے ہیں اور پھر وہاں اعمال لکھنے کی وجہ دوبارہ اعمال نامہ میں لکھے جاتے ہیں، دوسرا دروازہ وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ رزق زمین پر

اترتا ہے اور جس کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اتنا پہنچتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی مومن مرتا ہے تو دونوں دروازے روتے ہیں کیونکہ ایک دروازہ سے تو نیک اعمال اوپر جاتے تھے اور دوسرے دروازہ سے رزق اترتا تھا کہ جو نیک اعمال کے لیے معاون ہوتا ہے اس طرح دونوں دروازے مومن کے انتقال سے اس سعادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اپنی اس محرومی پر روتے ہیں۔ اس بات کو اس آیت کریمہ سے سمجھایا گیا ہے بایں طور کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے حق میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے نہ تو آسمان رویا نہ زمین روتی ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے لیے آسمان بھی روتا ہے اور زمین بھی روتی ہے۔

مرجانے والی چھوٹی اولاد ذخیر آخرت ہوتی ہے

حدیث

وعن ابن عباس قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :
من كان له فرطان من متي أدخله الله بهما الجنة " . فقالت عائشة :فمن كان له فرط من أمتك؛ قال :"ومن كان له فرط يا موفقة " . فقالت :فمن لم يكن له فرط من أمتك؛ قال :"فأنا فرط أمتي لن يصابوا بمثلي " . رواه الترمذي وقال :هذا حديث غريب

ترجمہ؛

حضرت ابن عباس (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "میری امت میں سے جس شخص کے دو بچے بالغ ہونے سے پہلے مرگئے اللہ تعالیٰ اسے ان دونوں بچوں کی وجہ سے جنت میں داخل کرے گا" (یہ سن کر حضرت عائشہ نے پوچھا کہ اور آپ کی امت میں سے جس شخص کا ایک ہی بچہ مرا ہو؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے موفقہ

! جس شخص کا ایک بچہ مرا ہو اس کے لیے بھی یہ بشارت ہے۔ حضرت عائشہ (رض) نے پھر پوچھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں اگر جس شخص کا ایک بچہ بھی نہ مرا ہو؟ تو اس کے لیے کیا بشارت ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر میں تو اپنی امت کا میر منزل ہوں ہی کیونکہ میری (وفات کی) مصیبت جیسی کسی اور مصیبت سے دو چار نہ ہوئے ہوں گے۔ (ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح:

" فرط" اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ سے پہلے منزل پر پہنچ کر اہل قافلہ کے لیے سامان خورد و نوش تیار کرتا ہے یہاں اس حدیث میں مذکور" فرط' سے مراد وہ بچہ ہے جو بالغ ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو جائے ایسے بچہ کو" فرط" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ آخرت میں پہلے پہنچ کر اپنے والدین کے لیے جنت کی نعمتوں کا انتظام کرتا ہے یعنی وہ اپنے ماں باپ کو اللہ رب العزت سے سفارش و شفاعت کر کے جنت میں لے جائے گا۔ ہاں حدیث کے آخری جملہ فانا فرط امتی الخ میں فرط سے فوت شدہ نابالغ بچے مراد نہیں ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ کو کمال تعلق اور ان کی ذات خصوصیت نیز ان کے اوصاف فضائل کی بنا پر موفقہ کہہ کر مخاطب کیا جو مجموعہ فضل و کمال لقب ہے اس کے معنیٰ ہیں کہ اے عائشہ کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور اچھی باتوں کے پوچھنے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی امت کے میر منزل ہوں بایں طور کہ میں ان سے پہلے آخرت میں پہنچ کر شفاعت کروں گا اور ان کو جنت میں لے جاؤں گا کیونکہ ثواب مصیبت اور مشقت کے بقدر ہوتا ہے یعنی مصیبت و مشقت جتنی سخت و شدید ہوتی ہے اتنا ہی ثواب زیادہ ملتا

ہے لہٰذا اس دنیا سے میرا اٹھ جانا اس کے لیے اتنی بڑی مصیبت اور اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی، لہٰذا میرے بعد میری امت کا ہر فرد حقیقۃً اور حکماً اس حادثہ و مصیبت سے دو چار ہو گا اس لیے جن لوگوں کی چھوٹی اولاد فوت ہو کر ان کے لیے ذخیرہ آخرت نہ بھی ہوئی ہو گی تو میرے وصال کا یہ حادثہ ہی ان کے لیے مذکورہ بالا سعادت و بشارت کے طور پر کافی ہو گا۔

فوت شدہ چھوٹے بچے اپنے والدین کو جنت میں لے جائیں گے

حدیث:

وعن أبي هريرة أن رجلا قال له :مات ابن لي فوجدت عليه هل سمعت من خليلك صلوات الله عليه شيئا يطيب بأنفسنا عن موتانا؛ قال :نعم سمعته صلى الله عليه و سلم قال :"صغارهم دعاميص الجنة يلقى أحدهم أباه فيأخذ بناحية ثوبه فلا يفارقه حتى يدخله الجنة". رواه مسلم وأحمد واللفظ له

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کے بارے میں مروی ہے کہ (ایک دن) ان سے ایک شخص ملا اور کہنے لگا کہ میرا (چھوٹا) بچہ مر گیا جس کی وجہ سے میں بہت غم گین ہوں کیا آپ نے اپنے دوست یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہ ان پر اللہ کی رحمتیں اور اللہ کا سلام نازل ہو کوئی ایسی بات بھی سنی ہے جو ہمارے مردوں (یعنی فوت شدہ چھوٹے بچوں) کی طرف سے ہمارے دلوں کو خوش کر دے (یعنی جس سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے چھوٹے بچے مر گئے وہ آخرت میں ہمارے کچھ کام آئیں گے) حضرت ابوہریرہ (رض) نے فرمایا کہ ہاں! میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچے جنت

میں دریا کے جانور کی طرح ہوں گے جب ان میں کسی کا باپ اسے ملے گا تو وہ بچے اپنے باپ کے کپڑے کا کونہ پکڑ لے گا اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑے گا جب تک کہ اس باپ کو جنت میں داخل نہ کر دے گا۔ (مسلم احمد، الفاظ احمد کے ہیں)

تشریح:

"دعامیص" دعموص کی جمع ہے۔ دعموص پانی کے ایک چھوٹے سے سیاہ جانور (کیڑے) کو کہتے ہیں جو عام طور پر تالابوں میں پانی کم ہو جانے پر ظاہر ہوتا ہے نیز یہ جانور مستقل پانی میں نہیں رہتا ہے بلکہ وہ غوطہ خور ہوتا ہے یعنی غوطہ مارتا ہے اور باہر نکل آتا ہے اس جانور بعض جگہ جو لایا بھی کہا جاتا ہے۔ دعموص اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلاطین و امراء کے معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتا ہے اور ان کے قوائے فکر و عمل پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ بہر حال فوت شدہ چھوٹے بچوں کو جنت میں (دعموص) سے بایں معنیٰ تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ بچے جنت میں سیر کرتے پھرتے ہیں جن طرح دنیا میں چھوٹے بچوں سے پردہ نہیں کیا جاتا اور کسی گھر میں جانے سے نہیں روکے جاتے اور نہ انھیں کہیں جانے سے منع کیا جاتا ہے اس طرح وہ چھوٹے بچے جنت میں جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں ان کے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس حدیث میں بطور خاص باپ کا ہی ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر صرف باپ ہی کے بارے میں بات چل رہی ہوگی اس لیے اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ورنہ تو جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح چھوٹا بچہ اپنے باپ کو جنت میں لے جائے گا اسی طرح اپنی ماں کو بھی جنت میں داخل کرائے گا چنانچہ بعض حدیثوں میں ماں باپ دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

زکوۃ کا بیان

" زکوۃ کے لفظی معنی ہیں" طہارت و برکت اور بڑھنا" اصطلاح شریعت میں زکوۃ کہتے ہیں اپنے مال کی مقدار متعین کے اس حصہ کو جو شریعت نے مقرر کیا ہے کسی مستحق کو مالک بنا دینا" زکوۃ کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی دونوں کو سامنے رکھ کر یہ سمجھ لیجیے کہ یہ فعل یعنی اپنے مال کی مقدار متعین کے ایک حصہ کا کسی مستحق کو مالک بنا دینا) مال کے باقی ماندہ حصے کو پاک کر دیتا ہے اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے برکت عنایت فرمائی جاتی ہے اور اس کا وہ مال نہ صرف یہ کہ دنیا میں بڑھتا اور زیادہ ہوتا ہے بلکہ اخروی طور پر اللہ تعالیٰ اس کے ثواب میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے مالک کو گناہوں اور دیگر بری خصلتوں مثلاً بخل وغیرہ سے پاک وصاف کرتا ہے اس لیے اس فعل کو زکوۃ کہا جاتا ہے۔" زکوۃ" کو صدقہ بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ فعل اپنے مال کا ایک حصہ نکالنے والے کے دعویٰ ایمان کی صحت وصداقت پر دلیل ہوتا ہے۔ زکوۃ کب فرض ہوئی؟ صدقہ فطر ۲ ہجری میں واجب کیا گیا تھا زکوۃ کی فرضیت کے بارے میں اگر چہ علماء کے یہاں اختلافی اقوال ہیں مگر صحیح قول یہ ہے کہ زکوۃ کی فرضیت کا حکم ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوگیا تھا مگر اس حکم کا نفاذ مدینہ میں ہجرت کے دوسرے سال رمضان کی پہلی تاریخ کو ہوا ہے گویا زکوۃ یکم رمضان ۲ ہجری میں فرض قرار دی گئی اور اس کا اعلان کیا گیا۔ زکوۃ تمام امتوں پر فرض تھی اجتماعی طور پر یہ مسئلہ ہے کہ زکوۃ انبیاء کرام پر فرض و واجب نہیں ہے البتہ جس طرح سابقہ تمام امتوں پر نماز فرض تھی اسی طرح امت محمدی سے پہلے ہر امت پر زکوۃ فرض تھی ہاں زکوۃ کی مقدار اور مال کی تحدید میں اختلاف ضرور رہا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ زکوۃ کے بارے میں اسلامی شریعت کے احکام بہت آسان اور سہل ہیں جب کہ سابقہ انبیاء کی شریعتوں میں اتنی

آسانی نہیں تھی۔زکوۃ کی اہمیت اوراس کی تاکید قرآن مجید میں بتیس جگہ زکوۃ کاذکرنماز کے ساتھ فرمایا گیاہے جس سے نہ صرف یہ کہ نماز روزہ اورزکوۃ دونوں کے کمال اتصال کااظہارہوتا ہے بلکہ یہ زکوۃ کی فضیلت وتاکید کی دلیل بھی ہے پھریہ کہ قرآن کریم میں بہت سی جگہ زکوۃ کا علیحدہ بھی ذکرفرمایا گیاہے اللہ تعالیٰ نے زکوۃادا کرنے والوں کو دنیاوی واخروی اجروثواب اور سعادت ونیک بختی کے دل کش وسچے وعدوں سے سرفرازفرمایاہے اوراس کی ادائیگی سے باز رہنے والوں کو جیسے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ شاہداہل ایمان کے قلوب ان کےتصور سے بھی کانپ اٹھتے ہیں کیسے بدبخت ہیں وہ لوگ جواس اہم فریضہ کی ادائیگی سے باز رہتے ہیں اوران عذابوں کوبرداشت کرنے کے لیے تیارہوگئے ہیں۔(العیاذ باللہ) چونکہ زکوۃاسلام کاایک بڑارکن ہےاوراس کی فرضیت قطعی ہے اس لیے زکوۃ کاانکارکرنے والا کافراورزکوۃادانہ کرنے والا فاسق اورشدیدترین گناہ گارہوتاہے بلکہ علماء لکھتے ہیں کہ زکوۃنہ دینے والا اس قابل ہے کہ اسے قتل کردیاجائے(محیط السرخسی) مال پرایک سال کامل گزرجانے کے بعدصاحب نصاب پرعلی الفورزکوۃواجب ہوجاتی ہے یہاں تک کہ اس کی ادائیگی میں تاخیرگناہ گاربناتی ہے بعض حضرات نےکہاہےکہ سال پوراہوجانے پرعلی الفورزکوۃواجب نہیں ہوتی بلکہ علی التراخی واجب ہوتی ہے یہاں تک کہ موت کے وقت گناہ گارہوتاہے۔زکوۃکن لوگوں پرفرض ہے ہراس آزاد عاقل اوربالغ مسلمان پرزکوۃفرض ہے جونصاب (یعنی مال کی وہ خاص مقدارجس پرشریعت نےزکوۃفرض کی ہے) کامالک ہواورمال کامل ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہاہونیز وہ مال دین یعنی قرض اورضرورت اصلیت سے فارغ ہواورنامی (یعنی بڑھنے والا ہو) خواہ حقیقۃً خواہ تقدیراًاسی طرح مال میں اس کی ملکیت پوری طرح اورکامل ہو۔کافر،غلام دیوانے

اور نابالغ لڑکے پر زکوۃ واجب نہیں ہے اور نہ اس مالک نصاب پر زکوۃ واجب ہے جس کے نصاب پر پورا ایک سال نہ گزرا ہو، ہاں اگر کوئی شخص سال کی ابتدائی اور آخری حصوں میں مالک نصاب رہے اور درمیان مالک نصاب نہ رہے تو اسے زکوۃ ادا کرنی ہوگی کیونکہ یہ بھی پورے ایک سال ہی کے حکم میں ہوگا۔ قرض دار پر اس کے بقدر قرض مال میں زکوۃ فرض نہیں ہاں جو مال قرض سے زائد ہو اور وہ حد نصاب کو پہنچتا ہو تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ قرض زکوۃ کے لیے مانع وجوب ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، چنانچہ نذر، کفارات فطرہ اور ان جیسے دوسرے مطالبات جن کا تعلق صرف اللہ جل شانہ کی ذات سے ہے اور کسی بندے کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا زکوۃ کے لیے مانع وجوب نہیں ہیں۔ ہاں ایسے قرض جن کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ ہی سے مگر ان کے مطالبہ وصول کرنے کا حق بندوں کو پہنچتا ہے جیسے زکوۃ عشر، خراج وغیرہ کہ امام وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کا مطالبہ کرسکتا ہے تو یہ بھی زکوۃ کے لیے مانع وجوب ہیں مگر امام وقت اور حاکم مال ظاہر میں مطالبہ کرسکتا ہے مثلاً مویشی وہ مال تجارت جو شہر میں لایا جائے یا شہر سے باہر لے جایا جائے اور نقدی لیکن وہ مال جس کی تجارت صرف شہر کے اندر اندر ہی محدود ہو اس میں حاکم کا مطالبہ اور اگر بیوی مہر کا تقاضا کرتی ہو تو اس کے مہر کے بقدر مال میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ بحرالرائق میں ہے کہ معتمد مسلک یہ ہے کہ فرض زکوۃ اور صدقہ فطر کے لیے مانع وجوب ہے نیز مطلقاً قرض مانع ہے خواہ معجل ہو یا موجل، اگرچہ بیوی کا مہر موجل ہی کیوں نہ ہو جس کی مدت تاجیل طلاق یا موت پر ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مہر موجل زکوۃ کے لیے مانع وجوب نہیں ہے کیونکہ عام طور پر اس کا مطالبہ نہیں ہوا کرتا بخلاف مہر معجل کے کہ اس کا مطالبہ ہوتا ہے

مگر بعض علماء نے اس بارے میں یہ لکھا ہے کہ اگر خاوند ادائیگی مہر کا ارادہ رکھتا ہو تو مہر موجل زکوۃ کے لیے مانع وجوب ہے ورنہ نہیں کیونکہ اس کا شمار قرض میں نہیں ہوتا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد رحمہم اللہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند تونگر یعنی مالدار ہو تو وہ اپنے مہر کی وجہ سے (کہ جو اس کے خاوند کے ذمہ باقی ہے) غنیہ سمجھی جائے گی یا نہیں؟ صاحبین کا مسلک تو یہ ہے کہ ایسی عورت غنیہ معتبر ہوگی یعنی مستحق زکوۃ نہیں ہوگی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا آخری قول یہ ہے کہ وہ غنیہ معتبر نہیں ہوگی، لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ اختلاف صرف مہر معجل کے بارے میں ہے مہر موجل کی صورت میں تینوں حضرات کا متفقہ مسلک یہ ہے کہ ایسی عورت غنیہ معتبر نہیں ہوگی۔ ضرورت اصلیہ کا مطلب ضرورت اصلیہ سے مراد یہ چیزیں ہیں رہائش کا مکان، پہننے کے کپڑے خانہ داری کے اسباب سواری کی چیزیں مثلاً گھوڑا گاڑی موٹر سائیکل وغیرہ خدمت کے غلام استعمال کے ہتھیار، اہل علم کے لیے ان کی کتابیں کاریگر کے واسطے اس کے پیشہ کے اوزار وغیرہ، لہٰذا مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے کوئی مکان تجارت کی نیت سے لیا اور وہ مکان اس کی رہائش سے فارغ بھی ہو تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی اسی طرح دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے اگر مکان و غلام وغیرہ اپنی ضرورت و حاجت سے فارغ ہوں اور ان کی تجارت کی نیت نہ ہو تو پھر ان میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کامل ملکیت ابھی پہلے زکوۃ واجب ہونے کی شرائط بیان کرتے ہوئے یہ شرط بھی بیان کی گئی تھی کہ مال میں اس کی ملکیت پوری طرح اور کامل ہو۔ لہٰذا اس کامل ملکیت سے مراد یہ ہے کہ مال کا اصل مالک بھی ہو اور وہ مال اس کے قبضہ و قدرت میں بھی ہو جو مالک ملک اور قبضہ میں نہ ہو یا ملک میں ہو قبضے میں نہ ہو یا

قبضہ میں ہوتو اس پر زکوۃ فرض نہیں ۔لہٰذا مکاتب کے کمائے ہوئے مال میں زکوۃ نہیں نہ خود مکاتب پر نہ اس کے مولیٰ پر اس لیے کہ وہ مال مکاتب کی ملکیت میں نہیں گو اس کے قبضہ میں ہے اسی طرح مولیٰ کے قبضہ میں نہیں ہے گو ملک میں ہے۔اسی طرح ضمار میں بھی زکوۃ واجب نہیں ہوتی کیونکہ وہ مال ملکیت میں تو ہوتا ہے مگر قبضہ میں نہیں ہوتا۔مال ضمار اس کو کہتے ہیں جو اپنی رسائی سے باہر ہو اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں (۱) وہ مال جو جاتا رہے یعنی گم ہو جائے (۲) وہ مال جو جنگل میں دفن کر دیا گیا ہو مگر وہ جگہ کہ جہاں اسے دفن کیا گیا تھا بھول جائے (۳) وہ مال جو دریا میں غرق ہو گیا، (٤) وہ مال جسے کوئی شخص زبردستی چھین لے مگر اس کا کوئی گواہ نہ ہو (٥) وہ مال جو کسی ظالم نے ڈنڈے کے طور لے لیا۔(٦) وہ مال جو کسی نے بطور قرض لیا اور بعد میں قرض دار قرض کا منکر ہو گیا اور کوئی تمسک یا گواہی اس کی نہ ہو۔پس مال ضمار کی یہ دو قسمیں ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی مال ہاتھ لگ جائے تو اس مال میں پچھلے دنوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی ہاں اگر وہ مال ہاتھ لگ جائے جو جنگل میں بلکہ گھر میں دفن کر کے اس کی جگہ بھول گیا تھا تو جب بھی وہ مال نکلے گا اس میں پچھلے دنوں کی زکوۃ واجب ہوگی۔اسی طرح قرض کے اس مال میں بھی زکوۃ واجب ہوگی جس سے قرض دار انکار نہ کرتا ہو خواہ وہ قرض دار تونگر ہو یا مفلس اور یا اگر انکار کرتا ہو تو کوئی تمسک یا گواہی ہو یا خود قاضی یہ جانتا ہو کہ اس نے اتنا مال قرض لیا تھا لیکن اس مال میں زکوۃ اس تفصیل کے ساتھ واجب ہوگی کہ۔(۱) اگر وہ قرض مال تجارت کے بدلہ میں ہو تو جب نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہو جائے تو پچھلے دنوں زکوۃ ادا کرے (۲) اگ وہ قرض مال تجارت کے بدلہ میں نہ ہو مثلاً گھر کے پہننے کے کپڑے فروخت کئے یا خدمت کا غلام فروخت کیا یا رہائش کا مکان فروخت کیا اور ان کی قیمت خریدنے والے کے

ذمہ قرض رہی تو اس میں پچھلے دنوں کی زکوۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب وصول ہوجائے (۳) اگر قرض اس چیز کے بدلہ میں ہو جو مال نہیں ہے جیسے مہر، وصیت اور بدل خلع وغیرہ تو اس میں زکوۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب وصول ہوجائے اور اس پر پورا ایک سال گزر جائے یعنی اس میں پچھلے دنوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ صرف اسی سال کی زکوۃ واجب ہوگی جس میں کہ وہ مال پر قابض رہا لیکن یہ حکم اسی شخص کے بارے میں ہے جو پہلے سے صاحب نصاب نہ ہو اگر پہلے سے صاحب نصاب ہوگا تو یہ مال اس کے حق میں بمنزلہ مال مستفاد کے ہوگا، پہلے مال کے ساتھ اس مال کی بھی زکوۃ واجب ہوگی اور ایک سال کا گزرنا شرط نہیں ہوگا۔ ادائیگی زکوۃ کے لیے نیت شرط ہے ادائیگی زکوۃ کے لیے یہ شرط ہے کہ زکوۃ دینے والا زکوۃ دیتے وقت نیت کرے یعنی دل میں یہ ارادہ کرے کہ" میرے اوپر جس قدر مال کا دینا فرض تھا میں محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے دیتا ہوں" یا جس وقت اپنے مال میں سے زکوۃ کا حصہ نکالے اسی وقت زکوۃ کی نیت کرے کہ میں اس قدر جو زکوۃ دینے کے لیے ہے نکالتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں خیرات کردے اور زکوۃ کی نیت نہ کرے تو اس کے ذمہ زکوۃ ساقط ہوجاتی ہے یعنی اس پر زکوۃ کا مطالبہ باقی نہیں رہتا بشرطیکہ اس نے وہ مال کسی اور واجب کی نیت سے نہ دیا ہو وہاں اگر کسی شخص نے پورا مال تو نہیں بلکہ تھوڑا سا بغیر نیت زکوۃ اللہ کی راہ میں خیرات کردیا تو حضرت امام محمد (رح) کے نزدیک اس مال کی زکوۃ ادا ہوجائے گی مگر حضرت امام ابویوسف کے ہاں اس مال کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی یہی قول منقول ہے اور اسی قول پر فتویٰ بھی ہے۔ زکوۃ کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ کرنا مکروہ ہے یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ مال زکوۃ کی ادائیگی سے بچ جائے اور

اس کی صورت یہ کرے کہ جب سال پورا ہونے کو ہو تو کچھ دن پہلے اپنا مال دوسرے کو ہبہ کر کے اسے قابض کر دے اور اس طرح زکوۃ کی ادائیگی سے بچ جائے اگر چہ اس صورت سے زکوۃ تو ساقط ہو جاتی ہے مگر یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے کوئی غلام تجارت کے لیے خریدا مگر بعد میں اس سے خدمت لینے کی نیت ہوگئی تو وہ غلام تجارت کے لیے نہیں رہے گا بلکہ خدمت ہی کے لیے ہو جائے گا اس میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی غلام خدمت کی نیت سے خریدا پھر بعد میں اس نے تجارت کی نیت کر لی تو وہ غلام اس وقت تک تجارت کے حکم میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ شخص اسے فروخت نہ کرے۔ فراخگی کے بعد اس کی قیمت میں زکوۃ واجب ہو جائے گی۔ نصاب کی تعریف نصاب زکوۃ مال کی اس خاص مقدار کو کہتے ہیں جس پر شریعت نے زکوۃ فرض کی ہے اور جس مقدار سے کم مال میں زکوۃ فرض نہیں ہوتی مثلاً اونٹ کے لیے پانچ اور پچیس وغیرہ کا عدد، بکری کے لیے چالیس اور ایک اکیس وغیرہ کا عدد اور چاندی کے لیے دوسو درہم اور سونے کے لیے بیس مثقال۔ نصاب کی قسمیں نصاب کی دو قسمیں ہیں۔ نامی یعنی بڑھنے والا مال اور غیر نامی یعنی نہ بڑھنے والا مال پھر نامی کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور تقدیری حقیق کا اطلاق تو تجارت کے مال اور جانور پر ہوتا ہے کیونکہ تجارت کا مال نفع سے بڑھتا ہے اور جانور بچوں کی پیدائش سے بڑھتے ہیں۔ تقدیری کا اطلاق سونے چاندی پر ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بظاہر تو نہیں بڑھتیں لیکن بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں نصاب غیر نامی کا اطلاق مکانات اور خانہ داری کے ان اسباب پر ہوتا ہے جو ضرورت اصلیہ کے علاوہ ہوں۔ نصابی اور غیر نصابی میں فرق نصاب نامی اور غیر نامی میں فرق یہ ہے کہ نصاب نامی کے مالک پر تو زکوۃ فرض ہوتی ہے نیز اس کے لیے دوسرے زکوۃ، نذر اور صدقات واجبہ کا

مال لینا درست نہیں ہوتا اور اس کے لیے صدقہ فطر دینا اور قربانی کرنا واجب ہوتا ہے۔ نصاب غیر نامی کے مالک پر زکوۃ فرض نہیں ہوتی مگر اس کے لیے بھی زکوۃ نذر اور صدقہ واجبہ کا مال لینا درست نہیں ہوتا نیز اس پر بھی صدقہ فطر دینا اور قربانی کرنا واجب ہوتا ہے۔

زکوۃ کے بارے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام

حدیث

عن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث معاذا إلى اليمن فقال :"إنك تأتي قوما من أهل الكتاب. فادعهم إلى شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله. فإن هم أطاعوا لذلك. فأعلمهم أن الله قد فرض عليهم خمس صلوات في اليوم والليلة. فإن هم أطاعوا لذلك فأعلمهم أن الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم فترد في فقرائهم. فإن هم أطاعوا لذلك. فإياك وكرائم أموالهم واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينها وبين الله حجاب"

ترجمہ:

حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب حضرت معاذ (رض) کو (امیر یا قاضی بنا کر) یمن بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم اہل کتاب میں سے ایک قوم (یہود و نصاری) کے پاس جا رہے ہو لہٰذا (پہلے تو تم) انھیں اس بات کی گواہی دینے کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ دعوت کو قبول کرلیں تو پھر تم انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اسے مان جائیں تو پھر اس کے بعد انھیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے (یعنی ان لوگوں سے جو مالک نصاب ہوں)

لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دے دی جائے گی۔ اگر وہ اسے مان جائیں تم یہ یاد رکھنا کہ ان سے زکوۃ میں اچھا مال لینے سے پرہیز کرنا یعنی چھانٹ کر اچھا مال نہ لینا بلکہ ان کے مال کو تین حصوں میں تقسیم کرنا اچھا، برا، درمیانہ لہٰذا زکوۃ میں درمیانہ مال لینا نیز تم (زکوۃ لینے میں غیر قانونی سختی کر کے یا ان سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کر کے جو ان پر واجب نہ ہوں اور یا انھیں زبان یا ہاتھ سے ایذاء پہنچا کر) ان کی بد دعا نہ لینا کیونکہ مظلوم کی دعا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس دعا کی قبولیت کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم)

••••••

تشریح:

اگر چہ یمن میں مشرک اور ذمی کافر بھی تھے مگر چونکہ تمام اقوام میں اہل کتاب ہی کی اکثریت تھی اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ کو یمن بھیجتے ہوئے وہاں کے لوگوں میں بطور خاص اہل کتاب ہی کا ذکر فرمایا۔ اعلان جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے ابن مالک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کے مقابلہ پر اعلان جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ کفار کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو اور انھیں اللہ کے آخری دین کی طرف پہلے سے نہ بلایا گیا ہو اگر صورت حال یہ ہو کہ ان کے پاس اسلام کی دعوت پہلے سے پہنچ چکی ہو تو اب جنگ سے پہلے انھیں اسلام کی دعوت دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہوگا۔

زکوٰۃ نہ دینے پر عذاب کی تفصیل

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"ما من صاحب ذهب ولا فضة لا يؤدي منها حقها إلا إذا كان يوم القيامة صفحت له صفائح من نار فأحمي عليها في نار جهنم فيكوى بها جنبه وجبينه وظهره كلما بردت أعيدت له في يوم كان مقداره خمسين ألف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله إما إلى الجنة وإما إلى النار" قيل :يارسول الله فالإبل؟ قال :"ولا صاحب إبل لا يؤدي منها حقها ومن حقها حلبها يوم وردها إلا إذا كان يوم القيامة بطح لها بقاع قرقر أوفر ما كانت لا يفقد منها فصيلا واحدا تطؤه بأخفافها وتعضه بأفواهها كلما مر عليه أولاها رد عليه أخراها في يوم كان مقداره خمسين ألف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله إما إلى الجنة وإما إلى النار" قيل :يارسول الله فالبقر والغنم؟ قال :"ولا صاحب بقر ولا غنم لا يؤدي منها حقها إلا إذا كان يوم القيامة بطح لها بقاع قرقر لا يفقد منها شيئا ليس فيها عقصاء ولا جلحاء ولا عضباء تنطحه بقرونها وتطؤه بأظلافها كلما مر عليه أولاها رد عليه أخراها في يوم كان مقداره خمسين ألف سنة حتى يقضى بين العباد فيرى سبيله إما إلى الجنة وإما إلى النار". قيل :يارسول الله فالخيل؟ قال :"الخيل ثلاثة :هي لرجل وزر وهي لرجل ستر وهي لرجل أجر. فأما التي هي له وزر فرجل ربطها رياء وفخرا ونواء على أهل الإسلام فهي له وزر. وأما التي له ستر فرجل ربطها في سبيل الله ثم لم ينس حق الله في ظهورها ولا رقابها فهي له ستر. وأما التي هي له أجر فرجل ربطها في سبيل الله لأهل الإسلام في مرج أو روضة فما أكلت من ذلك المرج أو الروضة من شيء إلا كتب له عدد ما أكلت حسنات و كتب له عدد أرواثها وأبوالها حسنات ولا تقطع طولها فاستنت شرفا أو شرفين إلا كتب الله له عدد آثارها وأورائها حسنات ولا مر بها صاحبها على نهر فشربت منه ولا يريد أن يسقيها إلا كتب الله له عدد ما شربت حسنات" قيل :يارسول الله فالحمر؟ قال :"ما أنزل علي في الحمر شيء إلا هذه الآية الفاذة الجامعة (فمن يعمل

مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ)

الزلزلۃ. رواہ مسلم

......

ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جو شخص سونے اور چاندی (کے نصاب) کا مالک ہو اور اس کا حق یعنی زکوۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کے تختے بنائے جائیں گے (یعنی تختے تو سونے اور چاندی کے ہوں گے مگر انھیں آگ میں اس قدر گرم کیا جائے گا کہ گویا وہ آگ ہی کے تختے ہوں گے اسی لیے آپ نے آگے فرمایا کہ وہ تختے دوزخ کی آگ میں گرم کئے جائیں گے اور ان تختوں سے اس شخص کے پہلو، اس کی پیشانی اور اس کی پیٹھ داغی جائے گی پھر ان تختوں کو (اس بدن سے) جدا کیا جائے اور آگ میں گرم کر کے پھر لایا جائے گا (یعنی جب وہ تختے ٹھنڈے ہو جائیں گے تو انھیں دوبارہ گرم کرنے کے لیے آگ میں ڈالا جائے گا اور وہاں سے نکال کر اس شخص کے بدن کو داغا جائے گا) اور اس دن کی مقدار کہ جس میں یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا اور وہ شخص جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ عذاب تو نقدی یعنی سونے چاندی کے بارے میں ہوگا اونٹ کی زکوۃ نہ دینے والوں کا کیا حشر ہوگا؟ آپ نے فرمایا جو شخص اونٹ کا مالک ہو اور اس کا حق یعنی زکوۃ ادا نہ کرے اور اونٹوں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ جس روز انھیں پانی پلایا جائے ان کا دودھ دوہا جائے تو قیامت کے دن اس شخص کو اونٹوں کے سامنے ہموار میدان میں منہ کے بل اوندھا ڈال دیا جائے گا اور اس کے سارے اونٹ گنتی اور موٹاپے میں پورے

ہوں گے مالک ان میں سے ایک بچہ بھی کم نہ پائے گا یعنی اس شخص کے سب اونٹ وہاں موجود ہوں گے۔ حتیٰ کہ اونٹوں کے سب بچے بھی ان کے ساتھ ہوں گے پھر یہ کہ وہ اونت خوب فربہ اور موٹے تازے ہوں گے تاکہ اپنے مالک کو روندتے وقت خوب تکلیف پہنچائیں چنانچہ وہ اونٹ اس شخص کو اپنے پیروں سے کچلیں گے اور اپنے دانتوں سے کاٹیں گے جب ان اونٹوں کی جماعت روند کچل اور کاٹ کر چلی جائے تو دوسری جماعت آئے گی یعنی اونٹوں کی قطار روند کچل کر چلی جائے گی تو اس کے پیچھے دوسری قطار آئے گی اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا اور جس دن یہ ہوگا اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب کر دیا جائے گا اور وہ شخص جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! گائے اور بکریوں کے مالک کا کیا حل ہوگا؟ آپ نے فرمایا جو شخص گائیوں اور بکریوں کا مالک ہو اور ان کا حق یعنی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اسے ہموار میدان میں اوندھے منہ ڈال دیا جائے گا اور اس کی گایوں اور بکریوں کو وہاں لایا جائے گا جن میں سے کچھ کم نہیں ہوگا ان میں سے کسی گائے بکری کے سینگ نہ مڑے ہوں گے نہ ٹوٹے ہوں گے اور نہ وہ منڈی یعنی بلا سینگ ہوں گی یعنی ان سب کے سروں پر سینگ ہوں گے نہ ٹوٹے ہوں گے اور سالم ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے سینگوں سے خوب مار سکیں چنانچہ وہ گائیں اور بکریاں اپنے سینگوں سے اپنے مالک کو ماریں گی اور اپنے کھروں سے کچلیں گی اور جب ایک قطار اسے مار کچل کر چلی جائے گی تو دوسری قطار آئے گی اور اپنا کام شروع کر دے گی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اور جس دن یہ ہوگا اس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی یہاں تک کہ بندوں کا حساب کتاب کیا جائے گا اور وہ شخص جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا صحابہ نے عرض کیا

کہ یا رسول اللہ! گھوڑوں کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ گھوڑے جو آدمی کے لیے گناہ کا سبب ہوتے ہیں اس شخص کے گھوڑے جنہیں اس کے مالک اظہار فخر وغرور اور مال دار اور ریاء کے لیے اور مسلمانوں سے دشمنی کے واسطے باندھے چنانچہ وہ گھوڑے اپنے مالک کے لیے گناہ کا سبب بنتے ہیں اور وہ گھوڑے جو آدمی کے لیے پردہ ہوتے ہیں اس شخص کے گھوڑے ہیں جنہیں اس کے مالک نے اللہ کی راہ میں کام لینے کے لیے باندھا اور ان کی پیٹھ اور ان کی گردن کے بارے میں وہ اللہ کے حق کو نہیں بھولا چنانچہ وہ گھوڑے اپنے مالک کے لیے پردہ ہیں اور وہ گھوڑے جو آدمی کے لیے ثواب کا سبب و ذریعہ بنتے ہیں اس شخص کے گھوڑے ہیں جنہیں ان کا مالک اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے مسلمانوں کے واسطے باندھے اور چراگاہ وسبزہ میں رکھے چنانچہ جب وہ گھوڑے چراگاہ وسبزہ سے کچھ کھاتے ہیں تو جو کچھ انھوں نے کھایا یعنی گھاس وغیرہ کی تعداد کے بقدر اس کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں یہاں تک کہ ان گھوڑوں کی لید اور ان کے پیشاب کے بقدر بھی اس کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں کیونکہ لید اور پیشاب بھی گھوڑے کی زندگی کا باعث ہیں اور گھوڑے رسی توڑ کر ایک یا دو میدان دوڑتے پھرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کے نشانات اور ان کی لید جو وہ اس دوڑنے کی حالت میں کرتے ہیں کی تعداد کے برابر اس شخص کے لیے نیکیاں لکھتا ہے اور جب وہ شخص ان گھوڑوں کو نہر پر پانی پلانے کے لیے لے جاتا ہے اور وہ نہر سے پانی پیتے ہیں اگرچہ مالک کا ارادہ ان کو پانی پلانے کا نہ ہو، اللہ تعالیٰ گھوڑوں کے پانی پینے کے بقدر اس شخص کے لیے نیکیاں لکھتا ہے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اچھا گدھوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا

گدھوں کے بارے میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا لیکن تمام نیکیوں اور اعمال کے بارے میں یہ آیت جامع ہے (فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔) 99۔ الزلزلۃ 7 :۔ 8) یعنی جو شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کا عمل کرے گا اسے دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرہ کے برابر برائی کا عمل کرے گا اسے دیکھے گا۔ (یعنی مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو نیک کام کے لیے جانے کے واسطے اپنا گدھا دے گا تو ثواب پائے گا اور اگر برے کام کے لیے دے گا تو گناہ گار ہوگا) مسلم۔

تشریح:

قیامت کے دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر بتائی گئی ہے لیکن اس کا تعلق کافروں کے ساتھ ہے یعنی قیامت کا دن کافروں کو پچاس ہزار سال کے بقدر دراز معلوم ہوگا بقیہ گناہ گاروں کو ان کے گناہ کے بقدر دراز محسوس ہوگا اگر کسی کے گناہ کم اور ہلکے ہوں گے تو اسے وہ دن اسی اعتبار سے کم دراز محسوس ہوگا اور اگر کسی کے گناہ زیادہ اور شدید نوعیت کے ہوں گے تو اسے وہ دن بھی اس کی اعتبار سے دراز محسوس ہوگا یہاں تک کہ اللہ کے نیک بندوں یعنی مومنین و کاملین کو وہ پورا دن صرف دو رکعت نماز کے بقدر معلوم ہوگا گویا جتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے انھیں وہ دن صرف اتنے عرصہ کے بقدر محسوس ہوگا۔ فیری سبیلہ اما الی الجنۃ الخ اور وہ جنت یا دوزخ کی طرف اپنی راہ دیکھے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص کے نامہ اعمال میں اس ترک زکوۃ کے گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہیں ہوگا اور مذکورہ عذاب کہ جس میں اسے مبتلا کیا جائے گا اس کے اس گناہ کو دور کر دے گا تو اس کے بعد وہ جنت میں چلا جائے گا اور اللہ نخواستہ اگر اس کا نامہ اعمال میں ترک زکوۃ کے علاوہ اور گناہ بھی ہوں گے یا یہ کہ مذکورہ عذاب کے بعد بھی ترک زکوۃ

کا گناہ اس سے دور نہیں ہوگا تو پھر وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔حتی یقضی بین العباد میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں دوسری مخلوق اللہ تو حساب کتاب میں مشغول ہوگی مگر وہ لوگ جنہوں نے زکوۃ ادا نہیں کی تھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ومن حقہا حلبہا یوم وردہا اونٹوں کا ایک حق یہ بھی ہے الخ۔اونٹ والوں کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اونٹوں کو تیسرے دن یا چوتھے دن پانی کی جگہ پانی پلانے لے جاتے ہیں چنانچہ عرب میں ایک یہ معمول بھی تھا کہ جس جگہ پانی پلانے کے لیے اونٹ لائے جاتے تھے وہاں لوگ جمع ہو جاتے تھے اونٹ والے اپنے اونٹوں کو وہاں پانی پلانے لاتے اور وہیں اونٹوں کا دودھ نکال کر وہاں جمع لوگوں کو پلا دیا کرتے چنانچہ اس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ اگرچہ اونٹوں کا واجب حق تو صرف یہی ہے کہ ان کی زکوۃ ادا کی جائے مگر ان کے اور دوسرے حقوق میں سے ایک مستحب حق یہ بھی ہے کہ جس دن اونٹ پانی پینے جائیں اس دن کا دودھ وہ غرباء و مساکین کو پلایا جائے لہٰذا یہ فعل اگرچہ مستحب ہے لیکن از راہ مروت و ہمدردی اور بربنائے ادائے شکر حق گویا واجب کا حکم رکھتا ہے اسی لیے اس کے بارے میں اتنی اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا چنانچہ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حق کی عدم ادائیگی کی صورت میں عذاب بھی ہوسکتا ہے۔ولا یرید ان یسقیہا (اگرچہ مالک کا ارادہ ان کو پانی پلانے کا نہ ہو) مطلب یہ ہے کہ مالک گھوڑے کو پانی پلانے کا ارادہ نہ رکھے بلکہ اس کے ارادہ و قصد کے بغیر گھوڑا پانی پیے تو اس کے بارے میں مذکورہ ثواب بیان کی گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر مالک خود ارادہ و قصد کر کے گھوڑے کو پانی پلائے گا تو اس کا کیا کچھ ثواب اسے ملے گا گھوڑوں کے بارے میں صحابہ کے سوال پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو جواب دیا اس کا اسلوب

پہلے جوابات کے اسلوب سے مختلف ہے اس موقعہ پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب کا جو اسلوب اختیار فرمایا ہے اسے جواب علی اسلوب الحکیم کہتے ہیں گویا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سوال کرنے والے صحابہ سے فرمایا کہ گھوڑوں کا جو حق واجب ہے یعنی زکوۃ وغیرہ صرف اس کے بارے میں مت پوچھو کہ ان گھوڑوں کی وجہ سے ان کے پالنے والے سعادت ونیک بختی اور بھلائی کے کیسے کیسے مقام حاصل کرتے ہیں اور انھیں ان گھوڑوں سے کیا نفع پہنچتا ہے اسی طرح دوسرا پہلو بھی کہ ان پالنے والوں کو کیسے کیسے گناہ ملتے ہیں اور انھیں کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اسی بنیاد پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (۱) وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لیے گناہ کا سبب ہوتے ہیں اس کی تشریح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جنہیں ان کے مالک نے اظہار فخر اور ریاء کے لیے باندھ رکھا ہو یعنی گھوڑے رکھنے سے اس کی غرض صرف یہ ہو کہ لوگ باگ اس کی حشمت وثروت دیکھیں اور جانیں کہ یہ مجاہد ہے حالانکہ واقعہ میں وہ مجاہد نہیں ہے نیز فخر یہی مراد ہے کہ وہ گھوڑا اس نیت سے پالے کہ میں اپنے سے کمتر لوگوں پر اپنی بڑائی جتاؤں اور ان کے سامنے فخر کا اظہار کروں (۲) وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لیے پردہ ہوتے ہیں اس کی وضاحت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جنہیں ان کے مالک نے اس لیے باندھا ہے تاکہ وہ اللہ کی راہ میں کام آئیں یہاں اللہ کی راہ سے مراد جہاد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ گھوڑوں کو رکھنے اور باندھنے کا مقصد اظہار فخر وغرور اور ریاء نہ ہو بلکہ انھیں اچھی ونیک نیت سے رکھے مثلاً گھوڑے اس مقصد کے لیے پالے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمان برداری اور اچھے ونیک مقاصد کے لیے کام آئیں یا ان سے اپنی سواری مقصود

ہو کہ اپنی مشروع و مباح ضرورتوں کے وقت ان پر سوار ہو سکے نیز یہ کہ اپنے فقر و احتیاج کی
پردہ پوشی کرے جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا ہے کہ ربطھا تغنیا وتعففا یعنی دوسروں سے مستغنی
رہنے اور دوسروں کے آگے اپنی احتیاج و ضرورت کے اظہار سے بچنے کے لیے گھوڑا رکھنا
چاہیے مثلاً تجارتی مقصد کے لیے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے یہاں جانے کے لیے
کھیت کھلیان میں آنے جانے کے واسطے یا اسی قسم کے دوسرے مقاصد کے وقت اگر
گھوڑے کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے کی طرف دیکھنا نہ پڑے بلکہ اپنا گھوڑا ہو تو وہ کام آئے
اور غیروں کے آگے اظہار ضرورت کی شرمندگی سے بچائے۔ اسی لیے اس موقع پر آنحضرت
(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑے کو اپنے مالک کے لیے پردہ قرار دیا ہے کہ ایک طرف تو
گھوڑا اپنے مالک کے فقر و احتیاج کے لیے پردہ پوش ہوتا ہے بایں طور کہ گھوڑے کی وجہ
سے دوسروں کی نظروں میں اس کے مالک کا وقار اور برہم قائم رہتا ہے اور اس کی عزت بنی
رہتی ہے۔ دوسری طرف گھوڑی کا مالک اپنی ضرورت و حاجت کے وقت کسی دوسرے شخص
کے آگے اظہار حاجت اور دس سوال دراز کرنے سے بچا رہتا ہے۔ اس موقع پر اللہ کے راستہ
سے یہ مفہوم اس لیے مراد لیا گیا ہے تا کہ ایک ہی عبارت میں تکرار لازم نہ آئے کیونکہ تیسری قسم
کے ضمن میں مذکورہ اللہ کے راستہ سے مراد جہاد ہی ہے۔ اسی ضمن میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم) نے گھوڑے کے مالک کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کی پیٹھ اور ان کی
گردن کے بارے میں وہ اللہ کے حق کو نہیں بھولا۔ چنانچہ اس ارشاد گرامی میں پیٹھ کے
بارے میں اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس گھوڑے پر اچھے اور نیک کاموں کی خاطر سوار ہوا اور اگر کسی
نے اس سے اپنی سواری کے لیے یا گھوڑیوں پر چھوڑنے کے لیے اس کا گھوڑا مانگا تو اس

نے اس کی ضرورت پوری کی۔اسی طرح گردن کے بارے میں حق یہ ہے کہ ان کی زکوۃ ادا کی۔
مگر حضرات شوافع کی طرف سے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مالک نے
اپنے گھوڑے کی خبر گیری کی بایں طور کہ ان کے گھاس دانہ میں کوئی کمی نہیں کی انھیں ان کی
پوری خوراک مہیا کی اور انھیں اگر کوئی مرض لاحق ہو یا کوئی تکلیف ہوئی تو اسے فوراً دور کیا۔
گھوڑوں میں زکوۃ ہے یا نہیں؟ دراصل اس عبارت کے مفہوم کے تعین میں یہ اختلاف اس
لیے واقع ہوا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان گھوڑوں میں زکوۃ واجب ہوتی ہے جو
جنگل میں چرتے ہیں پھر گھوڑے کا مالک اس بارے میں مختار ہے کہ چاہے تو وہ ان کی زکوۃ
میں ہر گھوڑے پیچھے ایک دینار دے چاہے ان کی قیمت متعین کر کے ہر دوسو درہم میں سے
پانچ درہم زکوۃ ادا کرے جیسا کہ زکوۃ کا حساب ہے۔حضرت امام شافعی اور صاحبین کے ہاں
گھوڑوں میں زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔ان حضرات کی دلیل آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
کا ارشاد گرامی ہے کہ مسلمانوں پر ان کے گھوڑے اور غلام میں صدقہ واجب نہیں ہے۔حضرت
امام ابوحنیفہ کی طرف سے دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ ہر گھوڑے پیچھے کہ جو
جنگل میں چرے ایک دینار ہے۔جہاں تک تعین قیمت پر زکوۃ کا تعلق ہے اس کے بارے
میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمر فاروق سے منقول ہے حضرت شافعی بطور دلیل جو حدیث پیش
کرتے ہیں اس کے بارے میں حضرت امام اعظم کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق غازی
ومجاہد کے گھوڑے سے ہے اسی طرح غلام سے مراد غلام ہے جو خدمت کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔
(۳) وہ گھوڑے جو اپنے مالک کے لیے ثواب کا ذریعہ بنتے ہیں اس کی تشریح آپ نے یہ
فرمائی کہ اس سے وہ گھوڑے مراد ہیں جسے اس کے مالک نے مسلمانوں کے لیے اللہ کی راہ

میں باندھا ہے یہاں اللہ کے راستہ سے مراد جہاد ہی ہے یعنی اس نے اس مقصد کے لیے گھوڑے پال رکھے ہیں تاکہ جب جہاد کا وقت آئے تو اس پر سوار ہو کر دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہو یا بوقت ضرورت دوسرے مسلمانوں کو دے تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر جہاد کریں۔

زکوۃ دینے والوں کے لیے رسول ﷺ کی دعائے رحمت

حدیث:

وعن عبد الله بن أبي أوفى رضي الله عنهما قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا أتاه قوم بصدقتهم قال: "اللهم صل على آل فلان". فأتاه أبي بصدقته فقال: "اللهم صل على آل أبي أوفى" وفي رواية: "إذا أتى الرجل النبي بصدقته قال: "اللهم صل عليه"

ترجمہ:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ (رض) کہتے ہیں کہ جب کوئی جماعت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنی زکوۃ لے کر آتی تاکہ آپ انہیں مستحقین میں تقسیم فرمادیں تو فرماتے اللہم صل علی الی فلاں اے اللہ! فلاں شخص کے خاندان پر رحمت نازل فرما چنانچہ جب میرے والد مکرم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنی زکوۃ لے کر حاضر ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہم صلی علی آل ابی اوفیٰ اے اللہ! اوفیٰ کے خاندان پر رحمت نازل فرما (بخاری ومسلم) ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کوئی شخص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں اپنی زکوۃ لے کر حاضر ہوتا تو آپ فرماتے کہ اے اللہ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرما۔ تشریح کسی شخص کے بارے میں تنہا اس کے لیے لفظ صلوۃ کے ساتھ دعا کرنا یعنی اس طرح کہنا کہ اللہم صل علی آل فلاں درست نہیں ہے لفظ صلوۃ کے ساتھ دعا صرف

انبیاء کرام کے لیے مخصوص ہے ہاں اگر کسی شخص کو انبیاء کے ساتھ متعلق کر کے لفظ صلوۃ کے ساتھ دعا کی جائے تو درست ہے جہاں تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کا تعلق ہے کہ آپ زکوۃ لانے والوں کے لیے لفظ صلوۃ کے ساتھ دعائے رحمت کرتے تھے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خصائص میں سے ہے کسی اور کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔

جن لوگوں کو سول کرنا جائز ہے اور جن کو جائز نہیں

حدیث؛

عن قبيصة بن مخارق الهلالي قال: تحملت حمالة فأتيت رسول الله صلى الله عليه و سلم أسأله فيها . فقال: "أقم حتى تأتينا الصدقة فنأمر لك بها" . قال ثم قال: "يا قبيصة إن المسألة لا تحل إلا لأحد ثلاثة رجل تحمل حمالة فحلت له المسألة حتى يصيبها ثم يمسك ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش أو قال سدادا من عيش ورجل أصابته فاقة حتى يقوم ثلاثة من ذوي الحجى من قومه. لقد أصابت فلانا فاقة فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش أو قال سدادا من عيش فما سواهن من المسألة يا قبيصة سحتا يأكلها صاحبها سحتا" . رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت قبیصہ بن مخارق (رض) کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے قرضہ کی ضمانت لی جو دیت کی وجہ سے تھا چنانچہ میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ادائیگی قرض کے لیے کچھ رقم یا مال کا سول کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ کچھ دن ٹھہرے رہو، جب ہمارے پاس زکوۃ کا مال آئے گا تو اس میں

سے تمہیں دینے کے لیے کہہ دیں گے۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قبیصہ! صرف تین طرح کے لوگوں کے لیے سوال کرنا جائز ہے ایک تو اس شخص کے لیے جو کسی کے قرض کا ضامن بن گیا ہو بشرطیکہ مانگنے میں مبالغہ نہ کرے بلکہ اتنے ہی مال یا رقم کا سوال کرے کہ اس سے قرضہ کو ادا کر دے اور اس کے بعد پھر نہ مانگے، دوسرے اس شخص کے لیے جو کسی آفت و مصیبت مثلاً قحط و سیلاب وغیرہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کا تمام مال ہلاک و ضائع ہو جائے، چنانچہ اس کو صرف اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی غذا و لباس کی ضرورت پوری ہو جائے یا فرمایا کہ اس قدر مانگے کہ اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اس کی زندگی کے لیے سہارا ہو جائے، تیسرے اس شخص کے لیے جو غنی ہو مگر اس کو کوئی ایسی سخت حاجت پیش آ گئی ہے جسے اہل محلہ بھی جانتے ہوں مثلاً گھر کا تمام مال و اسباب چوری ہو جائے یا اور کسی مصیب و حادثے سے دوچار ہونے کے وجہ سے ضرورت مند بن جائے اور قوم محلہ و بستی کے تین صاحب عقل و فراست لوگ اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اسے سخت حاجت پیش آ گئی ہے تو اس کے لیے اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یا فرمایا کہ اس کی وجہ سے اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اس کی زندگی کا سہارا ہو جائے۔ قبیصہ! ان تین کے علاوہ کسی اور کو سوال کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص ان تین مجبوریوں کے علاوہ دست سوال دراز کر کے کسی سے کچھ لے کر کھاتا ہے تو وہ حرام کھاتا ہے۔ (مسلم)

تشریح:

"حمالہ" اس مال کو کہتے ہیں جو کسی شخص پر دیت کے طور پر کچھ لوگوں کو دینا ضروری ہو اور کوئی دوسرا شخص اس مال کی عدم ادائیگی کی بناء پر آپس کے لڑائی جھگڑے کو نمٹانے کے لیے

درمیان میں پڑ جائے اور وہ مال اپنے ذمہ لے لے اور اس کی وجہ سے قرض دار ہو جائے۔
حدیث کے آخر میں تین صاحب عقل وفراست لوگوں کی شہادت کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ احتیاج و ضرورت کے واقعی اور حقیقی ہونے کے لیے بطور مبالغہ ہے نیز اس بات کا احساس پیدا کرنے کے لیے کہ لوگ دست سوال دراز کرنے کو آسان نہ سمجھیں اور اس برے فعل سے بچتے رہیں۔

فائدہ:

علماء لکھتے ہیں کہ جس شخص کے پاس ایک دن کے بقدر بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر کپڑا ہو تو اسے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بغیر ضرورت وحاجت مانگنا حرام ہے ہاں جس شخص کے پاس ایک دن کی بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر بھی کپڑا نہ ہو تو اس کے لیے دست سوال دراز کرنا حلال ہے جو محتاج وفقیر ایک دن کی غذا کا مالک ہو اور وہ کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے لیے زکوۃ لینا تو حلال ہے مگر لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا حرام ہے جس مسکین ومحتاج کو ایک دن کی غذا بھی میسر نہ ہو اور وہ کمانے کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے سوال کرنا حلال ہے۔ نووی (رح) نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بغیر ضرورت و احتیاج لوگوں سے مانگنا ممنوع ہے البتہ جو شخص کمانے کی قدرت رکھتا ہو اس کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ زیادہ صحیح قول تو یہ ہے کہ ایسے شخص کہ جو کما کر اپنا گزارہ کر سکتا ہو لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا حرام ہے لیکن بعض حضرات مکروہ کہتے ہیں وہ بھی تین شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ دست سوال دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ ہونے دے، دوم الحاح یعنی مانگنے میں مبالغہ سے کام نہ لے، سوم یہ کہ جس شخص کے آگے دست سوال دراز کر رہا ہے اسے تکلیف وایذاء نہ پہنچائے اگر ان تین شرطوں میں سے

ایک بھی پوری نہ ہو تو پھر سوال کرنا بالاتفاق حرام ہوگا۔ ابن مبارک (رح) سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا جو سائل "لوجہ اللہ" کہہ کر سوال کرے تو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اسے کچھ دیا جائے کیونکہ دنیا اور دنیا کی چیزیں کمتر و حقیر ہیں، جب اس نے دنیا کی کسی چیز کے لیے لوجہ اللہ کہہ کر سوال کیا تو گویا اس نے اس چیز (یعنی دنیا) کی تعظیم و توقیر کی جسے اللہ تعالیٰ نے کمتر و حقیر قرار دیا ہے لہٰذا ایسے شخص کو از راہ زجر و تنبیہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کوئی شخص یہ کہہ کر سوال کرے کہ بحق اللہ یا بحق محمد دو، تو اسے کچھ دینا واجب نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اپنی کوئی غلط اور جھوٹی حاجت و ضرورت ظاہر کر کے کسی سے کوئی چیز لے تو وہ اس چیز کا مالک نہیں ہوتا (گویا وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے) اسی طرح کوئی شخص کسی سے یہ کہے کہ میں سید ہوں اور مجھے فلاں چیز کی یا اتنے روپیہ کی ضرورت ہے اور وہ شخص سائل کو سید سمجھ کر اس کا سوال پورا کر دے مگر حقیقت میں وہ سید نہ ہو تو وہ بھی اس مانگی ہوئی چیز کا مالک نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص کسی سائل کو نیک بخت صالح سمجھ کر کوئی چیز دے دے حالانکہ وہ سائل باطنی طور پر ایسا گناہ گار ہے کہ اگر دینے والے کو اس کے گناہ کا پتہ چل جاتا تو اسے وہ چیز نہ دیتا تو اس صورت میں سائل اس چیز کا مالک نہیں ہوتا وہ چیز اس کے لیے حرام ہے اور اس چیز کو اس کے مالک کو واپس کر دینا اس پر واجب ہوگا اگر کوئی شخص کسی کو اس کی بدزبانی یا اس کی چغل خوری کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے کوئی چیز دے تو وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔ اگر کوئی فقیر کسی شخص کے پاس مانگنے کے لیے آئے اور وہ اس کے ہاتھ پیر چومے تاکہ وہ اس کی وجہ سے اس کا سوال پورا کر دے تو یہ مکروہ ہے بلکہ اس شخص کو چاہیے کہ وہ فقیر کو ہاتھ پیر نہ چومنے دے۔ ان سائل اور فقیروں کو کچھ بھی نہ دینا

چاہیے جو نقارہ، ڈھول یا ہارمونیم وغیرہ بجاتے ہوئے دروازوں پر مانگتے پھرتے ہیں اور مطرب یعنی ڈوم تو سب سے بدتر ہے۔

جو چیز بغیر طمع وحرص کے ملے اسے قبول کرنا چاہیے

حدیث؛

وعن عمر بن الخطاب قال :كان النبی صلی الله علیه وسلم یعطینی العطاء فأقول: أعطه أفقر إلیه منی. فقال :"خذه فتموله وتصدق به فما جاءك من هذا المال وأنت غیر مشرف ولا سائل فخذه. وما لا فلا تتبعه نفسك"

ترجمہ؛

حضرت عمر بن خطاب (رض) کہتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے زکوۃ وصول کرنے کی اجرت عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ یہ اس شخص کو دے دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے جواب میں فرماتے کہ اگر تمہیں حاجت و ضرورت ہو تو اسے لے کر اپنے مال میں شامل کرلو اور اگر حاجت وضرورت سے زیادہ ہو تو خود اللہ کی راہ میں خیرات کردو نیز یہ بھی فرماتے کہ جو چیز تمہیں بغیر طمع وحرص کے اور بغیر مانگے حاصل ہو اسے قبول کرلو اور جو چیز اس طرح یعنی بغیر طمع وحرص اور بغیر سوال کے ہاتھ نہ لگے تو اس کے پیچھے مت پڑو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح؛

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بغیر طمع وحرص اور بغیر مانگے حاصل نہ ہو اس کو

حاصل کرنے کے لیے طمع نہ کرو اور نہ اس کے لیے منتظر رہو جیسا کہ کہہ دیا جاتا ہے کہ لا ردولا کد۔
ایک دوسری حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بغیر طمع و حرص کے حاصل ہو اور وہ اسے واپس کر دے تو گویا اس نے اس چیز کو اللہ کو واپس کر دیا یعنی اللہ کی ایک نعمت کو ٹھکرا دیا۔

ایک سبق آموز واقعہ :

منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام احمد (رح) بازار گئے اور وہاں سے انھوں نے کچھ سامان خریدا جسے بنان جلال اٹھا کر احمد کے ساتھ ان کے گھر لائے جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں روٹیاں ٹھنڈی ہونے کے لیے کھلی ہوئی رکھی تھیں، حضرت امام نے اپنے صاجزادے کو حکم دیا کہ ایک روٹی بنان کو دے دیں، صاجزادے نے جب بنان کو روٹی دی تو انھوں نے انکار کر دیا بنان جب گھر سے باہر نکل گئے اور واپس چل دیئے تو امام احمد نے صاجزادے سے کہا کہ اب ان کے پاس جاؤ اور انھیں روٹی دے دو صاجزادے نے باہر جا کر بنان کو روٹی دی تو انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔ انھیں بڑا تعجب ہوا کہ پہلے تو روٹی لینے سے صاف انکار کر دیا اور اب فوراً قبول کر لیا آخر یہ ماجرا کیا ہے! انھوں نے حضرت امام احمد سے اس کا سبب پوچھا تو امام صاحب نے فرمایا کہ بنان جب گھر میں داخل ہوئے تو انھوں نے کھانے کی ایک عمدہ چیز دیکھی بتقاضائے طبیعت بشری انھیں اس کی خواہش ہوئی اور دل میں اس کی طمع پیدا ہو گئی اس لیے جب تم نے انھیں روٹی دی تو انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی طمع و خواہش کے تابع بن جائیں انھوں نے روٹی لینے سے انکار کر دیا مگر جب وہ باہر چلے گئے اور روٹی سے قطع نظر کر کے اپنا راستہ پکڑا اور پھر تم نے جا کر وہ روٹی دی تو اب چونکہ وہ روٹی انھیں بغیر طمع و خواہش اور غیر متوقع طریق پر حاصل ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا انتہائی محتاجگی کے وقت جائز ہے۔

حدیث؛

وعن أنس بن مالك :أن رجلا من الأنصار أتى النبي صلى الله عليه وسلم يسأله فقال :"أما في بيتك شيء؟" قال بلى حلس نلبس بعضه ونبسط بعضه وقعب نشرب فيه من الماء. قال :"ائتني بهما" قال فأتاه بهما فأخذهما رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده وقال :"من يشتري هذين؟" قال رجل أنا آخذهما بدرهم قال :"من يزيد على درهم؟" مرتين أو ثلاثا قال رجل أنا آخذهما بدرهمين فأعطاهما إياه وأخذ الدرهمين فأعطاهما الأنصاري وقال :"اشتر بأحدهما طعاما فانبذه إلى أهلك واشتر بالآخر قدوما فأتني به". فأتاه به فشد فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم عودا بيده ثم قال له اذهب فاحتطب وبع ولا أرينك خمسة عشر يوما". فذهب الرجل يحتطب ويبيع فجاء وقد أصاب عشرة دراهم فاشترى ببعضها ثوبا وببعضها طعاما فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"هذا خير لك من أن تجيء المسألة نكتة في وجهك يوم القيامة إن المسألة لا تصلح إلا لثلاثة لذي فقر مدقع أو لذي غرم مفظع أو لذي دم موجع". رواه أبو داود وروى ابن ماجه إلى قوله :"يوم القيامة"

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن انصار میں سے ایک شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آیا اور کسی چیز کا سوال کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا کہ کیا تمہارے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ صرف ایک موٹی سی کملی ہے جس میں سے کچھ حصہ اوڑھتا ہوں اور کچھ حصہ بچھا لیتا ہوں اس کے علاوہ ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان دونوں چیزوں کو لے آؤ۔ وہ دونوں

چیزیں لے کر حاضر ہوا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دونوں چیزیں اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ ان چیزوں کو کون خریدتا ہے ایک شخص نے کہا کہ میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم میں خریدنے کے لیے تیار ہوں ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان چیزوں کو ایک درہم سے زیادہ میں کون خریدنے والا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دو یا تین بار فرمایا ایک شخص نے کہا کہ میں ان چیزوں کو دو درہم میں خریدتا ہوں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دیں اور اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دیئے اور اس سے فرمایا کہ اس میں سے ایک درہم کا کھانے کا سامان خرید کر اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ وہ شخص کلہاڑی خرید کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لایا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کلہاڑی میں اپنے دس مبارک سے ایک مضبوط لکڑی لگا دی اور پھر اس سے فرمایا کہ اسے لے کر جاؤ لکڑیاں کاٹ کر جمع کرو اور انھیں فروخت کرو، اب اس کے بعد میں تمہیں پندرہ دن تک یہاں نہ دیکھوں یعنی اب یہاں نہ رہو جا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور محنت کرو چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں جمع کر کر کے فروخت کرنے لگا کچھ دنوں کے بعد جب وہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آیا تو کہاں وہ پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مانگنے آیا تھا درہم اب وہ دس درہم کا مالک تھا، اس نے ان درہموں میں سے کچھ کا کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ خرید لیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی حالت کی اس تبدیلی کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ صورتحال تمہارے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس چیز کے کہ کل قیامت کے دن تم اس حالت میں آؤ کہ تمہارے سوال تمہارے منہ پر برے نشان یعنی زخم کی صورت میں ہو اور یہ یاد رکھو کہ صرف تین طرح کے لوگوں

کو سوال کرنا مناسب ہے ایک تو اس محتاج کے لیے کہ جس کو مفلسی نے زمین پر گرا دیا ہو دوسرے اس قرض دار کے لیے جو بھاری اور عدم ادائیگی کی صورت میں ذلیل کرنے والے قرض کے بوجھ سے دبا ہو اور تیسرے صاحب خون کے لیے جو درد پہنچائے یعنی اس شخص کے لیے جس پر دیت واجب ہو خواہ اس نے خود کسی ناحق خون کیا ہو اور اس کا خون بہا اس کے ذمہ ہو یا کسی دوسرے شخص نے کوئی خون کر دیا ہو اور اس کی دیت اس نے اپنے ذمہ لی ہو مگر اس کی ادائیگی کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی جائز ہے کہ اس خون بہا کے بقدر کسی سے مانگ کر ادائیگی کر دے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اس روایت کو یوم القیامۃ تک نقل کیا ہے۔

صرف اللہ سے اپنی حاجت بیان کرنی چاہیے

حدیث:

وعن ابن مسعود قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"من أصابته فاقة فأنزلها بالناس لم تسد فاقته .ومن أنزلها بالله أوشك الله له بالغنى إما بموت عاجل أو غنى آجل". رواه أبو داود والترمذي

ترجمہ:

حضرت ابن مسعود (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ جو شخص فاقہ یعنی سخت حاجت سے دوچار ہو اور اس کو لوگوں کے سامنے بطور شکایت بیان کر کے ان سے حاجت روائی کی خواہش کرے تو اس کی حاجت پوری نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے صرف اللہ سے اپنی حاجت کو بیان کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ اور اطمینان عطا فرمائے گا بایں طور کہ

اسے جلد ہی یا تو موت سے ہمکنا کر دے تا کہ وہ دنیا کی مشقتوں اور تکلیفوں سے نجات پا کر رحمت الٰہی سے ہمکنار ہو یا اسے کچھ دنوں میں مالدار بنا دے گا تا کہ وہ اپنی حاجت پوری کر کے اطمینان محسوس کرے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح:

حدیث کے آخری جملے اوغنی جل میں لفظا جل مصابیح کے اکثر نسخوں اور جامع الاصول میں عین سے یعنی عاجل مرقوم ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ و اطمینان عطا فرمائے گا بایں طور کہ اسے جلد ہی دولت مند و مالدار بنا دے گا۔ مگر خود جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ و اطمینان عطا فرمائے بایں طور کہ اسے جلد ہی دولت مند و مالدار بنا دے گا مگر خود سنن ابوداؤد اور ترمذی میں کہ جہاں سے یہ روایت نقل کی گئی ہے یہ لفظا جل ہے ہے اور صحیح بھی یہی ہے چنانچہ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔

سخت ضرورت کے وقت نیک لوگوں سے سوال کرو:

حدیث:

عن ابن الفراسی أن الفراسی قال :قلت لرسول الله صلى الله عليه وسلم أسأل يا رسول الله؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم :"لا وإن كنت لا بد فسل الصالحين".
رواه أبو داود والنسائي

ترجمہ:

حضرت ابن فراسی (رح) کہتے ہیں کہ میرے والد مکرم حضرت فراسی (رض) نے کہا کہ میں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا

میں لوگوں سے مانگ سکتا ہوں؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ نہیں بلکہ ہر حالت میں خدا ہی پر بھروسہ رکھو ہاں اگر کسی شدید ضرورت اور سخت حاجت کی وجہ سے مانگنا ضروری ہے تو پھر نیک بختوں سے مانگو۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح:

ضرورت وحاجت کے وقت نیک بختوں سے مانگنے کے لیے اس لیے فرمایا جارہا ہے کہ ان کے پاس حلال مال ہوتا ہے وہ بردبار اور مہربان ہوتے ہیں مانگنے والوں کی پردہ دری نہیں کرتے اور ان کے ناموں کو اچھالتے نہیں یہی وجہ ہے کہ بغداد کے فقراء ومساکین اپنی ضرورت واحتیاج کے وقت حضرت امام احمد بن حنبل ہی کے دروازے پر جاتے تھے اور ان سے اپنی ضرورت وحاجت بیان کرتے تھے۔ حضرت امام موصوف (رح) کے تقویٰ واحتیاط کا کیا عالم تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے گھر والوں کو خمیر کی ضرورت ہوئی جسے انھوں نے حضرت امام احمد کے صاجزادے ہی کے گھر سے منگوالیا، حضرت امام احمد کے صاجزادے قاضی کے عہدہ پر فائز تھے اور ان کی سعادت وبھلائی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے ہی کے پاس سوتے تھے تاکہ کوئی محتاج وضرورت مند واپس نہ ہوجائے بہرحال امام احمد کے گھر والوں نے اس خمیر سے روٹی پکائی اور جب حضرت امام موصوف کے سامنے کھانا آیا تو انھیں بذریعہ کشف روٹی کے بارے میں کوئی شبہ گزرا انھوں نے گھر والوں سے پوچھا تو انھوں نے صورتحال بتائی، حضرت امام موصوف نے کھانا کھانے سے انکار کردیا ان کی وجہ سے گھر والوں نے بھی نہیں کھایا اور پوچھا کہ یہ کھانا فقراء کو دے دیا جائے، انھوں نے فرمایا کہ دے دو مگر اس شرط کے ساتھ کہ انھیں بھی صورتحال سے مطلع کردینا چنانچہ

فقراء نے بھی اسے لینے سے انکار کر دیا آخر کار گھر والوں نے پورے گھر کا کھانا امام موصوف کی اجازت کے بغیر ہی دریا میں ڈال دیا۔

ادائیگی شکر کا اجر اور ناشکری کی سزا

حدیث:

وعن أبي هريرة أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول :"إن ثلاثة في بني إسرائيل أبرص وأقرع وأعمى فأراد الله أن يبتليهم فبعث إليهم ملكا فأتى الأبرص فقال أي شيء أحب إليك قال لون حسن وجلد حسن ويذهب عني الذي قد قذرني الناس" قال :" فمسحه فذهب عنه قذره وأعطي لونا حسنا وجلدا حسنا قال فأي المال أحب إليك قال الإبل-أو قال البقر شك إسحق-إلا أن الأبرص أو الأقرع قال أحدهما الإبل وقال الآخر البقر قال فأعطي ناقة عشراء فقال بارك الله لك فيها" قال :"فأتى الأقرع فقال أي شيء أحب إليك قال شعر حسن ويذهب عني هذا الذي قد قذرني الناس". قال :"فمسحه فذهب عنه وأعطي شعرا حسنا قال فأي المال أحب إليك قال البقر فأعطي بقرة حاملا قال :"بارك الله لك فيها" قال :"فأتى الأعمى فقال أي شيء أحب إليك قال أن يرد الله إلى بصري فأبصر به الناس". قال :"فمسحه فرد الله إليه بصره قال فأي المال أحب إليك قال الغنم فأعطي شاة والدا فأنتج هذان وولد هذا قال فكان لهذا واد من الإبل ولهذا واد من البقر ولهذا واد من الغنم". قال :"ثم إنه أتى الأبرص في صورته وهيئته فقال رجل مسكين قد انقطعت بي الحبال في سفري فلا بلاغ لي اليوم إلا بالله ثم بك أسألك بالذي أعطاك اللون الحسن والجلد الحسن والمال بعيرا أتبلغ عليه في سفري فقال الحقوق كثيرة فقال له كأني أعرفك ألم تكن أبرص يقذرك الناس فقيرا فأعطاك الله مالا فقال إنما ورثت هذا المال كابرا عن كابر فقال إن كنت كاذبا فصيرك الله إلى ما كنت". قال :"وأتى الأقرع في صورته فقال له مثل ما قال لهذا ورد عليه مثل ما رد على هذا فقال إن كنت كاذبا فصيرك الله إلى ما كنت". قال :"وأتى الأعمى في صورته وهيئته

فقال رجل مسكين وابن سبيل انقطعت بي الحبال في سفري فلا بلاغ لي اليوم إلا بالله
ثم بك أسألك بالذي رد عليك بصرك شاة أتبلغ بها في سفري فقال قد كنت أعمى فرد الله
إلى بصري فخذ ما شئت ودع ما شئت فو الله لا أجهدك اليوم شيئا أخذته لله فقال
أمسك مالك فإنما ابتليتم فقد رضي عنك وسخط على صاحبيك"

ترجمہ:
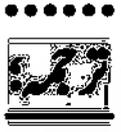
حضرت ابوہریرہ (رض) کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی اسرائیل میں تین شخص تھے ان میں ایک تو کوڑھی تھا دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمانا چاہا کہ یہ نعمت الٰہی کا شکر ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس ایک فرشتہ مسکین وفقیر کی صورت میں بھیجا وہ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟ کوڑھی نے کہا کہ اچھا رنگ اور جسم کی بہترین جلد نیز یہ کہ مجھے اس چیز یعنی وڑھ سے نجات مل جائے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے کہ یہ سن کر فرشتہ نے کوڑھی کے بدن پر ہاتھ پھیرا چنانچہ اس کا کوڑھ جاتا رہا۔ اسے بہترین رنگ و روپ اور بہترین جلد عطا کر دی گئی۔ پھر فرشتہ نے پوچھا کہ اب تمہیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس شخص نے کہا کہ" اونٹ" یا کہا" گائیں۔ (حدیث کے ایک راوی اسحق کو شک ہے کہ) گائے کے لیے کوڑھی نے کہا تھا یا گنجے نے کہا تھا بہر حال یہ طے ہے کہ ان میں سے ایک نے تو اونٹ کے لیے کہا تھا اور دوسرے نے گائے کے لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے کہ اس شخص کو حاملہ اونٹنیاں عطا کر دی گئیں پھر فرشتے نے یہ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس مال میں برکت عطا فرمائے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر

فرشتہ گنجے کے پاس آیااوراس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیزسب سے زیادہ پسند ہے؟ گنجے نے کہا کہ بہترین قسم کے بال اور یہ کہ یہ چیزیعنی گنجے پن سے نجات پاجاؤں جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایافرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرااوراس کا گنج جاتا رہانیزاسے بہترین قسم کے بال عطا کر دیئے گئے۔پھرفرشتہ نے اس سے پوچھا کہ اب تمہیں کونسا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟اس شخص نے کہا کہ گائیں چنانچہ اسے حاملہ گائیں عطا کر دی گئیں اور فرشتہ نے اسے دعا بھی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس مال میں برکت عطا فرمائے۔آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے کہ اس کے بعد پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیااوراس سے پوچھا کہ تمہیں کون سی چیزسب سے زیادہ پسند ہے؟ اندھے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے میری بینائی دے تا کہ میں اس کے ذریعے لوگوں کو دیکھوں۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فرشتہ نے اس اس پر ہاتھ پھیرااور اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی بینائی عطا فرمادی، پھر فرشتے نے اس سے پوچھا کہ اب تمہیں کون سامال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا بکریاں چنانچہ اسے بہت سی بچے دینے والی بکریاں عنایت فرمادی گئیں اس کے کچھ عرصے کے بعد کوڑھی اور گنجے نے اونٹنیوں اور گائیوں کے ذریعے اور اندھے نے بکریوں کے ذریعے بچے حاصل کیئے گویا اللہ نے تینوں کے مال میں بے انتہا برکت دی یہاں تک کہ کوڑھی کے اونٹوں سے ایک جنگل بھر گیا گنجے کی گائیوں سے ایک جنگل بھر گیااور اندھے کی بکریوں سے ایک جنگل بھر گیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایااس کے بعد فرشتہ پھر کوڑھی کے پاس اپنی اسی پہلی شکل وصورت میں آیا۔اوراس سے کہنے لگا کہ میں ایک مسکین شخص ہوں میرا تمام سامان سفر کے دوران جاتا رہا ہے اس لیے آج منزل مقصود تک میرا

پہنچنا ممکن نہیں ہے ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی ہو جائے اور اس کے بعد تم ذریعہ بن جاؤ تو میری یہ مشکل آسان ہو جائے گی لہٰذا میں تم سے اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہیں اچھا رنگ، بہترین جلد اور مال عطا کیا ہے ایک اونٹ مانگتا ہوں تاکہ اس کے ذریعے میرا سفر پورا ہو جائے اور میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں اس کوڑھی نے کہا کہ میرے اوپر حق بہت زیادہ ہیں (یعنی اس کوڑھی نے فرشتے کو ٹالنے کے لیے جھوٹ کہا کہ میرے اس مال کے حقدار بہت ہیں اس لیے تمہیں کوئی اونٹ نہیں مل سکتا) فرشتے نے کہا کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں کیا تم وہی کوڑھی نہیں ہو جس سے لوگوں کو گھن آتی تھی اور تم محتاج و قلاش تھے مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہترین رنگ و روپ کے ساتھ صحت عطا فرمائی اور مال سے نوازا کوڑھی نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ مال تو مجھے اپنے باپ دادا کی طرف سے وراثت میں ملا ہے۔ فرشتے نے کہا کہ تم جھوٹے ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اسی حالت کی طرف پھیر دے جس میں تم پہلے مبتلا تھے یعنی تمہیں پھر کوڑھی اور مفلس بنا دے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے کہ پھر فرشتہ گنجے کے پاس اپنی پہلی سی شکل و صورت میں آیا اور اس سے بھی وہی کہا جو اس نے کوڑھی سے کہا تھا چنانچہ گنجے نے بھی وہی جواب دیا جو جواب کوڑھی نے دیا تھا فرشتے نے گنجے سے بھی یہی کہا کہ اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں ویسا ہی کر دے جیسا کہ تم پہلے گنجے اور محتاج تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس اپنی اسی پہلی شکل و صورت میں آیا اور اس سے بھی یہی کہا کہ میں ایک مسکین انسان اور مسافر ہوں میرا تمام سامان سفر کے دوران جاتا رہا ہے۔ اس لیے آج منزل مقصود تک پہنچنا اس شکل میں ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی میرے شامل حال ہو جائے اور اس کے بعد تم اس کا ذریعہ بن جاؤ لہٰذا

میں اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہاری بینائی واپس کردی تم سے ایک بکری مانگتا ہوں تاکہ اس کے ذریعے میں اپنا سفر پورا کرسکوں اندھے نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ بیشک پہلے میں ایک اندھا تھا اللہ تعالیٰ نے میری بینائی واپس کردی ہے لہٰذا میری تمام بکریاں حاضر ہیں اس میں تم جو چاہو لے لو اور جو نہ چاہو اسے چھوڑ دو تم جو کچھ بھی لوگے میں اللہ کی قسم تمہیں اس کو واپس کرنے کی تکلیف نہیں دوں گا۔ یہ سن کر فرشتے نے کہا کہ تمہیں تمہارا مال مبارک تم اپنا مال اپنے پاس رکھو مجھے تمہارے مال کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف تمہیں آزمائش میں مبتلا کیا گیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارا امتحان لیا تھا کہ آیا تمہیں اپنا پرانا حال یاد بھی ہے یا نہیں؟ اور تم اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو یا نہیں؟ سو تم آزمائش میں پورے اترے چنانچہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی اور خوش ہوا اور تمہارے وہ دونوں بدبخت ساتھی یعنی کوڑھی اور گنجا ناشکرے ثابت ہوئے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض قرار پائے۔ (بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی ہوجائے اور اس کے بعد تم ذریعہ بن جاؤ علماء کہتے ہیں کہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کے موقع پر یہ اسلوب اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ اس طرح اصل سوال تو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ مگر بندہ کو اس کا ذریعہ اور سبب بنایا جاتا ہے ایسا اسلوب اختیار کرنا کہ جس میں اللہ کے ساتھ بندہ بھی حاجت روائی کا درجہ پاجائے مثلاً یوں کہا جائے کہ میں اللہ سے اور تم سے سوال کرتا ہوں، قطعاً درست نہیں ہے۔

مال وزر کے بارے میں حضرت ابوذر کا مسلک اوران کا جذبہ زہد

حدیث؛

وعن أبي ذر أنه استأذن على عثمان فأذن له وبيده عصاه فقال عثمان :يا كعب إن عبد الرحمن توفي وترك مالا فما ترى فيه؟ فقال :إن كان يصل فيه حق الله فلا بأس عليه. فرفع أبو ذر عصاه فضرب كعبا وقال :سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول :" ما أحب لو أن لي هذا الجبل ذهبا أنفقه ويتقبل مني أذر خلفي منه ست أواقي " . أنشدك بالله يا عثمان أسمعته؟ ثلاث مرات. قال :نعم. رواه أحمد

ترجمہ؛

حضرت ابوذر غفاری (رض) کے بارے میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عثمان غنی (رض) سے حاضری کی اجازت چاہی تو حضرت عثمان (رض) نے انھیں اجازت دی جب وہ حاضر ہوئے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں عصا تھا اسی موقع پر حضرت عثمان (رض) نے حضرت کعب (رض) سے جو اس وقت وہاں موجود تھے فرمایا کہ کعب! کیا حضرت عبدالرحمن بن عوف (رض) کا انتقال ہوگیا اور انھوں نے اپنے پیچھے بہت زیادہ مال چھوڑا ہے آپ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آیا ان کے مال کی بے انتہا کثرت و زیادتی ان کے کمال ایمان کے لیے مضرت تھی یا نہیں؟ حضرت کعب (رض) نے کہا کہ اگر حضرت عبدالرحمن (رض) اس مال میں سے اللہ تعالیٰ کا حق یعنی زکوۃ صدقات وغیرہ ادا کرتے تھے تو ان کے بارے میں کسی خوف کی گنجائش نہیں یہ سنتے ہی حضرت ابوذر (رض) نے اپنا عصا اٹھا کر حضرت کعب کو مارا اور کہا کہ میں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر میرے پاس سونے کا یہ پہاڑ احد ہو اور میں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کروں تو باوجود یکہ وہ

مقبول بھی ہو جائے میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ میں اس چھ اوقیہ یعنی دو سو چالیس درہم بھی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں۔ پھر حضرت ابوذر (رض) نے حضرت عثمان (رض) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ عثمان (رض) میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے یہ ارشاد گرامی نہیں سنا ہے؟ حضرت ابوذر (رض) نے یہ تین مرتبہ فرمایا حضرت عثمان (رض) نے فرمایا کہ ہاں میں نے بھی یہ ارشاد گرامی سنا ہے۔ (احمد)

تشریح:

حضرت ابوذر غفاری (رض) صحابہ کی ایک جماعت میں سے تھے جس کا فقر و زہد امتیازی شان رکھتا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت ابوذر غفاری (رض) کی ذات گرامی فقر و زہد اور استغنا کے بارے میں پوری امت میں ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ رجحان و نظریہ تھا کہ اپنے پاس مال و زر کا ادنیٰ ترین حصہ بھی جمع نہ کیا جائے بلکہ جو کچھ بھی اپنے قبضے و قدرت میں آئے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے چنانچہ اس موقع پر بھی ان کا یہ جذبہ ان پر غالب آگیا اور جب انھوں نے حضرت کعب (رض) سے اپنے مزاج اور رجحان کے خلاف بات سنی تو انھیں مار بیٹھے۔ اس بارے میں جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے وہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر مال کی زکوۃ ادا ہوتی ہے تو اس کو جمع کرنے میں مضائقہ نہیں ہے خواہ وہ مال کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد گرامی میں جملہ ویتقبل منی بطور مبالغہ استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا زیادہ مال و زر اللہ کی راہ میں خرچ کروں اس کے باوجود بھی کاش کہ قبول ہو جائے۔ لفظ" اذر" حذف ان کے ساتھ احب کا مفعول ہے گویا اس پورے جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر اللہ اتنا زیادہ مال عطا فرما

دے اور میں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کردو اور پھر وہ بارگاہ الوہیت میں قبول بھی ہوجائے تو جب بھی میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ اس مال میں سے کم از کم چھ اوقیہ ہی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں۔

خدا کی راہ میں خرچ کیا جانے والا غیر حلال مال قبول نہیں ہوتا

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله إلا الطيب فإن الله يتقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبها كما يربي أحدكم فلوه حتى تكون مثل الجبل "

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کھجور برابر (خواہ صورت میں خواہ قیمت میں) حلال کمائی میں خرچ کرے (اور یہ جان لو کہ) اللہ تعالیٰ صرف مال حلال قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اس صدقہ کو صدقہ دینے والے کے لیے اسی طرح پالتا ہے۔ جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچھڑا پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ یا اس کا ثواب) پہاڑ کی مانند ہوجاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح؛

کسب کے معنی ہیں جمع کرنا یہاں " کسب طیب " سے مراد وہ مال ہے جسے حلال ذریعوں سے جمع کیا جائے یعنی شرعی اصولوں کے تحت ہونے والی تجارت وصنعت زراعت وملازمت اور وراثت یا حصہ میں حاصل ہونے والا مال۔ " ولا یقبل اللہ الا الطیب " (اللہ تعالیٰ صرف حلال

مال قبول کرتا ہے) میں اسی طرف اشارہ ہے کہ بارگاہ الوہیت میں صرف وہی صدقہ قبول ہوتا ہے جو حلال مال کا ہو، غیر حلال مال قبول نہیں ہوتا نیز اس سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوا کہ حلال مال اچھی اور نیک جگہ ہی خرچ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جانے والا حلال مال بارگاہ الوہیت میں کمال قبول کو پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ حلال مال خرچ کرنے والے سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اسی مفہوم کو یہاں" داہنے سے لینے" سے اس لیے محاورۃ اور عرفاً تعبیر کیا گیا ہے کہ پسندیدہ اور محبوب چیز داہنے ہاتھ ہی سے لی جاتی ہے۔" پالتا" ہے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کے ثواب کو بڑھاتا جاتا ہے تاکہ وہ قیامت کے روز میزان عمل میں گراں ثابت ہو۔

ایک سبق آموز حکایت :

ایک سبق اموز حکایت حدیث بالا کی روشنی میں جو یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ حلال مال اچھی جگہ ہی خرچ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک سبق آموز حکایت سنیے شیخ علی متقی عارف باللہ (رح) فرماتے ہیں کہ ایک متقی وصالح شخص کسب معاش کرتے تھے اور ان کا معمول تھا کہ جو کچھ کماتے پہلے تو اس میں ایک تہائی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے پھر ایک تہائی اپنی ضروریات پر صرف کرتے اور ایک تہائی اپنی کسب معاش کے ذریعے میں لگا دیتے ایک دن ان کے پاس ایک دنیادار شخص آیا اور کہنے لگا کہ شیخ! میں چاہتا ہوں کہ کچھ مال اللہ کی راہ میں خرچ کروں، لہٰذا آپ مجھے کسی مستحق کا پتہ دیجیے انھوں نے کہا پہلے تو حلال مال حاصل کرو اور پھر اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، وہ مستحق شخص ہی کے پاس پہنچے گا۔ دنیادار شخص نے اسے مبالغہ پر محمول کیا، شیخ نے کہا اچھا تم جاؤ تمہیں جو شخص بھی ایسا ملے جس کے تمہارے دل میں جذبہ ترحم

پیدا ہوا اسے صدقہ کا مال دے دینا، چنانچہ وہ شخص جب شیخ کے پاس سے اٹھ کر آیا تو اس نے ایک بوڑھے اندھے کو دیکھا جس کے لیے اس کے دل میں جذبہ ترحم پیدا ہوا اور یہ سمجھ کر کہ صدقہ کے مال کا اس بے چارے سے زیادہ کون مستحق ہو سکتا ہے؟ اپنے کمائے ہوئے مال میں سے اسے کچھ حصہ خیرات کر دیا۔ جب دوسرے دن وہ ضعیف و نابینا شخص کے پاس سے گزرا تو اس نے سنا کہ وہ اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کل کا واقعہ بیان کر رہا تھا کہ کل میرے پاس سے ایک مالدار شخص گزرا اس نے مجھ پر ترس کھا کر اتنا مال مجھے دیا جسے میں نے فلاں بدکار شخص کے ساتھ شراب نوشی میں لٹا دیا۔ وہ دنیادار یہ سنتے ہی شیخ کے پاس آیا اور ان سے پورا ماجرا بیان کیا، شیخ نے یہ واقعہ سن کر اپنی کمائی میں سے ایک درہم اسے دیا اور کہا کہ اسے رکھو اور یہاں سے نکلتے ہی سب سے پہلے تمہاری نظر جس پر پڑے اسے یہ درہم بطور خیرات دے دینا چنانچہ وہ شیخ کا دیا ہوا درہم لے کر گھر سے باہر نکلا تو اس کی نظر سب سے پہلے ایک اچھے شخص پر پڑی جو بظاہر کھاتا پیتا معلوم ہو رہا تھا پہلے تو وہ دیتے ہوئے جھجکا مگر چونکہ شیخ کا حکم تھا اس لیے مجبوراً وہ درہم اس شخص کو دے دیا۔ اس شخص نے وہ درہم لے لیا اور اپنے پیچھے مڑ کر چل دیا، اس کے ساتھ ساتھ وہ مالدار بھی چلا اس نے دیکھا وہ شخص ایک کھنڈر میں داخل ہوا اور وہاں سے دوسری طرف نکل کر شہر راہ پکڑی، مالدار بھی اس کے پیچھے کھنڈر میں داخل ہوا وہاں اسے کوئی چیز نظر نہ آئی البتہ اس نے ایک مرا ہوا کبوتر دیکھا وہ پھر اس شخص کے پیچھے پیچھے ہو لیا، پھر اسے قسم دے کر پوچھا کہ بتاؤ تم کون ہو؟ اور کس حال میں ہو؟ اس نے کہا کہ میں ایک غریب انسان ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں وہ بہت بھوکے تھے جب مجھ سے ان کی بھوک کی شدت نہ دیکھی گئی اور انتہائی اضطراب و پریشانی کے عالم میں میں ان کے لیے کچھ

انتظام کرنے کی خاطر گھر سے نکل کھڑا ہوا تو میں سر گرداں پھر رہا تھا کہ مجھے یہ مرا ہوا کبوتر نظر آیا مرتا کیا نہ کرتا؟ میں نے یہ کبوتر اٹھا لیا اور اسے لے کر اپنے گھر کی طرف چلا تا کہ اس کے ذریعے بھوک سے بلکتے بچوں کو کچھ تسکین دلاؤں مگر جب اللہ نے تمہارے ذریعے یہ درہم مجھے عنایت فرما دیا تو یہ کبوتر جہاں سے اٹھایا تھا وہیں پھینک دیا۔ اب اس مالدار کی آنکھ کھلی اور اسے معلوم ہوا کہ شیخ کا وہ قول مبالغہ پر محمول نہیں تھا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ حلال مال اچھی جگہ اور حرام مال بری جگہ خرچ ہوتا ہے۔

زکوۃ کے علاوہ دوسرے صدقات بھی ہیں

حدیث:

وعن فاطمة بنت قبيس قالت :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إن في المال لحقا سوى الزكاة" ثم تلا :(ليس البر أن تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب) الآية .

رواه الترمذي وابن ماجه والدارمي

ترجمہ:

حضرت فاطمہ بنت قیس (رض) کہتی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ مال وزر میں زکوۃ کے علاوہ اور حق بھی ہیں پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ پوری آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ نیکی یہی نہیں ہے کہ اپنے منہ کو مشرق ومغرب کی طرف متوجہ کرو الخ۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح:

مطلب یہ ہے کہ مال کی زکوۃ دینا تو فرض ہے ہی کہ وہ ضرور دینی چاہیے۔ مگر زکوۃ کے علاوہ کچھ

اور نفل صدقات بھی مستحب ہیں کہ ان کا دیا جانا بھی بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے اور وہ صدقات یہ ہیں کہ سائل اور قرض مانگنے والے کو محروم و مایوس نہ کیا جائے گھر گرہستی کا سامان مثلاً ہانڈی و دیگچی اور پیالہ وغیرہ یا اور ایسا وہ سامان جو اپنے قبضے و ملکیت میں ہو اگر کوئی عاریۃ مانگے تو اسے دینے میں دریغ نہ کیا جائے کسی کو پانی، نمک اور آگ لینے سے منع نہ کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ "حق" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا اور غلام کو آزاد کرنے کے لیے مال خرچ کرنا وغیرہ، مذکورہ بالا آیت پوری یوں ہے۔ آیت (لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ) 2۔ البقرۃ 177 :)۔ نیکی یہی نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت بطور استنباط تلاوت فرمائی کہ اس میں حق تعالیٰ نے پہلے تو ان مومنین کی تعریف بیان فرمائی ہے جو اپنے رشتہ داروں، ت یتیموں اور مساکین وغیرہ پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نماز پڑھنے والوں اور زکوۃ دینے والوں کی تعریف بیان کی لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مال خرچ کرنا زکوۃ دینے کے علاوہ

ہے جو صدقہ نفل کہلاتا ہے۔ گویا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو یہ فرمایا تھا کہ مال و زر کے بارے میں زکوۃ کے علاوہ اور بھی حق یعنی صدقات نافلہ ہیں وہ اس آیت سے ثابت ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے صدقات نافلہ کو ذکر کیا اس کے بعد صدقہ واجب یعنی زکوۃ کا ذکر کیا گیا۔

نصائح نبوی ﷺ

حدیث:

وعن أبي جري جابر بن سليم قال :أتيت المدينة فرأيت رجلا يصدر الناس عن رأيه لا يقول شيئا إلا صدروا عنه قلت من هذا قالوا :هذا رسول الله صلى الله عليه و سلم قلت :عليك السلام يا رسول الله مرتين قال :"لا تقل عليك السلام فإن عليك السلام تحية الميت قل السلام عليك" قلت :أنت رسول الله؟ قال :"أنا رسول الله الذي إذا أصابك ضر فدعوته كشفه عنك وإن أصابك عام سنة فدعوته أنبتها لك وإذا كنت بأرض قفراء أو فلاة فضلت راحلتك فدعوته ردها عليك" .قلت :اعهد إلي. قال: "لا تسبن أحدا" قال فما سببت بعده حرا ولا عبدا ولا بعيرا ولا شاة .قال :"ولا تحقرن شيئا من المعروف وأن تكلم أخاك وأنت منبسط إليه وجهك إن ذلك من المعروف وارفع إزارك إلى نصف الساق فإن أبيت فإلى الكعبين وإياك وإسبال الإزار فإنها من المخيلة وإن الله لا يحب المخيلة وإن امرؤ شتمك وعيرك بما يعلم فيك فلا تعيره بما تعلم فيه فإنما وبال ذلك عليه" .رواه أبو داود وروى الترمذي منه حديث السلام .وفي رواية :"فيكون لك أجر ذلك ووباله عليه

ترجمہ:

حضرت ابوجری (رض) کہ جن کا نام جابر بن سلیم ہے کہتے ہیں کہ جب میں مدینہ آیا تو میں ایک

شخص کو دیکھا کہ لوگ ان کی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں (یعنی ان کے کہنے پر لوگ عمل کرتے ہیں، چنانچہ خود راوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ) وہ جو کچھ بھی فرماتے ہیں لوگ اس پر عمل کرتے ہیں میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں راوی کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دو مرتبہ یہ کہا علیک السلام آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام ہو۔ اے رسول خدا! رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سن کر کہا کہ علیک السلام نہ کہو کیونکہ علیک السلام کہنا میت کے لیے دعا ہے البتہ السلام علیک کہو! اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رسول ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسول ہوں وہ اللہ کہ اگر تمہیں کوئی تکلیف ومصیبت پہنچے اور تم اسے پکارو تو وہ تمہاری تکلیف ومصیبت کو دور کرے اگر تمہیں قحط سالی اپنی لپیٹ میں لے اور تم اسے پکارو تو زمین تمہارے لیے سبزہ (غلہ وغیرہ) اگادے اور اگر تم زمین کے کسی ایسے حصہ میں اپنی سواری گم کر بیٹھو کہ جہاں نہ پانی کا نام ونشان ہو نہ درخت کا، یا کہ کوئی ایسا جنگل جو آبادی سے دور ہو اور پھر تم اسے پکارو تو وہ تمہاری سواری تمہارے پاس واپس بھیج دے۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمادیجئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی کو برا نہ کہو۔ حضرت جابر (رض) کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کسی کو برا نہیں کہا نہ آزاد کو، نہ غلام کو، نہ اونٹ کو اور نہ بکری کو (یعنی کسی انسان کو برا کہنا کیسا، حیوانات کو بھی برا نہ کہا جیسا کہ عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو (یعنی اگر تم کسی کے ساتھ نیکی کرو یا کوئی دوسرا تمہارے ساتھ نیکی کرے تو اسے بہت جانو اور اس کا شکریہ ادا کرو اور خود تم سے جو بھی نیکی ہو سکے اس کے کرنے کو غنیمت جانو) اور جب تم اپنے کسی بھائی سے

ملاقات کرو تو خندہ پیشانی اختیار کرو (یعنی جب تم کسی سے ملو، تو اس سے تواضع اور خوش کلامی سے پیش آؤ تا کہ تمہارے اس حسن خلق کی وجہ سے اس کا دل خوش ہو) کیونکہ یہ بھی ایک نیکی ہے اور تم اپنی ازار (یعنی پاجامہ لنگی وغیرہ) کو نصف پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر اتنا اونچا رکھنا تم پسند نہ کرسکو تو ٹخنوں تک رکھو مگر (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانے سے بچو! اس لیے کہ (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانا تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ نیز اگر کوئی شخص تمہیں گالی دے اور تمہارے کسی ایسے عیب پر تمہیں عار دلائے جسے وہ جانتا ہے تو تم انتقاما اس کے کسی عیب پر کہ جسے تم جانتے ہو اسے عار نہ دلاؤ کیونکہ اس کا گناہ اسے ہی ملے گا۔ (ابوداؤد) ترمذی نے اس روایت کا صرف ابتدائی حصہ نقل کیا ہے جس میں سلام کا ذکر ہے (باقی روایت نقل نہیں کی ہے) اور (ترمذی کی) ایک دوسری روایت میں اس کا گناہ اسے ہی ملے گا کے بجائے یہ الفاظ ہیں کہ تمہارے لیے اس کا ثواب ہوگا اور اس کے لیے اس کا گناہ۔

تشریح:

حضرت جابر (رض) نے دو مرتبہ سلام اس لیے کیا کہ یا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلا سلام سنا نہیں ہوگا یا پھر یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو سلام کا طریقہ سکھانے کی غرض سے پہلے سلام کا جواب نہیں دیا ہوگا۔ ارشاد گرامی علیک السلام نہ کہو۔ نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔ نیز حدیث کے الفاظ، علیک السلام کہنا میت کے لیے دعا ہے، اس سے بظاہر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص میت کے پاس جائے علیک السلام کہے السلام علیک نہ کہے جیسا کہ کسی زندہ شخص کے لیے کہا جاتا ہے حالانکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ میت کے لیے بھی السلام علیک کہنا ہی مسنون ہے۔ کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں یہ بات ثابت ہے

کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب زیارت موتی کے لیے تشریف لے جاتے تو السلام علیکم فرماتے تھے۔لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد، علیک السلام کہنا میت کے لیے دعا ہے، کے معنی یہ بیان کئے جائیں گے کہ ایام جاہلیت میں علیک السلام میت کے لے دعا تھی۔ چنانچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عرب میں پہلے یہ معمول تھا کہ جب کوئی قبر پر جاتا تو وہاں سلام کے لیے یہی کہتا تھا کہ علیک السلام، لہٰذا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ارشاد کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ علیک السلام، کہنا اہل عرب کے معمول وعادت کے مطابق مردہ کے لیے دعا ہے نہ یہ کہ اس ارشاد سے آپ کی مراد یہ تھی کہ میت کو اس طرح سلام کیا جائے۔حضرت جابر(رض) کا یہ کہنا ہے کہ اس کے بعد میں نے کسی کو برا نہیں کہا۔سد باب اور احتیاط کے طور پر ہے ورنہ تو جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے علماء لکھتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کو برا کہنا کہ جس کا کفر کی حالت میں مرنا یقینی طور پر معلوم ہو جائے جائز ہے تاہم افضل اور بہتر یہی ہے کہ اپنی زبان کو اللہ رب العزت کے ذکر میں مشغول رکھا جائے کسی کو برا نہ کہا جائے اس لیے کہ ماسوی اللہ میں مشغول ہونا نقصان ہی کا باعث ہے جب کہ کسی کو برا نہ کہنے میں کوئی حرج ونقصان نہیں ہے بلکہ علماء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ شیطان کو بھی لعنت نہ کرنے میں کوئی ضرر نہیں ہے۔ جس طرح پائجامہ اور لنگی وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ممنوع ہے اسی طرح کرتہ وغیرہ بھی ٹخنوں سے نیچے کرنا ممنوع ہے۔حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہیں گالی دیتا ہے یا تمہارے کسی عیب سے تمہیں عار دلا کر شرمندہ وذلیل کرنا چاہتا ہے تو تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ وہ خود ہی گناہ گار ہوگا لہٰذا تم بھی اس کی طرح اپنی زبان خراب کر کے اور اسے برا بھلا کہہ کر خواہ مخواہ کے لیے اپنے ذمہ کیوں وبال لیتے ہو۔بدی را بدی سہل باشد جزاء اگر مردی

احسن الی من اساء روایت کے آخر میں وفی رواۃ الخ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی نے بھی یہ پوری روایت نقل کی ہے چنانچہ بعض حواشی میں لکھا ہوا ہے کہ ترمذی نے بھی پوری روایت نقل کی ہے اگر چہ اس کے الفاظ مختلف ہیں یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے وہ ابوداؤد کی نقل کردہ روایت کے الفاظ ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں کردیا وہ باقی ہے اور جو موجود رہا وہ فانی ہے

اللہ تعالیٰ کے دوست اور دشمن؛

حدیث؛

وعن أبي ذر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال :"ثلاثة يحبهم الله وثلاثة يبغضهم الله فأما الذين يحبهم الله فرجل أتى قوما فسألهم بالله ولم يسألهم بقرابة بينه وبينهم فمنعوه فتخلف رجل بأعيانهم فأعطاه سرا لا يعلم بعطيته إلا الله والذي أعطاه وقوم ساروا ليلتهم حتى إذا كان النوم أحب إليهم مما يعدل به فوضعوا رءوسهم فقام يتملقني ويتلو آياتي ورجل كان في سرية فلقي العدو فهزموا وأقبل بصدره حتى يقتل أو يفتح له والثلاثة الذين يبغضهم الله الشيخ الزاني والفقير المختال والغني الظلوم" .

رواه الترمذي والنسائي

ترجمہ؛

حضرت ابوذر (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اور تین شخص ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے چنانچہ وہ اشخاص کہ جنہیں اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان میں سے ایک تو وہ شخص ہے کہ جس نے ایسے شخص کو صدقہ دیا جو ایک جماعت کے پاس آیا اور اس سے اللہ کی قسم دے کر کچھ مانگا یعنی یوں

کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے اتنا مال یا اتنی چیز دو اس نے جماعت سے حق قرابت کی وجہ سے دیا جو اس کے اور جماعت کے درمیان تھا۔ مگر جماعت والوں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا، چنانچہ ایک شخص نے جماعت کو پس پشت ڈالا اور آگے بڑھ کر سائل کو پوشیدہ طور پر دے دیا، سوائے اللہ کے اور اس شخص کے کہ جسے اس نے دیا اور کسی نے اس کے عطیہ کو نہیں جانا اور دوسرا وہ شخص ہے جو جماعت کے ساتھ تمام رات چلا یہاں تک کہ جب ان کے لیے نیند ان تمام چیزوں سے زیادہ جو نیند کے برابر ہیں پیاری ہوئی تو جماعت کے تمام فرد سو گئے مگر وہ شخص کھڑا ہوا (اللہ فرماتا ہے کہ) اور میرے سامنے گڑ گڑانے لگا اور میری آیتیں (یعنی قرآن کریم) پڑھنے لگا۔ اور تیسرا شخص وہ ہے جو لشکر میں شامل تھا جب دشمن سے مقابلہ ہوا تو اس کے لشکر کو شکست ہوگئی مگر وہ شخص دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر ہوگیا یہاں تک کہ شہید ہوگیا یا فتح یاب اور وہ تین شخص جو اللہ کے نزدیک مبغوض ہیں ان میں سے ایک شخص تو وہ ہے جو بوڑھا ہونے کے باوجود زنا کرے، دوسرا شخص تکبر کرنے والا فقیر ہے اور تیسرا شخص دولت مند ظلم کرنے والا ہے (یعنی وہ شخص دولت مند ہوتے ہوئے قرض دینے والے کو قرض کی ادائیگی نہ کرے یا دوسروں کے ساتھ اور کسی ظلم کا معاملہ کرے) (ترمذی)

تشریح:

حدیث کی ابتدا جس اسلوب سے ہوئی اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے مگر بعد کے اسلوب یعنی حدیث کے الفاظ یتملقنی۔ اور میرے سامنے گڑ گڑانے لگا۔ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ارشاد نبوی نہیں ہے بلکہ کلام الٰہی یعنی حدیث قدسی ہے اسلوب کے اس اختلاف کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ یہ حدیث حقیقت میں تو ارشاد نبوی (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے نبی سے وہ کیفیت بیان کی جو اس کے اور اس کے بندے کے درمیان واقع ہوتی ہے اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس موقع پر اس اصل کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا بعینہ قول نقل فرمادیا۔ الشیخ الزانی، جو بوڑھا ہونے کے باوجود زنا کرے، میں لفظ شیخ سے یا تو اس کے اصل معنی یعنی بوڑھا ہی مراد ہے یا پھر کہا جائے کہ یہاں شیخ سے بکر (کنوارے) کی ضد محصن (شادی شدہ) مراد ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان، جیسا کہ اس آیت منسوخ میں ہے۔ الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموا ھا البتۃ نکال من اللہ واللہ عزیز حکیم، شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت جب دونوں زنا کریں تو دونوں کو سنگسار کردو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ضروری ہے اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔ میں شیخ سے مراد شادی شدہ ہے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا۔ تکبر کرنے والے فقیر کو بھی اللہ کے نزدیک مبغوض قرار دیا گیا ہے لیکن فقیر کا وہ تکبر مستثنیٰ ہے جو کسی متکبر کے ساتھ ہو بلکہ ایسے تکبر کو تو صدقہ قرار دیا گیا ہے یعنی اگر کوئی فقیر کسی متکبر کے ساتھ تکبر کرے تو وہ اللہ کے نزدیک مبغوض نہیں ہوگا۔ بلکہ اسے صدقہ کا ثواب ملے گا، چنانچہ حضرت بشیر بن حارث کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے عرض کیا کہ اے امیر المومنین مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا مالداروں کو ثواب الٰہی کے حصول کی خاطر فقیروں سے مہربانی کا معاملہ کرنا بہت ہی بہتر ہے اور فقیروں کو اللہ پر توکل اور اعتماد کے جذبے سے مالداروں سے تکبر کا معاملہ کرنا بہت بہتر ہے۔ جن بری خصلتوں کا ذکر کیا گیا اگرچہ وہ سب ہی کے حق میں بری ہیں لیکن ان تینوں کے حق میں چونکہ بہت ہی زیادہ بری ہیں جس کا سبب ظاہر ہے اس لیے یہ اللہ کے دشمن قرار دیئے گئے ہیں۔

ماہ رمضان میں شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إذا دخل شهر رمضان فتحت أبواب السماء". وفي رواية :"فتحت أبواب الجنة وغلقت أبواب جهنم وسلسلت الشياطين". وفي رواية :"فتحت أبواب الرحمة"

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ جب ماہ رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں نیز شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کی بجائے یہ ہیں کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح؛

آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں سے اس بات کی طرف کنایہ مقصود ہے کہ اس ماہ مقدس کے شروع ہوتے ہیں باری تعالیٰ کی پے در پے رحمتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور بندوں کے اعمال بغیر کسی مانع اور رکاوٹ کے صعود کرتے ہیں نیز باب قبولیت وا ہو جاتا ہے کہ بندہ جو دعا مانگتا ہے بارگاہ الوہیت میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوتی ہے۔ جنت کے

دروازے کھولے جاتے ہیں سے اس طرف کنایہ مقصود ہے کہ بندہ کو ان نیک اور اچھے کاموں کی توفیق عطا فرمائی جاتی ہے جو دخول جنت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں سے اس بات کی طرف کنایہ مقصود ہے کہ روزہ دار ایسے کاموں سے بچا رہتا ہے جو دوزخ میں داخل ہونے کا باعث ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہی ہے روزہ دار کبیرہ گناہوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے اور جو صغیرہ گناہ ہوتے ہیں وہ اس کے روزے کی برکت سے بخش دیئے جاتے ہیں۔ شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ ان شیاطین کو جو سرکش و سرغنہ ہوتے ہیں زنجیروں میں باندھ دیا جاتا ہے اور ان کی وہ قوت سلب کر لی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ بندوں کو بہکانے پر قادر ہوتے ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ جملہ دراصل اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ ماہ رمضان میں شیاطین لوگوں کو بہکانے سے باز رہتے ہیں اور بندے نہ صرف یہ کہ ان کے وسوسوں اور ان کے اوہام کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کے مکروفریب کے جال میں پھنستے بھی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ روزہ کی وجہ سے انسان کی قوت حیوانیہ مغلوب ہو جاتی ہے جو غیظ وغضب اور شہوت کی جڑ ہے اور طرح طرح کے گناہوں کا باعث ہوتی ہے اس کے برخلاف قوت عقلیہ غالب اور قوی ہو جاتی ہے جو طاعات اور نیکی کا باعث ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت گناہ کم صادر ہوتے ہیں اور عبادات واطاعات میں زیادتی ہوتی ہے۔

روزہ کی فضیلت؛

حدیث؛

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"من صام

رمضان إيمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه. ومن قام رمضان إيمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه. ومن قام ليلة القدر إيمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه"

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہی کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے ایمان کے ساتھ (یعنی شریعت کو سچ جانتے ہوئے اور فرضیت رمضان کا اعتقاد رکھتے ہوئے) اور طلب ثواب کی خاطر (یعنی کسی خوف یا ریاء کے طور پر نہیں بلکہ خالصتہ للہ) رمضان کا روزہ رکھا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے نیز جو شخص ایمان کے ساتھ اور طلب ثواب کی خاطر رمضان میں کھڑا ہوا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے اسی طرح جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ (یعنی شب قدر کی حقیقت کا ایمان و اعتقاد رکھتے ہوئے) اور طلب ثواب کی خاطر کھڑا ہوا تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے پہلے کئے تھے۔ (بخارو مسلم)

رمضان میں کھڑا ہونے، سے مراد یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں تراویح پڑھے، تلاوت قرآن کریم اور ذکر اللہ وغیرہ میں مشغول رہے نیز اگر حرم شریف میں ہو تو طواف وعمرہ کرے یا اسی طرح کی دوسری عبادات میں اپنے آپ کو مصروف رکھے۔ شب قدر میں کھڑا ہونے، کا مطلب یہ ہے کہ شب قدر عبادت الٰہی اور ذکر اللہ میں مشغول رہے خواہ اس رات کے شب قدر ہونے کا اسے علم ہو یا نہ ہو۔ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جائیں گے جو اس نے

پہلے کئے تھے۔ کے بارے میں علامہ نووی فرماتے ہیں کہ مکفرات (یعنی وہ اعمال جو گناہوں کو ختم کرنے والے ہوتے ہیں) صغیرہ گناہوں کو تو مٹا ڈالتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کو ہلکا کر دیتے ہیں اگر کسی خوش نصیب کے نامہ اعمال میں گناہ کا وجود نہیں ہوتا تو پھر مکفرات کی وجہ سے جنت میں اس کے درجات بلند کر دیئے جاتے ہیں۔

روزہ سے متعلق مسائل:

روزہ کب فرض ہوا؟

روزہ کب فرض ہوا؟ ماہ رمضان کے روزے ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینے میں تحویل قبلہ کے دس روز بعد فرض کئے گئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے قبل کوئی روزہ فرض نہیں تھا جب کہ بعض حضرات کا قول ہے کہ اس سے قبل بھی کچھ ایام کے روزے فرض تھے جو اس ماہ رمضان کے روزے کی فرضیت کے بعد منسوخ ہو گئے۔ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک تو عاشورہ محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ فرض تھا اور بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ایام بیض (قمری مہینے کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں راتوں کے دن) کے روزے فرض تھے۔ رمضان کے روزے کی فرضیت کے ابتدائی دنوں میں بعض احکام بہت سخت تھے مثلاً غروب آفتاب کے بعد سونے سے پہلے کھانے پینے کی اجازت تھی مگر سونے کے بعد کچھ بھی کھانے پینے کی اجازت نہیں تھی۔ چاہے کوئی شخص بغیر کھائے پیئے ہی کیوں نہ سو گیا ہو، اسی طرح جماع کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں جائز نہ تھا۔ مگر جب یہ احکام مسلمانوں پر بہت شاق گزرے اور ان احکام کی وجہ سے کئی واقعات بھی پیش آئے تو یہ احکام منسوخ کر دیئے گئے اور کوئی سختی باقی نہ رہی۔

روزے کی اہمیت وفضیلت :

روزے کی اہمیت وفضیلت اسلام کے جو پانچ بنیادی ارکان ہیں ان میں روزے کا تیسرا درجہ ہے گویا روزہ اسلام کا تیسرا رکن ہے اس اہم رکن کی جو تاکید اور بیش از بیش اہمیت ہے اسے ماہرین شریعت ہی بخوبی جان سکتے ہیں روزہ کا انکار کرنے والا کافر اور اس کا تارک فاسق اور اشد گناہ گار ہوتا ہے چنانچہ درمختار کے باب مایفسد الصوم میں یہ مسئلہ اور حکم نقل کیا گیا ہے کہ ولہ اکل عمداً اشہرۃ بلا عذر یقتل، جو شخص رمضان میں بلا عذر علی الاعلان کھاتا پیتا نظر آئے اسے قتل کردیا جائے۔ روزہ کی فضیلت کے بارے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بعض علماء نے اس اہم ترین اور باعظمت رکن کے بے انتہا فضائل دیکھ کر اس کو نماز جیسی عظیم الشان عبادت پر ترجیح اور فضیلت دی ہے اگرچہ یہ بعض ہی علماء کا قول ہے جب کہ اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ نماز تمام اعمال سے افضل ہے اور اسے روزہ پر بھی ترجیح وفضیلت حاصل ہے مگر بتانا تو صرف یہ ہے کہ جب اس بات میں علماء کے ہاں اختلاف ہے کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟ تو اب ظاہر ہے کہ نماز کے علاوہ اور کوئی بھی دوسرا عمل اور دوسرا رکن روزے کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

روزہ کے فوائد:

کسی بھی عبادت اور کسی بھی عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل ہوجائے اور پروردگار کی رحمت کاملہ اس عمل اور عبادت کرنے والے کو دین اور دنیا دونوں جگہ اپنی آغوش میں چھپالے ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے روزہ کا فائدہ بھی بڑا ہی عظیم الشان ہوگا مگر اس کے علاوہ روزے کے کچھ اور بھی روحانی اور دینی فوائد ہیں جو اپنی اہمیت وعظمت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں لہٰذا ان میں سے کچھ فائدے بیان کئے جاتے ہیں۔ (۱) روزہ کی

وجہ سے خاطر جمعی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے نفس امارہ کی تیزی وتندی جاتی رہتی ہے، اعضاء جسمانی اور بطور خاص وہ اعضاء جن کا نیکی اور بدی سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جیسے ہاتھ، آنکھ، زبان، کان اور ستر وغیرہ سست ہوجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے گناہ کی خواہش کم ہوجاتی ہے اور معصیت کی طرف رجحان ہلکا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں یعنی انھیں اپنے کام کی رغبت نہیں ہوتی اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضاء بھوکے ہوتے ہیں انھیں اپنے کام کی طرف رغبت ہوتی ہے اس قول کو وضاحت کے ساتھ یوں سمجھ لیجیے کہ جسم کے جتنے اعضاء ہیں قدرت نے انھیں اپنے مخصوص کاموں کے لیے پیدا کیا ہے مثلاً آنکھ کی تخلیق دیکھنے کے لیے ہوئی ہے گویا آنکھ کا کام دیکھنا ہے لہٰذا بھوک کی حالت میں کسی بھی چیز کو دیکھنے کی طرف راغب نہیں ہوتی ہاں جب پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو آنکھ اپنا کام بڑی رغبت کے ساتھ کرتی ہے اور ہر جائز وناجائز چیز کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے اسی پر بقیہ اعضاء کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ (۲) روزہ کی وجہ سے دل کدورتوں سے پاک و صاف ہوجاتا ہے کیونکہ دل کی کدورت آنکھ، زبان اور دوسرے اعضاء کے فضول کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی زبان کا ضرورت وحاجت سے زیادہ کلام کرنا، آنکھوں کا بلا ضرورت دیکھنا، اسی طرح دوسرے اعضاء کا ضرورت سے زیادہ اپنے کام میں مشغول رہنا افسردگی دل اور رنجش قلب کا باعث ہے اور ظاہر ہے کہ روزہ دار فضول گوئی اور فضول کاموں سے بچا رہتا ہے بدیں وجہ اس کا دل صاف اور مطمئن رہتا ہے اس طرح پاکیزگی دل اور اطمینان قلب اچھے ونیک کاموں کی طرف میلان ورغبت اور درجات عالیہ کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔ (۳) روزہ مساکین وغرباء کے ساتھ حسن سلوک اور ترحم کا سبب ہوتا ہے کیونکہ جو شخص کسی وقت بھوک کا غم

جھیل چکا ہوتا ہے اسے اکثر و بیشتر وہ کربناک حالت یاد آتی ہے چنانچہ وہ جب کسی شخص کو بھوکا دیکھتا ہے تو اسے خود اپنی بھوک کی وہ حالت یاد آجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا جذبہ ترحم امنڈ آتا ہے۔ (٤) روزہ دار اپنے روزہ کی حالت میں گویا فقراء مساکین کی حالت بھوک کی مطابقت کرتا ہے بایں طورکہ جس اذیت اور تکلیف میں وہ مبتلا ہوتے ہیں۔اسی تکلیف اور مشقت کو روزہ دار بھی برداشت کرتا ہے اس وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے جیسا کہ ایک بزرگ بشر حافی کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں جاڑے کے موسم میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے کانپ رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس اتنے کپڑے موجود تھے جو ان کو سردی سے بچا سکتے تھے۔مگر وہ کپڑے الگ رکھے ہوئے تھے۔اس شخص نے یہ صورت حال دیکھ کر ان سے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے سردی کی اس حالت میں اپنے کپڑے الگ رکھ چھوڑے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میرے بھائی فقراء و مساکین کی تعداد بہت زیادہ ہے مجھ میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں ان کے کپڑوں کا انتظام کروں لہٰذا (جو چیز میرے اختیار میں ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں کہ) جس طرح وہ لوگ سردی کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں اس طرح میں بھی سردی کی تکلیف برداشت کر رہا ہوں اس طرح میں بھی ان کی مطابقت کر رہا ہوں۔یہی جذبہ ہمیں ان اولیاء عارفین کی زندگیوں میں بھی ملتا ہے جن کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کھانے کے وقت ہر ہر لقمہ پر یہ دعائیہ کلمات کہا کرتے تھے۔اللھم لا تواخذنی بحق الجائعین۔اے اللہ مجھ سے بھوکوں کے حق کے بارے میں مواخذہ نہ کیجئے۔حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں منقول ہے کہ جب قحط سالی نے پورے ملک کو اپنے مہیب سایہ میں لے لیا باوجودیکہ خود ان کے پاس بے انتہا غلہ کا

ذخیرہ تھا مگر وہ صرف اس لیے پیٹ بھر کر نہیں کھاتے تھے کہ کہیں بھوکوں کا خیال دل سے اتر نہ جائے نیز یہ انھیں اس طرح بھوکوں اور قحط زدہ عوام کی تکلیف و مصیبت سے مشابہت اور مطابقت حاصل رہے۔

روزہ کی بے انتہا فضیلت کیوں؟

روزہ اور اس کے ثواب کی اس فضیلت کے دو سبب ہیں اول تو یہ کہ روزہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے، دوسری عبادتوں کے برخلاف کہ ان میں یہ وصف نہیں ہے جتنی بھی عبادات ہیں وہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جب کہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے سوا صرف روزہ دار ہی کو ہوتا ہے۔ لہٰذا روزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوتا ہے کہ اس میں ریاء اور نمائش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فانہ لی کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزہ خاص میرے ہی لیے ہے کیونکہ روزہ تو صورۃ اپنے لیے وجود نہیں رکھتا جب کہ دوسری عبادتیں صورتا اپنے لیے وجود رکھتی ہیں۔ دوم یہ کہ روزہ میں نفس کشی اور جسم و بدن کا ہلکان و نقصان ہے نیز روزہ کی حالت میں انتہائی کرب و تکلیف کی صورتیں بھوک و پیاس پیش آتی ہیں اور ان پر صبر کرنا پڑتا ہے جب کہ دوسری عبادتوں میں نہ اتنی تکلیف و مشقت ہوتی ہے اور نہ اپنی خواہش و طبیعت پر اتنا جبر چنانچہ باری تعالیٰ نے اپنے ارشاد یدع شہوتہ کے ذریعے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزہ دار اپنی خواہش کو چھوڑ دیتا ہے یعنی روزہ کی حالت میں جو چیزیں ممنوع ہیں وہ ان سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ لفظ شہوتہ کے بعد لفظ طعامہ کا ذکر کیا تو تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہے یا پھر شہوت سے مراد تو جماع ہے اور طعام سے جماع کے علاوہ دوسری چیزیں مراد ہیں جو روزہ کو توڑنے والی ہوتی

ہیں۔افطار کے وقت روزہ دار کو خوشی دو وجہ سے ہوسکتی ہے یا تو اس لیے کہ وہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ روزہ دار اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے حکم اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ محسوس کرتا ہے، یا پھر یہ کہ وہ عبادت کی توفیق اور اس کی نورانیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مطمئن و مسرور محسوس کرتا ہے، جو ظاہر ہے کہ خوشی کا سبب ہے اس کے علاوہ دنیاوی اور جسمانی طور پر بھی یوں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ دن بھر کی بھوک و پیاس کے بعد اسے کھانے پینے کو ملتا ہے۔حدیث کے آخری جملے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص روزہ دار کو برا بھلا کہے یا اس سے لڑنے کا ارادہ کرے تو وہ اس شخص کو انتقاما برا بھلا نہ کہے اور نہ اس سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائے بلکہ اس شخص سے یہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں اور یہ بات یا تو زبان سے کہے تا کہ دشمن اپنے ناپاک ارادوں سے باز رہے کیونکہ جب روزہ دار اپنے مقابل سے یہ کہے گا کہ میں روزہ دار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں چونکہ روزہ دار ہوں اس لیے میرے لیے تو یہ جائز نہیں کہ میں تم سے لڑوں جھگڑوں اور جب میں خود لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو تمہارے لیے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ایسی صورت میں تم مجھ سے لڑائی جھگڑے کا ارادہ کرو کیونکہ یہ اصول و مروت کے خلاف ہے ظاہر ہے کہ یہ انداز اور پیرایہ دشمن کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے غلط ارادوں سے باز رہے۔ یا اس کے یہ معنی ہوں کہ میں چونکہ روزہ دار ہوں اس لیے اس وقت تمہارے لیے زبان درازی مناسب اور لائق نہیں کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اس کی حفاظت میں ہوں۔ یا پھر یہ کہ ایسے موقع پر روزہ دار اپنے دل میں یہ کہہ لے کہ میں روزہ دار ہوں میرے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ میں روزہ حالت میں کسی سے لڑائی جھگڑا کروں یا کسی کو اپنی زبان سے برا کہوں۔لفظ" الا الصوم" کے سلسلے میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی (رح) نے لکھا ہے کہ

حدیث کے بعض شارحین اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ روزہ کی یہ خصوصیت کس وجہ سے ہے؟ تاہم ہمارے اوپر یہ بات واجب اور لازم ہے کہ بغیر کسی شک وشبہہ کے اس کی تصدیق کرے ہاں بعض محققین علماء نے اس خصوصیت کے کچھ اسباب بیان کیئے ہیں چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزہ ہی وہ عبادت ہے جو ایام جاہلیت میں بھی اہل عرب کے یہاں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مخصوص تھی یعنی جس طرح کفار ومشرکین سجدہ وغیرہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے بھی کرتے تھے اسی طرح وہ روزہ میں بھی اللہ کے علاوہ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے بلکہ روزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے رکھتے تھے۔اس طرح اس نکتہ کے ذریعے بھی اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ درحقیقت جو شخص روزہ رکھتا ہے اور اس طرح وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضاء کی خاطر اپنا کھانا پینا اور دوسری خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ ایک طرح کی لطافت و پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور گویا وہ اس بارے میں باری تعالیٰ کے اوصاف وخلق کے ساتھ مشابہت اختیار کرتا ہے بایں طور کہ جس طرح اللہ رب العزت کھانے پینے سے منزہ اور پاک ہے اس طرح بھی دن میں اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات وعلائق سے منزہ رکھتا ہے لہٰذا اس سبب سے روزہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔عبرت خیز وعبرت آموز ! ابھی آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ عرب کے مشرکین تک روزہ میں کسی کو اللہ کا شریک نہیں کرتے تھے ان کا روزہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص قرار دیتے تھے لیکن اب روزہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں رہ گیا ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اب بعض بزرگوں کے نام پر اور ان کے لیے بھی روزہ رکھا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو گمراہی وضلالت کے اس راستے سے بچائے اور صرف اپنی مرضیات تابع و پابند بنائے آمین۔

وہ چیزیں جن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

کسی شخص کو روزے کا خیال نہ رہا اور اس وجہ سے اس نے کچھ کھا پی لیا یا جماع کر لیا تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، خواہ روزہ فرض ہو یا نفل کسی شخص نے بھول کر جماع شروع کیا پھر فوراً ہی یاد آگیا کہ روزہ دار ہوں تو اگر اس نے یاد آتے ہی فوراً اپنا عضو مخصوص شرمگاہ سے باہر نکال لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر نہ نکالا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اس صورت میں اس روزے کی قضا لازم ہوگی کفارہ ضروری نہیں ہوگا مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ کفارہ کا ضروری نہ ہونا اس صورت سے متعلق ہے جب کہ اپنے بدن کو حرکت نہ دے یعنی یاد آجانے کے بعد دھکا نہ لگائے۔ جس سے کہ انزال ہو جائے کیونکہ اگر دھکا لگائے تو کفارہ لازم ہوگا جیسا کہ اگر کوئی شخص یاد آجانے کے بعد عضو مخصوص باہر نکال کر پھر داخل کرے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے قصداً جماع میں مشغول ہو گیا اور اسی دوران فجر طلوع ہو گئی تو اسے فوراً علیحدہ ہو جانا ضروری ہوگا اگر نہ صرف یہ کہ فوراً علیحدہ نہ ہو بلکہ بدن کو حرکت بھی دے تو اس صورت میں کفارہ لازم ہوگا۔ ہاں بدن کو حرکت نہ دے اور علیحدہ بھی نہ ہو تو صرف روزہ فاسد ہو جائے اگر کوئی شخص طلوع فجر کے خوف سے جماع سے علیحدہ ہو جائے اور پھر طلوع فجر کے بعد جماع سے علیحدہ ہو جانے کی صورت میں انزال ہو جائے تو اس سے روزہ پر اثر نہیں پڑے گا۔ اگر کوئی شخص بھول کر کچھ کھا پی رہا ہو تو دوسرے لوگوں کو اسے یاد دلانا چاہیے کیونکہ ایسی حالت میں اسے یاد نہ دلانا مکروہ ہے بشرطیکہ اس شخص میں روزہ رکھنے کی قوت ہو اور وہ بغیر کسی مشقت کے رات تک اپنا روزہ پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو اگر کوئی شخص اسے یاد دلا دے اور پھر بھی اسے یاد نہ آئے اور وہ کھا پی لے تو اس صورت میں اس پر قضا لازم ہوگی اگر اس شخص میں روزہ رکھنے کی قوت نہ ہو تو اسے یاد نہ دلانا ہی

اولی ہے۔عورت کی شرمگاہ کی طرف نظر ڈالنے کی وجہ سے انزال ہونے کی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جانور کے ساتھ فعل بد کرنے سے انزال ہوجانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر انزال نہ ہو تو متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ صرف فعل بد کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔جلق کے ذریعے انزال ہوجانے کی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا لازم آتی ہے کفارہ ضروری نہیں ہوتا اس بارے میں یہ بات جان لینی ضروری ہے کہ یہ فعل قبیح (جلق) غیر رمضان میں بھی حلال نہیں ہے جب کہ اسے قضاء شہوت مقصود ہو ہاں اگر تسکین شہوت مقصود ہو تو پھر امید ہے کہ اس صورت میں کوئی وبال نہیں ہوگا یعنی اگر کوئی شخص محض لذت حاصل کرنے کے لیے اس فعل میں مبتلا ہو تو اس کے لیے یہ قطعا حلال نہیں ہے اور اگر اضطراب و بیقراری کی یہ حالت ہو کہ اس فعل کے ذریعے منی خارج نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہوجانے کا خوف ہو اور وہ جلق کرے تو پھر امید ہے کہ وہ گناہ گار نہ ہو لیکن اس پر مداومت بہرصورت گناہ کا باعث ہے۔کسی عورت کا تصور کرنے سے انزال ہوجائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اسی طرح دو عورتوں کا آپس میں فعل بد کرنا جیسے چپٹی لگانا بھی کہا جاتا ہے روزہ کو نہیں توڑتا بشرطیکہ انزال نہ ہوا گر انزال ہوگا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم آئے گی تیل لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ مسامات کے ذریعے کسی چیز کا بدن میں داخل ہونا روزے کے منافی نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص نہائے اور اس کے جگر کو ٹھنڈک پہنچے اسی طرح سرمہ لگانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو یا اس کا رنگ رینٹ اور تھوک میں ظاہر ہو کیونکہ آنکھ اور دماغ کے درمیان کوئی نہیں ہے اسی لیے آنکھوں

سے آنسو بھی ٹپک کر نکلتے ہیں جیسا کہ کسی چیز کا عرق کشید ہوتا ہے اور یہ بتایا ہی جا چکا ہے کہ جو چیز مسامات کے ذریعے بدن میں داخل ہوتی ہے وہ روزہ کے منافی نہیں ہے پھر یہ کہ سرمہ کے بارے میں حضرت عائشہ (رض) کی یہ روایت منقول ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے اسی طرح اگر آنکھ میں دوا یا دودھ تیل کے ساتھ ڈالا جائے اور اس کا مزہ یا اس کی تلخی حلق میں محسوس ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کوئی شخص کوئی چیز یعنی روئی وغیرہ نگل جائے درآنحالیکہ وہ کسی ڈورے میں بندھی ہو اور ڈورہ اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا جب تک وہ ڈورے سے کھل کر پیٹ میں نہ گر جائے اگر ڈورے سے کھل کر گر پڑے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر کوئی حلق میں لکڑی یا اسی کی مانند کوئی اور چیز داخل کرے اور اس کا دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی انگلی مقعد میں داخل کرے یا کوئی عورت اپنی شرمگاہ میں داخل کرے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ ہاں اگر انگلی پانی یا تیل سے تر ہوگی تو ٹوٹ جائے گا۔ سینگی اور غیبت سے روزہ فاسد نہیں ہوتا البتہ روزہ کا ثواب جاتا رہتا ہے محض افطار کی نیت کرنے سے جب کہ کچھ کھائے پیئے نہیں روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کسی شخص کے حلق میں بے قصد و بے اختیار دھواں چلا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا کیونکہ اس سے بچنا قطعاً ناممکن ہے اگر کوئی شخص احتیاط کے پیش نظر ایسے موقعہ پر اپنا منہ بند بھی کرلے تو دھواں ناک کے ذریعے داخل ہوگا، لہٰذا یہ تری کی قسم سے ہے جو کلی کے بعد منہ میں باقی رہتی ہے اور جس سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہاں اگر قصداً کوئی شخص اپنے حلق میں دھواں داخل کرے گا اور داخل کرنا کسی بھی صورت سے ہو تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ دھواں عنبر کا ہو یا اگربتی کا یا ان کے علاوہ کسی بھی چیز کا لہٰذا اگر کوئی شخص خوشبو کی کوئی چیز جلا کر

اس کا دھواں اپنی طرف لے گا اور اس کو سونگھے گا باوجود یکہ اسے یہ یاد ہو کہ میں روزہ دار ہوں تو
اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ اس کے لیے اس سے بچنا ممکن ہے اس مسئلہ سے اکثر لوگ
غافل ہیں اس بارے میں احتیاط پیش نظر رہنی چاہیے یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس مسئلے کو
مشک وگلاب اور دیگر خوشبو کے سونگھنے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ محض خوشبو دار دھوئیں کے
اس جوہر میں جو قصداً حلق میں داخل کیا جائے جو فرق ہے وہ سب ہی جانتے ہیں اسی طرح حقہ
کے دھوئیں سے بھی روزہ جاتا رہتا ہے کیونکہ وہ قصداً کھینچا جاتا ہے اور اس سے نفس کو تسکین ہوتی
ہے اور اکثر حالت میں بطور دوا استعمال کیا جاتا ہے۔ پسینہ اور آنسو حلق میں جانے سے روزہ پر
اثر نہیں پڑتا جب کہ وہ تھوڑی مقدار میں ہوں ہاں اگر وہ زیادہ مقدار میں جائیں کہ جس سے حلق
میں نمکینی محسوس ہو تو روزہ ٹوٹ جائے گا کسی خوشبو کی چیز مثلاً پھول وعطر وغیرہ سونگھنے سے بھی روزہ
نہیں ٹوٹتا۔ کسی شخص کے حلق میں غبار یا چکی پیستے ہوئے آٹا یا مکھی جائے یا دوائیں کوٹتے ہوئے
یا ان کی پڑیا باندھتے ہوئے اس میں سے کچھ اڑ کر حلق میں چلا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ
ان چیزوں سے بچنا ناممکن ہے۔ کوئی روزہ دار حالت جنابت میں صبح کو اٹھے تو اس کا روزہ فاسد
نہیں ہوگا اگرچہ وہ پورے دن یا کئی دن تک اسی طرح رہے اور غسل پاکی نہ کرے البتہ نجس
رہنے اور نماز وغیرہ پڑھنے کی وجہ سے ثواب سے محروم رہے گا۔ اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں
اپنے عضو مخصوص کے سوراخ میں دوا یا تیل ڈالے یا اسی طرح سلائی وغیر داخل کرائے تو اگرچہ
یہ چیزیں مثانہ تک پہنچ جائیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ کے قول
کے مطابق روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ مثانہ نہ صرف یہ کہ جوف سے خارج ہے بلکہ مثانہ میں سے اندر
کو راستہ نہیں ہے اسی لیے پیشاب بھی ٹپک کر نکلتا ہے البتہ امام ابو یوسف کے نزدیک مذکورہ بالا

صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے ہاں اگر یہ چیزیں مثانہ تک نہ پہنچیں بلکہ عضو مخصوص کی اندرونی
نالی تک ہی محدود رہیں تو تینوں حضرات کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ کوئی شخص پانی میں
بیٹھ جائے اور پانی اس کے کان میں چلا جائے یا وہ تنکے سے اپنا کان کھجلائے اور تنکے پر کان کا
میل ظاہر ہو اور پھر وہ اس تنکے کو کان میں ڈالے اور اس طرح کئی مرتبہ کرے تب بھی روزہ فاسد
نہیں ہوگا۔ کسی شخص کی ناک میں دماغ سے اتر کر بلغم آجائے اور وہ اس کو چڑھا جائے یا نگل
جائے جیسا کہ اکثر بے تمیز اور کثیف الطبع لوگ کرتے ہیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کسی کے منہ سے لعاب
نکلے اور وہ منقطع نہ ہو بلکہ مثل تار کے لٹک کر ٹھوڑی تک پہنچ جائے اور پھر وہ اس لعاب کو اوپر
کھینچ کر نگل جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر لعاب لٹکتا نہ بلکہ منقطع ہو کر گر جائے اور پھر وہ اسے
منہ میں ڈال لے تو روزہ جاتا رہے گا، منہ بھر بلغم نگل جانے سے امام ابو یوسف کے نزدیک
روزہ جاتا رہتا ہے مگر امام اعظم کے نزدیک اس سے روزہ نہیں جاتا امام شافعی کے نزدیک
جب کہ بلغم وغیرہ کے تھوک دینے پر قادر ہو اور اس کے باوجود نگل جائے تو روزہ فاسد ہو جاتا
ہے۔ بے اختیار قے ہو جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا خواہ قے کسی قدر ہو منہ بھر کر یا اس سے
زیادہ اسی طرح صورت میں بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا جب کہ آئی ہوئی قے بے اختیار حلق کے نیچے
اتر جائے خواہ وہ کسی قدر ہو لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے
ہاں اگر وہ قصداً نگل جائے اور منہ بھر کر ہو تو سب ہی کے نزدیک روزہ جاتا رہے گا البتہ کفارہ
لازم نہیں آئے گا اور اگر منہ بھر کر نہیں ہوگی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اگر کوئی شخص قصداً قے کرے
اور منہ بھر کر ہو تو متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہے گا اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو امام ابو یوسف
کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوگا اور صحیح یہی ہے حضرت امام محمد کا قول ہے کہ منہ بھر کر نہ ہونے کی

صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے۔ جو قے عمداً کی جائے اور منہ بھر کر نہ ہو اور وہ بے اختیار حلق کے نیچے اتر جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، قصداً نگل جانے کے بارے میں دو قول ہیں صحیح قول یہ ہے کہ اس صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ کوئی چیز جو غذا وغیرہ کی قسم سے ہو اور رات میں دانتوں کے درمیان باقی رہ گئی ہو تو دن میں اسے نگل جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ چنے کی مقدار سے کم ہو اور منہ سے باہر نکال کر نہ کھائی جائے، اسی طرح کسی کے دانتوں سے یا منہ کے کسی دوسرے اندرونی حصے سے خون نکلے اور حلق میں چلا جائے تو روزہ نہیں جاتا بشرطیکہ وہ پیٹ تک نہ پہنچے یا پیٹ میں پہنچ جائے مگر تھوک کے ساتھ مخلوط ہو کر اور تھوک سے کم اور اس کا مزہ حلق میں محسوس نہ ہو اگر خون پیٹ تک پہنچ جائے گا اور وہ تھوک پر غالب ہوگا یا تھوک کے برابر ہوگا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص بقدر تل کوئی چیز باہر سے منہ میں ڈال کر چبائے اور وہ منہ میں پھیل بھی جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو، ہاں اگر وہ چیز منہ میں پھیلے نہیں نیز اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو یا یہ کہ بغیر چبائے ہی اس چیز کو نگل جائے اور حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو تب بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر وہ چیز ان چیزوں میں سے ہوگی جن سے کفارہ لازم آتا ہے تو کفارہ ضروری ہوگا نہیں تو قضاء لازم آئے گی۔

وہ چیزیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور جن سے کفارہ اور قضا دونوں لازم آتے ہیں

سب سے پہلے یہ بات جان لینی ضروری ہے کہ روزہ فاسد ہو جانے کی صورت میں کفارہ کن لوگوں پر اور کن حالات میں لازم ہوگا۔ کفارہ اس وقت لازم ہوتا ہے جب کہ روزہ رکھنے والا مکلف یعنی عاقل و بالغ ہو، روزہ رمضان کا ہو اور رمضان ہی کے مہینے میں ہو یعنی رمضان کے قضاء روزوں

میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوتا، نیت رات ہی سے کئے ہوئے ہو اگر طلوع فجر کے بعد نیت کی ہوگی، تو روزہ توڑنے پر کفارہ لازم نہیں ہوگا، روزہ توڑنے کے بعد ایسا کوئی امر پیش نہ آئے جو کفارہ کو ساقط کر دینے والا ہو جیسے حیض ونفاس، اگر روزہ توڑنے کے بعد ان میں سے کوئی چیز پیش نہ آئے جس سے کفارہ ساقط ہو جاتا ہے، جیسے سفر کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ توڑے گا تو کفارہ لازم نہیں آئے ہاں اگر کوئی شخص سفر سے پہلے روزہ توڑ دے گا تو کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب یہ تمام شرائط پائی جائیں گی اور مندرجہ ذیل مضرات صوم (روزہ کو توڑنے والی چیزوں) میں سے کوئی صورت پیش آئے گی تو کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوں گے۔ اس کے بعد اب دیکھئے کہ وہ کون سی چیزیں اور صورتیں ہیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور جن کی وجہ سے کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوتے ہیں۔ جماع کرنا، اغلام کرنا ان دونوں صورتوں میں فاعل اور مفعول دونوں پر کفارہ اور قضا لازم آتی ہے کھانا پینا خواہ بطور غذا یا بطور دوا۔ غذائیت کے معنی اور محمول میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ غذا کا محمول اس چیز پر ہوگا جس کو کھانے کے لیے طبیعت خواہش کرے اور اس کے کھانے سے پیٹ کی خواہش کا تقاضہ پورا ہوتا ہو۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ غذا کی چیز وہ کہلائے گی جس کے کھانے سے بدن کی اصلاح ہو اور بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ غذا انھیں چیزوں کو کہیں گے جو عادۃً کھائی جاتی ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بارش کا پانی، اولہ اور برف نگل جائے یا کچا گوشت کھائے خواہ وہ مردار ہی کا کیوں نہ ہو تو کفارہ لازم ہوگا اسی طرح چربی، خشک کیا ہوا گوشت اور گیہوں کھانے سے بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر ایک آدھ گیہوں منہ میں ڈال کر چبایا جائے اور وہ منہ میں پھیل جائے تو کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ اپنی بیوی یا محبوب کا تھوک نگل جانے سے

بھی کفارہ واجب ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی طبیعت کی خواہش کا دخل ہوتا ہے۔ ہاں ان کے علاوہ دوسروں کا تھوک نگلنے کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا، البتہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے نمک کو کم مقدار میں کھانے سے تو کفارہ لازم ہوتا ہے زیادہ مقدار میں کھانے سے نہیں۔ مستغنی میں اس قول کو روایت مختار کہا گیا لیکن خلاصہ اور بزاریہ میں لکھا ہے کہ مختار (یعنی قابل قبول اور لائق اعتماد) مسئلہ یہ ہے کہ مطلقاً نمک کھانے سے کفارہ واجب ہوتا ہے یعنی خواہ نمک زیادہ یا کم ہو۔ اگر بغیر بھنا جو کھایا جائے گا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ کچا جو نہیں جاتا، لیکن یہ خشک جو کا مسئلہ ہے۔ اگر تازہ خوشہ میں سے جو نکال کر بغیر بھنا ہوا بھی کھایا جائے گا تو کفارہ لازم آئے گا۔ گل ارمنی کے علاوہ وہ مٹی مثلاً ملتانی وغیرہ کھانے کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ عادۃً کھائی جاتی ہو تو اس پر بھی کفارہ لازم آئے گا اور اگر نہ کھائی جاتی ہو تو پھر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں الغیبۃ تفطر الصیام (غیبت روزہ کو ختم کر دیتی ہے) بظاہر تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار غیبت کرے گا تو اس کا روزہ جاتا رہے گا لیکن علماء امت نے اجتماعی طریقے پر اس حدیث کی تاویل یہ کی ہے کہ حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ غیبت کرنے سے روزہ جاتا رہتا ہے بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ جو روزہ دار غیبت میں مشغول ہوگا اس کے روزے کا ثواب جاتا رہے گا۔ حدیث اور اس کی تاویل ذہن میں رکھئے اور اب یہ مسئلہ سنئے کہ اگر کسی شخص نے کسی کی غیبت کی اور اس کے بعد قصداً کھانا کھا لیا تو اس پر کفارہ لازم آئے گا خواہ اسے یہ حدیث معلوم ہو یا معلوم نہ ہو اور خواہ حدیث کی مذکورہ بالا تاویل اس کے علم میں ہو یا علم میں نہ ہو نیز یہ کہ مفتی نے کفارہ لازم ہونے کا فتویٰ دیا ہو یا نہ دیا ہو کیونکہ حدیث اور اس کی تاویل سے قطع نظر غیبت کے بعد روزہ کا ختم ہو جانا قطعاً خلاف قیاس ہے۔ اسی طرح ایک

حدیث ہے افطر الحاجم والمحجوم (پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اس حدیث کی بھی یہ تاویل کی گئی ہے کہ پچھنے لگوانے سے چونکہ روزہ دار کو کمزوری لاحق ہو جاتی ہے اور زیادہ خون نکلنے کی صورت میں روزہ توڑ دینے کا خوف ہو سکتا ہے اسی طرح پچھنے لگانے والے کے بارے میں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ خون کا کوئی قطرہ اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔ اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے احتیاط کے پیش نظر یہ فرمایا کہ روزہ جاتا رہتا ہے ورنہ حقیقت میں پچھنے لگانے یا لگوانے سے روزہ ٹوٹتا نہیں۔ حدیث الغیبۃ تفطر الصیام کے برخلاف اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پچھنے لگانے یا لگوانے کے بعد اس حدیث کے پیش نظر اس گمان کے ساتھ کہ روزہ جاتا رہا ہے۔ قصداً کچھ کھا پی لے تو اس پر کفارہ صرف اسی صورت میں لازم آئے گا جب کہ وہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تاویل سے جو جمہور علماء سے منقول ہے واقف ہو یا یہ کہ کسی فقیہ اور مفتی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ پچھنے لگوانے یا لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ اس کا یہ فتویٰ حقیقت کے خلاف ہوگا اور اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی اور اگر اسے حدیث مذکور کی تاویل معلوم نہ ہوگی تو کفارہ لازم نہیں ہوگا الغیبۃ تفطر الصیام و افطر الحاجم والمحجوم دونوں حدیثوں کے احکام میں مذکورہ بالا فرق اس لیے ہے کہ غیب سے روزہ کا ٹوٹنا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تفریق تمام علماء امت کا اتفاق ہے جب کہ پچھنے سے روزہ کا ٹوٹ جانا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس نہیں ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تفریق پر تمام علماء امت کا اتفاق ہے کیونکہ بعض علماء مثلاً امام اوزاعی وغیرہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پچھنے لگانے یا لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ایسے ہی کسی شخص نے شہوت کے ساتھ کسی عورت کو ہاتھ لگایا، یا کسی عورت کا بوسہ لیا، یا کسی عورت

کے ساتھ ہم خواب ہوا، یا کسی عورت کے ساتھ بغیر انزال کے مباشرت فاحشہ کی یا سرمہ لگایا، یا فصد کھلوائی یا کسی جانور سے بدفعلی کی مگر انزال نہیں ہوا یا اپنی دبر میں انگلی داخل کی اور یہ گمان کر کے کہ روزہ جاتا رہے گا۔ اس نے قصداً کچھ کھا پی لیا تو اس صورت میں بھی کفارہ اسی وقت لازم ہوگا جب کہ کسی فقیہ یا مفتی نے مذکورہ بالا چیزوں کے بارے میں یہ فتویٰ دیا ہو کہ ان سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ اس کا یہ فتویٰ غلط اور حقیقت کے خلاف ہوگا اگر مفتی فتویٰ نہیں دے گا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ مذکورہ بالا چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس عورت پر کفارہ واجب ہوگا جس نے روزہ کی حالت میں کسی ایسے مرد سے برضا و رغبت اور بخوشی جماع کرایا جو جماع کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا چنانچہ کفارہ صرف عورت پر واجب ہوگا اس مرد پر نہیں۔ کسی عورت نے یہ جانتے ہوئے کہ فجر طلوع ہوگئی ہے اسے اپنے خاوند سے چھپایا، چنانچہ اس کے خاوند نے اس سے صحبت کر لی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ فجر طلوع ہوگئی ہے تو اس صورت میں بھی صرف عورت پر کفارہ واجب ہوا اور مرد پر واجب نہیں ہوگا۔

جن چیزوں سے کفارہ لازم آتا ہے

ایک عورت نے قصداً کھانا کھایا یا برضاء و رغبت جماع کرایا اور اسی دن اس کے ایام شروع ہوگئے یا نفاس میں مبتلا ہوگئی تو اس کے ذمہ سے کفارہ ساقط ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اس دن کسی ایسے مرض اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہوگیا جس میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور یہ کہ وہ مرض و تکلیف قدرتی ہو تو کفارہ ساقط ہو جائے گا۔ قدرتی کی قید اس لیے ہے کہ فرض کیجئے کسی شخص نے قصداً روزہ توڑ ڈالا اور پھر اپنے آپ کو اس طرح زخمی کر لیا کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے یا اپنے آپ کو چھت یا پہاڑ سے گرا لیا تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ تکلیف اور

مرض اس کا خود اپنا پیدا کیا ہوا ہوگا۔ایسی صورت میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اس صورت میں کفارہ ساقط ہو جائے گا جب کہ دوسرے حضرات کا قول ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوگا اور کمال کے قول کے مطابق مختار اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔جمع العلوم میں منقول ہے کہ اگر کسی شخص نے زیادہ چلنے یا کوئی کام کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تکلیف و مشقت میں مبتلا کیا یہاں تک کہ اسے بہت زیادہ اور شدید پیاس لگی اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ کفارہ لازم نہیں ہوگا اور اسی قول کو بقائی (رح) نے بھی اختیار کیا ہے جیسا کہ تاتارخانیہ میں منقول ہے۔

کفارہ کے مسائل

ایک روزے کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرنا چاہیے خواہ وہ غلام کافر ہی کیوں نہ ہو۔اگر عدم استطاعت کے سبب غلام آزاد کرنا ممکن نہ ہو یا کسی جگہ غلام نہ ملتا ہو تو پھر دو مہینے یعنی پورے ساٹھ دن پے در پے روزے رکھنا واجب ہے،ان روزوں کا علی الاتصال اور ایسے دنوں میں رکھنا ضروری ہے جن میں عیدین کے دن اور ایام تشریق (ذی الحجہ کی گیارہ،بارہ،تیرہ تاریخیں) واقع نہ ہوں کیونکہ ان دنوں میں کسی بھی طرح کے روزے رکھنا منع ہیں،اگر درمیان میں کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر کسی دن کا روزہ فوت ہو جائے تو پھر نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا ناغہ سے پہلے جس قدر روزے ہو چکے ہوں گے ان کا کوئی حساب نہیں ہوگا ہاں اگر کسی عورت کو حیض آجائے اور اس سبب سے درمیان کے روزے ناغہ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر نفاس کی وجہ سے ناغہ ہو جانے کی صورت میں نئے سرے سے روزے شروع کیے جائیں گے۔اور اگر مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے ساٹھ روزے رکھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ محتاجوں کو دو وقت

پیٹ بھر کر کھانا کھلانا واجب ہے اس طرح کہ چاہے تو انھیں ایک ہی دن دو وقت یعنی صبح وشام کھلا دے چاہے دو دن صبح کے وقت یا دو دن شام کے وقت یا عشاء وسحر کے وقت کھلا دے مگر شرط یہ ہے کہ اول وقت جن محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے تو دوسرے وقت بھی انھیں محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی نے ایک وقت ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا دیا اور پھر دوسرے وقت ان کے علاوہ دوسرے ساٹھ محتاجوں کو کھلایا تو یہ کافی نہیں بلکہ کفارہ اسی وقت ادا ہوگا جب کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کو پھر دوبارہ ایک وقت کا کھانا کھلائے ہاں اگر کوئی شخص ایک ہی محتاج کو مسلسل ساٹھ روز تک کھانا کھلائے یا مسلسل ساٹھ روز تک ہر روز نئے محتاج کو کھلائے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔اس طرح کفارہ ادا ہو جائے گا، ایک بات اور اگر کوئی شخص ایک ہی روز ساٹھ یا ان سے کچھ کم محتاجوں کے کھانے کے بقدر صدقہ کسی ایک محتاج کو دے دے گا تو وہ سب کے لیے ادا نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی محتاج کے لیے ادا ہوگا۔ ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلانے کے سلسلہ میں گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے کافی ہو جاتی ہے یعنی اگر ساٹھ محتاجوں کو صرف گیہوں کی روٹی ہی بغیر سالن کے پیٹ بھر کر کھلا دی جائے تو حکم پورا ہو جائے گا، بخلاف جو کی روٹی کے کہ اس کے ساتھ سالن ضروری ہے کیونکہ جو کی روٹی سخت ہونے کی وجہ سے عادۃً بغیر سالن کے پیٹ بھر کر نہیں کھائی جا سکتی جبکہ گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے بھی پیٹ بھر کر کھائی جا سکتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ گیہوں کی روٹی اپنی سالن خود اپنے اندر رکھتی ہے ۔لہٰذا جس شخص نے گیہوں کی روٹی کے ساتھ سالن مانگا وہ بھوکا نہیں ہے ۔ایک شرط یہ بھی ہے کہ جن ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے وہ سب بھوکے ہوں ان میں سے کوئی پیٹ بھرا نہ ہو اگر کوئی پیٹ بھرا ہوگا اور بھوکے کی مانند نہیں کھائے گا تو اس کی بجائے کسی دوسرے بھوکے کو کھانا کھلانا ضروری ہوگا۔

بہر کیف یا تو مندرجہ بالا طریقے اور شرائط کے مطابق محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے یا پھر یہ کہ چاہے تو ہر محتاج کو نصف صاع یعنی ایک کلو گرام ۶۳۳ گرام گیہوں یا اس کا آٹا یا اس کا ستو دے دیا جائے چاہے ایک صاع یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام جو یا انگور یا کھجور یا اس کی قیمت دی جائے اور چاہے اس طرح تمام محتاجوں کو ایک ہی وقت میں دے دیا جائے اور چاہے مختلف اوقات میں دے دیا جائے۔ اگر کسی شخص نے قصداً جماع کر کے یا قصداً کھا کر کئی روزے توڑے تو ان سب کے لیے ایک ہی کفارہ کافی ہوگا بشرطیکہ ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا ہو مثلاً کسی شخص نے دس روزے توڑے اور ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا تو ان دس روزوں کے لیے ایک کفارہ کافی ہو جائے گا اگر درمیان میں کوئی کفارہ ادا کیا تو پھر بعد کے روزوں کے لیے دوسرا کفارہ ضروری ہوگا پھر یہ کہ وہ توڑے ہوئے روزے چاہے ایک رمضان کے ہوں اور چاہے دو رمضان کے ہوں اس بارے میں صحیح مسئلہ بھی یہی ہے جیسا کہ درمختار میں مذکور ہے مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ وہ روزے ایک ہی رمضان کے ہوں اگر وہ روزے کئی رمضان کے ہوں گے تو ہر رمضان کے لیے علیحدہ علیحدہ کفارہ ضروری ہوگا چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔

وہ چیزیں جن سے صرف قضا لازم ہوتی ہے کفارہ لازم نہیں ہوتا

اس بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر کسی ایسی چیز سے روزہ فاسد ہو جو غذا کی قسم سے نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شرعی عذر کی بنا پر اسے پیٹ یا دماغ میں پہنچایا گیا ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جس سے شرمگاہ کی شہوت پوری طرح ختم نہ ہوتی ہو جیسے جلق وغیرہ تو ایسی چیزوں سے کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ صرف قضا ضروری ہے لہٰذا اگر روزہ دار رمضان میں کچے چاول اور خشک یا گوندھا ہوا آٹا کھائے تو

روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا واجب ہوتی ہے اور اگر کوئی جو یا گیہوں کا آٹا پانی میں گوندھ کر اور اس میں شکر ملا کر کھائے گا تو اس صورت میں کفارہ لازم ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص یکبارگی بہت زیادہ نمک کھائے یا گل ارمنی کے علاوہ کوئی ایسی مٹی کھائے جس کو عادۃً کھایا نہیں جاتا یا گٹھلی یا روئی یا اپنا تھوک نگل لے جو ریشم و کپڑے وغیرہ کے رنگ مثلاً زرد، سبزہ وغیرہ سے متغیر تھا اور اسے اپنا روزہ بھی یاد تھا یا کاغذ یا اس کے مانند ایسی کوئی چیز کھائی جو عادۃً نہیں کھائی جاتی یا کچی ہی یا اس کے مانند ایسا کوئی پھل کھائے جو پکنے سے پہلے عادۃً کھائے نہیں جاتے اور انھیں پکا کر یا نمک ملا کر نہیں کھایا، یا ایسا تازہ اخروٹ کھایا جس میں مغز نہ ہو یا کنکر، لوہا، تانبا، سونا چاندی اور یا پتھر خواہ وہ زمرد وغیرہ ہی ہو نگل گیا تو ان صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہوگا، صرف قضا لازم ہوگی اسی طرح اگر کسی نے حقنہ کرایا، یا ناک میں دوا ڈالی یا منہ میں دوا رکھی اور اس میں سے کچھ حلق میں اتر گئی اور یا کانوں میں تیل ڈالا تو ان صورتوں میں بھی صرف قضا لازم آئے گی کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ کان میں قصداً پانی ڈالنے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ہدایہ ملتقیٰ، درمختار، شرح وقایہ اور اکثر متون میں مذکور ہے کہ اس صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا مگر قاضی خان اور فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اس بارے میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔ کسی شخص نے پیٹ کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ پیٹ میں پہنچ گئی یا سر کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ دماغ میں پہنچ گئی یا حلق میں بارش کا پانی یا برف چلا گیا اور اسے قصداً نہیں نگلا بلکہ از خود حلق سے نیچے اتر گیا یا چوک میں روزہ جاتا رہا مثلاً کلی کرتے ہوئے پانی حلق کے نیچے اتر گیا یا ناک میں پانی دیتے ہوئے دماغ کو چڑھ گیا، یا کسی نے زبردستی روزہ تڑوا دیا خواہ جماع ہی کے سبب سے یعنی خاوند نے زبردستی بیوی سے جماع کیا یا بیوی نے زبردستی خاوند سے جماع کرایا تو ان

سب صورتوں میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا لازم ہوگی ہاں جماع کے سلسلہ میں زبردستی کرنے والے پر کفارہ بھی لازم ہوگا اور جس کے ساتھ زبردستی کی گئی اس پر صرف قضا واجب ہوگی۔ اگر کوئی عورت جو لونڈی ہو (خواہ حرم یا منکوحہ) خدمت و کام کاج کی وجہ سے بیمار ہو جانے کے خوف سے روزہ توڑ ڈالے تو اس پر قضا لازم ہوگی، اسی طرح اگر لونڈی اس صورت میں روزہ توڑ ڈالے جب کہ کام کاج مثلاً کھانا پکانا یا کپڑا وغیرہ دھونے کی وجہ سے ضعف و توانائی لاحق ہوگئی تو اس صورت میں بھی قضا واجب ہوگی اس ضمن میں یہ مسئلہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اگر کسی لونڈی کو اس کا آقا کسی ایسے کام کے لیے کہے جو ادائے فرض سے مانع ہو تو اس کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا چاہیے کسی شخص نے روزہ دار کے منہ میں سونے کی حالت میں پانی ڈال دیا یا خود روزہ دار نے سونے کی حالت میں پانی پی لیا تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر قضا واجب ہوگی اس مسئلہ کو بھول کر کھا پی لینے کی صورت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اگر سونے یا وہ شخص کہ جس کی عقل جاتی رہی ہو کوئی جانور ذبح کرے تو اس کا مذبوحہ کھانا حلال نہیں ہے اس کے برخلاف اگر کوئی ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو اس کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا جائز ہے اسی طرح یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ بھول کی حالت میں کھانے پینے والے کا روزہ نہیں ٹوٹے گا، ہاں کوئی شخص سونے کی حالت میں کھا پی لے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ ایک شخص نے بھول کر روزے میں کچھ کھا لیا پھر اس کے بعد قصداً کھایا، یا بھول کر جماع کر لیا اور اس کے بعد پھر قصداً جماع کیا یا دن میں روزہ کی نیت کی پھر قصداً کھا پی لیا یا جماع کیا، یا رات ہی سے روزہ کی نیت کی پھر صبح ہو کر سفر کیا اور پھر اس کے بعد اقامت کی نیت کر لی اور کچھ کھا پی لیا اگرچہ اس صورت میں اس کے لیے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا، یا رات سے روزہ کی نیت کی، صبح کو

مقیم تھا، پھر سفر کیا اور مسافر ہوگیا اور حالت سفر میں قصداً کھایا یا جماع کیا، اگر چہ اس صورت میں اس کے لیے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا تو ان تمام صورتوں میں صرف قضا لازم ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا مسئلہ مذکورہ میں حالت سفر میں کھانے کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص سفر شروع کر دینے کے بعد پھر اپنی کوئی بھولی ہوئی چیز لینے کے لیے واپس اپنے گھر میں آئے اور اپنے مکان میں یا اپنے شہر و اپنی آبادی سے جدا ہونے سے پہلے قصداً کھالے تو اس صورت میں قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ اگر کوئی شخص تمام دن کھانے پینے اور دوسری ممنوعات روزہ سے رکا رہا مگر نہ تو اس نے روزہ کی نیت کی اور نہ افطار کیا، یا کسی شخص نے سحری کھائی یا جماع کیا اس حالت میں کہ طلوع فجر کے بارے میں اسے شک تھا حالانکہ اس وقت فجر طلوع ہو چکی تھی، یا کسی شخص نے غروب آفتاب کے ظن غالب کے ساتھ افطار کیا حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو ان صورتوں میں صرف قضا واجب ہوگی کفارہ لازم نہیں ہوگا اور اگر غروب آفتاب میں شک ہونے کی صورت میں افطار کیا اور حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس صورت میں کفارہ لازم ہونے کے بارے میں دو قول ہیں جس میں سے فقیہ ابو جعفر (رح) کا مختار قول یہ ہے کہ غروب آفتاب کے شک کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا اس طرح اگر کسی شخص کا ظن غالب یہ ہو کہ آفتاب غروب نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ روزہ افطار کرے اور حقیقت میں بھی سورج غروب نہ ہوا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔ کسی شخص کو جانور کے ساتھ یا میت کے ساتھ فعل بد کرنے کے سبب انزال ہوگیا یا کسی کی ران یا ناف یا ہاتھ کی رگڑ سے منی گرائی یا کسی کو چھونے یا اس کا بوسہ لینے کی وجہ سے انزال ہوگیا یا غیر ادائے رمضان کا روزہ توڑا تو ان سب صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہوگا بلکہ قضا لازم ہوگی، اسی طرح اگر کسی نے روزہ

دار عورت کے ساتھ اس کے سونے کی حالت میں جماع کیا تو اس عورت کا روزہ جاتا رہے گا اور اس پر صرف قضا لازم ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا، یا کسی عورت نے رات سے روزہ کی نیت کی اور جب دن ہوا تو دیوانی ہوگئی اور اس کی دیوانگی کی حالت میں کسی نے اس سے جماع کیا تو اس صورت میں اس عورت پر اس روزہ کی قضا لازم ہوگی۔ اگر کسی عورت نے اپنی شرمگاہ میں پانی یا دوائی ٹپکائی یا کسی نے تیل یا پانی سے بھیگی ہوئی انگلی اپنے مقعد میں داخل کی یا کسی نے اس طرح استنجاء کیا کہ پانی حقنہ کی جگہ تک پہنچ گیا اگرچہ ایسا کم ہوتا ہے یا استنجاء کرنے میں زیادتی و مبالغہ کی وجہ سے پانی فرج داخل تک پہنچ گیا تو قضا واجب ہوگی۔ کسی شخص کو بواسیر ہو اور اس کے مسے باہر نکل آئیں اور وہ ان کو دھوئے تو اگر ان مسوں کو اوپر اٹھنے سے پہلے خشک کر لیا جائے گا تو ان کے اوپر چڑھ جانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ اس طرح پانی بدن کے ایک ظاہر حصہ پر پہنچا تھا اور پھر بدن کے اندرونی حصہ میں پہنچنے سے پہلے زائل ہوگیا ہاں اگر مسے اوپر چڑھنے سے پہلے خشک نہ ہوں گے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اگر کوئی عورت تیل یا پانی سے تر کی ہوئی انگلی اپنی شرم گاہ کے اندرونی حصے میں داخل کرے گی یا کوئی شخص روئی یا کپڑا یا پتھر اپنی دبر میں داخل کرے گا یا کوئی عورت ان چیزوں کو اپنی شرمگاہ کے اندرونی حصہ میں داخل کرے گی اور یہ چیزیں اندر غائب ہو جائیں گی تو روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم ہوگی ہاں اگر لکڑی وغیرہ کا ایک سرا ہاتھ میں رہے یا یہ چیزیں عورت کی شرمگاہ کے بیرونی حصہ ہی تک پہنچی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اسی طرح اگر کسی شخص نے ڈورا نگل لیا بایں طور کہ اس کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں ہو اور پھر وہ اس ڈورے کو باہر نکالے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اور اگر اس کا ایک سرا ہاتھ میں نہ ہو بلکہ سب نگل جائے تو یہ روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہوگی۔ جو شخص قصداً اپنے فعل

سے کسی چیز کا دھواں اپنے دماغ یا اپنے پیٹ میں داخل کرے گا تو بعید نہیں کہ کفارہ بھی لازم ہو جائے کیونکہ ان کا دھواں نہ صرف یہ کہ قابل انتفاع ہے بلکہ اکثر دواءً بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح سگریٹ بیڑی اور حقہ کا دھواں داخل کرنے کی صورت میں بھی کفارہ لازم ہو سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے قصداً قے کی خواہ وہ منہ بھر کر نہ آئی ہو تو اس کا روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم آئے گی اس بارے میں روایت یہی ہے لیکن حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ قصداً قے کرنے کی صورت میں روزہ اسی وقت فاسد ہوگا اور قضا لازم ہوگی جب کہ قے منہ بھر کر آئی ہو اگر منہ بھر کر نہ آئی ہوگی تو نہ روزہ فاسد ہوگا اور نہ قضاء لازم ہوگی۔ چنانچہ زیادہ صحیح اور مختار قول یہی ہے۔ کسی شخص کو از خود منہ بھر کر قے آئی اور وہ اسے نگل گیا، یا کسی شخص نے دانتوں میں اٹکی ہوئی کوئی چیز جو ایک چنے کے بقدر یا اس سے زیادہ تھی کھالی یا کسی شخص نے رات سے نیت نہیں کی، دن میں بھی اس نے نیت نہیں کی تھی کہ بھول کر کچھ کھالیا پی لیا اور اس کے بعد اس نے روزہ کی نیت کی تو ان سب صورتوں میں روزہ نہیں ہوگا اور قضا لازم ہوگی، یا اسی طرح کوئی روزہ دار بے ہوش ہو جائے اور خواہ وہ مہینہ بھر تک بے ہوش رہے تو اس پر قضا لازم ہوگی ہاں اس دن کے روزہ کی قضا لازم نہیں ہوگی۔ جس دن میں یا جس کی رات سے بیہوشی شروع ہوئی ہو کیونکہ مسلمان کے بارے میں نیک گمان ہی کرنا چاہیے اس لیے ہو سکتا ہے اس نے رات میں نیت کر لی ہو اور اس طرح اس کا روزہ پورا ہو جائے گا اب اس کے بعد جتنے دنوں بیہوش رہے گا ان کی قضا کرے گا۔ بے ہوشی شروع ہونے والے دن کے بارے میں بھی مگر یہ یقین ہو کہ نیت کی تھی تو اس دن کے روزہ کی قضا بھی ضروری ہوگی۔ بیہوشی کے دنوں کے روزوں کی قضا اس لیے ضروری ہوگی کہ اگرچہ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں مگر چونکہ روزہ کی نیت نہیں پائی گئی اس لیے

بیہوشی کی حالت میں اس کا بغیر نیت کچھ نہ کھانا پینا اور تمام چیزوں سے رکے رہنا کافی و کار آمد نہیں ہوگا اگر کسی شخص پر رمضان کے پورے مہینہ میں دیوانگی طاری رہی تو اس پر قضا واجب نہیں ہوگی ہاں مگر پورے مہینہ دیوانگی طاری نہ رہی تو پھر قضا ضروری ہوگی اور اگر کسی شخص پر پورے مہینے بایں طور دیوانگی طاری رہی کہ دن میں یا رات میں نیت کا وقت ختم ہوجانے کے بعد اچھا ہوجاتا تو جب بھی قضا ضروری نہیں ہوگی بلکہ یہ پورے مہینہ دیوانگی طاری رہنے کے حکم میں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے رمضان میں روزے کی نیت نہیں کی اور پھر اس نے دن میں کھایا پیا تو امام اعظم ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اس صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوگا صرف قضا لازم ہوگی مگر صاحبین کا قول یہ ہے کہ کفارہ واجب ہوگا۔ کسی شخص کا روزہ ٹوٹ گیا خواہ وہ کسی عذر ہی کی بناء پر ٹوٹا ہو پھر وہ عذر بھی ختم ہوگیا ہو تو اب اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دن کے بقیہ حصہ میں رمضان کے احترام کے طور پر کھانے پینے میں ممنوع دوسری چیزوں سے اجتناب کرے، اسی طرح اس عورت کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں روزہ میں ممنوع چیزوں سے اجتناب ضروری ہے جو حیض یا نفاس میں مبتلا تھی اور طلوع فجر کے بعد پاک ہوگئی نیز مسافر جو دن میں کسی وقت مقیم ہوگیا ہو یا بیمار جو اچھا ہوگیا ہو دیوانہ شخص جس کی دیوانگی جاتی رہی ہو، لڑکا جو بالغ ہوا ور کافر جو اسلام قبول کرلے ان سب لوگوں کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں کھانے پینے اور دوسری ممنوع چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے ان سب پر اس دن کے روزہ کی قضا لازم ہوگی البتہ موخر الذکر دونوں پر قضا لازم نہیں ہوگی۔ جو عورت حیض ونفاس میں مبتلا ہو یا جو شخص بیماری کی حالت میں ہو، یا جو شخص حالت سفر میں ہو ان کے لیے کھانے پینے سے اجتناب ضروری نہیں ہے تاہم ان کے لیے بھی یہ حکم ہے کہ عام نگاہوں سے بچ کر پوشیدہ طور پر کھائیں پئیں۔

روزہ دار کے لیے مکروہ اور غیر مکروہ چیزیں

روزہ دار کے لیے کسی چیز کا چکھنا (یعنی چکھ کر تھوک دینا) ذخیرہ میں منقول ہے کہ روزہ دار کے لیے بلا ضرورت کسی چیز کا چکھنا مکروہ ہے ہاں عذر کی صورت میں مکروہ نہیں ہے مثلاً کوئی شخص کھانے پینے کی کوئی چیز خریدے اور یہ خوف ہو کہ اگر اسے چکھ کر نہیں دیکھوں گا تو دھوکا کھا جاؤں گا یا یہ چیز میری مرضی کے مطابق نہیں ہوگی تو اس صورت میں اگر وہ اس چیز کو چکھ لے تو مکروہ نہیں ہوگا۔ فتاویٰ نسفی میں منقول ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند بد خلق اور ظالم ہو اور جو کھانے میں نمک کی کمی وبیشی پر اس کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہو تو اس کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ کھانا چکھ لے تا کہ اپنے خاوند کے ظلم وتشدد سے بچ سکے اور اگر خاوند نیک خلق ونیک مزاج ہو تو پھر عورت کے لیے چکھنا جائز نہیں ہوگا یہی حکم لونڈی کا بھی ہے بلکہ وہ نوکر وملازم بھی اس حکم میں شامل ہیں جو کھانا پکانے پر مقرر ہوتے ہیں۔ بلا عذر کسی چیز کا چبانا مکروہ ہے مثلاً کوئی عورت چاہے کہ روٹی وغیرہ چبا کر اپنے چھوٹے بچے کو دیدے تو اگر اس کے پاس کوئی ہوشیار بچی یا کوئی حائضہ ہو تو اس سے چبوا کر بچے کو دیدے خود نہ چبائے اس صورت میں خود چبا کر دینا مکروہ ہے ہاں اگر غیر روزہ دار ہاتھ نہ لگے تو پھر خود چبا کر دیدے اس صورت میں مکروہ نہیں ہوگا۔ روزہ دار کو مصطگی چبانا مکروہ ہے خواہ مرد ہو یا عورت کیونکہ اس کے چبانے سے روزہ ختم کرنے یا روزہ نہ رکھنے کا اشتباہ ہوتا ہے، ویسے تو مصطگی مرد کو غیر روزہ کی حالت میں بھی چبانا مکروہ ہے ہاں کسی عذر کی بناء پر اور وہ بھی خلوت میں چبانا جائز ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ مصطگی چبانا مردوں کے لیے مباح ہے جب کہ عورتوں کے لیے مستحب ہے کیونکہ وہ ان کے حق میں مسواک کے قائم مقام ہے۔ روزہ کی حالت میں بوسہ لینا اور عورتوں کے ساتھ مباشرت یعنی

ان کو گلے لگانا اور چمٹانا وغیرہ مکروہ ہے بشرطیکہ انزال کا خوف ہو یا اپنے نفس و جذبات کے بے اختیار ہو جانے کا اور اس حالت میں جماع کر لینے کا اندیشہ ہو اگر یہ خوف و اندیشہ نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں۔ قصداً منہ میں تھوک جمع کرنا اور اسے نگل جانا مکروہ ہے، اسی طرح روزہ دار کو وہ چیزیں اختیار کرنا بھی مکروہ ہے جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جانے کا خوف ہو جیسے فصد و پچھنے وغیرہ ہاں اگر فصد اور پچھنے کی وجہ سے ضعف ہو جانے کا احتمال نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔ روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا، موچھوں کو تیل لگانا اور مسواک کرنا خواہ زوال کے بعد ہی مسواک کی جائے اور یہ کہ خواہ مسواک تازی ہو یا پانی میں بھیگی ہوئی ہو مکروہ نہیں ہے۔ وضو کے علاوہ بھی کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا مکروہ نہیں ہے اسی طرح غسل کرنا اور تراوٹ و ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے بھیگا ہوا کپڑا بدن پر لپیٹنا مکروہ نہیں ہے، مفتی بہ قول یہی ہے کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ بات ثابت ہے چنانچہ یہ روایت آئندہ صفحات میں آئے گی۔ روزہ دار کے لیے جو چیزیں مستحب ہیں سحری کھانا، سحری کو دیر سے کھانا اور وقت ہو جانے پر افطار میں جلدی کرنا جب کہ فضا ابر آلود نہ ہو، جس دن فضا ابر آلود ہو اس دن افطار میں احتیاط یعنی دو تین منٹ کی تاخیر ضروری ہے۔

وہ اعذار جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے

ایسے اعذار کہ جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنا مباح ہے دس ہیں۔ (۱) مرض (۲) سفر (۳) اکراہ یعنی زبردستی (٤) حمل (٥) ارضاع یعنی دودھ پلانا (٦) بھوک (٧) پیاس (٨) بہت زیادہ بڑھاپا (۹) حیض (۱۰) نفاس۔ ان عوارض اور اعذار کو بتفصیل ذیل بیان کیا جا سکتا ہے۔ مرض اگر روزہ رکھنے کسی نئے مرض کے پیدا ہو جانے یا موجودہ مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو، تو اس صورت

میں روزہ نہ رکھنا چاہیے۔اسی طرح اگر یہ گمان ہو کہ روزہ رکھنے سے صحت وتندرستی دیر میں حاصل ہوگی تو بھی روزہ نہ رکھنا چاہیے کیونکہ بسا اوقات مرض کی زیادت اور اس میں طوالت ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے اس لیے ان سے اجتناب ضروری ہے۔مرض چونکہ نام ہے اس چیز کا جو طبیعت کے تغیر کا باعث ہوتی ہے اور جس کے سبب طبیعت کا سکون کرب و بے چینی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت پہلے اندرونی طور پر محسوس ہوتی ہے پھر اس کا اثر جسم پر ظاہر ہوتا ہے لہٰذا مرض کسی بھی قسم کا ہو خواہ وہ آنکھ دکھنے اور جسم و بدن کے کسی زخم کی صورت میں ہو یا درد سر و بخار وغیرہ کی شکل میں، جب اس میں زیادتی اس کے طول پکڑ جانے کا اندیشہ ہوگا تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی، بلکہ روزہ کی نیت کرنے کے بعد بھی اگر کوئی مرض پیدا ہو جائے مثلاً کسی کو سانپ بچھو کاٹے یا بخار چڑھ آئے یا دردسر ہونے لگے تو اس کو اس دن کا روزہ رکھنا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ روزہ توڑ دیا جائے۔علماء لکھتے ہیں کہ اگر کسی غازی اور مجاہد کو رمضان کے مہینہ میں دشمنان دین سے لڑنا ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ روزہ کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا جس کی بناء پر لڑائی میں نقصان پیدا ہوگا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے خواہ مسافر ہو یا مقیم۔اسی پر علماء نے اس مسئلہ کو بھی قیاس کیا ہے کہ جس شخص کو باری کا بکار آتا ہو اور وہ باری کے دن بخار چڑھنے سے پہلے اپنا روزہ ختم کر دے اس خوف کی بناء پر کہ آج بخار چڑھے گا جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس دن بخار نہ بھی آئے تو صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا جب کہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ دونوں صورتوں میں کفارہ لازم ہوگا۔ایسے ہی اگر بازار والے رمضان کی تیس تاریخ کو طبل ونقارہ یا گولے وغیرہ کی آوازسنیں اور گمان کر کے کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان ہے روزہ توڑ ڈالیں

اور پھر بعد میں معلوم ہو کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان نہیں تھا بلکہ کسی اور سبب سے طبل و نقارہ بجایا گیا تھا یا گولا داغا گیا تو اس صورت میں بھی ان پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ سفر سفر خواہ جائز ہو یا ناجائز، بے مشقت ہو جیسے پیادہ پا یا گھوڑے وغیرہ کی سواری پر، ہر حال میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر بے مشقت سفر میں بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھا جائے۔ بشرطیکہ اس کے تمام رفقاء سفر بغیر روزہ نہ ہوں اور سب کا خرچ مشترک نہ ہو، ہاں اگر اس کے تمام رفقاء سفر روزہ نہ رکھیں اور سب کا خرچ بھی مشترک ہو تو پھر روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہوگا تاکہ پوری جماعت کی موافقت رہے۔ اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے سفر شروع کر کے مسافر ہو جائے تو اس دن کا روزہ نہ رکھنا اس کے لیے مباح ہے ہاں اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرے تو اب اس کے لیے روزہ نہ رکھنا مباح نہیں ہوگا البتہ بیمار ہو جانے کی صورت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرنے والے کے لیے روزہ نہ رکھنا مباح ہوگا اور بہر صورت کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا واجب ہوگی خواہ سفر کی حالت میں بیماری کی وجہ سے روزہ توڑے یا بغیر بیماری کے۔ اکراہ (یعنی زبردستی) جو شخص روزہ نہ رکھنے پر مجبور کیا جائے اس کو بھی شریعت نے روزہ نہ رکھنے یا روزہ توڑنے کی اجازت دی ہے مثلاً کوئی شخص کسی روزہ دار کو زبردستی پچھاڑ کر اس کے منہ میں کوئی چیز ڈال دے یا کوئی شخص روزہ دار کو مجبور کرے کہ اگر تم نے روزہ رکھا تو تمہیں جان سے مار دیا جائے گا یا تمہیں ضرب شدید پہنچائی جائے گی، یا تمہارے جسم کا کوئی عضو کاٹ ڈالا جائے گا تو اس صورت میں اس کے لیے روزہ توڑنا یا روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ حمل حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے بشرطیکہ اپنی یا اپنے بچے کی مضرت کا خوف ہو، یا عقل میں فتور آجانے کا اندیشہ ہو مثلاً اگر حاملہ کو خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے خود اپنی دماغی و جسمانی کمزوری انتہاء کو پہنچ

جائے گی یا ہونے والے بچہ کی زندگی اور صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا یا خود کسی بیماری و ہلاکت میں مبتلا ہو جائے گی تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ قضا کر دے۔ ارضاع جس طرح حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے خواہ وہ بچہ اسی کا ہو کسی دوسرے کے بچہ کو باجرت یا مفت دودھ پلاتی ہو بشرطیکہ اپنی صحت وتندرستی کی خرابی یا بچے کی مضرت کا خوف ہو جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں" دودھ پلانے والی عورت" سے صرف دایہ مراد ہے غلط ہے، کیونکہ حدیث میں مطلقاً دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے چاہے وہ ماں ہو یا دایہ، چنانچہ ارشاد ہے۔ حدیث (ان اللہ وضع عن المسافر الصوع وشطر الصلوۃ وعن الحبلیٰ والمرضع الصوم)۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لیے روزہ اور آدھی نماز معاف کی ہے اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے بھی روزہ معاف کیا ہے۔ پھر یہ اگر اس بارے میں کوئی تخصیص ہوتی تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ تخصیص دایہ کی بجائے ماں کے لیے ہوتی کیونکہ دایہ کے لیے کسی بچہ کو دودھ پلانا واجب اور ضروری نہیں ہے وہ تو صرف اجرت کے لیے دودھ پلاتی ہے اگر وہ چاہے تو اس کام کو چھوڑ سکتی ہے جب کہ ماں کا معاملہ برعکس ہے اپنے بچہ کو دودھ پلانا اس پر دیانۃً واجب ہے خصوصا جب کہ باپ مفلس ہو۔ دودھ پلانے والی عورت کو دوا پینا جائز ہے جب کہ طبیب و ڈاکٹر کہے کہ یہ دوا بچے کو فائدہ کرے گی، مسئلہ بالا میں بتایا گیا ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے جب کہ اسے اپنی یا اپنے بچہ کی مضرت کا خوف ہو تو اس بارے میں جان لیجئے کہ خوف سے مراد یہ ہے کہ یا تو کسی سابقہ تجربہ کی بناء پر اپنی یا اپنے بچہ کی مضرت کا گمان غالب ہو یا یہ کہ مسلمان طبیب حاذق جس کا کردار عقیدہ وعمل کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو یہ بات کہے کہ روزہ

کی وجہ سے اسے ضرر پہنچے گا۔بھوک اور پیاس جس شخص کو بھوک یا پیاس کا اس قدر غلبہ ہو کہ اگر کچھ نہ کھائے یا پانی نہ پیئے تو جان جاتی رہے یا عقل میں فتور آجائے یا ہوش وحواس ختم ہو جائے تو اس کے لیے بھی روزہ رکھنا جائز ہے اور روزہ کی نیت کر لینے کے بعد اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے تب بھی اس کو اختیار ہے اگر روزہ توڑ دے گا تو کفارہ لازم نہ ہو گا صرف قضا واجب ہو گی مگر شرط یہ ہے کہ روزہ دار نے از خود اپنے نفس کو اس قدر مشقت میں مبتلا کر کے یہ حالت پیدا نہ کر دی ہو مثلاً کسی شخص نے از خود اپنے نفس کو بایں طور مشقت میں مبتلا کیا کہ بغیر کسی شدید ضرورت کے کوئی لمبی چوری دوڑ لگائی جس کی وجہ سے پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہو گا اگر چہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کفارہ لازم نہیں ہو گا۔حضرت علی بن احمد (رح) سے پیشہ و مزدوری کرنے والوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ کوئی مزدور یہ جانے کہ اگر میں اپنے اس کام میں مشغول ہوں گا تو ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤں گا جس میں روزہ نہ رکھنا مباح ہے درآنحالیکہ وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالنے کے لیے اس کام کے کرنے پر مجبور ہے تو آیا بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے اس کے کھانا مباح ہے یا نہیں؟ تو علی بن احمد نے اس بات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔لیکن اس بارے میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو درمختار میں لکھا ہے کہ اس صورت میں اگر اس مذکورہ بالا خوف ہو تو اسے چاہیے کہ وہ آدھے دن تو محنت ومزدوری کرے اور آدھے دن آرام کرے تاکہ اسباب معیشت بھی فراہم ہو جائیں اور روزہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔بڑھاپا شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ اس مرد اور عورت کو کہتے ہیں جو زندگی کے آخری سٹیج پر پہنچ چکے ہوں، ادائیگی فرض سے قطعاً مجبور اور عاجز ہوں اور جسمانی طاقت وقت روز بروز گھٹتی چلی جا

رہی ہو یہاں تک کہ ضعف وناتوانی کے سبب انھیں یہ قطعاً امید نہ ہو کہ آئندہ بھی کبھی روزہ رکھ سکیں گے۔حیض ونفاس جو عورت حیض یا نفاس میں مبتلا ہو تو اس کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔فدیہ مذکورہ بالا اعذار میں صرف شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے روزوں کا فدیہ ادا کریں ہاں اس شخص کے لیے فدیہ دینا جائز ہے جس نے ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر مانی ہو مگر اس سے عاجز ہو یعنی کوئی شخص یہ نذر مانے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا مگر بعد میں وہ اسباب معیشت کے حصول یا کسی اور عذر کی وجہ سے اپنی نذر کو پورا نہ کر سکتے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے البتہ ہر دن فدیہ دے دیا کرے ان کے علاوہ اور تمام اعذار کا مسئلہ یہ ہے کہ عذر زائل ہو جانے کے بعد روزوں کی قضا ضروری ہے فدیہ دینا درست نہیں یعنی فدیہ دینے سے روزہ معاف نہیں ہوگا اسی لیے اگر کوئی معذور اپنے عذر کی حالت میں مرجائے۔تو اس پر ان روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جانا واجب نہیں ہے جو اس کے عذر کی وجہ سے فوت ہوئے ہوں اور نہ اس کے وارثوں پر یہ واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں خواہ عذر یا بیماری کا ہو یا سفر کا، یا مذکورہ بالا اعذار میں سے کوئی اور عذر۔ ہاں اگر کوئی شخص اس حالت میں انتقال کرے کہ اس کا عذر زائل ہو چکا تھا اور وہ قضا روزے رکھ سکتا تھا مگر اس نے قضا روزے نہیں رکھے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ایام کے روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جائے جن میں مرض سے نجات پا کر صحت مند رہا تھا یا سفر پورا کر کے مقیم تھا اور یا جو بھی عذر رہا ہو وہ زائل ہو چکا تھا۔اگر کوئی شیخ فانی سفر کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کی طرف سے ان ایام کے روزوں کا فدیہ دینا ضروری نہیں ہوگا۔جن میں وہ مسافر رہا کیونکہ جس طرح اگر کوئی دوسرا شخص سفر کی حالت میں مرجائے تو اس کے لیے ایام سفر کے روزے معاف ہوتے ہیں اسی

طرح اس کے لیے بھی ان ایام کے روزے معاف ہوں گے۔ جس شخص پر فدیہ لازم ہو اور وہ فدیہ دینے پر قادر نہ ہو تو پھر آخری صورت یہی ہے کہ وہ اللہ رب العزت سے استغفار کرے عجب نہیں کہ ارحم الراحمین اسے معاف کر دے۔ فدیہ کی مقدار ہر دن کے روزے کے بدلے فدیہ کی مقدار نصف صاع یعنی ایک کلو ۲۳۳ گرام گیہوں یا اس کی مقدار ہے فدیہ اور کفارہ میں جس طرح تملیک جائز ہے اسی طرح اباحت طعام بھی جائز ہے یعنی چاہے تو ہر دن کے بدلے مذکورہ بالا مقدار کسی محتاج کو دے دی جائے اور چاہے ہر دن دونوں وقت بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ صدقہ فطر کے برخلاف کہ اس میں زکوۃ کی طرح تملیک ہی ضروری ہے اس بارے میں یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جو صدقہ لفظ اطعام یا طعام (کھلانے) کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک اور اباحت دونوں جائز ہیں اور جو صدقہ لفظ" ایتاء یا ادا" کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک شرط اور ضروری ہے اباحت قطعاً جائز نہیں ہے۔ قضاء روزے قضاء روزے پے درپے رکھنا شرط اور ضروری نہیں ہے تاہم مستحب ضرور ہے تاکہ واجب ذمہ سے جلد اتر جائے اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ جس شخص کا عذر زائل ہو جائے وہ فوراً روزے شروع کر دے کیونکہ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے ویسے مسئلہ یہ ہے کہ قضاء روزوں کا معاً عذر زائل ہوتے ہی رکھنا بھی ضروری نہیں ہے اختیار ہے کہ جب چاہے رکھے۔ نماز کی طرح اس میں ترتیب بھی فرض نہیں ہے قضا روزے رکھے بغیر ادا کے روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجئے کہ شریعت میں تیرہ قسم کے روزے ہیں جن میں سے سات قسم کے روزے تو وہ ہیں جو علی الاتصال یعنی پے درپے رکھے جاتے ہیں۔ (۱) رمضان کے مہینے کے روزے (۲) کفارہ ظہار کے روزے (۳) کفارہ قتل کے روزے۔ (٤) کفارہ یمین کے

روزے (٥) رمضان میں قصداً توڑے ہوئے روزوں کے کفارہ کے روزے (٦) نذر معین کے روزے (٧) اعتکاف واجب کے روزے۔ اور چھ قسم کے روزے ایسے ہیں جن میں اختیار ہے چاہے تو پے در پے رکھے جائیں چاہے متفرق طور پر یعنی ناغہ کے ساتھ۔ (١) نفل روزے (٢) رمضان کے قضا روزے (٣) متعہ کے روزے (٤) فدیہ حلق کے روزے (٥) جزاءِ صید کے روزے (٦) نذر مطلق کے روزے۔ صحیح یہ ہے کہ نفل روزے کا بھی بغیر کسی عذر کے توڑ ڈالنا جائز نہیں ہاں اتنی بات ہے کہ نفل روزہ شروع ہو جانے کے بعد واجب ہو جاتا ہے لہٰذا وہ کسی بھی حالت میں توڑا جائے گا تو اس کی قضا ضروری ہوگی ہاں پانچ ایام ایسے ہیں جن میں اگر نفل روزہ بعد شروع کر چکے کے توڑ دیا جائے تو قضا واجب نہیں ہوتی، دو دن تو عید و بقرعید کے اور تین دن تشریق (ذی الحجہ کی ١١، ١٢، ١٣، تاریخ) کے، چونکہ ان ایام کے روزے رکھنے ممنوع ہیں لہٰذا ان ایام میں جب روزہ شروع ہی سے واجب نہیں ہوگا تو اس کے توڑنے پر قضا بھی واجب نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شخص ان پانچوں ایام کے روزے کی نذر مانے یا پورے سال کے روزے کی نذر مانے تو ان دونوں صورتوں میں ان ایام میں روزے نہ رکھے جائیں بلکہ دوسرے دنوں میں ان کے بدلے قضا روزے رکھے جائیں۔ آخر میں ایک مسئلہ یہ بھی جان لیجیے کہ جب بچہ میں روزے رکھنے کی طاقت آجائے تو اسے روزہ رکھنے کے لیے کہا جائے اور جب وہ دس برس کا ہو جائے تو روزہ نہ رکھنے کی صورت میں اس پر سختی کی جائے اور اسے روزہ رکھنے پر مجبور کیا جائے جیسا کہ نماز کے بارے میں حکم ہے۔

شب قدر کب آتی ہے

حدیث؛

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :"تحروا الیلة القدر فی الوتر من العشر الأواخر من رمضان". رواہ البخاری

ترجمہ؛

ام المومنین حضرت عائشہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ (بخاری) تشریح رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں سے مراد ہیں اکیسویں وتیئسویں شب ستائیسویں شب اور انتیسویں شب۔

تشریح؛

اس باب میں لیلۃ القدر کی عظمت وفضیلت اوران اوقات کا بیان ہوگا جن میں اس مقدس رات کے آنے کی قوی امید ہوتی ہے یہ شب لیلۃ القدر اس لیے کہلاتی ہے کہ بندوں کے رزق ان کی زندگی وموت اور وہ واقعات وامور جو پورے سال رونما ہونے والے ہوتے ہیں وہ اسی رات میں لکھ دیئے جاتے ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس شب کے عظیم القدر ہونے کی وجہ سے اس کا نام لیلۃ القدر ہے۔ اس شب کے تعین میں بہت زیادہ اقوال ہیں، اکثر احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مقدس رات رمضان کے مبارک ماہ میں آتی ہے خصوصا رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات اور بالخصوص ستائیسویں شب لیلۃ القدر ہوتی ہے چنانچہ اکثر علماء ستائیسویں شب ہی کو لیلۃ القدر مانتے ہیں۔ لیلۃ القدر کی سعادت خاص طور پر

امت محمدیہ کے لیے مخصوص ہوئی ہے تاکہ اس امت کے لوگ اپنی چھوٹی عمروں کے باوجود بہت زیادہ پائیں چنانچہ اس بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پچھلی امتوں کے لوگوں کی عمروں کی زیادتی کے بارے میں معلوم ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے افسوس کا اظہار کیا کہ میری امت کے لوگ اپنی ان چھوٹی عمروں میں ان لوگوں کی طرح زیادہ نیک کام نہیں کر سکتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطہ سے پوری امت کو لیلۃ القدر کی عظیم سعادت عطا فرمائی جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔ ایک اور روایت میں جو ابن ابی حاتم سے منقول ہے بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بنی اسرائیل کے چار اشخاص کا ذکر کیا کہ انھوں نے اسی برس تک اللہ رب العزت کی عبادت کی اور ان کا ایک لمحہ بھی اللہ کی نافرمانی میں نہیں گزرا اور وہ اشخاص تھے۔ (۱) حضرت ایوب (علیہ السلام) (۲) حضرت زکریا (علیہ السلام) (۳) حضرت حزقیل (علیہ السلام) (٤) حضرت یوشع بن نون (علیہ السلام)۔ یہ سن کر صحابہ کرام بہت زیادہ تعجب کرنے لگے اور (متمنی ہوئے کہ کاش ہماری بھی اتنی ہی عمریں ہوتیں کہ ہم بھی اتنی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے) پھر حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اے محمد! آپ کی امت ان لوگوں کی اسی اسی برس کی عبادت پر متعجب ہوتی ہے (تو سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر و بھلائی عطا فرمائی چنانچہ انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آیت (انا انزلناہ فی لیلۃ القدر) پوری سورت پڑھی جس کے ذریعہ یہ عظیم بشارت عطا فرمائی گئی ہے کہ لیلۃ القدر جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور آپ کی پوری امت کو عطا کی

گئی ہے اس چیز سے بہتر ہے جس کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی امت متعجب و متمنی ہیں اس عظیم سعادت و خوش بختی پر سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت زیادہ خوش ہوئے۔ اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ہزار مہینہ کے تراسی برس اور چار مہینے ہوتے ہیں اسی لیے فرمایا کہ آیت (لیلۃ القدر خیر من الف شہر) یعنی لیلۃ القدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے کہ جس سے تراسی برس اور چار مہینے ہوئے۔ لیلۃ القدر میں اللہ رب العزت کی رحمت خاص کی تجلی آسمان دنیا پر غروب آفتاب کے وقت سے صبح تک ہوتی ہے۔ اس شب میں ملائکہ اور ارواح طیبہ صلحاء اور عابدین سے ملاقات کے لیے اترتی ہیں اسی مقدس رات میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا، یہی وہ شب ہے جس میں ملائکہ کی پیدائش ہوئی۔ اسی شب میں آدم (علیہ السلام) کا مادہ جمع ہونا شروع ہوا اسی شب میں جنت میں درخت لگائے گئے اس شب میں عبادت کا ثواب دوسرے اوقات کی عبادت سے کہیں زیاہ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مقدس شب ہے جس میں بندہ کی زبان و قلب سے نکلی ہوئی دعا بارگاہ رب العزت میں قبولیت سے نوازی جاتی ہے۔ شریعت نے واضح طور پر کسی شب کو متعین کر کے نہیں بتایا ہے کہ لیلۃ القدر فلاں شب ہے گویا اس شب کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر واضح طور پر اس شب کی نشان دہی کر دی جاتی تو عبادات و طاعات کی طرف لوگوں کا میلان نہ رہتا بلکہ صرف اسی شب میں عبادت کر کے یہ سمجھ لیتے کہ ہم نے پورے سال کی عبادت سے بھی زیادہ ثواب حاصل کر لیا اس لیے اس شب کو متعین نہیں کیا گیا تاکہ لوگ عبادات و طاعات میں ہمہ وقت مصروف رہیں صرف اسی شب پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ علماء لکھتے ہیں کہ جو شخص پورے سال عبادت الٰہی کے لیے شب بیداری کو اختیار کرے گا تو انشاء اللہ اسے شب قدر کی سعادت ضرور حاصل ہوگی اسی لیے کہا گیا ہے من لم یعرف قدر اللیلۃ

یعرف قدر لیلۃ القدر (جس شخص نے رات کی قدر نہ پہچانی یعنی عبادت الٰہی کے لیے شب بیداری نہیں کی وہ لیلۃ القدر کی عظمت وسعادت کو کیا پہچان پائیں گے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس رات کی کچھ ایسی علامتیں ہیں جو احادیث وآثار سے منقول ہیں اور بعض علامتیں اہل کشف نے پہچانی ہیں چنانچہ طبری نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ اس رات میں درخت بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوجاتے ہیں اور زمین پر گر پڑتے ہیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں اسی طرح اس رات میں ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس شب کے تعین کے سلسلہ میں ان چیزوں کا دیکھنا شرط نہیں ہے کیونکہ اکثر لوگ اس مقدس شب کو پالیتے ہیں مگر نہ تو وہ درختوں کو سجدہ ریز دیکھتے ہیں اور نہ تمام چیزیں سجدہ کرتی نظر آتی ہیں اس لیے ہوسکتا ہے ایک ہی جگہ دو آدمی موجود ہوں دونوں شب قدر کو پالیں ان میں سے ایک کو علامتیں نظر آئیں مگر دوسرے کو ان میں سے کچھ بھی محسوس نہ ہو بہرکیف سب سے بڑی علامت تو یہ ہے کہ اس مقدس رات میں عبادت الٰہی و ذکر و مناجات خضوع وخشوع اور حضور و اخلاص کی توفیق حاصل ہوجائے تو جانے کہ یہ عظیم سعادت حاصل ہوگئی۔اس رات میں شب بیداری کے سلسلہ میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ رات کے اکثر حصہ میں عبادت الٰہی کے لیے جاگتے رہنا معتبر ہے ہاں اگر کوئی شخص پوری شب جاگتا رہے تو افضل ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے کسی مرض وتکلیف میں مبتلا نہ ہوجائے یا فرائض وسنن موکدہ میں نقص وخلل واقع ہوجانے کا خوف نہ ہو، ورنہ تو رات کے جس قدر حصے میں جاگنے اور عبادت و ذکر میں مشغول رہنے کی توفیق حاصل ہوجائے انشاء اللہ مقصد حاصل ہوجائے گا۔(ولیس للانسان الا ماسعی وکان سعیہ مشکورا۔رزقنا اللہ۔

اعتکاف کا بیان

لغوی طور پر اعتکاف کے معنی ہیں ایک جگہ ٹھہرنا اور کسی مکان میں بند رہنا اور اصطلاح شریعت میں اعتکاف کا مفہوم ہے اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی کی خاطر اعتکاف کی نیت کے ساتھ کسی جماعت والی مسجد میں ٹھہرنا۔ اعتکاف کے لیے نیت اسی مسلمان کی معتبر ہے جو عاقل ہو اور جنابت اور حیض و نفاس سے پاک وصاف ہو، رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت موکدہ ہے کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رمضان کے آخری عشرہ میں ہمیشہ اعتکاف فرماتے تھے درمختار میں لکھا ہے کہ سنت موکدہ علی الکفایہ ہے یعنی اگر ایک شخص بھی اعتکاف کرلے تو سب کی طرف سے حکم ادا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں اعتکاف نہ کرنے والوں پر کوئی ملامت نہیں۔ اعتکاف کے لیے زبان سے نذر ماننے سے اعتکاف واجب ہو جاتا ہے خواہ فی الحال ہو جیسے کہ کوئی کہے میں اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اوپر اتنے دنوں کا اعتکاف لازم کرتا ہوں اور خواہ معلق ہو جیسے کوئی کہے کہ میں یہ نذر مانتا ہوں کہ اگر میرا کام ہو جائے گا تو میں اتنے دنوں کا اعتکاف کروں گا۔ گویا اعتکاف کی یہ دو قسمیں ہوئیں یعنی ایک تو سنت موکدہ جو رمضان کے آخری عشرہ میں ہے اور دوسرا واجب جس کا تعلق نذر سے ہے ان دو قسموں کے علاوہ تیسری قسم مستحب ہے یعنی رمضان کے آخری عشرہ کے سوا اور کسی زمانہ میں خواہ رمضان کا پہلا دوسرا عشرہ ہو یا اور کوئی مہینہ ہو اعتکاف کرنا مستحب ہے۔ اعتکاف مستحب کے لیے اکثر زیادہ سے زیادہ مدت کوئی مقدار متعین نہیں ہے اگر کوئی شخص تمام عمر کے اعتکاف کی بھی نیت کرلے تو جائز ہے البتہ اقل (کم سے کم) مدت کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں امام محمد کے نزدیک اعتکاف مستحب کے لیے کم سے کم مدت کی بھی کوئی مقدار متعین نہیں ہے دن ورات کے کسی بھی حصہ میں

ایک منٹ بلکہ اس سے بھی کم مدت کے لیے اعتکاف کی نیت کی جا سکتی ہے امام اعظم ابوحنیفہ کی ظاہر روایت بھی یہی ہے اور حنفیہ کے یہاں اسی قول پر فتویٰ ہے لہٰذا ہر مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ وہ جب بھی مسجد میں داخل ہو خواہ نماز کے لیے یا اور کسی مقصد کے لیے تو اس طرح اعتکاف کی نیت کر لے۔کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں جب تک کہ مسجد میں ہوں۔اسی طرح بلا کسی مشقت و محنت کے دن میں کئی مرتبہ اعتکاف کی سعادت و فضیلت حاصل ہو جایا کرے گی حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک اقل مدت دن کا اکثر حصہ یعنی نصف دن سے زیادہ ہے نیز حضرت امام اعظم کا ایک اور قول یہ ہے کہ اعتکاف کی اقل مدت ایک دن ہے یہ قول حضرت امام اعظم کی مذکورہ بالا ظاہر روایت کے علاوہ ہے جس پر فتویٰ نہیں ہے۔

آداب وشرائط اعتکاف

حدیث؛

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت :کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا اعتکف أدنی إلی رأسه وهو فی المسجد فأرجله وکان لا یدخل البیت إلا لحاجة الإنسان

ترجمہ؛

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اعتکاف کی حالت میں ہوتے تو مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنا سر مبارک میری طرف کر دیتے اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بالوں میں کنگھی کر دیتی نیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حاجت انسانی کے علاوہ گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔(بخاری ومسلم)

تشریح؛

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر معتکف اپنا کوئی عضو مسجد سے باہر نکالے تو اس سے اعکاف باطل نہیں ہوتا نیز اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ معتکف کے لیے کنگھی کرنا جائز ہے۔علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اگر معتکف اپنے جسم کا کوئی عضو مسجد کے اندر کسی برتن میں دھوئے تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس سے مسجد آلودہ نہ ہو۔حاجت انسانی کے ضمن میں حضرت امام اعظم کا مسلک یہ ہے کہ اگر معتکف بغیر حاجت وضرورت کے ایک منٹ کے لیے بھی معتکف سے نکلے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔حاجت یا ضرورت کی دو قسمیں ہیں اول طبعی جیسے پاخانہ پیشاب اور غسل جنابت یعنی احتلام ہو جانے کی صورت میں غسل کرنا۔البتہ جمعہ کے غسل کے بارے میں کوئی صریح روایت منقول نہیں ہے مگر شرح اوراد میں لکھا ہے کہ غسل کے لیے معتکف سے باہر نکلنا جائز ہے غسل خواہ واجب ہو (جیسے غسل جنابت) یا نفل ہو (جیسے غسل جمعہ وغیرہ۔دوم شرعی جیسے نماز عیدین اور اذان یعنی اگر اذان کہنے کی جگہ مسجد سے باہر ہو تو وہاں جانا بھی حاجت کے ضمن میں آتا ہے ان سے اعتکاف باطل نہیں ہوگا پھر یہ کہ صحیح روایت کے بموجب اس حکم میں موذن اور غیر موذن دونوں شامل ہیں نماز جمعہ کے لیے باہر نکلنا بھی حاجت یا ضرورت کے تحت آتا ہے۔لیکن اس بارے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ نماز جمعہ کے لیے اپنے معتکف سے زوال آفتاب کے وقت نکلے یا اگر جامع مسجد دور ہو تو ایسے وقت نکلے کہ جامع مسجد پہنچ کر جمعہ کی نماز تحیۃ المسجد جمعہ کی سنت کے ساتھ پڑھ سکے،نماز کے بعد کی سنت پڑھنے کے جامع مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے اور اگر کوئی شخص نماز سے زیادہ وقت کے لیے جامع مسجد میں ٹھہرے گا تو اگرچہ اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا مگر یہ مکروہ تنزیہی ہے اسی طرح اگر کسی معتکف کے ہاں خادم وملازم وغیرہ نہ ہو تو کھانا کھانے یا کھانا لانے کے لیے گھر جانا بھی ضرورت میں

داخل ہے۔ اگر مسجد گرنے لگے، یا کوئی شخص زبردستی مسجد سے باہر نکالے اور معتکف اسی وقت اپنے معتکف سے نکل کر فوراہی کسی دوسری مسجد میں داخل ہو جائے تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا استحساناً (بدائع) ایسے ہی اگر کوئی معتکف جان یا مال کے خوف سے کسی دوسری مسجد میں چلا جائے تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ کوئی معتکف پیشاب و پاخانہ یا اپنی کسی دوسری طبعی و شرعی ضرورت کے تحت معتکف سے باہر نکلا اور وہاں اس کو قرض خواہ مل گیا جس نے اسے ایک منٹ کے لیے بھی روک لیا تو حضرت امام اعظم کے نزدیک اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا جب کہ صاحبین حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد فرماتے ہیں کہ فاسد نہیں ہوگا۔ کوئی شخص پانی میں ڈوب رہا ہو یا کوئی آگ میں جل رہا ہو اور معتکف اسے بچانے کے لیے باہر نکلے یا جہاد کے لیے جب کہ نفیر عام ہو اور یا گواہی و شہادت دینے کے لیے اپنا معتکف چھوڑ کر باہر آجائے تو ان صورتوں میں اعتکاف فاسد ہو جائے گا غرضیکہ طبعی یا شرعی حاجت و ضرورت کے تحت مذکورہ بالا جو عذر بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ اگر کوئی معتکف ایک منٹ کے لیے بھی باہر نکلے گا اگر چہ اس کا نکلنا سہواہی کیوں نہ ہو تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا البتہ صاحبین کے ہاں اتنی آسانی ہے کہ اس کا اعتکاف اسی وقت فاسد ہوگا جب کہ وہ دن کا اکثر حصہ باہر نکلا رہے۔ مذکورہ بالا حدیث سے ایک مسئلہ یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معتکف کے لیے مسجد میں حجامت بنوانی جائز ہے بشرطیکہ بال وغیرہ مسجد میں نہ گریں۔

قرآن پڑھنے کی فضیلت

حدیث:

وعن عقبة بن عامر قال :خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن فی الصفة فقال :
"أیکم یحب أن یغدو کل یوم إلی بطحان أو إلی العقیق فیأتی منه بناقتین کوماوین فی
غیر إثم ولا قطع رحم" فقلنا یا رسول الله نحب ذلك قال :" أفلا یغدو أحدکم إلی المسجد
فیعلم أو یقرأ آیتین من کتاب الله عز وجل خیر له من ناقة أو ناقتین وثلاث خیر له من
ثلاث وأربع خیر له من أربع ومن أعدادهن من الإبل" . رواہ مسلم

ترجمہ:

حضرت عقبہ بن عامر (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر تشریف لائے۔ تو ہم صفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے دو اونٹنیاں بڑے کوہان والی بغیر کسی گناہ کے اور بغیر انقطاع صلہ رحمی کے لائے؟ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم سب پسند کرتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تو پھر سن لو کہ تم میں سے جو شخص مسجد میں جاتا ہے اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں کسی کو سکھاتا ہے یا خود پڑھتا ہے تو وہ اس کے لیے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے تین آیتیں اس کے لیے تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں اس کے لیے چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ حاصل یہ کہ آیتوں کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے (یعنی پانچ آیتیں پانچ اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چھ آیتیں چھ اونٹنیوں سے بہتر ہیں اسی طرح آگے تک قیاس کیا جائے۔ (مسلم)

تشریح:

صفہ وہ سایہ دار چبوترہ تھا جو مسجد نبوی کے سامنے بنا ہوا تھا اور وہ مہاجرین صحابہ جن کے نہ گھر بار تھا اور نہ بیوی بچے اور عبادت و زہد کے انتہائی بلند مقام پر تھے وہ اسی چبوترہ پر رہا کرتے اور ہمہ وقت ابرگاہ نبوت سے اکتساب فیض کرتے رہتے تھے گویا وہ اسلام کی سب سے پہلی اق امتی اور تربیتی درگاہ تھی جس کے معلم اول خود سرکار رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے اور طلباء کی جماعت صحابہ (رض) پر مشتمل تھی۔ بطحان مدینہ کے قریب ایک نالہ تھا اسی طرح عقیق بھی ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ کے مضافات میں تقریبا چار میل کے فاصلہ پر ہے ان دونوں جگہوں پر اس زمانہ میں بازار لگا کرتے تھے جس میں اونٹوں کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اہل عرب کے ہاں اونٹ ایک متاع گرانمایہ کے درجہ کی چیز تھی خصوصا بڑے کوہان کے اونٹ کی قدر و قیمت کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بڑے بلیغ اسلوب میں صحابہ سے مذکورہ سوال کر کے اس چیز کی طرف رغبت دلائی جو باقی رہنے والی ہے اور اس چیز سے نفرت دلائی جو دنیاوی اعتبار سے کتنی ہی قدر و قیمت کی کیوں نہ ہو لیکن مآل کار فانی اور ختم ہو جانے والی ہے۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ آپ نے اونٹ کا ذکر ان کو سمجھانے کے لیے صرف بطریق تمثیل فرمایا ورنہ تو دنیا کی تمام چیزیں بھی ایک آیت کے مقابلہ پر کوئی حقیقت اور قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔

قرآن مجید کیا ہے؟

یہ وہ سب سے مقدس اور سب سے عظیم کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کاروان انسانیت کے سب سے آخری اور سب سے عظیم راہنما رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوئی جو ظلم و

جہل کی تاریکیوں میں منارہ نور، کفر و شرک کے تابوت کی آخری کیل اور پوری انسانی برادری کے لیے اللہ کی طرف سے اتارا ہوا سب سے آخری اور سب سے جامع قانون ہے۔ اور جسے حبل متین کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کی عظمت و بزرگی اور اس کی فضیلت و رفعت کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ وہ خداوند عالم، مالک ارض و سماء اور خلق لوح و قلم کا کلام ہے تمام عیوب اور تمام نقائص سے بری اور پاک ہے فصاحت و بلاغت کا وہ آخری نقطہ عروج کہ بڑے بڑے عرب فصیح و بلیغ اس کے سامنے طفل مکتب علوم و معارف اور فکر و دانش کا وہ کوہ ہمالہ کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، فلسفی، دانشور اور ارباب فکر و نظر اس سے سر ٹکرائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور پڑھنے پڑھانے کا ثواب محتاج بیان نہیں تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ کوئی ذکر، تلاوت کلام مجید سے زیادہ ثواب نہیں رکھتا، خصوصاً نماز میں اس کی قرأت کا ثواب اور اس کی فضیلت اتنی ہے کہ وہ دائرہ تحریر سے باہر ہے، قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس کے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں اور نماز میں اس کی قرأت کے وقت اس کے ہر حرف کے عوض پچیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ قرآن کا پڑھنا بندہ کو اللہ کا قرب بخشتا ہے، قلب کو عرفان الٰہی اور ذکر اللہ کے نور سے روشن کرتا ہے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کرے گا۔ تلاوت قرآن کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ تفکر اور تذکر یعنی امور دین کو یاد دلانے اور آخرت کی طرف توجہ کا باعث ہو اور کثرت تلاوت کی وجہ سے احکام الٰہی یاد اور مستحضرت ہوں تا کہ احکام الٰہی پر عمل کیا جائے اور عبرت حاصل کی جائے تلاوت کا یہ مقصد نہیں کہ محض آواز و حروف کو آراستہ کیا جائے اور دل غفلت کے اندھیروں میں پڑا رہے چنانچہ جو شخص قرآن پڑھے مگر اس پر عمل نہ کرے تو قرآن ایسے شخص کا دشمن ہوتا ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو قرآن تو پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت

بھیجتا ہے کیونکہ قرآن صرف پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا ہے اور جو شخص قرآن پڑھتا تو ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا وہ گویا قرآن کی اہانت کرتا ہے۔لہٰذا قرآن پڑھنا اور اس پر عمل کرنا اس کے حق میں آخرت کے نقصان وخسران کی دلیل ہوگا۔ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تفکر وتدبر اور فہم معانی اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ آہستگی، وقار، ترتیل اور حضور دل کے ساتھ قرآن پڑھا جائے اسی لیے قرآن کی تجوید لازم ہے اور قرآن کا کم پڑھنا مشروع ہوا ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ قرآن کے حق کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ چالیس دن میں ایک قرآن ختم کیا جائے بلکہ ایک سال میں قرآن ختم کرنا بھی کافی ہے، نیز عبادت مثلا تراویح وغیرہ میں بھی ایک قرآن کم سے کم سات دن میں ختم کرنا چاہیے اور جس قدر اس سے زیادہ عرصہ میں ختم کرے افضل ہے۔جو شخص عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے قرآن کے معانی نہ جانتا ہو اس کو بھی چاہیے کہ وہ حضور دل کے ساتھ قرآن کی تلاوت شروع کرے اور اپنے ذہن میں یہ خیال جمائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے وہ احکام ہیں جو اس نے دنیا پر نازل فرمائے ہیں نیز وہ اس عاجز اور فروتنی کے ساتھ بیٹھ کر تلاوت کرے گا کہ گویا وہ قرآن نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ احکم الحاکمین کا کلام براہ راست سن رہا ہے۔

آداب تلاوت :

قرآن کریم اللہ رب العزت کا براہ راست کلام اور بارگاہ الوہیت سے اترے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہے اس کلام کی نسبت جس ذات کی طرف ہے وہ حاکموں کا حاکم، بادشاہوں کا بادشاہ اور پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔لہٰذا اس کی تلاوت کے وقت وہی آداب ملحوظ ہونے چاہئیں جو کلام اور صاحب کلام کی عظمت شان کے مطابق ہوں اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع

پر آداب تلاوت کا ذکر وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ سب سے پہلے مسواک کے ساتھ وضو کیجئے اس کے بعد کسی اچھی جگہ متواضع اور رو بقبلہ بیٹھے اپنے آپ کو کمتر و ذلیل اور عاجز جان کر اور قلب و دماغ کے حضور کے ساتھ بیٹھئے کہ گویا اللہ رب العزت کے سامنے بیٹھ کر عرض و نیاز اور التجا کر رہے ہیں پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر تلاوت کیجئے دل میں یہ تصور جمائیے کہ میں اللہ کا کلام بغیر کسی واسطہ کے سن رہا ہوں قرآن کی آیتوں کو آہستہ آہستہ تدبر، تفکر اور ترتیل کے ساتھ پڑھئے۔ جہاں بندوں کے حق میں وعدہ و رحمت کی آیت آئے تو تسبیح کیجئے، جہاد و وعید و عذاب کے متعلق آیت آئے اللہ سے پناہ مانگئے۔ جب اللہ رب العزت کی تنزیہ اور تقدیس پر مشتمل آیت آئے تو تسبیح کیجئے، یعنی جس آیت میں اللہ کی پاکی اور اس کی بڑائی و بزرگی کا بیان ہو اسے پڑھ کر سبحان اللہ کہئے، تلاوت کے درمیان الحاح وزاری اختیار کیجئے اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنالیجئے۔ حاصل یہ کہ تلاوت قرآن گویا بارگاہ الوہیت میں حاضری کا وقت ہے اس لیے اس موقع پر اللہ رب العزت کی عظمت و رفعت کے احساس سے اپنے اوپر مکمل عاجزی، ذلت اور فروتنی طاری کیجئے، اس بات کی کوشش نہ کیجئے کہ قرآن جلد ختم ہو اور اس کی وجہ سے تیز تیز پڑھنا شروع کر دیا جائے کیونکہ غور و فکر کے ساتھ کم پڑھنا آداب تلاوت کا لحاظ کئے بغیر زیادہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ پھر یہ کہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے سے ختم شماری کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ امر ممنوع ہے لہٰذا آج کل جو یہ رسم چل گئی ہے کہ لوگ پورا قرآن ایک دن میں ختم کرنے یا زیادہ تیز پڑھنے کو فخریا کمال کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ نہایت بری اور غفلت و نادانی کی بات ہے۔ خواجہ پندارد کہ طاعت می کند بے خبر کز معصیت جان می کند بعض بزرگوں سے جو زیادہ سے زیادہ پڑھنا ثابت ہے تو وہ ان کی کرامت ہے اس بارے میں ان کی پیروی نہ کیجئے حاصل یہ کہ تدبر، ذوق،

حضورِقلب اور آداب تلاوت کی رعایت کے ساتھ جس قدر بھی تلاوت کر پائیں اسی کو غنیمت سمجھئے۔ جس مجلس میں لوگ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوں یا شوروغوغا ہو وہاں تلاوت نہ کیجئے ہاں اگر تلاوت ضروری ہی ہو اور کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو تو تلاوت کیجئے مگر آہستہ آواز کے ساتھ، البتہ اگر لوگ تلاوت سننے کے مشتاق ہوں اور خاموش و پرسکون ہوں تو باآواز بلند تلاوت افضل ہوگی کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تلاوت سننے والا اور تلاوت کرنے والا دونوں اجر و ثواب میں یکساں شریک ہیں۔ اسی طرح مصحف (قرآن) میں دیکھ کر پڑھنا بغیر دیکھے پڑھنے سے افضل ہے کیونکہ اس طرح آنکھیں اور دوسرے اعصاب بھی عبادت میں شریک ہوتے ہیں اور حضورِقلب بھی زیادہ میسر ہوتا ہے۔ قرآن کریم کو رحل یا کسی دوسری بلند چیز (مثلاً تکیہ) پر رکھئے تاکہ قرآن کی تعظیم و تکریم آشکارا ہو، تلاوت کے دوران دنیوی کلام و گفتگو، کھانے پینے اور دوسرے سب کاموں سے باز رہئے اگر کوئی ضرورت پیش آجائے تو قرآن کو بند کر کے کلام و گفتگو کیجئے اس کے بعد پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر تلاوت شروع کیجئے، غلط پڑھنے سے احتراز کیجئے۔ ترتیل و تجوید کے ساتھ بے تکلف اور بے ساخت پڑھئے۔ غلط طریقہ سے آواز و لہجہ بنانے کی ضرورت نہیں، تلاوت کے وقت کسی کی تعظیم نہ کیجئے۔ ہاں اگر عالم باعمل، استاد یا والدین کے لیے کھڑے ہو جانا اور ان کی تعظیم جائز ہے جب قرآن ختم ہونے کو ہو تو اپنے عزیز و اقارب اور محبین و متعلقین کو جمع کیجئے ان کی مجلس میں قرآن ختم کیجئے اور ان سب کو دعا میں شامل کیجئے کیونکہ وہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔ قرآن ختم کرنے کے بعد پھر سورت فاتحہ اور سورت بقرہ مفلحون تک پڑھ کر قرآن بند کیجئے کیونکہ یہ افضل ہے۔ تکیہ لگا کر یا لیٹ کر قرآن پڑھنا اگرچہ جائز ہے لیکن افضل یہی ہے کہ مودب بیٹھ کر پڑھا جائے اسی طرح راستہ چلتے قرآن پڑھنا جائز ہے اگر جنگل ہو تو

باآواز بلند پڑھا جائے ورنہ بصورت دیگر باآواز آہستہ۔ نجس اور مکروہ جگہوں مثلاً حمام اور کمیلے وغیرہ میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔ قرآن کی تقطیع بہت چھوٹی نہ رکھی جائے اور نہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے متفرق کیا جائے تاکہ اس کے احترام وعظمت میں کچھ کمی واقع نہ ہو ہاں ضرورت کے تحت مثلاً بچوں کے پڑھنے کے لیے یا کسی مناسب آسانی وسہولت کے پیش نظر پارہ پارہ یا ہفت سورت وغیرہ کی شکل میں کرنا جائز ہے۔ قرآن کو ایسے لشکر میں لے جانا جہاں امن پر اعتماد نہ ہو مناسب نہیں ہے اسی طرح دارالحرب میں بھی قرآن نہ لے جانا چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ کافروں کے ہاتھ میں پڑ جائے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں۔ قرآن کی اتنی آیتوں کا یاد کرنا کہ جن سے نماز ہو جائے ہر مسلمان پر عین فرض ہے اور پورا قرآن شریف یاد کرنا فرض کفایہ ہے کہ اگر ایک شخص حفظ کرے تو سب کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ فقہا لکھتے ہیں کہ سورت فاتحہ اور کوئی ایک سورت یاد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور باقی قرآن کا یاد کرنا اور اس کے احکام کو جاننا اور سیکھنا نفل نماز سے اولیٰ ہے۔ مصحف کی طرف پاؤں پھیلانے مکروہ نہیں بشرطیکہ وہ پاؤں کے برابر نہ ہو، اسی طرح مصحف اگر کھونٹی پر لٹکا ہوا ہو یا طاق میں رکھا ہوا ہو تو ادھر پاؤں پھیلانا مکروہ نہیں ہے۔ سفر میں حفاظ کی خاطر مصحف کو خرجی (بیگ زنبیل اور جھولا) میں رکھ کر اس پر سوار ہونا یا تکیہ کے نیچے رکھ کر سونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے،، جس مکان میں یا کمرہ میں مصحف رکھا ہو اس میں جماع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جب قرآن شروع ہو تو پہلے یہ دعا پڑھئے۔ دعا (اللهم انی اشهد ان هذا کتابك المنزل من عندك علی رسولك محمد بن عبدالله صلی الله علیه وآله واصحابه واتباعه اجمعین وکلامك الناطق علی لسان نبیك جعلته هادیا منك لخلقك وحبلا متصلا فیما بینك وبین

عبادك اللهم فاجعل نظری فيه عبادة وقرائتی فكروفكری فيه اعتبارا انك انت الرؤف الرحيم رب اعوذبك من همزات الشياطين واعوذبك رب ان يحضرون) ۔" اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری یہ کتاب تیری طرف سے تیرے رسول پر اتاری گئی ہے جن کا نام نامی محمد بن عبداللہ ہے رحمت ہو اللہ کی ان پر، ان کی اولاد پر، ان کے اصحاب پر اور ان کے تمام تابعداروں پر اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا کلام ناطق ہے تیرے رسول کی زبان پر، اس کلام کو تو نے اپنی مخلوق کی ہدایت کرنے والا بنایا ہے اور اس کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان واسطہ متصل بنایا ہے ۔لہٰذا اے اللہ! تو میری نظر کو اس میں عبادت گزار میری قرأت کو اس میں با فکر اور میرے با فکر کو اس میں عبرت پذیر بنا، بلاشبہ تیری ذات بڑی مہربان ہے اور تو بڑا رحم کرنے والا ہے اور اے میرے رب میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ کا طلبگار نہیں کہ میرے پاس شیاطین آئیں ۔اس دعا کے بعد ایت (قل اعوذ برب الناس) پڑھئے اور پھر یہ دعا مانگئے۔ دعا (اللهم بالحق انزلته وبالحق نزل اللهم عظم رغبی جه واجعله نورا لیبصری و شفاء لصدری وه ذهابالهمی وحزنی وبیض به وجهی وارزقنی تلاوته وفهم معانیه برحمتك یاارحم الراحمین) ۔اے اللہ تو نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ حق کے ساتھ اترا ۔اے اللہ قرآن میں میری رغبت بڑی بنا اور اسے میری آنکھوں کو نور میرے سینے کے لیے شفاء اور میرے فکروغم کے دور ہونے کا سبب بنا اس کے ذریعہ میرے چہرے کو روشن و منور فرما اور اپنی رحمت کے صدقہ اے ارحم الراحمین اس کی تلاوت مجھے نصیب کرا اور اس کے معنی کی سمجھ عطا فرما ہر روز تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھا کر یہ

دعا پڑھیئے۔ دعا (اللھم اجعل القرآن لنا فی الدنیا قرینا وفی الآخرة شافعا وہ فی القبر مونسا وفی القیامة صاحبا وعلی الصراط نورا وفی الجنة رفیقا ومن النار سترا) ۔اے اللہ قرآن پاک کو میرے لیے دنیا میں ہم نشین، آخرت میں شافع، قبر میں غم خوار، قیامت میں مونس، پل صراط پر نور، جنت میں رفیق اور آگے سے پردہ دینا۔ پھر آپ نے دینی اور دنیوی مقاصد وعزائم کے لیے جو بھی دعا چاہیں مانگیں انشاء اللہ آپ کی ہر درخواست مجیب الدعوات کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازری جائے گی۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب قرآن ختم کرتے تو کھڑے ہو کر دعا مانگتے، اسی طرح بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوہریرہ ہی سے نقل کیا کہ رول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص قرآن پڑھے اللہ کی حمد وثنا کرے محمد پر درود بھیجے اور پھر اپنے رب سے اپنی بخشش چاہے تو بلاشبہ اس نے بہترین طریقے سے خیر وبھلائی کی دعا مانگی۔ بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب قرآن ختم فرماتے تو کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ حمد وثنا کرتے چنانچہ حمد وثنا اور دعا کے کلمات یہ ہوتے۔ الحمد للہ رب العالیمن الحمد للہ الذی خلق السماوات والرض وجعل الظلمت والنور ثم الذین کفروا بربھم یعدلون۔ لا الہ الا اللہ و کذب العادلون باللہ وضلوا ضللا بعیدا لا الا اللہ وکذب المشر کون باللہ من العرب والمجوس والیھود النصاریٰ والصابئین ومن دعا للہ ولد وصاحبة او ندا او شبھا او مثلا او سمیا او عدلا فانت ربنا اعظم من ان نتخذ فیما خلقت والحمد للہ الذی لم یتخذ

صاحبة ولا ولدا ولم یکن له شریك فی الملك ولم یکن لو ولی من الذل وکبری تکبیرا الله اکبر کبیرا والحمد لله کثیرا وسبحان الله بکرة واصیلا۔ والحمدلله الذی انزل علی عبدہ الکتب ولم یجعل له عوفا قیما لتنذر به باسا شدیدا من لدنه وبشر المومنین الذی یعمولن الصالحات ان لهم اجرا حسان ما کثین فیه ابدا وینذر الذین قالوا اتخذا لله ولدا مالهم به میں علم ولا لاباہ م کبرت کلمة تخرج من افواههم ان یقولون الا کذبا۔ الحمد لله الذی له مافی السموات وما فی الارض وله الحمد فی الآخرة وهو الحکیم الخبیر۔ یعلم مایلج فی الارض وما یخرج من السماء وما یعرج فیها وهو الرحیم الغفور۔ الحمدلله فاطر السماوات والارض جاعل الملئکة رسلا اولی اجنحة مثنی وثلث ارباع یزید فی الخق مایشاء ان الله علی کل چیز قدیر۔ مایفتح الله للناس من رحمة فلا ممسك ها وما یمسك فلا مرسل له من بعد وهو العزیز الحکم۔ الحمدلله وسلم علی عبادہ الذین اصطفی آلله خیر اما یشرکون۔ بل الله خیر وابقی وا حکم وا کرم و اعظم ممایشرکون۔ فالحمدلله بل اکثرهم لایعلمون۔ صدق الله وبلغت رسله الکرام وانا علی ذالکم من الشاهدین۔ اللهم صل علی جمیع الملائکة والمرسلین وارحم عبادك المومنین مب اهل السماوات والارض واختم لنا بخیر وافتح لنا بخیر وبارك لنا فی القرآن العظیم وانفسنا بالآیت والذکر الحکیم ربنا

تقبل منا انك انت السميع العليم ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو رب ہے تمام عالم کا، تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور اندھیرا اور اجالا بنایا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر کر دیتے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو برابر کر دیتے ہیں دوسروں کو اللہ کے ساتھ اور گمراہ ہیں وہ لوگ اور بھٹک گئے ہیں وہ صحیح راستہ سے کامل بھٹک جانا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو اہل عرب میں سے ہیں اور آتش پرست، یہود و نصاریٰ اور کوکب پرست وہ دوسروں کو اللہ کا شریک مان رہے ہیں جو شخص ثابت کرتا ہے اللہ کے لیے اولاد کو یا بیوی کو یا ہمسر کو یا مشابہ کو یا مثیل کو اس کے ہمنام کو یا اس کی ذات وصفات میں برابر کو، تو وہ کیا کرے کیونکہ وہ بھی جھوٹا ہے اور آپ تو اے ہمارے پروردگار! اس سے برتر و بلند ہیں کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو اپنا شریک وساجھی بنائیں ۔تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں بنایا اور نہ بنایا اپنے لیے بیوی کو اور نہ بیٹے کو اور نہیں ہے کوئی اس کا ساجھ سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ہے ذلت کے وقت پر اور اس کی بڑائی بیان کرو بڑا جان کر اللہ سب سے بڑا بہت بڑا اور بے انتہاء، بیشمار تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور تمام چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندہ محمد پر کتاب اتاری جس میں کوئی کجی نہیں رکھی، بالکل ٹھیک اتاری تاکہ خوف دلائے ایک سخت آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوشخبری دے ایمان لانے والوں کو جو نیکیاں کرتے ہیں اس بات کی کہ ان کے لیے اچھا بدلہ جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور ان کو متنبہ کر دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی نہ ان کے باپ دادوں کو، کیا بڑی بات ہے جو ان کے

منہ سے نکلتی ہے، سب کچھ جھوٹ ہے جس کو وہ کہہ رہے ہیں، تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کی مملوک میں وہ تمام چیزیں ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور تمام تعریفیں اس کے لیے ہیں عالم آخرت میں اور وہ بڑی حکمت والا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے وہ جانتا ہے ان تمام چیزوں کو جو زمین میں داخل ہوتی ہیں اور اس سے باہر نکلتی ہیں اور جو آسمانوں سے اترتی ہیں اور اسمانوں پر چڑھتی ہیں وہ بڑا رحم کرنے والا اور بہت زیادہ مغفرت کرنے والا ہے، تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے تمام آسمانوں کو اور زمین کو اور بنانے والا ہے فرشتوں کو اپنا پیغام پہچانے والا جو بازوؤں والے ہیں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین اور کسی کے چار، اپنی مخلوق میں وہ زیادتی کرتا ہے جتنا چاہتا ہے یقیناً اللہ تمام چیزوں پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے جو کچھ کھول دے، اللہ تعالیٰ لوگوں پر اپنی رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا اور جو کچھ کہ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا اس کے سوا اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور سلامتی ہو اللہ کی اللہ کے ان بندوں پر جن کو اس نے پسند فرما لیا ہے کیا اللہ سب سے بہتر ہے یا وہ (بت) جن کو وہ (کافر و مشرک) اللہ کا ساجھی ٹھہرا رہے ہیں (یہ بات نہیں ہے) بلکہ اللہ ہی سب سے بہتر اور وہی باقی رہنے والا ہے، وہی مضبوط حکم والا ہے اور وہی عزت والا ہے وہ ان تمام چیزوں سے جن کو یہ کافر شریک ٹھہرا رہے ہیں سب سے عظمت والا ہے، پس تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے، اللہ نے سچ فرمایا ہے اور اس کے کریم رسولوں نے اس کا پیغام (صحیح صحیح) پہنچایا ہے اور میں تمام باتوں پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت نازل فرما، تمام فرشتوں پر، تمام پیغمبروں پر اور رحم فرما اپنے مومن بندوں پر آسمان کے رہنے والوں اور

زمین پر بسنے والوں سے، ہمارا خاتمہ کیجئے خیر کے ساتھ اور کھول دیجئے ہمارے لیے خیر کے دروازہ کو اور برکت دیجئے ہمارے لیے قرآن عظیم کے علوم میں اور نفع دیجئے ہم کو آیات قرآنی سے اور اپنے مستحکم ذکر سے، اے ہمارے رب! ہماری یہ دعا قبول فرمالے یقیناً آپ ہماری دعاؤں کو سننے والے اور ہماری باتوں کو جاننے والے ہیں۔

دعاؤں کا بیان

دعا کے معنیٰ ہیں کہ

"اعلیٰ ذات سے ادنیٰ چیزوں میں سے کچھ بطریق عاجزی طلب کرنا" امام نووی فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ دعا مانگنا مستحب ہے ان کی دلیل قرآن و حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم کے علاوہ انبیاء (علیہم السلام) کا فعل بھی ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام دعا مانگا کرتے تھے۔ لیکن بعض زہاد اور اہل معارف یہ بھی کہنا ہے کہ ترک دعا (یعنی دعا نہ مانگنا) افضل ہے کیونکہ اس طرح رضاء مولیٰ اور اپنی قسمت پر اور تقدیر کے ساتھ راضی ہونے کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ مولانا شاہ محمد اسحق صاحب نے ان زہاد و اہل معارف کے اس قول کے بارے میں کہا ہے کہ یہ قول اس خاص کیفیت پر محمول ہے جو بعض وقت بعض مردان حق پر طاری ہوتی ہے اور جس میں رضاء بقضاء ہی غالب ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ پیش آیا کہ جب انھیں آگ میں ڈالا گیا تو حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے اور اپنے پروردگار سے اپنی نجات سلامتی کے لیے درخواست کیجئے تو انھوں نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جل شانہ میرا حال جانتا ہے مجھے کوئی درخواست کرنے اور دعا مانگنے کی

ضرورت نہیں ہے

دعا جزم ویقین کے ساتھ کرو

حدیث؛

وعنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إذا دعا أحدكم فلا يقل :اللهم اغفر لي إن شئت ارحمني إن شئت ارزقني إن شئت وليعزم مسألته إنه يفعل ما يشاء ولا مكره له". رواه البخاری

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے۔اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے تو مجھے رزق عطا فرما اگر تو چاہے۔بلکہ چاہیے یہ کہ وہ عزم بالجزم اور یقین و اعتماد کے ساتھ دعا مانگے (شک وشبہ کا کلمہ مثلا اگر تو چاہے وغیرہ کا استعمال نہ کرے) کیونکہ اللہ تعالیٰ تو خود وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اس پر کوئی زورزبردستی کرنے والا نہیں ۔(بخاری)

تشریح؛

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو جزم ویقین کے ساتھ مانگو یعنی یہی کہو کہ اے اللہ ہمارا فلاں مطلب پورا کر، جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اس لیے یہ نہ کہو۔کہ اگر تو چاہے تو ہمارا فلاں مطلب پورا کر دے۔کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت دعا میں شک پیدا کرنا ہے حالانکہ قبولیت دعا میں یقین ہونا چاہیے کیونکہ اس نے قبولیت کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کیا کرتا اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ بے پروا اور مستغنی ہے کسی کام کے کرنے

یا نہ کرنے میں اس پر کسی کا کوئی زور نہیں ہے بلکہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اس لیے اپنی دعا کے ساتھ یہ کہنا کہ اگر تو چاہے بالکل بے فائدہ اور لا حاصل ہے۔

تھک کر دعا مانگنا نہ چھوڑو

حدیث؛

وعنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"يستجاب للعبد ما لم يدع بإثم أو قطيعة رحم ما لم يستعجل". قيل :يا رسول الله ما الاستعجال؟ قال :"يقول :قد دعوت وقد دعوت فلم أر يستجاب لي فيستحسر عند ذلك ويدع الدعاء". رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت ابو ہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندے کی دعا شرائط قبولیت کے بعد قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ کی یا ناطہ توڑنے کی دعا نہیں مانگتا اور جب تک کہ جلدی نہیں کرتا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ جلدی کا کیا مطلب ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دعا مانگنے والا بار بار کہنے لگے کہ میں نے دعا مانگی یعنی اکثر میں نے دعا مانگی لیکن میں نے اسے قبول ہوتے نہیں دیکھا۔ اور پھر وہ تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنی ہی چھوڑ دے۔ (مسلم)

تشریح؛

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قبولیت دعا کے لیے جہاں جزم و یقین اور اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ شرط ہے وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ دعا ان ہی چیزوں کے لیے مانگی جائے جو عادتا مانگی جاتی ہوں اور مباح ہوں، لہٰذا یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ مومن کی دعا اسی وقت قبول ہوتی ہے

جب کہ وہ نہ گناہ کی کوئی چیز طلب کرے اور نہ ناطہ توڑنے کی دعا کرے اور نہ جلد بازی سے کام لے۔گناہ کی چیز مانگنے کا مطلب یہ کہ کوئی شخص یہ دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ! مجھے فلاں شخص کو (جو مسلمان ہے) قتل کر دینے کی طاقت عطا فرما، یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شراب یا کوئی حرام وغیر حلال چیز عطا کر یا یہ کہے کہ اے اللہ فلاں شخص کو بخش دے درآنحالیکہ اس بارے میں یقین ہے کہ وہ کافر مرا ہے۔ظاہر ہے اس قسم کی دعا مانگنا اور پھر ان کی قبولیت کی توقع ہی رکھنا دیدہ دلیری ہی کہا جاسکتا ہے اس طرح محال اور غیر ممکن الوقوع چیزوں کی دعا مانگنا اور ان کی قبولیت کی امید رکھنا بھی انتہائی حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے مثلاً کوئی عقل کا اندھا یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! تو مجھے دنیا ہی میں حالت بیداری میں اپنا دیدار عطا فرما۔ناطہ توڑنے کی دعا، کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بد باطن شخص یہ دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ! مجھ میں اور میرے باپ میں جدائی اور تفریق کر دے۔یہ حدیث کا مفہوم کے مطابق مومن کی ایسی غیر ایمانی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بندہ مومن کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اگر قبولیت دعا میں تاخیر محسوس ہو تو تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنا ہی چھوڑ دے۔کیونکہ دعا بھی عبادت ہے اور عبادت سے اس طرح اکتاہٹ یا دل گرفتگی مومن کے لیے کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہے۔پھر یہ کہ قبولیت دعا میں تاخیر یا تو اس لیے ہوتی ہے کہ اس کا وقت نہیں آتا کیونکہ ازل ہی میں ہر چیز کے وقوع اور تکمیل کا ایک وقت مقرر ہے جب تک وہ وقت نہیں آتا وہ چیز بھی وقوع پذیر نہیں ہوتی یا یہ دعا مانگنے والا جو دعا مانگتا ہے اس کی تقدیر میں اس کی دعا کا اس دنیا میں قبول ہونا لکھا نہیں ہوتا اس صورت میں اسے اس کے بدلہ میں آخرت کا ثواب عطا کیا جاتا ہے یا پھر قبولیت میں تاخیر اس لیے ہوتی ہے کہ دعا مانگنے میں پوری عاجزی

وانکساری، سچی لگن اور تڑپ اور کمال عبودیت کا اظہار کرتا رہے کیونکہ دعا میں ان چیزوں کو اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔

دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

حدیث؛

وعن سلمان الفارسي قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا يرد القضاء إلا الدعاء ولا يزيد في العمر إلا البر". رواه الترمذي

ترجمہ؛

حضرت سلمان فارسی (رض) راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔ (ترمذی)

تشریح؛

تقدیر سے مراد ہے ایسی ناپسندیدہ چیز کا پیش آنا جس سے انسان ڈرتا ہے، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جب بندہ کو دعا کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ایسی چیز کو دور کرتا ہے۔ تقدیر کی قسمیں خوب سمجھ لیجئے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں ایک تو "مبرم" اور دوسری "معلق" تقدیر مبرم تو حق تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہوتا ہے جو چیز پیش آنے والی ہوتی ہے اس میں کچھ بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے مگر تقدیر معلق میں بعض اسباب کی بنا پر تغیر و تبدل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں حدیث میں جس تقدیر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ دعا سے بدل جاتی ہے وہ تقدیر معلق ہی ہے یہاں تقدیر مبرم مراد نہیں ہے۔ نیکی سے عمر میں اضافہ کا مطلب حدیث سے جو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے بارے میں بھی سمجھ لیجئے کہ یہاں بھی عمر کی کمی و زیادتی تقدیر

معلق کے اعتبار سے ہے یعنی تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اگر نیکی کرے گا تو اتنی عمر ہوگی اور اگر نیکی نہ کرے گا تو اتنی عمر ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوح محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ مثلاً اگر فلاں شخص حج کرے گا یا جہاد کرے گا تو اس کی عمر چالیس سال کی ہوگی اور اگر حج و جہاد دونوں کرے گا تو اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی لہٰذا اگر اس شخص نے حج بھی کیا اور جہاد بھی کیا تو اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی اس طرح اس کی عمر بڑھ گئی اور اگر اس نے صرف جہاد ہی کیا یا صرف حج ہی کیا تو اس کی عمر چالیس سال کی ہوگی اس طرح اس کی عمر انتہاء عمر سے کہ وہ ساٹھ سال تھی کم ہوئی۔ بعض حضرات نے حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس شخص نے نیکی کی اس کی عمر ضائع نہیں ہوئی پس گویا اس کی عمر زیادہ ہوئی اس اعتبار سے یہاں فرمایا گیا ہے کہ نیکی انسان کی عمر میں اضافہ کر دیتی ہے۔

ذکر اللہ اور تقرب الی اللہ کا بیان

تقرب الی اللہ یعنی اللہ کا قرب و نزدیکی حاصل کرنے سے ذکر اللہ کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے اور نوافل کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ ذکر اللہ کی قسمیں ذکر اللہ (اللہ کا ذکر) دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی اور افضل یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے اللہ کا ذکر ہو اور اگر ان میں سے کسی ایک سے ہو تو پھر دل کا ذکر افضل ہے۔ اب ذکر بالقلب (دل سے اللہ کا ذکر) کی بھی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو یہ ہے اللہ کی عظمت میں، جبروت و ملکوت میں اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں جو زمین و آسمان میں ہیں، غور و فکر اور استغراق اس قسم کے ذکر کو ذکر خفی کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں منقول ہے کہ وہ ذکر خفی ستر درجہ

افضل ہے جسے حفظہ (یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے) بھی نہیں سنتے چنانچہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو حساب کتاب کے لیے جمع کرے گا تو حفظہ (اعمال لکھنے والے فرشتے) وہ تمام ریکارڈ لے کر حاضر ہوں گے جنہیں انھوں نے اپنی نوشت اور یاد داشت میں محفوظ کر رکھا ہوگا وہ تمام ریکارڈ دیکھ کر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ دیکھو میرے بندوں کے اعمال میں اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے (جو تمہارے اس ریکارڈ میں نہیں ہے) وہ عرض کریں گے! پروردگار! بندوں کے اعمال کے سلسلہ میں جو کچھ بھی ہمیں معلوم ہوا اور جو کچھ بھی ہم نے یاد رکھا ہم نے اسے اس ریکارڈ میں جمع کر دیا ہے، اس ریکارڈ میں ہم نے ایسی کوئی چیز محفوظ کرنے سے نہیں چھوڑی جس کی ہمیں خبر ہوئی ہو تب اللہ تعالیٰ بندہ کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ میرے پاس تیری ایسی نیکی محفوظ ہے جسے کوئی نہیں جانتا اور وہ ذکر خفی ہے میں تجھے اس نیکی کا اجر عطا کروں گا۔ ذکر بالقلب کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں خواہ ان کا تعلق امر کرنے سے ہو یا نہی سے ان کی ادائیگی کے وقت آنے پر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔ ذکر بالقلب کی ان دونوں قسموں میں سے پہلی قسم افضل واعلیٰ ہے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ذکر کا اطلاق صرف زبان کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے پر ہوتا ہے اور قول مختار کے مطابق اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ" وہ اپنے تئیں سنائے" یعنی ذکر کرنے والے کی زبان کم سے کم اس درجہ میں جاری ہو کہ وہ خود سن لے ان فقہاء کے کہنے کے مطابق اس درجہ سے کم ذکر معتبر نہیں۔ نیز یہ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ دل کے ذکر کی حیثیت از قسم علم وتصور قلب کے فعل کی تو ہے، لیکن اسے ذکر نہیں کہیں گے۔ ذکر اسی کو کہیں گے جس کا تعلق زبان کی ادائیگی سے ہو۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ اس بات سے ان فقہاء کا مقصود کیا ہے؟ اگر مطلب یہ ہے کہ لغوی طور پر فعل قلب پر ذکر کا اطلاق نہیں ہوتا تو یہ بات اس

چیز کے خلاف ہے جو لغت کی کتابوں میں موجود ہے چنانچہ صحاح اور قاموس میں لکھا ہے کہ ذکر نسیان کی ضد ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خود قلب کا فعل ہے کیونکہ جس طرح نسیان بھول جانے کا تعلق قلب سے ہے اسی طرح اس کی ضد یعنی ذکر (یاد) کا تعلق بھی قلب ہی سے ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جو کچھ زبان سے ادا ہوتا ہے اسے بھی ذکر کہا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ لفظ ذکر فعل قلب اور فعل لسان دونوں کے درمیان مشترک ہے جس طرح فعل قلب کو ذکر کہتے ہیں اسی طرح فعل لسان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے لہذا جیسے ذکر باللسان معتبر ہے ایسے ہی ذکر بالقلب بھی معتبر ہے بلکہ ذکر بالقلب ہی افضل ہے۔ مشائخ طریقت رحمہم اللہ بھی فرماتے ہیں کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں قلبی اور لسانی اور ذکر قلبی کا اثر لسانی کے اثر سے کہیں زیادہ قوی اور افضل ہے۔ جن فقہاء نے ذکر قلبی کا انکار کیا ہے ہوسکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ شریعت نے جن مواقع پر ذکر باللسان کی تعلیم دی ہے جیسے تسبیحات قرآت نماز اور نماز کے بعد کے اذکار و اوراد وغیرہ تو وہاں قلبی ذکر کافی نہیں ہوتا بلکہ لسانی ذکر ہونا چاہیے ان فقہاء کی مراد یہ نہیں ہے کہ ذکر قلبی پر اخروی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

ذکر کرنے والوں کی فضیلت

حدیث؛

وعن أبي هريرة قال :كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسير في طريق مكة فمر على جبل يقال له :جمدان فقال :"سيروا هذا جمدان سبق المفردون". قالوا :وما المفردون؟ يارسول الله قال :"الذاكرون الله كثيرا والذاكرات". رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت ابو ہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ کے راستوں پر چلے جارہے تھے کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرے جس کا نام جمدان تھا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس وقت فرمایا چلے چلو یہ جمدان ہے، مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مفردون کون ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ مرد جو اللہ کو بہت یاد کریں۔ اور وہ عورتیں جو اللہ کو بہت یاد کریں۔ (مسلم)

تشریح:

ماالمفردون۔ (مفردون کون ہیں) درحقیقت صحابہ نے صفت کے بارے میں سوال کیا کہ مفردون کی صفت کیا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے مذکورہ بالا جواب کے ذریعہ مفردون کی صفت کی طرف اشارہ کیا کہ حقیقی تنہائی جولائق اعتبار ہے وہ اللہ کی یاد کے لیے نفس کی تنہائی ہے۔ منقول ہے کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ سے آتے ہوئے اپنے رفقاء سمیت حمدان پہاڑ کے پاس پہنچے جو مدینہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے تو صحابہ کو اپنے گھر جلد سے جلد پہنچنے کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ بعض صحابہ اپنے بقیہ ہم قافلہ لوگوں سے جدا ہو کر تیزی سے آگے بڑھ گئے تاکہ وہ دوسروں سے پہلے ہی اپنے وطن پہنچ جائیں جو صحابہ پیچھے رہ گئے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا کہ گھر قریب آپہنچا ہے جلد چلو کیونکہ مفردون (یعنی قافلہ سے الگ ہوجانے والے) آگے پہنچ گئے ہیں اسی موقع پر صحابہ نے مفردون کی صفت پوچھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو جواب دیا اس کا حاصل یہ تھا کہ ان مفردون (یعنی اس وقت ہم سے آگے نکل گئے ہیں) کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ ان کا مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ لوگ گھر جلد پہنچنے میں ہم سے سبقت لے گئے ان لوگوں کے بارے میں پوچھو جو

نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں تو سنو کہ نیکیوں میں سبقت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر کے لیے تنہاء اور علیحدہ کرتے ہیں یعنی وہ لوگوں سے منقطع ہوکر اور گوشہ نشینی اختیار کر کے اکثر ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اللہ کو بہت یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ بغیر کسی غفلت وکوتاہی کے ذکر اللہ پر ہمیشگی اختیار کرے اگر کوئی غفلت وکوتاہی ہو بھی جائے تو اسے فوراً ختم کر کے ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے۔ حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد اور صبح وشام سوتے بیٹھے اور اسی طرح حدیث میں منقول دوسرے مواقع پر ذکر کرنے سے کثرت ذکر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ناموں کا بیان

یہ بات جان لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں یعنی سماع اور اذن شارع پر موقوف ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو نام شرع سے منقول ہے وہی کہنا چاہیے اپنی طرف سے از راہ عقل کوئی نام نہ لینا چاہیے، چاہے وہ نام معنی کے اعتبار سے شرع کے نام منقول کے مطابق ہی کیوں نہ ہو مثلاً اللہ تعالیٰ کو عالم کہنا چاہیے عاقل نہ کہا جائے، جواد کہنا چاہیے سخی نہ کہا جائے اور شافی کہنا چاہیے طبیب نہ کہا جائے۔ بندہ کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اپنی ذات میں پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے چنانچہ آگے صفحات میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کی وضاحت کے موقع پر یا دوسری عبادتوں کی تشریح میں باری تعالیٰ کی صفات کے حصول کی جو تلقین کی گئی ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے تاکہ ان صفات کے حصول کے بعد اپنی ذات انوار الٰہیہ کا پرتو اور اپنی زندگی اسلامی اخلاق تعلیم کا پیکر بنے۔ اللھم وفقنا ویسر لنا حصولہا۔

اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اور ان کی تفصیل ووضاحت

حدیث:

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إن لله تعالى تسعة وتسعين اسما من أحصاها دخل الجنة هو الله الذى لا إله هو الرحمن الرحيم الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر الخالق البارء المصور الغفار القهار الوهاب الرزاق الفتاح العليم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل السميع البصير الحكم العدل اللطيف الخبير الحليم العظيم الغفور الشكور العلى الكبير الحفيظ المقيت الحسيب الجليل الكريم الرقيب المجيب الواسع الحكيم الودود المجيد الباعث الشهيد الحق الوكيل القوى المتين الولى الحميد المحصى المبدء المعيد المحيى المميت الحى القيوم الواجد الماجد الواحد الأحد الصمد القادر المقتدر المقدم المؤخر الأول الآخر الظاهر الباطن الوالى المتعالى البر التواب المنتقم العفو الرؤوف مالك الملك ذو الجلال والإكرام المقسط الجامع الغنى المغنى المانع الضار النافع النور الهادى البديع الباقى الوارث الرشيد الصبور ".رواه الترمذى والبيهقى فى الدعوات الكبير .وقال الترمذى :هذا حديث غريب

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان ناموں کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا وہ اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اسم ذات اللہ کے علاوہ ننانوے نام یہ ہیں ۔(١) الرحمن (٢) الرحیم (٣) الملک (٤) القدوس (٥) السلام (٦) المومن (٧) المہیمن (٨) العزیز (٩) الجبار (١٠) المتکبر (١١) الخالق (١٢) الباری (١٣) المصور (١٤) الغفار (١٥) القہار (١٦) الوہاب (١٧)

الرزاق (۱۸) الفتاح (۱۹) العلیم (۲۰) القابض (۲۱) الباسط (۲۲) الخافض (۲۳) الرافع (۲۴) المعز (۲۵) المذل (۲۶) السمیع (۲۷) البصیر (۲۸) الحکم (۲۹) العدل (۳۰) اللطیف (۳۱) الخبیر (۳۲) الحلیم (۳۳) العظیم (۳۴) الغفور (۳۵) الشکور (۳۶) العلی (۳۷) الکبیر (۳۸) الحفیظ (۳۹) المقیت (۴۰) الحسیب (۴۱) الجلیل (۴۲) الکریم (۴۳) الرقیب (۴۴) المجیب (۴۵) الواسع (۴۶) الحکیم (۴۷) الودود (۴۸) المجید (۴۹) الباعث (۵۰) الشہید (۵۱) الحق (۵۲) الوکیل (۵۳) القوی (۵۴) المتین (۵۵) الولی (۵۶) الحمید (۵۷) المحصی (۵۸) المبدی (۵۹) المعید (۶۰) المحی (۶۱) الممیت (۶۲) الحی (۶۳) القیوم (۶۴) الواجد (۶۵) الماجد (۶۶) الواحد (۶۷) الاحد (۶۸) الصمد (۶۹) القادر (۷۰) المقتدر (۷۱) المقدم (۷۲) المؤخر (۷۳) الاول (۷۴) الآخر (۷۵) الظاہر (۷۶) الباطن (۷۷) الوالی (۷۸) المتعال (۷۹) البر (۸۰) التواب (۸۱) المنتقم (۸۲) العفو (۸۳) الرؤف (۸۴) مالک الملک (۸۵) ذوالجلال والاکرام (۸۶) المقسط (۸۷) الجامع (۸۸) الغنی (۸۹) المغنی (۹۰) المانع (۹۱) الضار (۹۲) النافع (۹۳) النور (۹۴) الہادی (۹۵) البدیع (۹۶) الباقی (۹۷) الوارث (۹۸) الرشید (۹۹) الصبور۔ اس روایت کو ترمذی نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا۔ نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح:

آیت (ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو)۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی یہ علیحدہ جملہ ہے اور ان ننانوے ناموں کا بیان ہے جو آگے ذکر کئے گئے ہیں۔ اس کلمہ کے کئی مراتب ہیں اول یہ کہ جب منافق اس کلمہ کو پڑھتا ہے اور اس کی تصدیق سے خالی ہوتا ہے یعنی وہ قلبی تصدیق اور اعتقاد کے بغیر

محض اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے لیے اس کلمہ کو زبان سے ادا کرتا ہے تو یہ کلمہ اس کی دنیا کے لیے تو نافع بن جاتا ہے بایں طور کہ اس کی وجہ سے اس کی جان، اس کا مال اور اس کے اہل و عیال مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن آخرت کے اعتبار سے یہ کلمہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ دوم یہ کہ اس کلمہ کو زبان سے پڑھنے کے ساتھ اعتقاد قلبی بھی ہو مگر تقلید محض کے طور پر اس درجہ صحیح ہونے میں مختلف اقوال ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ درجہ صحیح ہے۔ سوم یہ کہ اس کلمہ کو پڑھنے کے ساتھ اعتقاد قلبی بھی ہو مگر ایسا اعتقاد قلبی جو اللہ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر حاصل کیا گیا ہو۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ بھی درجہ معتبر ہے۔ چہارم یہ کہ زبان سے اس کلمہ کی ادائیگی کے ساتھ اعتقاد جازم بھی ہو۔ جو از راہ دلیل قطعی حاصل ہوا ہو متفقہ طور پر یہ درجہ مقبول ہے پنجم یہ کہ اس کلمہ کو ادا کرنے والا اس طرح کا ہو کہ وہ دل کی آنکھوں سے اس کلمہ کے معنی جانتا ہو۔ یعنی اسے کامل طور پر عرفان حق حاصل ہو اور یہی رتبہ عالی ہے یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ اس کلمہ کو زبان سے ادا کیا جائے دوسری شکل یہ ہے کہ اس کلمہ کو صرف دل میں کہے یعنی زبان سے ادائیگی نہ ہو اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی عذر مثلاً گونگے پن وغیرہ کی بنا پر اس کلمہ کو زبان سے ادا کرنے سے قاصر ہے تو یہ کلمہ دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع ہے یعنی وہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے نجات یافتہ ہوگا اور اگر کسی عذر کے بغیر بھی زبان سے ادا نہ کرے تو پھر آخرت میں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نووی نے اس بات پر اہل سنت کا اجماع نقل کیا ہے۔ "اللہ" باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اس کے معنی ہیں وہ ذات عبادت کے لائق ہے۔ اکثر علماء کہتے ہیں کہ اسماء باری تعالیٰ میں یہ نام سب سے بڑا ہے نیز کہا گیا ہے کہ عوام کو چاہیے کہ وہ اس نام کو اپنی زبان پر جاری کریں اور خشیت و تعظیم کے طور پر اس نام کے ساتھ ذکر کریں

خواص کو چاہیے کہ وہ اس نام کے معنی میں غور و فکر کریں اور یہ جانیں کہ اس نام کا اطلاق صرف اسی ذات پر ہوسکتا ہے جو صفات الوہیت کی جامع ہے اور خواص الخواص کو چاہیے کہ وہ اپنا دل اللہ میں مستغرق رکھیں اور اس ذات کے علاوہ اور کسی بھی طرف التفات نہ کریں اور صرف اسی سے ڈریں کیونکہ وہی حق اور ثابت ہے اس کے علاوہ ہر چیز فانی اور باطل ہے جیسا کہ بخاری میں منقول ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ شاعروں کے کلام میں سب سے صحیح کلام شاعر لبید کا یہ مصرعہ ہے کہ۔ الا کل چیز ما خلا اللہ باطل۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ خاصیت جو شخص اس اسم ذات (اللہ) کو ہزار بار پڑھے وہ صاحب یقین ہو اور جو شخص اس کو نماز کے بعد وافر پڑھے اس کا باطن کشادہ ہو اور وہ صاحب کشف ہو۔" الرحمن، الرحیم۔ بخشنے والا " ان دونوں ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے (یعنی صفات باری تعالیٰ کو اپنانے کے سلسلہ میں ان اسماء کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کامل توجہ ہو، اسی ذات پر توکل و بھروسہ کیا جائے اپنا باطن اس کے ذکر میں مشغول رکھا جائے غیر اللہ سے بے پرواہی برتی جائے بندگان اللہ پر رحم کیا جائے چنانچہ مظلوم کی حمایت و مدد کی جائے اور ظالم کو بطریق نیک ظلم سے باز رکھا جائے اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غفلت برتنے والوں کو خبردار کیا جائے گناہ گار کی طرف رحمت کی نظر کی جائے نہ کہ اسے نظر حقارت سے دیکھا جائے اپنی طاقت کے بقدر شرع امور کے استیصال میں کوشش صرف کی جائے اور اپنی وسعت و ہمت کے مطابق محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجتوں کو پورا کرنے کی سعی کی جائے۔ خاصیت جو شخص ہر نماز کے بعد سو بار الرحمن الرحیم کہے حق تعالیٰ اس کے دل سے غفلت، نسیان اور قساوت دور کرے گا اور تمام مخلوق اس پر مہربان و مشفق ہوگی۔" الملک" حقیقی بادشاہ۔ یعنی وہ زمین و

آسمان اور تمام عالم کا حقیقی بادشاہ ہے دونوں جہاں اسی کے تصرف اور قبضہ میں ہیں وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج لہٰذا جب بندہ نے اس کی یہ حیثیت وصفت جان لی تو اس پر لازم ہے کہ اس کی بارگاہ کا بندہ وغلام اور اسی کے در کا گدا بنے اور اس کی اطاعت و فرمان برداری کے ذریعہ اسی کے آستانہ عزت وجاہ کی طلب کرے۔ نیز بندہ پر لازم ہے کہ اس کی بارگاہ قدرت وتصرف سے تعلق پیدا کرے اس کے علاوہ ہر ایک سے کلیۃ بے نیازی اختیار کرے۔ نہ کسی سے اپنی ضرورت وحاجت بیان کرے اور نہ کسی سے ڈرے نہ امید رکھے اپنے دل اپنے نفس اور اپنے قالب کی دنیا کا حاکم بنے اور اپنے اعضاء اور اپنے قوی کو قابو میں رکھ کر اس کی اطاعت وعبادت اور شریعت کی فرمان برداری میں لگا دے تا کہ صحیح معنی میں اپنے وجود کی دنیا کا حاکم کہلائے۔ خاصیت جو شخص اس اسم کو القدوس کے ساتھ (یعنی ملک القدوس) پابندی کے ساتھ پڑھتا رہے تو اگر وہ صاحب ملک اور سلطنت ہوگا تو اس کے ملک اور سلطنت کو اللہ تعالیٰ قائم ودائم رکھے گا اور جو صاحب سلطنت نہ ہوگا تو اس کی برکت سے اس کا اپنا نفس مطیع وفرمان بردار رہے گا اور جو شخص اسے عزت وجاہ کے لیے پڑھے تو اس کا مقصود حاصل ہوگا اور اس بارے میں یہ عمل مجرب ہے۔ حضرت شاہ عبد الرحمن نے اس کی خاصیت یہ لکھی ہے کہ جو شخص اس اسم "الملک" کو روزانہ نوے بار پڑھے تو نہ صرف یہ کہ روشن اور تونگر ہوگا بلکہ حکام و سلاطین اس کے لیے مسخر ہو جائیں گے اور عزت واحترام اور جاہ کی زیادتی کے حصول کے لیے مجرب ہے۔" القدوس" نہایت پاک۔ قیثری (رح) نے کہا کہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نہایت پاک ہے تو اب اس کو چاہیے کہ اس بات کی آرزو کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر حالت میں عیوب اور آفات سے دور اور گناہوں کی نجاست سے پاک رکھے۔ خاصیت جو شخص اس اسم

پاک کو ہر روز زوال آفتاب کے وقت پڑھے اس کا دل صاف ہو اور جو شخص نماز جمعہ کے بعد اس اسم و اسم السبوح کے ساتھ (یعنی القدس السبوح) روٹی کے ٹکڑے پر لکھ کر کھائے تو فرشتہ صفت ہو اور بھگدڑ کے وقت دشمنوں سے حفاظت کے وقت اس اسم کو جتنا پڑھا جاسکے پڑھا جائے اور مسافر اس کو برابر پڑھتا رہے اور کبھی ماندہ اور عاجز نہ ہو اور اگر اس کو تین سو انیس بار شیرنی پر پڑھ کر دشمن کو کھلا دے تو وہ مہربان ہو۔" السلام" ۔بے عیب و سلامت۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ بتایا ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ و سلامت رہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ شفقت کا معاملہ کرے جب وہ کسی ایسے مسلمان کو دیکھے جو اس سے عمر میں بڑا ہو تو یہ کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اس نے میری نسبت زیادہ عبادت و اطاعت کی ہے اور ایمان و معرفت میں مجھ پر سبقت رکھتا ہے اور اگر کسی ایسے مسلمان کو دیکھے جو عمر میں اس سے چھوٹا ہو تو بھی یہی کہے یہ مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اس نے میری بنسبت گناہ کم کئے ہیں۔ نیز اگر کسی مسلمان بھائی سے کوئی قصور ہو جائے اور وہ معذرت کرے تو اس کی معذرت قبول کر کے اس کا قصور معاف کر دیا جائے۔خاصیت اگر کوئی شخص اس اسم مبارک کو کسی بیمار پر ایک سو گیارہ مرتبہ پڑھے تو انشاء اللہ حق تعالیٰ اسے صحت و شفا عطا فرمائے گا اور اگر کوئی شخص اس کو برابر پڑھتا رہے تو خوف سے نڈر رہو گا۔" المؤمن" ۔امن دینے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق اللہ کو نہ صرف اپنے شر اور اپنی برائی سے بلکہ دوسروں کی برائی اور شر سے بھی امن میں رکھے۔خاصیت جو شخص اس اسم کو بہت پڑھتا رہے یا اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے تو حق تعالیٰ اس کو شیطان کے شر سے نڈر رکھے گا اور کوئی شخص اس پر حاوی نہیں ہو گا نیز اس کا ظاہر اور اس کا باطن حق تعالیٰ کی امان میں رہے گا اور جو شخص اس کو بہت زیادہ پڑھتا رہے گا مخلوق

اللہ اس کی مطیع اور فرمان بردار ہوگی۔" المہیمن" ۔ ہر چیز کا اچھی طرح محافظ نگہبان ۔اس اسم سے عارف کا نصیب یہ ہے کہ بری عادتوں، برے عقیدوں اور بری چیزوں مثلاً حسد اور کینہ وغیرہما سے اپنے دل کی نگہبانی کرے اپنے احوال درست کرے اور اپنے قوی اور اپنے اعضا کو ان چیزوں میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھے جو دل کو اللہ کی طرف سے غفلت میں ڈالنے والی ہوں ۔خاصیت جو شخص غسل کے بعد اس اسم کو ایک سو پندرہ مرتبہ پڑھے وہ غیب اور باطن کی باتوں پر مطلع ہو اور جو شخص اس کو برابر پڑھتا رہے وہ تمام آفات سے پناہ پائے اور جنتیوں کی جماعت میں شامل ہو۔" العزیز" ۔غالب و بے مثل کہ کوئی اس پر غالب نہیں ۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے نفس، اپنی خواہشات اور شیطان پر غالب رہے علم و عمل اور عرفات میں بے مثل بنے اور مخلوق اللہ کے آگے ہاتھ نہ پھیلا کر اپنی ذات کو عزت بخشے اور غیر اللہ کے آگے دست سوال دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے ۔ابو العباس مریسی کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! عزت تو میں نے مخلوق اللہ سے بلند ہمتی اختیار کرنے (یعنی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے ہی میں دیکھی ہے)۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ کو عزیز و غالب و بے مثل تو اسی نے جانا جس نے اس کے احکام اور اس کی شریعت کو عزیز یعنی (اپنے اوپر غالب) کیا اور اس کی اطاعت و فرمان برداری میں بے مثل بنا اور جس نے ان چیزوں میں سہل پسندی اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا اس نے اللہ کی عزت نہیں پہچانی یعنی اسے عزیز نہیں مانا۔اور ارشاد ربانی ہے۔آیت (واللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لا یعلمون)۔اور اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے عزت ہے اور لیکن منافق اسے نہیں جانتے۔خاصیت جو شخص اس اسم کو فجر کی نماز کے بعد اکتالیس بار پڑھے وہ دنیا اور آخرت میں کسی کا محتاج نہ ہو اور بعد خواری کے عزیز ہو

اس کے علاوہ بھی اس اسم مبارک کی بڑی عجیب وغریب خاصیتیں مذکور ہیں۔" الجبار"۔ بگڑے کاموں کو درست کرنے والا۔اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں، بندوں کو اس چیز کی طرف لانے والا جس کا ارادہ کرتا ہے۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ فضائل وکمال حاصل کر کے اپنے نفس کی خرابیوں کو درست کرے اور تقویٰ و پرہیزگاری اور طاعت پر مداومت اختیار کر کے اپنے نفس پر غالب ہو اور اس طرح درجہ کامل کو پہنچے۔قشیری کہتے ہیں کہ بعض کتابوں میں یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندے! کسی چیز کا تو بھی ارادہ کرتا ہے اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں (یعنی اس چیز کے بارے میں تیری خواہش کچھ ہوتی ہے اور میری مشیت کچھ اور) ہوتا وہی ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں لہٰذا تو اگر اس پر راضی ہو جائے جس کا میں ارادہ کرتا ہوں (یعنی اس چیز کے بارے میں میری طرف جو فیصلہ صادر ہو جائے تو اپنی خواہش کے علی الرغم اس کو بلا چوں وچرا مان لے اور اس پر راضی ہو جائے) تو تو جو ارادہ کرتا ہے میں اس پر تجھ سے کفایت کروں گا۔(یعنی اس کا نعم البدل عطا کروں گا) اور تو اگر اس پر راضی نہ ہو ہوا۔جس کا میں ارادہ کرتا ہوں تو پھر میں اس میں تجھ سے کفایت نہیں کروں گا جس کا تو ارادہ کرتا ہے (یعنی تجھے نعم البدل عطا نہیں کروں گا۔اور پھر ہو گا وہی جو میں ارادہ کرتا ہوں اور تو محروم کا محروم رہ جائے گا)۔خاصیت جو شخص مسبعات عشر کے بعد اس اسم کو اکیس بار پڑھے وہ ظالموں کے شر سے امن میں رہے گا جو شخص اس اسم کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے گا وہ غیب اور مخلوق کی بدگوئی سے نڈر اور امان میں رہے گا اور اہل دولت وسلطنت میں سے ہوگا اور اگر کوئی شخص اس اسم کو انگوٹھی پر نقش کرا کے پہنے تو لوگوں کے دل میں اس کی ہیبت اور شوکت بیٹھ جائے گی۔" المتکبر"۔نہایت بزرگ۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اسے حق

تعالیٰ کی یہ بزرگی معلوم ہوئی تو اب اسے چاہیے کہ وہ خواہشات نفسانی کی طرف میلان ورلذات
شہوانی کی طرف رغبت سے تکبر یعنی پرہیز کرے کیونکہ ان چیزوں کی طرف رغبت کرے گا تو
جانور کا شریک ہوگا۔ بلکہ ہراس چیز سے تکبر کرنا چاہیے جو باطن کو حق سے باز رکھے اور حق تعالیٰ کی
طرف پہنچنے کے علاوہ ہر چیز کو حقیر جاننا اور تواضع وتذلل کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور اپنی ذات
سے تکبر کے تمام دعووں کو زائل کرنا چاہیے تاکہ نفس صاف ہو اور اس میں اللہ کی محبت جاگزیں
ہو اور اس طرح نہ نفس کا اختیار باقی رہے اور نہ غیر اللہ کے ساتھ قرار۔ خاصیت جو شخص اپنی بیوی
سے مباشرت کے وقت دخول سے پہلے اس مبارک اسم کو دس مرتبہ پڑھے تو انشاء اللہ حق تعالیٰ
اسے پرہیز گار فرزند خلف عطا فرمائے گا اور جو شخص اپنے ہر کام کی ابتداء میں یہ اسم مبارک بہت
پڑھے تو اللہ نے چاہا وہ اپنی مراد کو پہنچے گا۔" الخالق" ۔مشیت وحکمت کے موافق پیدا ہونے والی
چیز کا اندازہ کرنے والا۔ خاصیت جو شخص اس اسم مبارک کو برابر پڑھتا رہتا ہے حق تعالیٰ اس
کے لیے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے قیامت کے دن تک عبادت کرتا
رہے نیز حق تعالیٰ اس اسم مبارک کی برکت سے اس شخص کا دل اور منہ، روشن ونورانی کر دیتا
ہے! حضرت شاہ عبدالرحمن نے لکھا ہے کہ جو شخص رات میں یہ اسم بہت زیادہ پڑھے گا اس کا
دل اور منہ روشن ومنور ہوگا اور وہ تمام کاموں پر حاوی رہے گا۔" الباری" ۔ پیدا کرنے والا۔
خاصیت جو شخص اس اسم کو ہفتہ میں سو بار پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کو قبر میں نہیں چھوڑے گا
بلکہ ریاض قدس میں لے جائے گا اور جو حکیم ومعالج اس اسم کو مستقل طور پر پڑھتا رہے وہ جو بھی
علاج کرے گا کامیاب رہے گا۔" المصور" ۔صورت بنانے والا۔ مذکورہ بالا ان تینوں ناموں سے
بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ جب کوئی چیز دیکھے اور جب بھی کسی چیز کا تصور کرے تو اللہ کی قدرتوں اور

عجائبات میں غور وفکر کرے جو اس چیز میں موجود ہیں۔خاصیت اگر کوئی عورت بانجھ ہو اور اولاد کی دولت سے محرورم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ سات دن روزے رکھے اور ہر روز افطار کے وقت اکیس بار المصور پڑھ کر پانی پر دم کرے اور اسے پی لے انشاء اللہ حق تعالیٰ اسے فرزند نیک عطا فرمائے گا جو شخص کسی دشوار اور مشکل کام کے وقت اس اسم کو بہت پڑھے وہ کام اس ان ہو جائے گا۔" الغفار"۔بندوں کے گناہوں کو بخشنے والا اور ان کے عیوب کو ڈھانکنے والا " اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ گناہوں کو اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں بخشتا نیز اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کے عیوب کو چھپائے کسی سے کوئی قصور وخطا ہو جائے تو اس سے درگزر کرے اور اپنے اوپر ہمہ اوقات خصوصا سحر کے وقت استغفار کو لازم کرے جو شخص جمعہ کی نماز کے بعد سو بار یہ کہتا ہے۔ یا غفار اغفر لی ذنوبی۔اے بخشنے والے! میرے گناہ بخش دے۔تو حق تعالیٰ اسے ان لوگوں میں سے قرار دیتا ہے جن کی بخشش ہو چکی ہوتی ہے۔" القہار"۔غالب کہ اس کی قدرت کے سامنے سب عاجز ومغلوب ہیں۔اس اسم مبارک سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے دشمنوں پر غالب ہو کر انھیں اپنے سامنے عاجز اور اپنا مغلوب بنا دے اور وہ بڑے دشمن نفس اور شیطان ہیں۔خاصیت جو کوئی اس اسم کو بہت پڑھتا ہے حق تعالیٰ اس کے دل سے دنیا کی محبت دور کر دیتا ہے اور اس کا خاتمہ بخیر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں شوق ومحبت پیدا کرتا ہے اور جو شخص اس اسم کو اپنی کسی بھی مہم کے لیے سو بار پڑھے تو اس کی مہم آسان ہو جائے گی اور جو کوئی اس کو پڑھنے میں ہمیشگی اختیار کرے گا اس کے دل سے دنیا کی محبت جاتی رہے گی اور اگر کوئی شخص سنت وفرض نمازوں کے درمیان اس اسم کو سو بار بہ نیت مقہوری پڑھے تو بڑے سے بڑا دشمن مقہور ومغلوب ہو" الوہاب"۔بغیر بدلہ کے

بہت دینے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنا مال بغیر
کسی غرض اور بلا کسی عوض کے لالچ کے خرچ کرے۔خاصیت جو کوئی فقر و فاقہ کی تکلیف و
مصیبت جھیل رہا ہو تو اسے چاہیے کہ اس اسم پاک کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے حق تعالیٰ اسے
اس مصیبت سے اس طرح نجات دے گا کہ وہ حیران رہ جائے گا اور جو شخص اس کو لکھ کر اپنے
پاس رکھے وہ اس کا ایسا ہی اثر پائے گا اور جو شخص نماز چاشت کے بعد سجدہ کی کوئی آیت
پڑھے۔اور پھر سجدہ میں سر رکھ کر سات بار یہ اسم پاک پڑھے تو مخلوق سے بے نیاز و بے پروا
ہو جائے گا اور اگر کسی کو اپنی کوئی حاجت پوری کرانی ہو تو وہ آدھی رات کو اپنے مکان یا مسجد کے
صحن میں تین بار سجدہ کرے اور پھر ہاتھ اٹھا کر اسم کو سو بار پڑھے انشاء اللہ اس کی حاجت ضرور
پوری ہوگی۔مولانا شاہ عبدالعزیز (رح) فرماتے ہیں کہ فراخی رزق کے لیے چاشت کے وقت
چار رکعت نماز پڑھی جائے نماز سے فراغت کے بعد سجدہ میں جا کر ایک سو چار مرتبہ یا وہاب
پڑھا جائے اور اگر اتنا وقت نہ ہو تو پچاس مرتبہ پڑھ لیا جائے انشاء اللہ رزق میں وسعت و فراخی
ہوگی۔" الرزاق"۔رزق پیدا کرنے والا اور مخلوقات کو رزق پہنچانے والا۔رزق اس چیز کو کہتے
ہیں کہ جس سے فائدہ اٹھایا جائے پھر اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ظاہری اور باطنی باطنی وہ ہے جس
سے نفس کو اور دل کو فائدہ پہنچے جیسے علوم معارف وغیرہ اور ظاہری وہ ہے جس سے بدن کو فائدہ
پہنچے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور اسباب یعنی کپڑا وغیرہ۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ
اس بات پر کامل یقین و اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی بھی ذات رزق دینے کے
قابل نہیں ہے لہٰذا وہ رزق کی توقع صرف اللہ تعالیٰ سے ہی رکھے اور اپنے تمام امور اسی کی
طرف سونپے نیز اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے لوگوں کو جسمانی اور روحانی رزق پہنچاتا رہے یعنی

جومحتاج وضرورت مندہوں ان پراپنا مال خرچ کرے۔جوکہ کم علم اورگمراہ ہوں انھیں تعلیم دے اوران کی ہدایت کرے اور ہر مسلمان کے لیے دعائے خیر کرتا رہے وغیرہ وغیرہ کسی عارف سے پوچھا گیاکہ آپ کے کھانے پینے کاانتظام کیسے ہوتاہے؟ توانھوں نے جواب دیا کہ جب سے مجھے اپنے خالق کا عرفان حاصل ہوامیں نے کبھی بھی اپنے رزق کا فکرنہیں کیااسی طرح ایک عارف سے پوچھا گیاکہ قوت غذا کیاہے؟ انھوں نے کہاحی الذی لایموت (وہ پاک ذات یعنی اللہ ایسازندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے) کاذکر خاصیت جوشخص صبح صادق کے طلوع کے بعداورنماز فجر سے پہلے اپنے گھرکے چاروں کونوں میں اس اسم پاک کو دس دس مرتبہ پڑھے اس طرح کہ داہنی طرف سے پڑھنا شروع کرے اور منہ قبلہ کی طرف سے نہ پھیرے تواس گھر میں رنج ومفلسی کا گزرنہیں ہوگا۔" الفتاح "حکم کرنے والا۔اور بعضوں نے کہاہے رزق رحمت کے دروازے کھولنے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح و صفائی اورانصاف کے لیے فیصلہ کرنے کی سعی وکوشش کرتارہے اورمظلوموں کی مدد کرے نیزلوگوں کی دنیاوی اخروی حاجتوں کو پورا کرنے کاارادہ رکھے۔قیثری نے فرمایاکہ جس شخص نے یہ جان لیاکہ اللہ تعالیٰ رزق ورحمت کے دروازے کھولنے والا۔اسباب میسر کرنے والا اور تمام چیزوں کودرست کرنے والا ہےتواب وہ اللہ کےعلاوہ کسی اورمیں اپنادل نہیں لگائے گا۔ خاصیت جوشخص نماز فجر کے بعداپنے سینہ پردونوں ہاتھ رکھ کرستر باراس اسم کوپڑھےتواس کے دل کا میل جاتارہے گااوراسے قلب و باطن کی بہت زیاد صفائی حاصل ہوگی۔" العلیم" ظاہرو باطن کاجاننے والا۔کسی نےکیاخوب کہاہےکہ جس شخص نے یہ جان لیاکہ اللہ تعالیٰ میراحال خوب جانتاہےتواب اس کے لیےضروری ہےکہ اگراللہ تعالیٰ اسےکسی مصیبت وبلامیں مبتلا کرےتووہ

اس پر صبر کرے اور جو کچھ عطا کرے اس کا شکر ادا کرے اور اس سے اپنی خطاؤں کی بخشش و معافی کا خواستگار ہو۔ بعض کتابوں میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ (بندوں سے) فرماتا ہے اگر تم یہ نہیں جانتے کہ ہر حالت میں تم پر میری نظر رہتی ہے اور میں تمہیں دیکھتا ہوں تو پھر تمہارے ایمان میں کمی ہے اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں تمہیں ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں تو پھر کیوں تم مجھے دیکھنے والوں میں سب سے حقیر سمجھتے ہو؟ یعنی (دوسروں سے تو تم ڈرتے ہو اور شرم کرتے ہو کہ کہیں وہ تمہیں برائی اور تمہارے کسی جرم کو دیکھ نہ لیں لیکن کسی بھی برائی اور جرم کے وقت مجھ سے نہ ڈرتے ہو اور نہ شرم کرتے ہو جب کہ تمہاری ایک ایک حرکت میری نظر رہتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) میرے مقابلہ پر تم دنیا والوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہو۔ خاصیت جو شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھتا ہے حق تعالیٰ اسے اپنی معرفت بہت زیادہ عطا کرتا ہے اور جو شخص نماز کے بعد یا عالم الغیب سو مرتبہ کہے حق تعالیٰ اسے صاحب کشف بنائے گا اور اگر کوئی چاہے کہ اسے کسی پوشیدہ چیز کا علم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں یہ سو مرتبہ کہہ کر سوئے انشاء اللہ اس پر اس چیز کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ "القابض" بندوں کی روزی یا دل تنگ کرنے والا اور اس کی روح قبض کرنے والا۔ خاصیت اگر کوئی شخص اس نام پاک کو چالیس دنوں تک روزانہ (روٹی وغیرہ) چار نوالوں پر لکھ کر کھایا کرے تو انشاء اللہ وہ بھوک اور قبر کے عذاب سے امن میں رہے گا۔" الباسط" بندوں کی روزی میں وسعت اور فراخی پیدا کرنے والا یا ان کا دل کشادہ کرنے والا۔ ان دونوں ناموں (یعنی القابض اور الباسط) سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی بلاء و مصیبت کے وقت ناامید ہو اور نہ اس کی بخشش عطاء کے وقت بے فکری اختیار کرے اور تنگی کو اس کے عدل کا نتیجہ جانے اور اس پر صبر کرے اور فراخی و

وسعت کو اس کے فضل کا ثمرہ سمجھے اور اس پر شکر گزار ہو۔! قشیری کہتے ہیں کہ یہ دونوں کیفیت یعنی دل کا تنگ اور کشادہ ہونا۔ عارفوں کے دل پر طاری ہوتی ہے کہ جب خوف اللہ غالب ہوتا ہے تو ان کے دل تنگ ہوتے ہیں اور جب رحمت کی امید غالب ہوتی ہے تو ان کے دل کشادہ ہوتے ہیں! چنانچہ حضرت جنید بغدادی کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا خوف میرے دل کو تنگ کر دیتا ہے امید میرے دل کو کشادہ کر دیتی ہے حق مجھے جمع کرتا ہے (یعنی حق تعالیٰ کی یاد سے مجھے خاطر جمعی حاصل ہوتی ہے) اور مخلوق مجھے منتشر کرتی ہے (یعنی مخلوق کی صحبت سے میں پراگندہ خاطر اور متواحش ہوتا ہوں) اور بندہ کی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ تنگی اور پریشانی کی حالت میں بے قراری سے پرہیز کرے اور وسعت فراخی کے وقت بے جا خوشی اور بے ادبی سے اجتناب کرے کہ ان چیزوں سے بڑے بڑے لوگ ڈرتے رہے ہیں۔ خاصیت جو شخص سحر کے وقت ہاتھ اٹھا کر اس اسم پاک کو دس بار پڑھے اور پھر اپنے ہاتھوں کو منہ پر پھیرے تو اسے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ وہ کسی سے اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی درخواست کرے۔ ”الخافض“ کافروں کو ذلیل وخوار کر کے یا ان کو اپنی درگارہ سے دور رکھ کر پشت کرنے والا۔ خاصیت جو شخص تین روزے رکھے اور چوتھے روز ایک نشت میں اس اسم پاک کو ستر ہزار بار پڑھے وہ دشمنوں پر فتح پائے گا۔ نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی کسی بھی حالت پر اعتماد نہ کرے اور نہ اپنے علوم اعمال میں سے کسی چیز پر بھروسہ کرے اور اس چیز کو پست و مغلوب کرے جس کو اللہ نے پست کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً نفس وخواہش، اس چیز کو بلند کرے جس کو اللہ نے بلند کرنے کا حکم دیا ہے جیسے دل اور روح۔ منقول ہے کہ ایک شخص کو لوگوں نے ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم اس مرتبہ پر کیونکر پہنچے؟ اس نے کہا کہ میں

نے اپنی ہوا یعنی اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے فضا کی ہوا کو میرے لیے مسخر کر دیا۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو آدھی رات کے وقت یا دو پہر میں سو مرتبہ پڑھے حق تعالیٰ اسے مخلوق میں برگزیدہ اور تونگر اور بے نیاز بنائے گا۔" المعز" ۔عزت دینے والا۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو دوشنبہ کی شب میں یا جمعہ کی شب میں ایک سو چالیس مرتبہ پڑھے گا مخلوق کی نظر میں اس کی ہیبت وشوکت پیدا ہوگی اور وہ حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کے خوف میں مبتلا نہیں ہوگا۔" المذل" ذلت دینے والا۔ ان دونوں ناموں (المعز اور المذل) سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو عزیز رکھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کی وجہ سے عزیز رکھا ہے اور ان لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفر ضلالت کے سبب سے ذلیل و خوار قرار دیا ہے۔ خاصیت اگر کوئی شخص کسی ظالم و حاسد سے ڈرتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اس اسم پاک کو پچھتر بار پڑھے اس کے بعد سجدہ کرے اور بارگاہ حق میں یوں عرض کرے۔ اے اللہ! فلاں ظالم و حاسد کے شر سے مجھے امن دے۔ حق تعالیٰ اسے امان دے گا۔" السمیع" سننے والا۔" البصیر" دیکھنے والا۔ ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خلاف شرع چیزوں کے کہنے سننے اور دیکھنے سے پرہیز کرے اور اللہ کو اپنے اقوال و افعال پر حاضر ناظر جانے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس نے غیر اللہ سے اس چیز کو چھپایا جس کو وہ اللہ سے نہیں چھپاتا اس نے گویا اللہ کی نظر کو حقیر جانا لہٰذا جس شخص نے یہ جانتے ہوئے کوئی گناہ کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے تو اس نے بڑی جرات کی اور کیا ہی بڑی جرات کی؟ اور جس نے اس گمان کے ساتھ کوئی گناہ کیا کہ اسے اللہ نہیں دیکھتا ہے تو پھر اس نے بڑا کفر کیا اور کیا ہی بڑا کفر کیا؟ اس لیے بطور تعلیق بالمحال کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنے اللہ کا کوئی جرم کرو تو ایسی جگہ کرو جہاں وہ تمہیں نہ دیکھے مطلب یہ ہے کہ ایسی کون سی جگہ ہے

کہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ ہو اور جب ایسی کوئی جگہ بھی ممکن نہیں جہاں اللہ گناہ کرتے نہ دیکھے تو پھر گناہ نہ کرو۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک السمیع کو پنجشنبہ کے دن نماز چاشت کے بعد پانچ سو بار ایک قول کے مطابق ہر روز نماز چاشت کے بعد ایک سو بار پڑھے اور پڑھنے کے درمیان کوئی کلام نہ کرے تو اس کے بعد جو دعا مانگے قبول ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص فجر کی سنت وفرض نماز کے درمیان اسم پاک البصیر کو کامل اور صحیح اعتقاد کے ساتھ ایک سو ایک بار پڑھا کرے تو انشاء اللہ وہ حق تعالیٰ کی نظر عنایت کے ساتھ مختص ہوگا۔" الحکم" ۔حکم کرنے والا کہ اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کرسکتا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ ایسا حاکم ہے کہ اس کے حکم اور اس کے فیصلہ کو کوئی ٹال نہیں سکتا تو اب اسے چاہیے کہ وہ اس کا ہر حکم مانے اور اس کی مشیت وقضا کا تابعدار ہو، لہٰذا جو بندہ اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر پر قصداً راضی نہ ہوگا تو حق تعالیٰ اس پر اپنی مشیت اور اپنا فیصلہ زبردستی جاری کرے گا جو شخص برضا ورغبت اور دل کے ساتھ بخوشی اسے مان لے گا۔ حق تعالیٰ اسے اپنی رحمت اور اپنے کرم سے نوازے گا وہ خوشی اور اطمینان کی زندگی گزارے گا اور وہ غیر اللہ کے سامنے اپنی فریاد لے کر جانے کا محتاج نہیں ہوگا۔ خاصیت جو شخص اس اسم مبارک کو شب جمعہ میں اور ایک قول کے مطابق آدھی رات کے وقت اتنا پڑھے کہ بے ہوش ہو جائے تو حق تعالیٰ اس کے باطن کو معدن اسرار بنا دے گا۔" العدل" انصاف کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ یہ جاننے کے بعد کہ اللہ انصاف کرنے والا ہے بندہ کو چاہیے کہ اس کے احکام اور اس کے فیصلوں سے اپنے اندر گھبراہٹ اور تنگی پیدا نہ کرے بلکہ یہ یقین رکھے کہ اس نے میرے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے وہ عین انصاف ہے لہٰذا اس پر توکل اور اعتماد کے ذریعہ راحت و اطمینان پیدا

کرنے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اسے دے اس کو اس جگہ خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے جہاں خرچ کرنا از راہ شروع وعقل مناسب ہے اور اس کے عدل سے ڈرے اس کے فضل و کرم کا امیدوار رہے اور تمام امور میں افراط وتفریط سے پرہیز کرتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کرے۔ خاصیت یہ جو شخص اس اسم پاک کو شب جمعہ میں روٹی کے بیس لقموں پر لکھ کر کھائے حق تعالیٰ تمام مخلوق کو اس کے لیے مسخر کر دے گا۔" اللطیف" اپنے بندوں پر نرمی کرنے والا اور باریک بین کہ اس کے لیے دور و نزدیک یکساں ہیں۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ امور دین و دنیا میں غور و فکر کرے اور نرمی کے ساتھ لوگوں کو راہ حق کی طرف بلائے۔ خاصیت جس شخص کو اسباب معیشت مہیا نہ ہوں اور فقر و فاقہ میں مبتلا رہتا ہو، یا غربت میں کوئی غمخوار نہ ہو یا بیمار ہو اور کوئی اس کی تیمار داری نہ کرتا ہو یا اس کے لڑکی ہو کہ اس کا رشتہ وغیرہ نہ آتا ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اس اسم پاک کو اپنے مقصد کی نیت کے ساتھ سو بار پڑھے انشاء اللہ حق تعالیٰ اس کی مشکل کو آسان کرے گا اسی طرح لڑکیوں کا نصیب کھلنے کے لئے، امراض سے صحت یابی کے لیے اور مہمات کی تکمیل کے لیے کسی خالی جگہ میں اس اسم کی دعا کی شرائط کے ساتھ سولہ ہزار تین سو اکتالیس مرتبہ پڑھا جائے انشاء اللہ مراد حاصل ہو گی۔" الخبیر" دل کی باتوں اور تمام چیزوں کی خبر رکھنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرے بھیدوں پر مطلع ہے اور میرے دل کی باتیں تک جانتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بھی اس کو یاد رکھے اور اس کی یاد کے آگے اس کے ماسوا کو بھول جائے۔ ضلالت کے راستوں سے پرہیز کرے۔ اپنی ذات پر ریاکاری کے ترک اور تقویٰ کے اختیار کو لازم کرے باطن کی اصلاح میں مشغول رہے اس سے غفلت نہ برتے اور دین و دنیا کی

بہترین کھلی باتوں کی خبر رکھنے والا ہو۔خاصیت جوشخص نفس امارہ کے ہاتھوں گرفتار ہو وہ اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے اللہ نے چاہ تو اس سے نجات پائے گا۔" الحلیم" ۔بردبار کہ مومن کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ توبہ کر کے فلاح پائیں۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ بد طینت لوگوں کی ایذاء پر تحمل کرے، زبردستوں کو سزا دینے پر تامل کرے اور غیض وغضب اور غصہ سے دور رہے اور حلم کے اس مرتبہ کمال کو پہنچنے کی کوشش کرے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ برائی کرے گا تو وہ اس کے ساتھ نیکی کرے۔ خاصیت اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو کاغذ پر لکھ کر دھوئے اور اس کا پانی کھیتی و درخت میں ڈالے نقصان سے محفوظ رہے گا، ان میں برکت ہوگی۔اور ان سے پورا پورا ثمرہ حاصل ہوگا۔" العظیم" ذات پاک میں فہم وشعور کی رسائی سے بھی زیادہ بزرگ و برتر۔یعنی اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے اس کی بزرگی و بڑائی اور عظمت اتنی زیادہ ہے کہ انسان کی عقل اور اس کی فہم و شعور اس کی عظمت و بڑائی کا ادراک بھی نہیں کرسکتا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ عظمت الٰہی کے آگے کونین کو بھی حقیر جانے، دنیا کے لیے کسی کے آگے اپنا سر نہ جھکائے۔ اپنے نفس کو حقیر جانے اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو کرنے کا حکم کیا ہے ان کو اختیار کر کے اور جن چیزوں سے بچنے کا حکم کیا ہے ان سے اجتناب کرے اور جو چیزیں اللہ کو محبوب ہیں ان میں مشغول رہ کر اپنے نفس کو ذلیل کرے۔تاکہ اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل ہو۔خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو پڑھنے پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرے وہ مخلوق اللہ کی نظروں میں عزیز ومکرم ہوگا۔" الغفور" ۔بہت بخشنے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ رات و دن کے اکثر اوقات میں خصوصاً سحر کے وقت استغفار کو اپنے اوپر لازم کرے اور اس شخص کو بخشش ومعافی

دے جو اسے تکلیف وایذاء پہنچائے۔خاصیت جس شخص کو کوئی بیماری ہو مثلاً بخار اور درد سر وغیرہ یا کوئی رنج وغم اس پر غالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس اسم پاک کو کاغذ پر لکھے اور اس کے نقش کو روٹی پر جذب کر کے اسے کھالے حق تعالیٰ اسے شفاو نجات عطا فرمائے گا اور اگر کوئی شخص اس کو بہت پڑھتا رہے اس کے دل کی ظلمت جاتی رہے گی۔ایک حدیث میں منقول ہے کہ جو شخص سجدہ کرے اور سجدہ میں یارب اغفرلی اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے۔تین مرتبہ کہے حق تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا۔جس شخص کو درد سر کا عارضہ لاحق ہو یا کسی اور بیماری اور غم میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ یاغفور کے مقطعات تین مرتبہ لکھ کر کھالے انشاء اللہ شفا پائے گا۔" الشکور" قدر دان اور تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب دینے والا۔منقول ہے کہ کسی شخص کو جو مر چکا تھا خواب میں دیکھا گیا تو اس سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ حق تعالیٰ نے کیسا معاملہ؟ اس شخص نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھ سے حساب کیا تو میری نیکیوں کا پلڑا اٹھ گیا۔ اور گناہوں کا پلڑا غالب ہو گیا کہ اچانک نیکیوں کے پلڑے میں ایک تھیلی آ کر پڑی جس سے وہ پلڑا جھک گیا۔جب میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو مجھے بتایا گیا کہ یہ ایک مٹھی بھر مٹی ہے جو تو نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی قبر میں ڈالی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا فضل وکرم کتنے معمولی عمل پر بھی بندہ کو بے انتہا ثواب ورحمت سے نوازتا ہے اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے بایں طور کہ تمام نعمتوں کو اسی کی عطا جان کر اپنے ہر عضو کو اسی کام میں مشغول رکھے جس کے لیے حق تعالیٰ نے اسے پیدا کیا لے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے اور ان کا شکر ادا کرتا رہے۔کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے۔حدیث (لایشکر اللہ من لایشکر الناس)۔وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا۔خاصیت جس شخص کی

معیشت تنگ ہو یا اس کی آنکھ کی روشنی اور قلب کے نور میں کمی پیدا ہوگئی ہو تو وہ اس اسم پاک کو اکتالیس بار پانی پر پڑھ کر پیئے اور آنکھوں پر ملے انشاء اللہ تو نگری حاصل ہوگی اور شفا پائے گا۔" العلیٰ" بلند مرتبہ۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ظاہری اور باطنی طاعات اور عبادات کے ذریعہ اپنے نفس کو ذلیل کرے اور اپنی تمام تر توانائی علم وعمل کے حصول میں صرف کرے یہاں تک کہ وہ انتہائی کمالات اور مراتب عالی کو پہنچے۔ حدیث شریف میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ امور کو پسند کرتا (کیونکہ اس کی وجہ سے بندہ اعلیٰ مراتب اور بلند درجات کو پہنچتا ہے) اور ادنیٰ امور کو ناپسند کرتا ہے اسی لیے حضرت علی کرام اللہ وجہہ کا یہ مقولہ ہے کہ علو ہمتی ایمان ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے یا اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے تو اگر وہ کمتر اور بے قدر ہو تو بزرگ و بلند مرتبہ ہو جائے گا فقر و افلاس میں مبتلا ہو تو تو نگری حاصل ہوگی اگر سفر کی صعوبتوں میں مبتلا ہو تو وطن مالوف لوٹنا نصیب ہوگا۔" الکبیر" بڑا اور ایسا بڑا کہ اس کی بڑائی میں کوئی اس کا ہمسفر نہیں۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اس کی بڑائی کو ہمیشہ یاد رکھے یہاں تک کہ اس کے ماسوا کی بڑائی کو بالکل فراموش کر دے علم وعمل کے حصول کے ذریعہ اپنے نفس کو کامل بنانے کی کوشش کرے تا کہ اس کے کمال اور اس کے فیض سے دوسرے مستفید ہوں۔ تواضع وانکساری اختیار کرنے میں مبالغہ کرے اور خدمت مولیٰ کو اپنے اوپر لازم قرار دے کر بے اعتنائی و بے ادبی سے احتراز کرے۔ خاصیت اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھنے والا بزرگ مرتبہ اور عالی قدر ہوتا ہے اور اگر حکام وفرمانروا اس اسم پاک پر مداومت کریں تو لوگوں پر ان کو خوف و دبدبہ غالب ہو اور ان کے تمام امور بحسن خوبی انجام پائیں۔" الحفیظ"۔ عالم کو آفات ونقصانات سے محفوظ رکھنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا

نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو گناہوں سے اور باطن کو ملاحظہ اغیار سے محفوظ رکھے اور اپنے تمام امور میں اللہ کے فیصلوں اور اس کی مشیت پر اکتفا کرے اور اس کی قضاوقدر پر راضی ہو۔ ایک بزرگ کا یہ قول منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے اعضاء محفوظ رکھے اس کا دل محفوظ رکھا اور جس کا دل محفوظ رکھا اس کے بھیدوں کو محفوظ کیا۔ منقول ہے کہ ایک دن اتفاق سے ایک بزرگ وصالح کی نظر کسی ممنوع چیز پر پڑگئی فوراً وہ بارگاہ الٰہی میں عرض رساں ہوئے الٰہ العالمین! مجھے اپنی بینائی کی بقاء کی صرف اسی لیے تمنا تھی تاکہ تیری عبادت میں کام آئے اب جب کہ تیرے حکم کی مخالفت کا سبب بن گئی ہے تو پروردگار! اسے مجھ سے چھین لے۔ چنانچہ ان کی بینائی جاتی رہی اور وہ اندھے ہوگئے وہ رات میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ بینائی جانے کے بعد رات میں انھیں پریشانی ہوئی یہاں تک کہ وہ طہارت اور وضو کے لیے پانی لینے سے بھی محتاج ہوگئے اب جب پانی ان کے ہاتھ نہ لگا اور نماز وعبادت میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو پھر اللہ کے حضور عرض کیا پروردگار! میں نے خود ہی کہا تھا کہ میری بینائی مجھ سے چھین لے لیکن اب رات میں تیری عبادت کے لیے مجھے اس کی ضرورت ہے اس کے بعد اللہ نے ان کی بینائی واپس کردی اور وہ ٹھیک ہوگئے۔ خاصیت اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو لکھ کر اپنے دائیں بازو پر باندھ لے تو وہ ڈوبنے، جلنے، آسیب اور نظر بد وغیرہ سے محفوظ رہے گا۔ ''المقیت'' بدن وروح کے لیے قوت (غذا) پیدا کرنے والا اور انھیں قوت دینے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے یہ جان لیا کہ وہی قوت پیدا کرنے والا ہے اور قوت دینے والا ہے تو اب اسے چاہیے کہ وہ اس کے ذکر (یعنی یاد الٰہی) کے سامنے اپنے قوت کا ذکر (یعنی اپنی غذا کا فکر) بھول جائے کیونکہ حقیقی قوت تو اسی کا ذکر اور اسی کی یاد ہے جیسا کہ حضرت سہل (رض) سے

منقول ہے کہ ان سے جب قوت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ حی الذی لایموت (ایسا زندہ جونہیں مرتا) کا ذکر ہے۔ نیز بندہ کو چاہیے کہ وہ قوت اور قوت اپنے مولیٰ کے علاوہ اور کسی سے نہ مانگے ارشاد ربانی ہے۔ آیت (وان من چیز الا عندنا خزائنہ ومانتزلہ الا بقدر معلوم)۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہے ہمارے پاس جس کے خزانے نہ ہوں اور ہم اسے اپنے اندازہ مقرر کے مطابق ہی اتارتے ہیں۔ نیز بندہ کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر متعلق کو قوت دے جس کا وہ مستحق ہے تاکہ دوسروں کو نفع پہنچانا گمراہوں کی ہدایت کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا اس کا طرہ بن جائے۔ قیشری فرماتے ہیں کہ قوت مختلف نوع کے ہوتے ہیں ایک تو یہی ظاہری غذا اور خوراک کہ جس پر انسان کی زندگی کا مدار سمجھا جاتا ہے لیکن بعض بندے تو ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عبادات کی توفیق کو ان کے نفس کا قوت، مکاشفات کے صدور کو ان کے دل کا قوت اور مداومت مشاہدات کو ان کی روح کا قوت بنا دیتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی نیک بندہ کو اپنی طاعت وعبادات میں مشغول کرتا ہے اور طرح کہ وہ اپنی خواہشات نفس سے بالکل قطع نظر کر کے پورے حضور اور صدق و اخلاص کے ساتھ صرف اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کسی ایسے شخص کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کی خبر گیری اور خدمت کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اس کی ضروریات زندگی خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن جب کوئی بندہ اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کی تکمیل کو اسی کے بل بوتہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کے اوپر سے اپنی عنایت ومدد کا سایہ اٹھالیتا ہے۔ خاصیت اگر کوئی شخص کسی کو غربت زدہ دیکھے یا خود غربت میں مبتلا ہو، یا کوئی بچہ اپنی بدخوئی سے باز نہ آتا ہو یا بہت روتا ہو تو کسی خالی پیالہ وغیرہ پر سات بار اس اسم پاک کو پڑھ کر دم کرے اور پھر اس

پیالہ میں پانی ڈال کر پی لے یا جس کو ضرورت ہو اسے پلا دے۔ اسی طرح اگر کسی روزہ دار کو ہلاکت کا خوف ہو تو وہ اس اسم پاک کو کسی پھول پر پڑھ کر سونگھے انشاء اللہ اسے قوت وتقویت حاصل ہوگی اور روزے رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ "الحسیب" ہر حال میں کفایت کرنے والا یا قیامت کے دن حساب لینے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ محتاجوں کو کفایت کرنے والا یعنی ان کی حاجتوں کو پورا کرنے والا ہو اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔ قشیری نے اس موقع پر جو بات کہی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندوں کو اللہ کا کفایت کرنا یہ ہے کہ وہ اس کے ہر حال میں اور ہر کام میں مددگار ہوتا ہے اور اس کا ہر کام پورا ہوتا ہے لہٰذا جب بندہ نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی اور میری ہر مراد اور میرے ہر کام کو پورا کرنے والا ہے تو اب اس کو چاہیے کہ وہ کسی بھی دنیاوی سہارے پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اگر اسے اپنے مقصد کے حصول میں کسی بھی دنیاوی سہارے سے بوقت ضرورت فائدہ نہ پہنچے جب کہ اسے اس سہارے پر اعتماد بھی رہا ہو تو اس سے بددل اور پریشان خاطر نہ ہو بلکہ یہ یقین رکھے کہ اللہ نے میرے مقدر میں جو طے فرما دیا ہے بہر صورت وہی ہوگا اگر قسمت میں حصول مقصد لکھا جا چکا ہے تو وہ ضرور حاصل ہوگا چاہے وہ دنیاوی سہارا کتنا ہی مایوس کن کیوں نہ ہو اور اگر قسمت میں مقصد کا حصول نہیں لکھا ہے تو وہ حاصل نہیں ہوگا چاہے وہ دنیاوی سہارا کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے اور پھر یہ کہ جو شخص اللہ کی طرف سے پیش آنے والی چیز پر جو کہ اگرچہ اس کا مطلب نہیں ہے اکتفا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اس چیز پر راضی و مطمئن کر دے گا جو اس نے اس شخص کے لیے طے فرما دی ہوگی چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا بندہ اپنے اسی وصف (یعنی راضی برضاء ہو جانے کی) بناء پر اپنے مطلوب کے عدم حصول کو اس کے حصول کے مقابلہ میں فقر کو غنا کے مقابلہ میں برضا و رغبت

اختیار و قبول کرے گا اور بسبب مشاہدہ و تصرف مولیٰ حصول مقصد کے اسباب و ذرائع مہیا نہ ہونے ہی پر مطمئن ہو جائے گا۔خاصیت جو شخص کسی چور یا حاسد یا ہمسایہ بد اور دشمن کے شر سے ڈرتا ہو یا چشم زخم سے پریشان ہو تو وہ ایک ہفتہ تک ہر صبح و شام ستر بار حسبی اللہ الحسیب (کفایت کرنے والا اللہ میرے لیے کافی ہے) پڑھ لیا کرے اللہ تعالیٰ اسے ان چیزوں کے شر اور پریشانی سے محفوظ رکھے گا۔" الجلیل" بزرگ قدر۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ صفات کمال کے ذریعہ اپنے نفس کو آراستہ کر کے بزرگ مرتبہ بنے۔خاصیت اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو مشک و زعفران سے لکھ کر اپنے پاس رکھے یا کھائے تو تمام لوگ اس کی تعظیم و توقیر کرنے لگیں گے۔" الکریم" بڑا سخی اور بہت دینے والا کہ اس کا دینا نہ کبھی بند ہوتا ہے نہ اس کے خزانے خالی ہوتے ہیں۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق اللہ کو بغیر وعدہ کے مال و زر دیتا رہے اور ان کی ہر طرح کی مدد کرتا رہے نیز برے اخلاق اور برے فعل سے پرہیز کرے۔خاصیت جو شخص اپنے بستر پر پہنچ کر اس اسم پاک کو اتنا پڑھے کہ پڑھتے پڑھتے سو جائے تو اس کے لیے فرشتے دعا کریں اور کہیں اکرمک اللہ اللہ تجھے بزرگ مرتبہ کرے اور تو مکرم و معزز ہو۔کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس اسم کو بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے اسی وجہ سے انھیں کرم اللہ وجہہ کہا جانے لگا۔" الرقیب" ہر چیز کی نگہبانی کرنے والا۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ بندوں کے احوال و افعال جاننے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اور ہر حال میں اللہ ہی پر نظر رکھے اس کے علاوہ کسی اور سے سوال نہ کرے کہ ماسوا اللہ کی طرف التفات ظاہر ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جن کی نگہبانی اور دیکھ بھال پر مقرر فرمایا ہے ان کی نگہبانی اور دیکھ بھال میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہ کرے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم

سب راعی یعنی نگہبان ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا یعنی جن کی نگہبانی اور خبر گیری پر تمہیں متعین کیا گیا ہے ان کی نگہبانی اور خبر گیری کا حال تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنا فرض کہاں تک ادا کیا؟ قشیری کہتے ہیں کہ اس طائفہ یعنی اولیاء اللہ کی جماعت کے نزدیک مراقبہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ پر دل کے ساتھ۔۔۔ اللہ کی یاد غالب ہو اور یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ میرے حال پر مطلع ہے لہٰذا وہ ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرے اور ہر دم اس کے عذاب سے ڈرے چنانچہ صاحب مراقبہ اللہ تعالیٰ کی حیاء اور اس کی ہیبت کی وجہ سے خلاف شرع باتیں اس شخص سے زیادہ چھوڑتا ہے جو عذاب الٰہی کے ڈر سے گناہ چھوڑتا ہے اور جو شخص اپنے دل کی رعایت کرتا ہے یعنی ضمیر کے صحیح تقاضے پر ہی عمل کرتا ہے تو اس کا کوئی لمحہ اللہ کی یاد اور اس کی اطاعت سے خالی نہیں رہتا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل کا حساب لے گا خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا عمل ہو یا بڑے سے بڑا۔ چنانچہ ایک ولی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے انتقال کے بعد انھیں کسی نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور مجھ پر اپنا احسان فرمایا لیکن پورا حساب لیا یہاں تک مجھ سے اس عمل کا بھی مواخذہ کیا کہ ایک دن میں روزے سے تھا جب افطار کا وقت ہوا تو میں نے اپنے ایک دوست کی دکان سے گیہوں کا ایک دانہ اٹھالیا اور پھر اسے توڑا، معاً مجھے خیال آیا کہ گیہوں کا یہ دانہ میری ملکیت میں نہیں ہے یہ خیال آتے ہی میں نے اس دانے کو اس جگہ ڈال دیا چنانچہ اب جب کہ میرا حساب لیا گیا تو اس گیہوں کے توڑنے کی بقدر نیکی میری نیکیوں سے لی گئی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسے ایک دن اللہ کی بارگاہ میں اتنی

چھوٹی سے چھوٹی سے باتوں کا بھی حساب دینا ہے تو کیا وہ گوارا کرے گا کہ اپنی عمر عزیز باطل چیزوں میں ضائع کرے۔ اور اپنے وقت کو کوتاہیوں اور غفلتوں کی نذر کر دے؟ حدیث شریف میں منقول ہے کہ تم اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے۔ خاصیت جو شخص اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنے مال پر اس اسم پاک کو سات مرتبہ پڑھ کر ان کے چاروں طرف دم کرے وہ تمام دشمنوں اور تمام آفات سے بے خوف ہو جائے گا۔ "المجیب" عاجزوں کی دعا قبول کرنے والا اور پکارنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری کرے اور حاجتمندوں کی حاجتوں کو پورا کرے۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور پھر دعا کرے تو اس کی دعا جلد قبول ہو گی اور اگر اسے لکھ کر اپنے پاس رکھے تو حق تعالیٰ کی امان میں رہے گا۔" الواسع"۔ وسیع علم والا اور اپنی نعمتوں سے سب کو نوازنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے علم میں اپنی سخاوت میں اور معارف و اخلاق میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کرے سب ہی سے چہرہ کی بشاشت اور کشادگی کے ساتھ پیش آئے اور دنیاوی مقاصد کے حصول میں فکرمند نہ رہا کرے۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرے حق تعالیٰ اسے قناعت اور برکت کی دولت سے نوازے گا۔" الحکیم" دانا اور استوار کار۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ کتاب اللہ میں مذکور صفات حمیدہ کو اپنائے اور کمال تعلق اس سے پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنے تمام امور میں استوار پیدا کرے نیز اسے چاہیے کہ وہ سفاہت یعنی بے وقوفی سے پرہیز کرے اور کوئی کام بغیر باعث حقانی اور بغیر داعیہ ربانی نہ کرے تا کہ اس کی ذات اسم "حکیم" کا پرتو ثابت ہو۔ حضرت ذوالنون مصری کے بارے میں منقول ہے کہ

انھوں نے فرمایا جب میں نے سنا کہ مغرب کے علاقہ میں ایک شخص اپنے علم وحکمت کی بناء پر بہت مشہور و معروف ہیں تو میں ان کی زیارت کے لیے ان کے پاس پہنچا میں چالیس دن تک ان کے دروزے پر پڑا رہا اور میں یہ دیکھتا تھا کہ وہ نماز کے وقت مسجد میں آتے اور حیران و پریشان پھرنے لگتے اور میری طرف قطعاً کوئی توجہ والتفات نہ فرماتے اس صورت حال سے میں تنگ آگیا تو ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ جناب! چالیس دن سے میں یہاں پڑا ہوں لیکن نہ تو آپ میری طرف التفات کرتے ہیں اور نہ مجھ سے کلام کرتے ہیں؟ آپ مجھے کوئی نصیحت کیجئے اور کچھ باحکمت باتیں بتائیے کہ اسے میں یاد رکھو۔ انھوں نے کہا کہ تم اس پر عمل کرو گے یا نہیں؟ میں نے کہا ہاں اگر اللہ نے توفیق دی تو ضرور عمل کروں گا۔ پھر انھوں نے حکمت و موعظت سے بھرپور یہ بات مجھ سے کہی کہ دنیا کو دوست نہ رکھو، فقر کو غنیمت جانو، بلا کو نعمت سمجھو، منع یعنی نہ ملنے کو عطا جانو، غیر اللہ کے ساتھ نہ انس اختیار کرو اور نہ ان کی صحبت میں اپنے کو مشغول رکھو، خواری کو عزت سمجھو، موت کو حقیقی حیات جانو، طاعت و عبادت کو اپنی عزت کا ذریعہ سمجھو اور توکل کو اپنی معاش قرار دو۔ از سینہ محو کن ہمہ نام ونشان غیر الا کسے کہ می دہد از وے نشان ترا خاصیت اگر کسی شخص کو اپنے کسی کام میں پریشانی ہو اور وہ پورا نہ ہو رہا ہو تو اسے چاہیے کہ اس اسم پاک پر مداومت اور ہمیشگی اختیار کرے انشاء اللہ تعالیٰ اس کا کام پورا ہو جائے گا۔“

الودود” فرمان بردار بندوں کو دوست رکھنے والا یا اولیاء اللہ کے قلوب میں محبوب۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ مخلوق اللہ کے لیے وہی چیز پسند کرے گا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور ان پر اپنی بساط بھر احسان کرتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے

لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ بندوں کو اللہ تعالیٰ کا دوست رکھنا یہ ہے کہ کہ وہ بندوں پر اپنی رحمت نازل کرتا ہے۔ ان کی تعریف کرتا ہے ان کو خیر و بھلائی پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کا دوست رکھنا یہ ہے کہ وہ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اپنے قلوب میں اس کی ہیبت و بڑائی رکھتے ہیں۔ حدیث میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے دوستوں میں بڑا دوست وہ ہے جو غیر عطا کے لیے میری عبادت کرتا ہے یعنی وہ عطا و بخشش کی امید سے نہیں بلکہ صرف میری رضا اور خوشنودی کی خاطر ہی عبادت کرتا ہے۔ خاصیت اگر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہو جائے اور تعلقات انتہائی کشیدہ ہو جائیں تو اس اسم پاک کو کسی کھانے کی چیز پر ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھ کر دونوں میں سے اس کو کھلا دیا جائے جس کی طرف سے ناچاقی پیدا ہوتی ہو انشاء اللہ ان دونوں کے درمیان اتفاق و الفت کی فضا بحال ہو جائے گی۔" المجید" بزرگ و شریف ذات۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم مبارک العظیم کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ خاصیت جس شخص کو آبلہ پا، یا باد فرنگ (آتشک) یا برص اور یا جزام کا مرض لاحق ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایام بیض میں روزے رکھے اور افطار کے وقت اس اسم پاک کو بہت پڑھے اور دم کر کے پی لے اللہ نے چاہا تو یقیناً شفا پائے گا اور جس شخص کو اپنے ہم عصروں اور ہم جنسوں میں عزت و احترام کی نظر سے نہ دیکھا جاتا ہو تو وہ ہر صبح اس اسم پاک کو ننانوے مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے اسے عزت و احترم حاصل ہوگا۔" الباعث"۔ مردوں کی قبروں سے اٹھانے والا اور زندہ کرنے والا غافلوں کا دل خواب غفلت سے بیدار کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ جاہل نفسوں کو تعلیم دے کر اور نصیحت کرے انھیں دنیا سے بے رغبتی کا احساس دلا کر اور آخرت کی نعمتوں کا راغب بنا کر جہالت و غفلت کے خواب

سے انھیں بیدار کرے اور ان کے مردہ قلوب کو زندہ کرے۔ چنانچہ وہ اپنے نفس سے اس کی ابتدا کرے اس کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہو۔ خاصیت اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کے قلب کو حقیقی زندگی ملے تو سوتے وقت اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس اسم پاک کو ایک سو ایک بار پڑھے۔ حق تعالیٰ اس کے دل کی مردنی کو دور کرے گا اور اسے حیات بخش کر انوار کا مسکن بنائے گا۔" الشہید" حاضر اور ظاہر و باطن پر مطلع۔ قشیری کہتے ہیں کہ اہل معرفت اللہ سے اس کی ذات کے علاوہ اور کسی مونس کی خواہش نہیں کرتے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صرف اسی ذات پر خوش اور مطمئن رہتے ہیں کیونکہ صرف اللہ ہی ان کے تمام احوال پر نظر رکھتا ہے اور وہی ان کے تمام امور و افعال کو جانتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ آیت (اولم یکف بربک انہ علی کل شیً شہید)۔ کیا تمہارا پروردگار تمہارے لیے اس بات میں کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر مطلع ہے۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے کہ اس کا پروردگار اس کو کسی ایسی جگہ نہ دیکھے جو اس کے لیے پروردگار کی طرف سے ممنوع ہے یعنی برائی کی جگہ اور اس کو کسی بھی ایسی جگہ سے غیر موجود نہ دیکھے جہاں اس کو موجود رہنے کا اس نے حکم دیا ہے (یعنی بھلائی کی جگہ) اور اس یقین کی بناء پر کہ اللہ تعالیٰ میرے حال کو مجھ سے اچھی طرح جانتا ہے اور وہ میری حالت کو بخوبی دیکھتا ہے، غیر اللہ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنے اور غیر اللہ کی طرف بنظر امید رغبت و میلان رکھنے سے باز رہے نیز بندہ پر اس اسم کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ صرف سچائی کا گواہ بنے اور سچائی ہی کی رعایت کرے۔ خاصیت اگر کسی شخص کا لڑکا نافرمان ہو یا اس کی لڑکی غیر صالح ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہر روز صبح کے وقت اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھے اور اس کا منہ آسمان کی طرف اٹھوا کر یاشہید اکیس بار پڑھے حق تعالیٰ اسے فرمان بردار اور صالح بنائے گا۔"

الحق" شہنشاہی کے ساتھ قائم اور خدائی کے لائق۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ جب اس نے جان لیا کہ اسی کی ذات حق ہے تو اب وہ اس کے مقابلہ میں مخلوق کی یاد اور مخلوق کی طلب بھول جائے۔ نیز اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام اقوال و افعال اور احوال میں حق بات اور حق چیز ہی کو اپنے اوپر لازم کرے۔خاصیت اگر کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی تو ایک کاغذ کے چاروں کونوں پر اس اسم پاک کو لکھے اور کاغذ کے بیچ میں اس چیز کا نام لکھے اور پھر آدھی رات کے وقت اس کاغذ کو ہتھیلی پر رکھ کر اور آسمان کی طرف نظر کر کے حق تعالیٰ سے اس اسم پاک کی برکت اور اس کے وسیلہ کے ذریعہ اس چیز کے حصول کی دعا کرے۔انشاء اللہ یا وہ چیز جوں کی توں مل جائے گی یا اس کا کچھ حصہ حاصل ہو جائے گا اور اگر کوئی قیدی آدھی رات کے وقت ننگے سر ہو کر اس اسم پاک کو ایک سو آٹھ مرتبہ پڑھے تو حق تعالیٰ اسے رہائی نصیب کرے گا۔" الوکیل " کارساز۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے آیت (وکفی باللہ وکیلا) (یعنی کارساز ہونے میں اللہ کفایت کرتا ہے) اور آیت (وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین) اگر تم مومن ہو تو اپنا ہر کام اللہ ہی کی طرف سونپو آیت (ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ) (جو شخص اللہ ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے اور اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے) اور آیت (وتوکل علی الحی الذی لایموت) (یعنی ایسے زندہ پر بھروسہ اور اعتماد کرو جو غالب اور مہربان ہے)۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ضعیف اور لاچار لوگوں کا مددگار و معاون بنے اور ان کے کام کاج کرتا رہے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اس طور پر سعی و کوشش کرے کہ گویا وہ ان کا وکیل ہے۔خاصیت اگر بجلی گرنے کا خوف ہو یا پانی اور آگ سے کسی نقصان کا خطرہ ہو تو اس اسم پاک کا ورد کیا جائے تو انشاء اللہ امان ملے گی اور اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو کسی خوف و خطر کی جگہ بہت پڑھے تو وہ بے خوف و بے خطر

ہوگا۔" القوی۔ المتین" قوت والا اور تمام امور میں استوار۔ ان سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خواہشات نفسانی پر غالب اور قوی ہو دین کے معاملہ میں سخت وچست رہے اور شرعی احکام کو نافذ کرنے اور پھیلانے میں کسی سستی اور کمزوری کو راہ نہ دے۔ خاصیت اگر کسی کا دشمن قوی ہو اور وہ اس کے دفاع میں عاجز اور لاچار ہو تو وہ تھوڑا سا آٹا گوندھے اور اس کی ایک ہزار ایک سو گولیاں بنالے۔ پھر ایک ایک گولی اٹھاتا جائے اور یا قوی پڑھتا جائے اور اس گولی کو بہ نیت دفاع دشمن مرغ کے آگے ڈالتا رہے حق تعالیٰ اس کے دشمن کو مغلوب و مقہور کر دے گا اور اگر اس اسم پاک کو جمعہ کی شب میں بہت زیادہ پڑھا جائے تو نسیان کا مرض جاتا رہے گا اگر کسی بچہ کا دودھ چھڑایا گیا ہو اور وہ بچہ اس کی وجہ سے صبر وقرار نہ پاتا ہو تو اس اسم پاک کو لکھ کر اس بچہ کو پلا دے اسے صبر وقرار آجائے گا، اسی طرح اگر کسی دودھ والی کے دودھ میں کمی ہو تو اس اسم پاک کو لکھ کر اس کو پلا دیا جائے اس کے دودھ میں فراوانی آجائے گی اور اگر کوئی شخص ملک و حکومت کے کسی منصب یا کام پانے کی خواہش رکھتا ہو تو وہ اس کو اتوار کے روز اول ساعت میں اپنے مقصد کی نیت سے اس اسم المتین کو تین سو ساٹھ بار پڑھے۔ انشاء اللہ اس کو وہ منصب حاصل ہوگا۔" الولی" مددگار اور مومنوں کو دوست رکھنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ میل ملاپ اور دوستی رکھے اور دین کی تائید وحمایت میں کوشش کرے اور مخلوق اللہ کی حاجتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ قشیری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی علامات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دوست رکھتا ہے اسے ہمیشہ خیر و برکت بھلائی کی توفیق دیتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بندہ اگر بتقاضائے بشریت کسی برائی کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ارتکاب سے اسے بچاتا ہے اور اگر وہ ناگہاں اس برائی میں مبتلا ہو بھی جاتا ہے تو اسے اس میں

مبتلا نہیں رہنے دیتا بلکہ جلد ہی توبہ وانابت کے ساتھ اس برائی سے نکال لیتا ہے۔ چنانچہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ۔ اذا احب اللہ عبدالم یضرہ ذنب۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کو گناہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ اور اگر طاعت وعبادت میں کوتاہی وقصور کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اسے طاعت وعبادت میں مشغول ہونے ہی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور یہی بات بندہ کی سعادت کی علامت قرار پاتی ہے جب کہ اس کا عکس بندہ کی شقاوت وسیاہ بختی کی علامت ہے نیز اللہ تعالیٰ کی دوستی کی ایک اور علامت اور اس کا اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے اولیا کے قلوب میں ایسے بندہ کی محبت جاگزیں کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اولیاء اللہ اس بندہ سے کمال تعلق اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا ہے وہ مخلوق اللہ کی دل کی باتوں پر آگاہ ہو اور اگر کسی شخص کی بیوی یا لونڈی ایسی سیرت و عادت کی حامل ہو کہ اس کے لیے باعث کوفت اور باعث اذیت ہو تو اسے چاہیے کہ جب وہ اس بیوی یا لونڈی کے سامنے جانا چاہے تو اس اسم پاک کو بہت پڑھے حق تعالیٰ اسے صلاحیت و درستی کی راہ پر لگائے گا۔" الحمید" اپنی ذات صفات کی تعریف کرنے والا یا تعریف کیا ہوا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ہمیشہ حق کی تعریف کرنے والا رہے۔ صفات کمالیہ کے ساتھ اپنی ذات کو آراستہ کرے یا اپنے اعمال حسنہ اور اخلاق حمیدہ کی بناء پر اللہ اور اللہ کی مخلوق دونوں کی نظروں میں ایسا ثابت ہو کہ اس کی تعریف کی جائے۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھے اس کے افعال پسندیدہ ہوں گے اور اگر کسی شخص پر فحش گوئی اور بدزبانی غالب ہو کہ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس اسم پاک کو کسی پیالہ پر لکھے یا بعض حضرات کے قول کے مطابق اس اسم پاک کو اس پیالہ پر نوے بار پڑھے ور ہمیشہ اسی

پیالہ میں پانی پیتا رہے انشاء اللہ فحش گوئی اور بدزبانی سے محفوظ رہے گا۔" المحصی" اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے نزدیک تمام مخلوقات کی تعداد ظاہر ہے۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ خواہ حرکت کی حالت میں ہو یا سکون کی حالت میں یعنی کسی بھی لحظہ اور کسی بھی لمحہ غفلت میں مبتلا نہ وہ اور اس کا ایک ایک سانس یاد الٰہی کے ساتھ باہر آئے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اہل جنت اس لمحہ پر حسرت وافسوس کریں گے جو یاد الٰہی کے بغیر گزرا ہوگا۔نیز اس بات کی کوشش کرے کہ اپنے اعمال اور باطنی احوال پر مطلع رہے۔اور اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کو شمار کرتا رہے تاکہ وہ ان کا شکر ادا کرے کے اللہ کے سامنے اپنے آپ کو عاجز و محتاج سمجھے اور اپنے گناہوں کو شمار کرے۔ان کی وجہ سے شرمندہ وشرمسار ومعذرت خواہ ہو اور ان ایام اور لمحات کو یاد کر کے حسرت وافسوس کرے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس کی یاد سے خالی رہے ہوں۔خاصیت جو شخص شب جمعہ میں اس اسم پاک کو ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اسے عذاب قبر اور عذاب قیامت سے محفوظ رکھے گا۔" المبدیَ۔المعید" پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا اور دوبارہ پیدا کرنے والا۔ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ اور ہر چیز میں اللہ رب العزت کی طرف اول بار بھی اور دوبارہ بھی رجوع کرے۔نیکیاں پیدا کرنے میں سعی وکوشش کرے اور جو نیک عمل کرنے سے رہ گیا ہو یا جس عمل میں کوئی کمی اور کوتاہی ہوگئی ہو اس کا اعادہ کرے یعنی ان کو دوبارہ کرے۔خاصیت جس کی بیوی کو حمل ہو اور اسقاط حمل کا خوف ہو یا ولادت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہو تو خاوند کو چاہیے کہ وہ اس اسم پاک المبدی کو نوے بار پڑھے اور شہادت کی انگلی اسے پیٹ کے چاروں طرف پھیرے انشاء اللہ حمل ساقط ہونے کا خوف نہیں رہے گا اور ولادت سے

باطمینان اور بلا کسی ضرر جلد فراغت حاصل ہوگی اور جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے یعنی اس کو پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے تو اس کی زبان سے وہی بات نکلے گی جو صحیح اور باعث ثواب ہوگی۔ اگر کسی شخص کا کوئی عزیز وغیرہ غائب ہو گیا ہو اور اس کی آمد یا خیریت کی طلب کا خواہش مند ہو تو اس وقت جب کہ اس کے گھر والے سو گئے ہوں اس اسم پاک کو گھر کے چاروں کونوں میں ستر بار پڑھے اور اس کے بعد کہے یا معید فلاں شخص کو میرے پاس واپس بلا دے یا اس کی خیریت معلوم کرا دے، سات دن بھی گزرنے نہ پائیں گے کہ یا تو غائب آجائے گا یا اس کی خیریت معلوم ہو جائے گی۔ اور اگر کسی شخص کی کوئی چیز گم ہوئی ہو تو وہ اس اسم المعید کو بہت زیادہ پڑھتا رہے انشاء اللہ اس کی وہ چیز مل جائے گی۔" المحی۔ الممیت" زندہ کرنے والا اور مارنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نور ایمان کے ذریعہ قلوب کو زندہ کرتا ہے اور جسم میں زندگی پیدا کرتا ہے نیز وہی جسم کو موت دیتا ہے اور قلوب کو غفلت و نادانی کے ذریعہ مردہ کرتا ہے۔ ان دونوں ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ علم سے نفع پہنچا کر مخلوق اللہ کو اور مغفرت الٰہی کی شمع جلا کر قلب کو زندگی و تازگی کی دولت بخشے اور نفسانی خواہشات اور شیطانی خطرات و وساوس کو موت کے گھاٹ اتارے، نیز یہ حیات کی تمنا کرے اور نہ موت کی آرزو بلکہ قضاء و قدر الٰہی کا تابعدار بنے اور یہ دعا جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول ہے پڑھتا رہے۔ دعا (اللھم احینی ما کان الحیوۃ خیر الی وتوفنی اذا کانت الوفاۃ خیر الی واجعل الحیوۃ زیادۃ فی کل خیر واجعل الموت راحۃ من کل شر)۔ اے اللہ مجھے زندگی دے کہ جب تک کہ زندگی میرے لیے بہتر ہو اور مجھے موت دے جب کہ موت میرے لیے بہتر ہو اور میری زندگی کو ہر خیر و بھلائی میں زیادتی کا سبب اور موت کو ہر برائی سے راحت کا باعث بنا دے۔ خاصیت جو شخص کسی درد، رنج و تکلیف اور

کسی عضو کے ضائع ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو تو وہ اس اسم پاک الحی کو سات بار پڑھے حق تعالیٰ اسے خوف سے نجات دے گا نیز درد ہفت اندام کو دور کرنے کے لیے سات روز تک یہ اسم پڑھا کرے اور ہر روز پڑھ کر دم کیا جائے اور جو شخص اس اسم پاک کے پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کرے تو اس کے دل کو زندگی اور بدن کو قوت حاصل ہو گی جو شخص اپنے نفس پر قادر نہ ہو کہ اتباع شریعت کے معاملہ میں اس کا نفس اس پر غالب ہو یعنی اسے اتباع شریعت سے باز رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ سوتے وقت سینہ پر ہاتھ رکھ کر اسم پاک الممیت اتنا زیادہ پڑھا کرے کہ پڑھتے ہوئے سو جائے تو حق تعالیٰ اس کے نفس کو مطیع و فرمان بردار بنا دے گا۔ "الحی" ازل سے ابد تک زندہ رہنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے ذریعہ زندہ رہے اور اپنی جان اس کی راہ میں قربان کر دے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں شہید ہو کر ابدی حیات حاصل کرے۔ خاصیت اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اس اسما پاک کو بہت پڑھتا رہے یا کوئی دوسرا شخص اس بیمار پر اور بعض حضرات کے قول کے مطابق آنکھ سامنے کر کے اسے بہت پڑھے تو حق تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے گا اور جو شخص ہر روز ستر بار اس اسم کو پڑھ لیا کرے تو اس کی عمر دراز ہو گی اور اس کی قوت روحانیہ میں اضافہ ہو گا۔ "القیوم" خود بھی قائم اور مخلوقات کا قائم رکھنے والا اور خبر گیری کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ماسوا اللہ سے بالکل بے پروا ہو جائے۔ قیشری فرماتے ہیں کہ جس نے یہ جانا اللہ تعالیٰ قیوم ہے تو اس نے تدبیر و اشتغال سے نجات پائی اور راحت و تفویض کے ساتھ اپنی زندگی گزاری لہٰذا اب نہ تو بخل کرے گا اور نہ دنیا کی کسی بھی بیش قیمت چیز کو کوئی اہمیت دے گا۔ خاصیت جو شخص بوقت سحر اس اسم کو بہت زیادہ پڑھا کرے تو لوگوں کے قلوب میں اس کا تصرف ظاہر ہو گا یعنی تمام لوگ اسے

محبوب و دوست رکھیں گے اور اگر کوئی شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھے تو اس کے تمام امور بحسب دلخواہ پورے ہوں گے۔" الواجد" غنی کہ کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ضروری کمالات عالیہ حاصل کرنے میں سعی وکوشش کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ماسوی اللہ سے مستغنی و بے پرواہو۔ خاصیت اگر کوئی شخص کھانا کھاتے وقت ہر نوالے کے ساتھ یہ اسم پاک پڑھے تو وہ کھانا اس کے پیٹ میں نور ہوگا اور اگر کوئی خلوت میں اس اسم کو پڑھے تو تونگر ہوگا۔" الماجد" بزرگ نصیب۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اس سے پہلے نام کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو خلوت میں پڑھے اتنا کہ بے ہوش ہو جائے اس کے دل پر انوار الٰہی ظاہر ہوں گے اور کوئی شخص اس کو بہت پڑھتا رہے تو مخلوق اللہ کی نظروں میں بزرگ مرتبہ ہو۔" الواحد۔ الاحد" ذات وصفات میں یکتا و یگانہ۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ عبادت و بندگی میں یکتا و یگانہ بنے جیسا کہ اس کا معبود خدائی میں یکتا و یگانہ ہے۔ اور ایسے فضائل سے اپنی ذات کو آراستہ کرے کہ اس کا کوئی ہم جنس اس کے مثال نہ ہو۔ خاصیت اگر کسی کا دل خلوت سے ہراساں ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس اسم پاک کو ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھے انشاء اللہ اس کے دل سے خوف جاتا رہے گا اور بارگاہ حق جل مجدہ کا مقرب ہوگا اور اگر کسی کا فرزند پیدا ہونے کی تمنا ہو تو وہ اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے اللہ تعالیٰ اسے فرزند عطا کرے گا۔" الصمد" بے پرواکہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنی ہر حاجت میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرے اپنے رزق سے بے فکر رہے، اس کی ذات پر توکل کرے دنیا کی حرام چیزوں سے بچے دنیا کی زینت کی چیزوں کی طرف رغبت نہ کرے، دنیا کی حلال چیزوں کے حصول کی بھی ہوس نہ

کرے، مخلوق سے اپنے آپ کو بے پروا رکھے اور مخلوق اللہ کی حاجت روائی کی سعی و کوشش کرتا رہے۔ خاصیت جو شخص بوقت سحر یا آدھی رات کو سجدہ کرے اور اس اسم پاک کو ایک سو پندرہ بار پڑھے اللہ تعالیٰ اسے صادق الحال بنائے گا اور کسی ظالم کے ہاتھ نہیں لگے گا۔ اور جو شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے وہ بھوکا نہیں رہے گا۔ اور اگر حال وضو میں اسے پڑھے گا تو مخلوق اللہ سے بے پروا ہو۔" القادر۔ المقتدر۔ قدرت والا۔ اور قدرت ظاہر کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو خواہشات ولذات سے باز رکھنے پر قادر ہو۔ خاصیت اگر کوئی شخص وضو میں وضو کے ہر عضو کو دھوتے وقت اسم پاک" القادر" پڑھ لیا کرے تو وہ کسی ظالم کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہوگا اور کوئی دشمن اس پر فتحیاب نہ ہوگا اور اگر کوئی مشکل کام پیش آئے تو اکتالیس مرتبہ یہ اسم پڑھ لیا جائے اللہ نے چاہا تو کام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوگا۔ اگر کوئی شخص اسم پاک" المقتدر" کو پابندی کے ساتھ پڑھتا رہا تو غفلت ہوشیاری میں بدل جائے گی اور جو شخص سو کر اٹھتے وقت یہ اسم پاک بیس بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام حق تعالیٰ کی طرف راجع ہوں۔" المقدم۔ المؤخر" دوستوں کو اپنی درگاہ عزت کا قرب بخش کر آگے بڑھانے والا اور دشمنوں کو اپنے لطف و کرم سے دور رکھ کر پیچھے ڈالنے والا۔ ان دونوں پاک ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ نیکیوں میں پیش قدمی اختیار کر کے اپنے آپ کو آگے کرے یعنی دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو افضل بنائے اور ان لوگوں کو آگے کرے جو اللہ رب العزت کی بارگاہ عزت کے مقربین میں سے ہیں یعنی ان کو عزیز رکھے اور نفس اور شیاطین کو اور ان لوگوں کو جو بارگاہ کبریائی کے ٹھکرائے ہوئے ہیں پس پشت ڈالے، نیز اپنے تمام امور و اعمال کو ضابطہ و قاعدہ کے مطابق انجام دے۔ مثلاً پہلے وہ کام اور عمل کرے جو سب سے زیادہ ضروری ہو اور جسے اللہ

نے سب سے مقدم کیا ہو اور سب سے بعد میں اس عمل کو اختیار کرے جو سب سے کم ضروری ہو۔
خاصیت اگر کوئی شخص معرکہ جنگ میں اس اسم پاک "المقدم" پڑھے یا اسے لکھ کر اپنے پاس رکھے تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور جو شخص اس اسم پاک کو بہت پڑھتا رہے تو اس کا نفس طاعت الٰہی کے لیے فرمان بردار و مطیع ہو جائے گا۔ جو شخص یہ اسم پاک "المؤخر" سو مرتبہ پڑھے اس کے دل کو غیر اللہ کے ساتھ قرار نہیں ملے گا۔ اور جو شخص روزانہ اس اسم پاک کو سو بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام انجام پذیر ہوں اور جو شخص اس کو اکتالیس مرتبہ پڑھے اس کا نفس مطیع و فرمان بردار ہو۔ "الاول۔ الآخر"۔ سب سے پہلے اور سب سے پیچھے۔ ان سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اللہ کی عبادات اور اس کے احکام بجالانے میں جلدی کرے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی جان قربان کرے تا کہ حیات ابدی حاصل ہو۔ خاصیت اگر کسی کی اولاد نرینہ نہ ہوتی ہو تو اس اسم پاک الاول چالیس دن تک ہر روز چالیس مرتبہ پڑھے اس کی مراد پوری ہوگی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ فرزند، غنا یا اور کسی چیز کی حاجت و تمنا ہو تو وہ چالیس جمعوں کی راتوں میں ہر رات ایک ہزار مرتبہ یہ اسم پڑھے انشاء اللہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہوں گی۔ جو شخص اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہو اور اس کی پوری زندگی بدعملیوں اور گناہوں میں گزری ہو تو وہ اس اسم پاک الآخر کو اپنا ورد قرار دے لے حق تعالیٰ اس کا خاتمہ بخیر کرے گا۔ "الظاہر۔ الباطن"۔ اپنی مصنوعات اور مخلوقات کے اعتبار سے جو اس کے کمال صفات کی دلیل ہیں، آشکار! اور اپنی ذات کی حقیقت و کنہ کے اعتبار سے وہم و خیال سے مخفی۔ خاصیت جو شخص نماز اشراق کے بعد اسم پاک الظاہر پانچ سو مرتبہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کی آنکھیں روشن و منور کرے گا اگر طوفان باد و باران وغیرہ کا خوف ہو تو یہ اسم پاک بہت زیادہ پڑھا جائے امن و عافیت حاصل

ہو گی۔ اگر اس اسم پاک کو گھر کی دیواروں پر لکھ دیا جائے تو وہ دیواریں محفوظ وسلامت رہیں گی۔ جو شخص ہر روز یا باطن تینتیس بار کہہ لیا کرے حق تعالیٰ اسے صاحب اسرار الٰہی بنائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس پر مداومت اختیار کرے تو اس پر جس کی بھی نظر پڑے گی اس کا دوست بن جائے گا۔ "الوالی"۔ کارساز و مالک۔ اس اسم پاک سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک الوکیل کے ضمن میں نقل کیا جا چکا ہے۔ خاصیت اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس کا یا اس کے علاوہ کسی اور کا گھر معمور و آباد ہو اور بارش و دیگر آفات سے محفوظ رہے تو اسے چاہیے کہ کوزہ آب نارسیدہ پر یہ اسم پاک لکھے اور اس کوزہ میں پانی ڈال کر اس کوزہ کو گھر کی دیوار پر مارے، گھر اور در و دیوار محفوظ وسلامت رہیں گے۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اسم پاک الوالی کو تین سو مرتبہ پڑھنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص کی تسخیر کی نیت سے یہ اسم پاک گیارہ مرتبہ پڑھا جائے تو وہ شخص اس کا مطیع و فرمان بردار ہو جائے گا۔ "المتعالی"۔ بہت بلند مرتبہ۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اس نام پاک العلی کے سلسلہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ خاصیت اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا ہے تو اس کو بھی جو دشواری پیش آئے گی حل ہو جائے گی اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ جو عورت ایام حمل میں یہ اسم پاک پڑھتی رہا کرے تو وہ حمل کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں سے نجات پائے گی۔ "البر" انتہائی احسان کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ، استاد بزرگان دین، عزیز و اقارب اور تمام لواحقین و متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ خاصیت طوفان باد و باراں اور کسی آفت کے وقت یہ اسم پاک پڑھنا چاہیے انشاء اللہ کوئی نقصان و گزند نہیں پہنچے گا۔ اگر اس اسم پاک کو سات مرتبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی امان میں دے دیا جائے تو وہ بچہ بالغ ہونے تک ہر

آفت وبلا اور ہر تکلیف و مصیبت سے محفوظ رہے گا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شراب نوشی اور زنا میں مبتلا ہو تو وہ ہر روز سات مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس کے دل کو ان معصیتوں سے پھیر دے گا۔" التواب" توبہ قبول کرنے والا۔ توبہ کے اصل معنی ہیں، رجوع کرنا یعنی پھرنا جب اس لفظ کی نسبت بندہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ گناہ سے پھرنا، یعنی اپنے گناہ پر نادم، وشرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ اور جب حق تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے تو اس لفظ کی مراد ہوتی ہے، رحمت و توفیق کے ساتھ پھرنا یعنی بندہ کی طرف نظر رحمت و توفیق متوجہ ہونا۔ اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر سمجھئے کہ جب کوئی بندہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی توبہ کے اسباب میسر کرتا ہے اس کو توبہ کی توفیق دیتا ہے اور اس کو گناہوں کے عواقب سے ڈرا کر، عذاب کا خوف دلا کر اور آخرت کی سزا کا احساس بخش کر اسے خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور اس کے قلب و شعور میں اپنے جرم کا احساس اور گناہ پر ندامت وشرمندگی کی توفیق عطا فرماتا ہے اس کے بعد وہ بندہ توبہ و ندامت کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر حق تعالیٰ اپنے فضل اور اپنی رحمت کے ساتھ اس بندہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی اسے بخش دیتا ہے، لہٰذا حقیقت میں حق تعالیٰ کی توبہ یعنی اس کی توجہ بندہ کی توبہ یعنی اس کے رجوع پر مقدم ہوتی ہے اگر حق تعالیٰ کی توجہ نہ ہو تو بندہ کو رجوع کی نوبت نہیں آسکتی۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ آیت (تاب علیہم لیتوبوا) اللہ تعالیٰ ان کی طرف متوجہ ہوا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (یعنی توبہ کریں)۔ توبہ کنم بشکنم توبہ دہی نشکنم اس لیے بدہ کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ حق تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار رہے قبولیت توبہ کا یقین رکھے، ناامیدی کے دروازہ کو بند کر دے۔ بایں طور اس کی رحمت کے نزول سے ناامید نہ ہو دوسروں کی خطائیں معاف

کرے معذرت خواہ کی معذرت قبول کرے چاہے کتنی بار معذرت قبول کرنی پڑے۔اور اگر کسی سے کوئی قصور و کوتاہی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے درگزر کرے بلکہ انعام و اکرام کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو۔جناب باری تعالیٰ سے توبہ طلب کرے، گناہوں پر شرمندہ و نادم ہو گوش عبرت کھلے رکھے اور توبہ میں تاخیر نہ کرے تاکہ اس حکم عجلوا بالتوبۃ قبل الموت (مرنے سے پہلے توبہ میں جلدی کرو) کی بجا آوری ہو۔اس موقع پر ایک عبرت انگیز اور سبق آموز حکایت سن لیجئے۔کہتے ہیں کہ کسی سلطنت کا ایک وزیر تھا جس کا نام عیسیٰ بن عیسیٰ تھا ایک دن وہ سواروں کی ایک جماعت کے ہمراہ چلا جا رہا تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے لوگ آپس میں پوچھتے تھے کہ یہ کون ہے یہ کون ہے، راستہ میں کہیں ایک بڑھیا بھی بیٹھی ہوئی تھی اس نے جو لوگوں کو پوچھتے سنا تو کہنے لگی کہ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہے۔ہوتا کون! یہ ایک بندہ ہے جو نظرِ حق عنایت سے گرا ہوا ہے اور اس حالت میں مبتلا ہے (یعنی دنیاوی جاہ و جلال میں اس طرح مگن اور مطمئن ہے) عیسیٰ بن عیسیٰ نے یہ بات سن لی۔بس پھر کیا تھا فوراً اپنے مکان کو لوٹا وزارت پر لات ماری اور توبہ کی دولت سے مشرف ہوا اس طرح وہ تمام دنیاوی جاہ حشم کو پس پشت ڈال کر مکہ مکرمہ میں مقیم ہوا اور وہیں مجاور ہو گیا۔خاصیت اگر کوئی شخص نماز چاشت کے بعد اس اسم پاک کو تین سو ساٹھ مرتبہ پڑھے تو حق تعالیٰ اسے توبہ نصوح ایسی پختہ توبہ کہ اس کے بعد گناہ سرزد نہ ہو، کی سعادت سے نوازے گا اور اگر کوئی شخص اس اسم پاک کو بہت زیادہ پڑھتا رہے تو اس کے تمام امور انجام و صلاح پذیر ہوتے رہیں گے اور نفس کو طاعت عبادت کے بغیر سکون و قرار نہیں ملے گا اور جو شخص نماز چاشت کے بعد یہ پڑھا کرے۔آیت (اللھم اغفرلی وتب علی انک انت التواب الرحیم تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔" المنتقم" کافروں

اور سرکشوں سے عذاب کے ذریعہ بدلہ لینے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنے بڑے دشمنوں سے کہ وہ نفس اور شیطان ہیں بدلہ لیتا رہے اور سب سے بڑا دشمن نفس امارہ ہے اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی گناہ میں مبتلا ہو یا عبادت میں کوتاہی کرے تو اس سے انتقام لے بایں طور کہ اسے عقوبت و سختی میں مبتلا کرے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامی کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ راتوں میں اوراد و وظائف میں مشغول رہا کرتا تھا کہ ایک رات میرے نفس نے تکاسل کیا اس کی سزا میں نے اس کو یہ دی کہ ایک برس تک اپنے نفس کو پانی سے محروم رکھا۔ خاصیت جو شخص اپنے دشمن کے ظلم و جور پر صبر اور اس کا دفاع نہ کرسکے وہ تین جمعوں تک اس اسم پاک کو پابندی سے پڑھتا رہے اس کا دشمن دوست ہو جائے گا اور اس کے ظلم سے نجات مل جائے گی۔ نیز اگر کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے اس مقصد کی نیت کے ساتھ اس اسم پاک کو آدھی رات کے وقت پڑھا جائے تو وہ مقصد حاصل ہوگا۔ ایک دسری روایت میں حضرت ابوہریرہ (رض) کے علاوہ ایک اور صحابی سے منقول ہے اس موقع پر باری تعالیٰ کا ایک اسم المنعم بھی نقل کیا گیا ہے جو اس اسم پاک المنعم پر مداومت کرے کبھی کسی کا محتاج نہ ہوگا۔ " العفو" گناہوں اور تقصیرات سے درگزر کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو الغفور کے ضمن میں نقل کیا گیا حضرت شیخ عبدالحق شرح اسماء حسنی میں لکھتے ہیں کہ العفو جس کے معنی ہیں سیئات کو محو کرنے والا اور گناہوں کو معاف کرنے والا۔ اگرچہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے غفور کے قریب ہے لیکن عفو، غفور سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ غفران کے معنی ہیں ستر وکتمان، اس لیے غفار کے معنی ہوں گے گناہوں کو چھپانے والا جب کہ عفو مشعر بمحو و معدوم کردینے کے ہے جس کا مطلب ہے گناہوں کو معاف کرکے ختم و معدوم کردینے والا۔ لہٰذا بندہ

کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کی شان عفو کے پیش نظر اس کی طرف سے معافی و بخشش کا پوری طرح امیدوار ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی گناہ گار کے ساتھ تحقیر و تذلیل کا برتاؤ نہ کیا جائے کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے حدود شرع اور احکام دین کی پابندی کی بنا پر بخش دے اور اس کے گناہوں کو یکسر محو کر دے۔ رد مکن بدرا، چہ دانی درازل نام و درنامہ نیکاں بود و رود و بر جائے نی کا ایں گمان بر تو روز جاز تاواں بود اس اسم پاک کا بندہ پر تقاضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی تقصیرات اور ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کر کے انھیں معاف کر دے تا کہ آیت (الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس)۔ (غصہ کو نگل جانے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں) کے زمرہ میں داخل ہو۔ خاصیت جو شخص زیادہ گناہ گار ہو اسے چاہیے کہ وہ اس اسم پاک کو اپنا ورد قرار دے لے انشاء اللہ اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ "الرؤف" بہت مہربان۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک الرحیم کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے۔ منقول ہے کہ ایک شخص کا ہمسایہ بہت برا تھا جب اس کا انتقال ہوا تو اس شخص نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی بعد میں اس کو کسی اور شخص نے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ اس شخص نے کہا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے لیکن وہ ذرا ان صاحب سے جنہوں نے نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی یہ ضرور کہہ دینا کہ آیت (لو انتم تملکون خزائن رحمۃ ربی اذا لامسکتم خشیۃ الانفاق)۔ (اگر میرے رب کی رحمتوں کے خزانے تمہاری ملکیت میں ہوتے تو تم انھیں خرچ ہو جانے کے خوف سے ضرور دبا کر بیٹھ جاتے) یہ گویا اس نے نماز جنازہ نہ پڑھنے والے پر طعن کیا کہ میرا رب تو بہت مہربان ہے اس نے مجھے بخش دیا ہے اگر کہیں تمہارا بس چل جاتا تو نہ معلوم تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ خاصیت اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی مظلوم کو ظالم

کے ہاتھوں سے بچالے تو وہ اس اسم اعظم کو دس بار پڑھے ظالم اس کی سفارش قبول کرے گا اور اپنے ظلم سے باز آجائے گا۔ اگر کوئی شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے تو اس کا دل نرم رہے گا۔ وہ سب کو دوست رکھے اور سب اسے دوست رکھیں گے۔" مالک الملک" سارے جہان کا مالک اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک الملک کے ضمن بہت گزر چکا ہے۔ شاذلی (رح) فرماتے ہیں کہ اے شخص ایک دروازہ پر ٹھہر یعنی صرف اللہ کے دروازہ پر آ، تا کہ تیرے لیے بہت سے دروازے کھولے جائیں اور صرف ایک بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی گردن جھکا تا کہ تیرے سامنے بہت سی گردنیں جھکیں ارشاد ربانی ہے آیت (وان من شیء الا عندنا خزائنہ)۔ (ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے خزانے نہ ہوں ہمارے پاس) خاصیت جو شخص اس اسم پاک پر مداومت اختیار کرے تو نگر ہو اور اس کے دنیا و آخرت کے تمام امور اور تمام مقاصد نیک ثمرہ وانجام پذیر ہوں اس کے بعد ذکر کئے جانے والے اسم پاک " ذوالجلال والاکرم کی بھی یہی خاصیت ہے۔" ذولجلال والاکرام۔ بزرگی اور بخشش کا مالک۔ جس نے اللہ کا جلال جانا تو اس کی بارگاہ میں تذلل اختیار کرے اور جس نے اس کا اکرام دیکھا تو اس کا شکر گزر ہو پس نہ تو غیر اللہ کی اطاعت فرمان برداری جائے نہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے اپنی حاجت بیان کی جائے۔ اس اسم بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کے لیے بزرگی کے حصول کی کوشش کرے اور بندگان اللہ سے اچھا سلوک کرے۔" المقسط" عدل کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب وہی ہے جو اسم پاک العدل کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو سو بار پڑھے وہ شیطان کے شر اور اس کے وسوسوں سے محفوظ رہے گا اور اگر سات سو بار پڑھے تو اس کا جو بھی مقصد ہو گا حاصل ہو گا" الجامع" قیامت میں

لوگوں کو جمع کرنے والا۔اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ علم وعمل اور کمالات نفسانیہ وجسمانیہ کا جامع بنے اور اللہ کی ذات میں محویت استغراق اور غور وفکر، ذکر اللہ کے ذریعہ تسکین قلب وخاطر جمع، ذات وصفات باری تعالیٰ کا عرفان جیسی صفات حمیدہ کی سعادتیں اپنے اندر جمع کرے۔ درجمعیت کوش تا ہمہ ذات شوی ترسم کہ پراگندہ شوی مات شوی خاصیت جس شخص کے عزیز و اقارب اور اہل خانہ منتشر اور تتر بتر ہوں وہ چاشت کے وقت غسل کرے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اس اسم پاک کو دس مرتبہ اس طرح پڑھے کہ ہر مرتبہ ایک انگلی بند کرتا جائے اور پھر اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سب جمع ویکجا ہو جائیں گے۔"الغنی" ہر چیز سے بے پروا۔خاصیت جو شخص حرص وطمع کی بلا میں مبتلا ہو وہ اپنے جسم کے ہر عضو پر ہاتھ رکھ کر اسم پاک الغنی پڑھے اور ہاتھ کو اس عضو کے اوپر نیچے کی طرف لائے حق تعالیٰ اسے اس بلا سے نجات دے گا۔اور جو شخص یہ اسم پاک ہر روز ستر بار پڑھے اس کے مال میں برکت ہوگی اور وہ کبھی محتاج نہ ہوگا۔" المغنی" جس کو چاہے بے پروا کرنے والا۔ ان ناموں سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ ماسوا اللہ سے مکمل استغناء اور بے پرواہی برتے اور اللہ کے علاوہ کسی کو حاجت روا قرار نہ دے۔خاصیت جو شخص مسلسل دس جمعہ تک اس اسم پاک کو پڑھنے میں باقاعدگی اختیار کرے بایں طور کہ ہر جمعہ کے روز ایک ہزار بار پڑھے تو مخلوق سے بے پروا ہو جائے گا۔" المانع" اپنے بندوں کو دین و دنیا کی ہلاکت ونقصان سے باز رکھنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ اپنے نفس اور اپنی طبیعت کو خواہشات نفسانی سے باز رکھ کر اپنے آپ کو دینی و دنیاوی ہلاکت ونقصان سے محفوظ رکھے۔خاصیت اگر شوہر بیوی کے درمیان ناچاقی ہو تو بستر پر جاتے وقت اس اسم پاک کو بیس بار پڑھ لیا جائے تا کہ حق تعالیٰ غصہ وناچاقی

کی بدمزگی سے بچائے گا۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح اسماء حسنی میں اس پاک المانع سے پہلے اس پاک المعطی بھی نقل کیا ہے اور انھوں نے ان دونوں ناموں کی ترجمانی کی وضاحت یوں کی ہے کہ وہ جس کو جو کچھ چاہے دے اور جو چاہے نہ دے۔لامانع لما اعطی ولا معطی لما منع (جان لو جس کو وہ دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو نہ دے اس کو کوئی دینے والا نہیں) لہٰذا جب بندہ نے جان لیا کہ حق تعالیٰ ہی معطی دینے والا اور مانع نہ دینے والا ہے تو اس کی عطا کا امیدوار اور اس کے منع سے خائف رہے! بندہ پر اس اسم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں اور مستحقین کو اپنے عطا سے نوازے اور فاسقوں ظالموں کو عطا کرنے سے باز رہے یا یہ کہ اپنے قلب و روح کو حضور طاعت کے انوار عطا کرے اور اپنے نفس و طبیعت کو خواہشات و ہوس سے باز رکھے! حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت میں جو یہاں ذکر کی گئی ہے المعطی کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) کی اس روایت کے پیش نظر منع کی وضاحت رد و ہلاک کی جاتی ہے۔اس کے بعد حضرت شیخ اس پاک المعطی کی خاصیت یہ لکھتے ہیں کہ جو شخص المعطی کو اپنا ورد بنالے اور یا معطی السائلین بہت پڑھتا رہا کرے تو کسی سے سوال کا محتاج نہیں ہوگا۔" الضار۔النافع" جس کو چاہے ضرر پہنچانے والا اور جس کو چاہے نفع پہنچانے والا۔قیشری کہتے ہیں کہ ان اسماء میں اس طرف اشارہ ہے کہ ضرر و نفع اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ہے لہٰذا جو شخص اس کے حکم یعنی اس کی قضا وقدر کا تابعدار ہو وہ راحت و سکون کی زندگی پائے گا اور جو شخص اس کا تابعدار نہ ہو وہ آفت و مصیبت میں پڑے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔من استسلم لقضائی وصبر علی بلائی وشکر علی نعمائی کان عبدی حقا ومن لم یستسلم لقضائی ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر علی نعمائی فلیطلب ربا سوائی۔جس شخص نے میری قضا وقدر کو تسلیم کیا میری بلا

پر صبر کیا ور میری نعمتوں پر شکر کیا وہ میرا سچا بندہ ہے اور جس شخص نے میری قضا و قدر کو تسلیم نہ کیا۔ میری بلاء پر صبر نہ کیا اور میری نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا تو وہ میرے علاوہ کوئی اور رب ڈھونڈ لے۔ حضرت شیخ نے شرح اسماء حسنیٰ میں ان دونوں اسماء الضار اور النافع کی وضاحت کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ خیر و شر اور نفع و ضرر کا صرف اللہ تعالیٰ مالک ہے اور گرمی سردی خشکی اور تری میں درد و تکلیف، رنج و پریشانی اور شفا کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ یہ قطعاً گمان نہ کیا جائے کہ دوا بذات خود فائدہ دیتی ہے زہر بذات خود ہلاک کرتا ہے کھانا بذات خود سیر کرتا ہے اور پانی بذات خود سیراب کرتا ہے بلکہ یہ تمام اسباب عادی ہیں بایں معنیٰ کہ یہ عادت قائم کہ حق تعالیٰ نے ان کو اسباب بنادیا ہے کہ مذکورہ بالا چیزیں ان کے واسطہ سے پیدا کرتا ہے اگر وہ چاہے تو ان چیزوں کو ان واسطوں اور اسباب کے بغیر بھی پیدا کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو ان کے باوجود بھی ان چیزوں کو پیدا نہ ہونے دے۔ اسی طرح عالم علویات وسفلیات کی تمام چیزیں اور تمام اجزا محض واسطے اور اس باب کے درجہ میں ہوتی ہیں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے زیر اثر ہیں اور ان تمام کی حیثیت بہ نسبت قدرت ازلیہ وہی ہے جو لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم کی ہوتی ہے لہٰذا بندہ کو چاہیے کہ تمام نقصانات اور تمام فائدہ کو حق تعالیٰ کے فیصلے جانے، عالم اسباب کو اس قدرت کے زیر اثر سمجھے اور حکم وقضا الٰہی کا تابعدار ہو کر اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرے تاکہ وہ ایک ایسی زندگی کا حامل بن جائے جو مخلوق سے محفوظ اور مطمئن ہو۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دانتوں کے درد سے پریشان ہو کر بارگاہ حق میں فریاد کی تو وہاں سے حکم ہوا کہ فلاں گھاس دانتوں پر ملو تاکہ آرام ہو حضرت موسیٰ نے وہ گھاس دانتوں پر ملی تو آرام ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد پھر ایک دانت میں درد ہوا تو انھوں نے وہی گھاس استعمال کی،

اس مرتبہ درد کم تو کیا ہوتا اور بڑھ گیا بارگاہ حق میں عرض رساں ہوئے۔ الٰہ العالمین! یہ تو وہی گھاس ہے جس کو استعمال کرنے کا آپ نے حکم فرمایا تھا مگر اب اس کے استعمال سے درد اور بڑھ گیا ہے! بارگاہ حق سے عتاب کے ساتھ یہ ارشاد ہوا کہ اس مرتبہ تم نے ہماری طرف توجہ کی تھی تو ہم نے شفا دی اور اس مرتبہ تم نے گھاس کی طرف توجہ کی اس لیے ہم نے درد میں اضافہ کر دیا تاکہ تم یہ جان لو کہ شفا دیتے تو ہم ہی ہیں نہ کہ گھاس۔ بندہ پر ان اسماء کا تقاضہ یہ ہے کہا امر الٰہی اور حکم شریعت کے ذریعہ دشمنان دین کو ضرر پہنچائے اور انھیں متنبہ کرے اور بندگان اللہ کو نفع پہنچائے اور ان کی مدد کرتا رہے۔ خاصیت اگر کسی شخص کو کوئی حال اور مقام میسر ہو تو وہ اسم پاک الضار کو جمعہ کی راتوں میں سو بار پڑھا کرے حق تعالیٰ اسے اس مقام پر استقامت عطا فرمائے گا اور وہ مرتبہ اہل قرب کو پہنچے گا۔ اگر کوئی شخص کشتی یا پانی کے جہاز میں سفر کرے تو وہ روزانہ اسم پاک النافع کو اکتالیس بار پڑھے انشاء اللہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اپنے ہر کام کی ابتداء میں النافع اکتالیس بار پڑھ لیا کرے تو اس کے تمام کام حسب خواہش انجام پذیر ہوں گے۔ "النور" آسمان کو ستاروں کے ساتھ، زمین کو انبیاء و علماء وغیرہ کے ذریعہ اور مسلمانوں کے قلوب کو نور معرفت و طاعت کے ذریعہ روشن کرنے والا۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ ایمان و عرفان کے نور سے اپنی ذات کو روشن و منور کرے۔ خاصیت جو شخص جمعہ کی شب میں سورت نور ساتھ مرتبہ اور یہ اسم پاک ایک ہزار ایک مرتبہ پڑھے حق تعالیٰ اس کے دل میں نورانیت پیدا فرما دے گا اور جو شخص روزانہ صبح اس اسم پاک کو پڑھنے کا التزام رکھے تو اس کا دل منور ہوگا۔ "الہادی" راہ دکھانے۔ اس اسم سے بندہ کا نصیب یہ ہے کہ وہ بندگان اللہ کو اللہ کی راہ دکھائے۔ اس بات کو حضرت شیخ نے شرح اسماء حسنیٰ میں وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا

ہے۔کہ ہدایت کا مطلب ہے راہ دکھانا اور منزل مقصود تک پہنچانا۔لہٰذا اللہ تعالیٰ تمام راہ رووں کا رہنما ہے۔اگر کوئی دنیا کی راہ پر ہوتا ہے تب بھی رہنما ہے اور اگر کوئی آخرت کی راہ پر چلتا ہے تو بھی راہبر اسی کی ذات ہوتی ہے۔گر نہ چراغ لطف تو راہ نماید از کرم قافلہائے شب روں پے نبرد بمنزلے حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ انواع ہدایت کی کوئی حد وشمار نہیں ہے۔آیت (الذی اعطی کل شیءٍ خلقہ ثم ھدا)۔(وہ ایسی ذات ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا اور پھر اس کی راہ بتائی) چنانچہ یہ حق تعالیٰ ہی ہے جو بچہ کو پیٹ سے باہر آتے ہی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینے کی راہ بتاتا ہے۔چوزہ کو انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنے کی راہ پر لگاتا ہے اور شہد کی مکھی کو کیا عجیب وغریب گھر بنانے کی راہ دکھاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ کائنات کا ایک ایک فرد اپنے ایک ایک لمحہ اور اپنے ایک ایک فعل میں اسی کی ہدایت ورہنمائی کا مرہون منت ہوتا ہے۔لیکن سب سے افضل اور سب سے عظیم الشان ہدایت وہ راستہ دکھانا ہے جو بارگاہ حق جل مجدہ تک اور دیدار باری تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ تک پہچاتا ہے اور خواص کے باطن میں توفیق الٰہی اور اسرار تحقیق کا وہ نور پیدا کرتا ہے جو ہدایت معرفت اور طاعت کا سبب بنتا ہے۔بندوں میں اس اسم پاک الہادی سے سب سے زیادہ بہرہ مند انبیاء اولیاء اور علماء ہیں جو مخلوق اللہ کو صرط مستقیم کی طرف راہ دکھانے والے ہیں۔سید انبیاء اور ختم رسل دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی اس اسم پاک کی حقیقی پر تو ہے جو اس دنیا میں پوری انسانیت اور پوری کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے بلند مرتبہ راہنما اور راہبر ہیں۔آیت (اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین) حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا عارفین کی صفات عالیہ میں شمار ہوتا ہے (۱) تنگدل اور غمزدوں کو کشادگی اور فرحت کی طرف لانا۔(۲)

غافلین کو حق تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلانا۔(۳) زبان توحید سے مسلمانوں کو حق کی راہ دکھانا یعنی ان کے قلوب کی توجہ دنیا سے دین کی طرف اور معاش سے معاد کی طرف پھیرنا۔ خاصیت جو شخص ہاتھ اٹھا کر اور اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر اس اسم پاک الہادی کو بہت زیادہ پڑھا کرے اور پھر ہاتھوں کو آنکھوں اور منہ پر پھیر لیا کرے تو حق تعالیٰ اسے اہل معرفت کا مرتبہ بخشے گا۔" البدیع" عالم کو بغیر مثال کے پیدا کرنے والا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو شخص قول و فعل میں اپنے نفس پر سنت کو امیر (حاکم) بناتا ہے وہ حکمت کی باتیں کرتا ہے یعنی اس کا ذہن اس کی فکر اس کی زبان حکمت و شریعت ہی کے ڈھانچے میں ڈھل جاتی ہے اور جو شخص قول و فعل میں اپنے نفس پر خواہش کو امیر بناتا ہے وہ بدعت ہی کی باتیں کرتا ہے۔ اس کا ذہن اس کی فکر اور اس کی زبان بدعت ہی کے چکر میں پڑی رہتی ہے۔ قیشری فرماتے ہیں کہ ہمارے مسلک کے تین اصول ہیں (۱) اخلاق و افعال میں اور کھانے پینے کہ وہ حلال ہو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کرنا۔(۲) ہمیشہ سچ بولنا۔(۳) تمام اعمال میں نیت کو خالص کرنا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ جو شخص بدعتی کے بارے میں مداہنت کرتا ہے یعنی اس سے نرمی برتتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال سے سنت کی حلاوت اٹھالیتا ہے اور جو شخص بدعتی کو دیکھ کر ہنستا ہے یعنی بدعتی کے ساتھ احترام کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے ایمان کا نور سلب کر لیتا ہے۔ خاصیت جس شخص پر کوئی غم پڑے یا کوئی دشوار کام پیش آئے تو وہ یابدیع السماوات والارض ستر ہزار بار اور ایک قول کے مطابق ایک ہزار بار پڑھے انشاءاللہ وہ غم دور ہو جائے گا اور اس کا کام پورا ہوگا اور اگر کوئی شخص باوضو ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے یہ اتنا پڑھے کہ سو جائے تو وہ خواب میں جس چیز کے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوگا دیکھ لے گا۔" الباقی" ہمیشہ باقی رہنے والا

خاصیت جو شخص اس اسم پاک کو جمعہ کی شب میں سو بار پڑھ لیا کرے اس کے تمام اعمال قبول ہوں گے اور کوئی رنج وغم اسے نہ ستائے گا۔ "الوارث" موجودات کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہنے والا اور تمام مخلوقات کا مالک جیسا کہ بتایا گیا۔ وارث سے مراد ہے موجودات کے فنا ہو جانے کے بعد باقی تمام املاک اپنے مالکوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کریں گی، لیکن یہ مطلب وارث کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ہے ورنہ تو حقیقت میں کائنات کی ایک ایک چیز کا علی الاطلاق ازل سے ابد تک ملکیت میں بغیر کسی تبدل وتغیر کے وہی مالک ہے۔ تمام ملک وملکوت بالشرکت غیرے اسی کے لیے ہیں اور وہی سب کا حقیقی مالک ہے چنانچہ ارباب بصائر ہمیشہ یہ نداء آیت (لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار) (گوش ہوش سے سنتے ہیں) لہٰذا بندہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مال ومیراث کے فکر میں نہ رہے بلکہ یہ جانے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے جانا ہے اسی لیے کہا جاتا کہ موتوا قبل ان تموتوا عارفوں کا شعار ہے دل بریں منزل فانی چہ نہی رخت بہ بند بندہ پر اس اسم پاک کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ان اعمال میں اپنی زندگی صرف کرے جو باقیات صالحات میں سے ہیں جیسے تعلیم وتعلم اور صدقہ جاریہ وغیرہ۔ نیز دین کے علوم معارف کو پوری سعی وکوشش کے ساتھ زیادہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرے۔ تاکہ صحیح معنی میں انبیاء کا وارث قرار پائے۔ خاصیت جو شخص طلوع آفتاب کے وقت اس اسم پاک کو سو بار پڑھا کرے اس کو کوئی رنج وغم نہیں پہنچے گا اور جو شخص اس اسم کو بہت زیادہ پڑھتا رہے اس کے تمام کام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوں گے۔ "الرشید" عالم کا رہنما" بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اپنے بندہ کو اللہ کا راہ دکھانا یہ ہے اور وہ اس کے نفس کو اپنی طاعت وعبادت کی راہ دکھاتا ہے اس کے قلب کو اپنی مغفرت کی راہ دکھاتا ہے اور اس کی روح کو اپنی محبت کی راہ

دکھاتا ہے اور جس بندہ کا نفس سنوارنے کے لیے حق تعالیٰ اس کو راہ دکھاتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام امور میں توکل وتفویض الہام فرماتا ہے۔ منقول ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم بن ادہم کو بھوک لگی تو انھوں نے ایک شخص کو ایک چیز دی جو ان کے پاس موجود تھی اور اس سے کہا کہ اس کو گروی رکھ کر کھانے کا انتظام کرو، جب وہ شخص وہ چیز لے کر وہاں سے نکلا تو اچانک اس کو ایک اور شخص ملا جو ایک خچر کے ساتھ چلا آ رہا تھا اس خچر پر چالیس ہزار دینار لدے ہوئے تھے اس نے اس شخص سے حضرت ابراہیم بن ادہم کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ یہ چالیس ہزار دینار ابراہیم کی میراث ہیں جو ان تک ان کے والد کے مال سے پہنچی ہے میں ان کا غلام ہوں میراث کا یہ مال میں ان کی خدمت میں لایا ہوں۔ اس کے بعد وہ شخص حضرت ابراہیم کے پاس پہنچا اور چالیس ہزار دینار ان کے حوالہ کئے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تم سچ کہتے ہو کہ تم میرے غلام ہو اور یہ مال بھی میرا ہی ہے تو میں تمہیں اللہ کی خوشنودی کے لیے آزاد کرتا ہوں اور یہ چالیس ہزار دینا بھی میں تمہیں بخشتا ہوں۔ بس اب تم میرے پاس سے چلے جاؤ جب وہ شخص وہاں سے چلا گیا تو ابراہیم نے کہا کہ پروردگار میں نے تو تیرے سامنے صرف روٹی کی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تو نے مجھے اتنی مقدار میں دنیا دے دی پس قسم تیری ذات کی اب اگر مجھے بھوک سے مار بھی ڈالے گا تو تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔
خاصیت اگر کوئی شخص اپنے کسی کام کے بارے میں کچھ طے نہ کر پا رہا ہو تو وہ عشاء کی نماز اور اپنے سونے کے درمیان اس اسم پاک کو ایک ہزار مرتبہ پڑھے گا اس کام کے بارے میں جو صحیح اور مفید بات ہوگی اس پر ظاہر ہو جائے گی اور جو شخص اس اسم پاک پر مداومت کرے اس کے تمام امور بغیر سعی وکوشش کے انجام پذیر ہوں گے۔" الصبور" بردبار کہ گنہگاروں کو عذاب

دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ لغت میں صبر کے معنی ہیں شکیبائی کرنا اور صبور وہ کہ گنہگاروں کو پکڑنے اور ان کو سزا دینے میں جلدی نہ کرے۔ صبور معنی ومفہوم کے اعتبار سے حلیم کے قریب ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ صبور اس بات پر مشعر ہے کہ اگرچہ فی الوقت بردباری کی لیکن آخرت میں پکڑے گا اور عذاب دے گا جب کہ حلیم بردباری کے مفہوم میں مطلق ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ صبور کے معنی بندہ کو اس کی مصیبت و بلاء میں صبر دینے والا لہٰذا مبارک امانت کے تحمل پر صبر دینے والا، شہوات وخواہش کی مخالفت پر صبر دینے والا اور اداء عبادت میں مشقت پر صبر دینے والا وہی حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اس لیے بندہ کو چاہیے کہ وہ ہر مصیبت و رنج وآفت و بلاء میں اللہ سے صبر چاہے اور اس کی نافرمانی سے دور رہے۔ نیز اس اسم پاک کا بندہ پر یہ تقاضہ ہے کہ وہ کسی کام میں بکی اور جلدی نہ کرے بلکہ وقار وطمانیت اور تمکین اختیار کرے اور ہر رنج میں اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ طلب کرے۔ آیت (ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین یا ایہا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون) مشائخ میں سے ایک شخص کا یہ مقولہ کتنا ہی عارفانہ ہے۔ جام صبر پیو اگر مارے جاؤ گے شہید اور اگر زندہ رہو گے تو سعید کہلاؤ گے۔ خاصیت جس شخص کو رنج ومشقت، درد وتکلیف اور کوئی مصیب پیش آئے تو یہ اسم تینتیس بار پڑھے اطمینان باطن پائے گا۔ دشمنوں کی زبان بندی و پسپائی حکام کی خوشنودی اور لوگوں کے دلوں میں مقبولیت کے لیے آدھی رات کے وقت یا دوپہر میں اس اسم پاک کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا بڑی خاصیت اور تاثیر رکھتا ہے۔ مشکوۃ میں حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت میں حق تعالیٰ کے جو ننانوے نام منقول ہیں ان کی وضاحت ختم ہوئی ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث میں ان ناموں کے علاوہ کچھ اور نام بھی منقول ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم میں یہ نام بھی آتے ہیں۔ الرب۔ الاکرم۔ الاعلیٰ۔ الحافظ الخ۔ الحق۔ الساتر۔ الستار۔ الشاکر العادل۔ العلام۔ الغالب۔ الناظر الخ۔ الحق۔ القدیر۔ القریب۔ القاہر الکفیل۔ الکافی۔ المنیر۔ المحیط۔ الملک المولی۔ النصیر۔ احکم الحاکمین۔ ارحم الراحمین۔ احسن الخالقین۔ ذوالفضل۔ ذوالطول۔ ذوالقوۃ۔ ذوالمعارج۔ ذوالعرش۔ رفیع الدرجات۔ قابل التوب۔ الفعال لمایرید۔ مخرج الحی من المیت اور احادیث میں یہ نام بھی آئے ہیں۔ الحنان، المنان، المغیث نیز ان کے علاوہ دیگر آسمانی کتب مثلاً توراۃ وغیرہ سے اللہ تعالیٰ کے کچھ اور نام نقل کئے جاتے ہیں۔

اسم اعظم

حدیث:

وعن أسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "اسم اللہ الأعظم فی ہاتین الآیتین: (وإلھکم إلہ واحد لا إلہ إلا ہو الرحمن الرحیم) وفاتحۃ (آل عمران) الم اللہ لا إلہ إلا ہو الحی القیوم) رواہ الترمذی وأبو داود وابن ماجہ والدارمی

ترجمہ:

حضرت اسماء بنت یزید (رض) کہتی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کا سب سے بڑا نام (اسم اعظم) ان دو آیتوں میں ہے۔ آیت (وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ) 2۔ البقرۃ 163 :) (اور تمہارا معبود وہ ایک معبود ہے اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں اور وہ بخشنے والا اور مہربان ہے) اور سورت آل عمران کی یہ ابتدائی

آیت(الٓمّٓ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْ حَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔) 3۔آل عمران 1 :-2)(الم۔اللہ کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

استغفار و توبہ کا بیان

"استغفار" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنی بخشش چاہنا اور چونکہ" استغفار" کے ضمن میں جس طرح" توبہ" بھی آجاتی ہے اسی طرح بھی" توبہ" استغفار کے ضمن میں نہیں بھی آتی اس لیے باب کا عنوان قائم کرتے ہوئے بطور خاص والتوبۃ کا ذکر کیا گیا ہے یا پھر والتوبہ کو الگ سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ استغفار تو زبان سے متعلق ہے کہ بندہ اپنی زبان کے ذریعہ اللہ سے بخشش و مغفرت مانگتا ہے جب کہ توبہ کا تعلق دل سے ہے کیونکہ کسی گناہ پر ندامت و شرمندگی اور پھر اللہ کی طرف رجوع اور آئندہ اس گناہ میں ملوث نہ ہونے کا عہد دل ہی سے ہوتا ہے۔" توبہ" کے معنی ہیں رجوع کرنا گناہوں سے طاعت کی طرف، غفلت سے ذکر کی طرف اور غیبت سے حضور کی طرف۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کی بخشش کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کے گناہوں کو دنیا میں بھی ڈھانکے بایں طور کہ کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ ہونے دے اور آخرت میں اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرے بایں طور کہ اس کو ان گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے پوچھا گیا کہ" توبہ" کا کیا مطلب ہے تو انھوں نے فرمایا کہ گناہ کو فراموش کردینا یعنی توبہ کرنے کے بعد گناہ کی لذت کا احساس بھی دل سے اس طرح ختم ہوجائے گویا وہ جانتا ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے!!۔اور سہیل تستری سے پوچھا گیا کہ حضرت! توبہ کا کیا مفہوم ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ تم گناہوں کو فراموش نہ کرو یعنی گناہ کو بھول مت جاؤ تاکہ

عذاب الٰہی کے خوف سے آئندہ کسی گناہ کی جرات نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم آیت (توبوا الی اللہ جمیعا) تم سب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ کے مطابق استغفار یعنی طلب بخشش ومغفرت اور توبہ کرنا ہر بندہ پر واجب ہے کیونکہ کوئی بندہ بحسب اپنے حال ومرتبہ کے گناہ یا بھول چوک سے خالی نہیں ہے لہٰذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تمام گزشتہ گناہوں سے توبہ کرے۔ طلب بخشش ومغفرت کرے آئندہ تمام گناہوں سے بچتا رہے اور صبح وشام توبہ واستغفار کو اپنا معمول بنالے تمام صغیرہ وکبیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہے خواہ وہ گناہ قصداً کئے ہوں یا خطاء وسہواً سرزد ہوئے ہوں اور گناہوں کی نحوست کی وجہ سے طاعت کی توفیق سے محروم نہ رہے نیز گناہوں پر اصرار کی ظلمت دل کو پوری طرح گھیر کر اللہ نخواستہ کفر و دوزخ تک نہ پہنچا دے۔ توبہ کے صحیح اور قبول ہونے کے لیے چار باتیں ضروری ہیں اور شرط کے درجہ میں ہیں : ایک تو یہ کہ محض اللہ کے عذاب کے خوف سے اور اس کے حکم کی تعظیم کے پیش نظر ہی توبہ کی جائے، درمیان میں توبہ کی کوئی اور غرض نہ ہو مثلاً لوگوں کی تعریف ومدح کا حصول اور ضعف وفقر کی وجہ توبہ کی غرض میں داخل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ گزشتہ گناہوں پر واقعی شرمندگی وندامت ہو۔ تیسرے یہ کہ آئندہ ہر ظاہری وباطنی گناہ سے اجتناب کرے۔ اور چوتھے یہ کہ پختہ عہد اور عزم بالجزم کرے کہ آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ توبہ کی کیفیت اور اثر آئندہ گناہ کرنے کے عزم کا صحیح ہونا یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اپنے بلوغ کی ابتداء سے توبہ کرنے کے وقت تک پورے عرصہ کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ اس سے کیا کیا گناہ سرزد ہوئے ہیں تاکہ ان میں سے ہر ایک گناہ کا تدارک کرے چنانچہ اگر اس عرصہ میں وہ، نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور دیگر فرائض ترک ہوئے ہوں تو ان کی قضاء کرے اور اپنے اوقات کو نفل یا فرض کفایہ عبادتوں میں مصروف رکھ کر ان فرائض کو قضا کرنے

میں سستی نہ کرے۔اسی طرح اس عرصہ میں اگرممنوع حرام چیزوں کا ارتکاب کیا ہے مثلا شراب پی ہے یااورکوئی ممنوع وقبیح فعل کیا ہے۔تو اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ان سے توبہ واستغفار کرے اوراس کے ساتھ ساتھ اللہ کے نام پرغرباء ومساکین میں اپنا مال خرچ کرے اورصدقہ وخیرات کرتارہے تاکہ اس کی توبہ باب قبولیت تک پہنچے اورحق تعالیٰ کی طرف سے اسے بخشش و مغفرت سے نوازاجائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کے فضل پریقین رکھے کہ انشاء اللہ توبہ قبول ہوگی اورمغفرت کی جائے گی، چنانچہ خودحق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ آیت (ھوالذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفوا عن السیاٰت)۔وہ ایسارحیم وکریم ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتاہے اوران کی خطاؤں سے درگزرکرتاہے۔یہ تو اس توبہ کی بات تھی جوان گناہوں سے کی جائے جومحض اللہ تعالیٰ کے گناہ ہوں یعنی جن کا تعلق صرف حق اللہ سے ہواوراگراپنے اوپروہ گناہ ہوں جن کا تعلق حقوق العبادیعنی بندوں کے حقوق کی تلفی یاان کے نقصان سے ہوتواس صورت میں اللہ تعالیٰ سے بھی اپنی بخشش ومغفرت چاہے کیونکہ اس کی نافرمانی کی اوران بندوں سے بھی ان کا تدارک کرے جن کی حق تلفی ہوئی ہے۔چنانچہ اگرحق تلفی کا تعلق مال سے ہوتو یا صاحب حق کووہ مال اداکرے یااس سے معاف کرائے اوراگراس کا تعلق مال سے نہ ہو جیسے غیبت یا اورکوئی ذہنی وجسمانی تکلیف جواسے پہنچی ہوتواس سے معافی چاہے۔اگرحق تلفی کا تعلق کسی ایسی کوتاہی یاقصور سے ہوکہ اگرمعاف کراتے وقت اس کا تذکرہ کسی فتنہ وفساد کا سبب بنتا ہوتو ایسی صورت میں اس قصور کاذکر کئے بغیراس شخص سے مطلقاً قصور معاف کرائے مثلاً اس سے یوں کہے کہ مجھ سے جوبھی قصور ہوگیا ہواسے معاف کردیجئے اوراگراس طرح معاف کرانے میں بھی فتنہ وفساد کاخوف ہوتو پھر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرے۔اس کی بارگاہ میں تضرع وزاری

کرے، اچھے کام کرے اور صدقہ وخیرات کرتا رہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو اور اس شخص کو جس کا قصور ہوا ہے آخرت میں اپنے فضل و کرم کے تحت اپنے پاس سے اجر دے کر اسے راضی کرائے، اگر صاحب حق مر چکا ہو تو اس کے وارث اس کے قائم مقام ہیں اس لیے مردہ کا حق ان سے معاف کرائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے نیز مردہ کی طرف سے بھی صدقہ خیرات کرے۔ایک مومن مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے توبہ کرنے میں بالکل سستی اور تاخیر نہ کرے نیز نفس کے مکر اور شیطان کے وسوسہ میں مبتلا ہو کر یہ نہ سوچے کہ میں توبہ پر قائم تو رہ سکوں گا نہیں اس لیے توبہ کیسے کروں کیونکہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اس لیے اگر بتقاضائے بشریت توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ سرزد نہ ہو جائے تو پھر توبہ کرے چاہے دن میں کئی مرتبہ ایسا ہو بشرطیکہ توبہ کے وقت اس کے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ میں پھر گناہ بھی کروں گا اور توبہ بھی کرلوں گا بلکہ توبہ کرتے وقت یہی احساس رہے کہ شاید پھر گناہ کرنے سے پہلے مر جاؤں اور یہ توبہ میری آخری توبہ ثابت ہو۔جب کوئی شخص توبہ کرنا چاہے تو پہلے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے اور دو رکعت نماز حضور قلب کے ساتھ پڑھے اور سجدہ میں گر کر بہت ہی زیادہ تضرع وزاری کے ساتھ اپنے نفس کو ملامت کرے اور اپنے گزشتہ گناہوں کو یاد کر کے عذاب الٰہی کے خوف سے اپنے قلب کو لرزاں وترساں کرے اور شرمندگی وندامت کے پورے احساس کے ساتھ توبہ واستغفار کرے اور پھر ہاتھ اٹھا کر بارگاہ الٰہی میں یوں عرض رسا ہو۔میرے پروردگار! تیرے در سے بھاگا ہوا یہ گناہ گار غلام اپنے گناہوں کی پوٹ لیے پھر تیرے در پر حاضر ہوا ہے انتہائی ندامت وشرمندگی کے ساتھ اپنی لغزشوں اور اپنے گناہوں کی معذرت لے کر آیا ہے تیری ذات رحیم وکریم ہے تو

ستار و غفار ہے اپنے کرم کے صدقے میرے گناہ بخش دے! اپنے فضل سے میری معذرت قبول فرما کر رحمت کی نظر سے میری طرف دیکھ نہ صرف یہ کہ میرے پچھلے گناہ بخش دے بلکہ آئندہ ہر گناہ ولغزش سے مجھے محفوظ رکھ کہ خیر و بھلائی تیرے ہی دست قدرت میں ہے اور اپنے گناہ گار بندوں کو تو ہی بخشنے والا ہے اس کے بعد درود پڑھے اور تمام ہی مسلمانوں کے لیے بخشش و مغفرت چاہے۔ یہ تو عوام کی توبہ ہے کہ جن کی زندگی اور گناہ کے درمیان کوئی بڑی حد فاصل نہیں ہوتی اور وہ گناہ و معصیت میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی یہ توبہ انھیں اس بشارت کا مستحق قرار دیتی ہے کہ آیت (ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین) لیکن خواص کہ جو اللہ کے اطاعت گزار بندے ہوتے ہیں جن کی زندگی معصیت و گناہ سے دور رہتی ہے اور اتباع شریعت کی حامل ہوتی ہے ان کی توبہ یہ ہے کہ وہ ان برے اخلاق سے کہ جن سے قلب کو پاک رکھنا واجب ہے توبہ کریں، اسی طرح عاشقین اللہ کی توبہ یہ ہے کہ اگر بتقاضائے بشریت کسی وقت ان سے ذکر اللہ اور یاد الٰہی میں غفلت ہو جائے اور ماسوی اللہ میں مشغول ہو جائیں تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اپنی اس کوتاہی سے توبہ کریں۔ یہ بات جان لینی چاہیے کہ گناہ کبیرہ کا صدور ایمان سے خارج نہیں کرتا لیکن فاسق و عاصی کر دیتا ہے گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کے متعلق کتاب کے شروع میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے اس موقع پر گناہ کی ان دونوں اقسام کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک صغیرہ گناہوں کا تعلق ہے تو وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عام زندگی کے لیے ان سے اجتناب بھی دشوار ہے چنانچہ مسلک مختار کے مطابق صغیرہ گناہ سے تقویٰ میں خلل نہیں پڑتا بشرطیکہ گناہ صغیرہ پر اصرار و دوام نہ ہو کیونکہ صغیرہ گناہ پر اصرار و دوام گناہ کبیرہ کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا ہر مومن و مسلمان پر واجب ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں اور

حتیٰ المقدور صغیرہ گناہوں سے اجتناب بھی کرے اور جانے کہ اگرچہ گناہ ایمان سے خارج نہیں کر دیتے لیکن اس بات کا خوف ہے کہ گناہ کی زندگی رفتہ رفتہ انجام کار کفر اور دوزخ کی حد تک پہنچا دے۔

رجوع الی اللہ کا حکم

حدیث؛

وعن أبي ذر رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما يروي عن الله تبارك وتعالى أنه قال :"يا عبادي إني حرمت الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرما فلا تظالموا يا عبادي كلكم ضال إلا من هديته فاستهدوني أهدكم يا عبادي كلكم جائع إلا من أطعمته فاستطعموني أطعمكم يا عبادي كلكم عار إلا من كسوته فاستكسوني أكسكم يا عبادي إنكم تخطئون بالليل والنهار وأنا أغفر الذنوب جميعا فاستغفروني أغفر لكم يا عبادي إنكم لن تبلغوا ضري فتضروني ولن تبلغوا نفعي فتنفعوني يا عبادي لو أن أولكم وآخركم وإنسكم وجنكم كانوا أتقى قلب رجل واحد منكم ما زاد ذلك في ملكي شيئا يا عبادي لو أن أولكم وآخركم وإنسكم وجنكم كانوا على أفجر قلب واحد منكم ما نقص من ملكي شيئا يا عبادي لو أن أولكم وآخركم وإنسكم وجنكم قاموا في صعيد واحد فسألوني فأعطيت كل إنسان مسألته ما نقص ذلك مما عندي إلا كما ينقص المخيط إذا أدخل البحر يا عبادي إنما هي أعمالكم أحصها عليكم ثم أوفيكم إياها فمن وجد خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذلك فلا يلومن إلا نفسه" . رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت ابوذر (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں کہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے تھے فرمایا کہ ایک

حدیث قدسی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے یعنی میں ظلم سے پاک ہوں اور چونکہ ظلم میرے حق میں بھی ایسا ہے جیسے کہ تمہارے حق میں اس لیے میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں پس تم مجھ سے ہدایت چاہو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو (یعنی کھانے کے محتاج) علاوہ اس شخص کے جس کو میں کھلا دوں اور اسے رزق کی وسعت و فراخی بخشوں اور مستغنی بناؤں پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا اے میرے بندو! تم سب ننگے (یعنی ستر پوش کے لیے کپڑے کے محتاج ہو) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے پہننے کے لیے دیا پس تم سب مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم اکثر دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمہاری خطائیں بخشتا ہوں پس تم سب مجھ سے بخشش مانگو میں تمہیں بخشوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز میرے ضرر کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے نقصان پہنچا سکو اور ہرگز میرے نفع کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے فائدہ پہنچا سکو (یعنی گناہ کرنے سے بارگاہ صمدیت میں کوئی نقصان نہیں اور اطاعت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ دونوں کا نقصان و فائدہ صرف تمہیں ہی پہنچتا ہے چنانچہ آگے اس کی تفصیل فرمائی کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر بھی تم میں سے کسی ایک نہایت پرہیزگار دل کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہو گی (یعنی اگر تم سب کے سب اتنے ہی پرہیزگار اور اتنے ہی نیک بن جاؤ جتنا کہ کوئی شخص پرہیزگار بن سکتا ہے مثلاً تم سب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی طرح پرہیزگار بن جاؤ کہ روئے

زمین پر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے جس کی زندگی پر فسق و فجور اور گناہ معصیت کا ہلکا سا اثر بھی ہو تو اس سے میری سلطنت و میری ادنیٰ سی بھی زیادتی نہیں ہوگی) اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرضیکہ سب کے سب) مل کر تم میں سے کسی ایک نہایت بدکار دل کی مانند ہو جائیں (یعنی تم سب ملک کر شیطان کی مانند ہو جاؤ) تو اس سے میری مملکت کی کسی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں نقصان پہنچے گا، اے میرے بندو! اگر تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر تم میں سے نہایت بدکار دل کی مانند ہو جائیں یعنی تم سب ملک کر شیطان کی مانند ہو جاؤ تو اس سے مملکت کی کسی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں نقصان پہنچے گا، اے میرے بندو! اگر تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر کسی جگہ کھڑے ہوں اور مجھ سے پھر مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کے مانگنے کے مطابق (ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ) دوں تو میرا یہ دینا اس چیز سے جو میرے پاس ہے اتنا ہی کم کرتی ہے جتنا کہ ایک سوئی سمندر میں گر کر (اس کے پانی کو کم کرتی ہے) اے میرے بندو! جان لو میں تمہارے اعمال یاد رکھتا ہوں اور انھیں تمہارے لیے لکھتا ہوں، میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا، پس جو شخص بھلائی پائے (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی نیک توفیق حاصل ہو اور عمل خیر کرے) تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی نیک توفیق حاصل ہو اور عمل خیر کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے یعنی اس سے کوئی گناہ سرزد ہو تو وہ اپنے نفس کو ملامت کرے کیونکہ اس سے گناہ کا سرزد ہونا نفس ہی کے تقاضہ سے ہوا۔ (مسلم)

تشریح:

کلکم ضال (تم سب گمراہ ہو) اس اعتبار سے فرمایا کہ دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس سے دنیا اور دین کا ہر کمال ہر سعادت اور تمام ہی بھلائیاں ہوں ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ کمی اور کوتاہی ضرور ہوتی ہے اور اگر کوئی دینی اور اخروی اعتبار سے اپنے اندر کوئی کمی اور کوتاہی و گمراہی رکھتا ہے تو کسی کے اندر دنیاوی امور کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی اور کجی ہوتی ہے اس لیے فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو

یعنی دنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے درجہ کمال سے ہٹے ہوئے ہوں۔ الا من ہدیتہ (علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں) اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں کو ان کی اس حالت وکیفیت پر چھوڑ دیا جو ان کی طبیعت اور ان کے نفس کی بنیاد ہوتی ہے تو وہ خود رو درخت کی طرح جس طرح چاہیں بڑھیں اور جس سمت چاہیں چلیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لیے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکر و ذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لیے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکر و ذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس صحیح راستہ پر چلتا ہے اور اس کی طبیعت نیکی ہی کی سمت بڑھتی ہے اس بات کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ خلق الخلق فی ظلمۃ ثم رش علیھم من نورہ۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا چھینٹا دیا۔ اس موقع پر یہ خلجان پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بات اس حدیث (کل مولود یولد علی الفطرۃ)۔ ہر بچہ فطرت (اسلام کی فطرت) پر پیدا کیا جاتا ہے۔ کے منافی ہے کیونکہ فطرت

سے مراد توحید ہے اور ضلالت یا ظلمت سے مراد احکام ایمان کی تفصیل اور اسلام کے حدود و شرائط کا نہ جاننا ہے۔ وانا اغفر الذنوب جمیعا میں تمہاری ساری خطائیں بخشتا ہوں کا مطلب یہ ہے کہ تم دن رات لغزشوں اور گناہوں میں مبتلا رہتے ہو لیکن اگر اپنے ان گناہوں پر ندامت کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے تو میں تمہارے سب گناہ بخش دیتا یا پھر یہ مراد ہے کہ ایک تو صرف ایسا گناہ ہے جس سے توبہ کئے بغیر بخشش ممکن نہیں ہاں اس کے علاوہ اور سب گناہ اگر میں چاہتا ہوں تو بغیر توبہ و استغفار کے بھی اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت خاص کے پیش نظر بخش دیتا ہوں۔ جتنا کہ سوئی کم کر دیتی ہے۔ کے بارے میں علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ سوئی کا سمندر میں گر کر اس کے پانی کو کم کر دینا نہ محسوس چیز ہے اور نہ عقل و شعور کی رسائی میں آنے والی بات بلکہ وہ کالعدم ہے اس لیے اس کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے ورنہ تو اللہ کے خزانے میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی کمی کا بھی کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ابن ملک کہتے ہیں کہ اس بارے میں یا پھر کہا جائے کہ یہ جملہ بالفرض والتقدیر کی قسم سے ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی فرض بھی کی جائے تو وہ اس قدر ہو سکتی ہے۔

اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے

حدیث:

عن أبي هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"لما قضى الله الخلق كتب كتابا فهو عنده فوق عرشه :إن رحمتي سبقت غضبي". وفي رواية "غلبت غضبي"

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ

نے جب میثاق کے دن مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا (یا یہ کہ جب مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کیا) تو ایک کتاب لکھی (یعنی فرشتوں کو وہ کتاب لکھنے کا حکم دیا یا قلم کو لکھنے کا حکم فرمایا) وہ کتاب حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے اس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح:

جس کتاب میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت عظمیٰ لکھی ہوئی ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس کتاب کی عظمت و بزرگ قدری کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کی اس عظیم و بزرگ قدری کے پیش نظر حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس عرش کے اوپر رکھا ہے۔ رحمت الٰہی کی سبقت اور اس کے غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی بخشش و کرم اور اس کی نعمتوں کی نشانیاں اور اس کے مظاہرے غالب ہیں کہ وہ تمام مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہیں اور بے انتہا ہیں اس کے مقابلہ میں اس کے غضب کی نشانیاں اور اس کے مظاہر کم ہیں جیسا کہ خود حق تعالیٰ کا ارشد ہے۔ آیت (وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکتے۔ نیز فرمایا۔ آیت (عذابی اصیب بہ من اشاء ورحمتی وسعت کل شیء) ۔عذاب تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ اور اس کی نعمتوں کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ کائنات کا کوئی فرد اس سے باہر نہیں ہے اور اس دنیاوی زندگی کا ایک ایک لمحہ کسی نہ کسی شکل میں رحمت الٰہی ہی کا مرہون منت ہوتا ہے

لیکن اس کے مقابلہ میں بندوں کی طرف سے خدائے رحیم و کریم کی نعمتوں اور رحمتوں کے شکر کی ادائیگی میں جتنی کوتاہی اور قصور ہوتا ہے اس کی بھی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آیت (ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمهم ما ترك علی ظهرها من دابة) ۔اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے ظلم کے سبب ان سے مواخذہ کرنے لگے تو اس کے نتیجہ میں ایک بھی جاندار روئے زمین پر نہ چھوڑے ۔ چنانچہ یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا ہی ظہور ہے کہ بندوں کی تمام کوتاہیوں اور خطاؤں کے باوجود اس دنیا میں ان کو باقی رکھتا ہے اور ان کو روزی دیتا ہے ان پر اپنی نعمتوں کی بارش کرتا ہے اور اس دنیا میں ان کو عذاب و مواخذہ میں مبتلا نہیں کرتا یہ تو اس دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ کی رحمت کا ظہور کس کس طرح اور کن کن صورتوں میں سامنے آتا ہے لیکن آخرت میں رحمت کا ظہور تو اس دنیا کے ظہور سے کہیں زیادہ ہوگا۔

خرید وفروخت کا بیان

اسلامی نقطہ نظر سے کائنات انسانی کی عملی زندگی کی دو محور ہیں اول حقوق اللہ کہ جسے عبادات کہتے ہیں اور دو حقوق العباد کہ جسے معاملات کہا جاتا ہے یہی دو اصطلاحیں ہیں جو انسانی نظام حیات کے تمام اصول وقواعد اور قوانین کی بنیاد ہیں ان دونوں میں چونکہ حقوق اللہ کی عمومیت حاصل ہے کہ اس کا تعلق کائنات انسانی کے ہر فرد سے ہے اس لیے مصنف کتاب نے پہلے ان کو بیان کیا اب اس کے بعد حقوق العباد یعنی معاملات کا بیان شروع کیا ہے جس کا سب سے اہم جزو بیع ہے۔ بیع کے معنی بیع کے معنی ہیں بیچنا یعنی فروخت کرنا لیکن کبھی اس کے معنی خریدنا بھی مراد ہوتے ہیں اس لیے بیع کا ترجمہ اصطلاحی طور پر خرید وفروخت کیا جاتا ہے۔ فخر الاسلام کا بیان ہے کہ اصطلاح شریعت میں آپس کی رضامندی سے مال کے ساتھ مال بدلنا بیع کہلاتا ہے بیع کی شرعیت : بیع یعنی خرید وفروخت کا شرعی ہونا قرآن کریم کی اس آیت (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا) 2۔ البقرۃ 275 :) (اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے) اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث جو (آگے آئیں گی) سے ثابت ہے بیع کی قسمیں : بیع یعنی خرید وفروخت میں بنیادی طور پر تین چیزیں ہوتی ہیں اول تو عقد بیع یعنی نفس معاملہ کہ ایک شخص کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور دوسرا اسے خریدتا ہے دوم مبیع یعنی وہ چیز جس کو فروخت کیا جاتا ہے اور سوم ثمن یعنی قیمت ان تینوں کے اعتبار سے فقہی طور پر بیع کی کچھ قسمیں ہیں۔ چنانچہ نفس معاملہ اور اس کے حکم کہ بیع صحیح ہوئی یا نہیں۔ کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں ہیں 1 نافذ 2 موقوف 3 فاسد 4 باطل بیع نافذ اس بیع کو کہتے ہیں کہ طرفین میں مال ہو یعنی بیچنے والے کے پاس بیع ہو خریدار کے پاس ثمن ہو اور عاقدین یعنی بیچنے والا اور خریدار دونوں عاقل

ہوں نیز وہ دونوں بیع یا تو اصالۃ کریں یا وکالۃ اور دلالۃ جس بیع میں یہ تینوں چیزیں پائی جائیں
گی وہ بیع بالکل صحیح اور نافذ ہوگی بیع موقوف اس بیع کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص کسی دوسرے
کی چیز کو اس کی اجازت یا ولایت کے بغیر فروخت کرے۔ اس بیع کا حکم یہ ہے کہ جب تک کہ
اصل مالک کی اجازت و رضامندی حاصل نہ ہو جائے یہ بیع صحیح نہیں ہوتی۔ اجازت کے بعد صحیح
ہو جاتی ہے بیع فاسد وہ بیع ہے جو باصلہ یعنی معاملہ کے اعتبار سے تو درست ہو مگر بوصفہ یعنی کسی
خاص وجہ کی بنا پر درست نہ ہو بیع باطل اس بیع کو کہتے ہیں جو نہ باصلہ درست ہو اور نہ بوصفہ بیع
فاسد اور بیع باطل کی تفصیل اور ان کی مثالیں انشاء اللہ باب المنہی عنہا من البیوع میں ذکر کی
جائیں گی مبیع یعنی فروخت کی جانے والی چیز کے اعتبار سے بھی مبیع کی چار قسمیں ہیں۔ 1
مقائضہ 2 صرف 3 سلم 4 بیع مطلق بیع مقائضہ یہ ہے کہ مبیع بھی مال اور ثمن بھی مال ہو مثلاً
ایک شخص کپڑا دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں اس کو غلہ دے۔ گویا بیع کی یہ وہ صورت
ہے جسے عرف عام میں تبادلہ مال کہا جاتا ہے۔ بیع صرف یہ ہے کہ نقد کا تبادلہ نقد سے کیا جائے مثلاً
ایک شخص ایک روپیہ کا نوٹ دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں ایک روپیہ کے پیسے
دے یا ایک شخص اشرفی دے اور دوسرا شخص اس کے بدلے میں اسے روپیہ دے گویا روپیہ
بھنانا یا روپیہ کی ریزگاری لینا دینا بیع صرف کی ایک قسم ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار
سے کسی چیز کی قیمت پیشگی لے لے اور یہ طے ہو جائے کہ خریدار یہ چیز اتنی مدت مثلاً ایک دو مہینے
کے بعد لے لے گا۔ بیع مطلق یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع نقد کے عوض کی جائے مثلاً بیچنے والا ایک من
گیہوں دے اور خریدار اس کی قیمت کے طور پر تیس روپے ادا کرے۔ ثمن یعنی قیمت کے
اعتبار سے بیع کی چار قسمیں یہ ہے۔ 1 مرابحہ 2 تولیت 3 وديعت 4 مساومت مرابحہ کی یہ

صورت ہے کہ بیچنے والا مبیع کو اپنے خریدار سے نفع لے کر فروخت کرے تولیت کی یہ صورت ہے کہ بیچنے والا مبیع کو بلا نفع کے اس قیمت پر فروخت کرے جتنی قیمت میں اس نے خود خریدی ہو اور مساومت کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والا اور خریدار آپس کی رضامندی سے کسی چیز کی خرید و فروخت چاہے جس قیمت پر کریں اور اس میں بیچنے والے کی قیمت خرید کا کوئی لحاظ نہ ہو۔

کسب اور طلب حلال کا بیان

کسب اور طلب حلال کا مطلب ہے اپنی معاشی ضروریات مثلاً روٹی کپڑے وغیرہ کے حصول کے لیے کمانا اور پاک روزی و حلال پیشہ کو بہر صورت اختیار کرنا چنانچہ اس باب میں کسب معاش کی فضیلت ذکر کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ کون سا کسب اور کون سا پیشہ اچھا ہے اور کون سا برا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ سب سے بہتر کسب و پیشہ جہاد ہے اس کے بعد تجارت پھر زراعت اور پھر دستکاری یعنی کتابت وغیرہ۔ کسب یعنی کمانا فرض بھی ہے اور مستحب بھی اسی طرح مباح بھی ہے اور حرام بھی چنانچہ اتنا کمانا فرض ہے جو کمانے والے اور اس کے اہل و عیال کی معاشی ضروریات کے لیے اور اگر اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کی ادائیگی کے لیے کافی ہو جائے اس سے زیادہ کمانا مستحب ہے بشرطیکہ اس نیت کے ساتھ زیادہ کمائے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات سے جو کچھ بچے گا وہ فقراء و مساکین اور اپنے دوسرے مستحق اقرباء پر خرچ کروں گا اسی طرح ضروریات زندگی سے زیادہ کمانا اس صورت میں مباح ہے جب کہ نیت اپنی شان و شوکت اور اپنے وقار و تمکنت کی حفاظت ہو البتہ محض مال و دولت جمع کر کے فخر و تکبر کے اظہار کے لیے زیادہ حرام ہے اگر چہ حلال ذرائع ہی سے کیوں نہ کمایا جائے۔ کمانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کمائی کو اپنی ذات پر اور

اپنے اہل وعیال پر اس طرح خرچ کرے کہ نہ تو اسراف میں مبتلا ہو اور نہ بخل وتنگی کرے۔ جو شخص کمانے اور اپنی روزی خود فراہم کرنے پر قادر ہو اس پر لازم ہے کہ وہ کمائے اور جس طرح بھی ہو سکے حلال ذرائع سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ابرومندانہ زندگی کے تحفظ کے لیے معاشی ضروریات خود فراہم کر کے دوسروں پر بار نہ بنے ہاں جو شخص کسی بھی مجبوری اور عذر کی وجہ سے کسب وکمائی پر قادر نہ ہو تو پھر اس کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ وہ دوسروں سے سوال کر کے اپنی زندگی کی حفاظت کرے اگر اس صورت میں کوئی شخص محض اس وجہ سے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اس کی غیرت کو گوارا نہیں اس نے کسی سے سوال نہیں کیا یہاں تک کہ بھولو افلاس نے اس کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہو گا بلکہ ایک گناہ گار کی موت مرے گا۔ نیز جو شخص خود کما کر اپنا پیٹ بھرنے سے عاجز ہو تو اس کا حال جاننے والے پر یہ فرض ہے کہ وہ اس کی سفارش کرے جو اس کی مدد کرنے پر قادر ہو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اس آیت

کریمہ (يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ) 2۔البقرۃ172 :)
(اے مومنو تم صرف وہی پاک وحلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے) کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ سب سے بہتر کسب جہاد ہے بشرطیکہ جہاد کے ارادے کے وقت مال غنیمت کے حصول کا خیال دل میں قطعاً نہ ہو بلکہ نیت میں اخلاص ہو اس کے بعد تجارت کا درجہ ہے خاص طور پر وہ تجارت جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں یا ایک شہر سے دوسرے شہر میں مسلمانوں کی ضروریات خاص کی چیزوں کو لانے لے جانے کا ذریعہ ہو اس قسم کی تجارت کرنے والا شخص اگر حصول منفعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خدمت اور ان کی حاجت روائی کی نیت بھی رکھے تو

اس کی تجارت عبادت کی بھی ایک صورت بن جائے گی۔تجارت کے بعد زراعت کا درجہ ہے زراعت کا پیشہ بھی دنیاوی منفعت کے علاوہ اجر وثواب کا ایک بڑا ذریعہ بنا جاتا ہے جب کہ اس میں مخلوق اللہ یعنی انسانوں اور جانوروں کی غذائی ضروریات کی فراہمی کی نیت خیر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی بارش وہوا وغیرہ پر توکل اور اعتماد ہو ان تینوں پیشوں کے علاوہ اور پیشے آپس میں کوئی فضیلت نہیں رکھتے البتہ کتابت کا پیشہ بہتر درجہ ضرور رکھتا ہے کیونکہ اس پیشے میں نہ صرف یہ کہ علم کی خدمت ہوتی ہے بلکہ دینی علوم، شرعی احکام انبیاء اور بزرگوں کے احوال بھی یاد ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا پیشوں کے بعد ان پیشوں کا درجہ آتا ہے جو بقاء عالم اور معاشرت و تمدن کی اصل ضروریات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں مثلا معماری، بیلداری، خشت سازی، چونا بنانا گھی اور تیل نکالنا روئی بیچنا سوت کا تنا کپڑے سینا اور آٹا پیسنا وغیرہ یہ تمام کسب اور پیشے ان پیشوں سے بہتر ہیں جو محض تکلف و تزئین اور اظہار امارت و دولت کے کام آتے ہیں جیسے زردوزی و نقاشی مٹھائی بنانا عطر بنانا بیچنا اور رنگریزی وغیرہ تاہم یہ پیشے بھی اگر حسب موقع ہوں بایں طور کہ ان کی وجہ سے خلاف شرع امور کا ارتکاب نہ ہوتا ہو تو ان میں بھی کچھ کراہیت نہیں ہے۔بخلاف ان پیشوں کے جن میں آلودگی نجاست مخلوق اللہ کی بدخواہی گناہوں کے ارتکاب میں اعانت دین فروشی کذب وجہل سازی اور فریب ودغا کا دخل رہتا ہو جیسے شاخ کشی جاروب کشی دباغی احتکار غلہ حمالی مردہ شوئی کفن فروشی کٹنائی ناچنا گانا نقالی جرہ بازی (پہلے زمانے میں ایک مستقل پیشہ تھا کہ کچھ جہل باز شارع عام پر ایک شخص کو کھڑا کر دیتے جو راہ چلتے آدمی کو کوکھ میں اس طرح ٹھوکا مار دیتا کہ اسے یہ پتہ نہ چلتا کہ یہ کس کی حرکت ہے چنانچہ جب وہ اس پر حیران و پریشان ہوتا تو سب

چہل باز اس پر قہقہہ لگاتے اس کو جرہ بازی کہتے تھے) نقالی دلالی اور وکالت (جس میں جھوٹ فریب سے کام لیا جاتا ہو) امام اذان اور خدمت مسجد کی اجرت اور قرآن کی تلاوت وتعلیم کا معاوضہ لینا وغیرہ یہ سب پیشے مکروہ ہیں (شاہ عبدالعزیز) مغنی الطالب میں لکھا ہے کہ کسب اور کسب کرنے والے کی فضیلت احادیث میں بہت منقول ہے اسی طرح جو شخص کسب پر قادر ہونے کے باوجود از راہ کسل و سستی کسب نہ کرے بلکہ اپنی گزر اوقات کے لیے دوسروں سے مانگتا پھرے اس کے حق میں بڑی وعید بیان کی گئی ہے لیکن جو شخص اللہ کی رزاقی پر اعتماد وبھروسہ کرتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور نہ ہی اپنی دینی مصروفیات اور عبادت و اذکار میں خلل پڑنے کی وجہ سے کسب وغیرہ کرے تو اس وعید میں داخل نہیں بشرطیکہ اپنی امداد کے لیے دوسرے لوگوں کی طرف نہ تو اس کا دل متوجہ ہو اور نہ وہ کسی سے اپنی امداد واعانت کی توقع رکھتا ہو کیونکہ اسے سوال دلی کہتے ہیں جو سوال زبانی سے کہیں بدتر چیز ہے۔ جو شخص اتنا مال زر رکھتا ہو جو اس کی معاشی ضروریات کے لیے کافی ہو یا اوقات وغیرہ اسے بقدر ضروریات روپیہ پیسہ مل جاتا ہو (مطلب یہ کہ گھر بیٹھے اسے کسی بھی جائز وسیلے سے بقدر ضروریات آمدنی ہو جاتی ہو) تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ عبادت وغیرہ میں مشغول رہے اپنے اوقات کسی کسب وغیرہ میں صرف نہ کرے۔ اسی طرح دینی علوم کی تعلیم دینے والے مفتیء قاضی اور اسی زمرہ کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی یہی حکم ہے اگر یہ لوگ بقدر کفایت ضروریات آمدنی رکھتے ہوں تو ان کو اپنے امور ہی میں مصروف رہنا چاہیے کسب وغیرہ میں مصروف نہ ہوں۔ جو شخص کسی کسب مثلاً تجارت وغیرہ کا پیشہ اختیار کرے تو اس پر فرض ہے کہ وہ صرف حلال اور جائز مال کمائے حرام سے کلیۃً اجتناب کرے اور اپنے پیشے وہنر میں احکام

شرعی کی رعایت بہر صورت ملحوظ رکھے نیز اپنے پیشہ میں تمام تر محنت و جدو جہد کے باوجود اللہ کی ذات پر توکل و اعتماد رکھے کہ رزاق مطلق صرف اللہ تعالیٰ اور کسب محض ایک ظاہری وسیلہ کے درجہ کی چیز ہے اپنے پیشے و کسب کو رزاق ہر گز نہ سمجھے کیونکہ یہ شرک خفی ہے۔حرام کسب کے ذریعے حاصل ہونے والے مال و زر سے مکمل پرہیز کرے کیونکہ اس کے بارے میں سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ وعید منقول ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص حرام مال سے صدقہ وخیرات کرتا ہے تو اس کا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور مال حرام اپنے پیچھے یعنی مالک کی موت کے بعد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا کہ وہ اپنے مالک کے لیے ایسا برا زادراہ بن جاتا ہے جو اسے یعنی مالک کو دوزخ کی آگ میں پہنچادیتا ہے۔بعض لوگ حرام مال کی بڑی تعداد سے تو پرہیز کرتے ہیں لیکن قلیل مقدار میں احتیاط نہیں کرتے حالانکہ حرام مال کی قلیل ترین مقدار سے بھی اسی طرح اجتناب کرنا چاہیے جس طرح بڑی سے بڑی مقدار سے اجتناب ضروری ہے اس بارے میں یہ احساس ہونا چاہیے کہ حرام مال کی وہ قلیل ترین مقدار بقیہ تمام حلال مال میں مل کر سارے مال کو مشتبہ بنادیگی اور مشتبہ مال و مشتبہ پیشے کے بارے میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ اس سے اجتناب ہی اولی ہے۔اگر کوئی شخص کسی کو بطور ہدیہ وغیرہ کوئی ایسی چیز یا ایسا مال دے جس کی حرمت وحلت کے بارے میں شبہ ہو تو چاہیے کہ اس چیز یا اس مال کو اچھے انداز میں اور نرمی کے ساتھ دینے والے کو واپس کردے ہاں اگر واپس کرنے دینے والا آزردہ خاطر ہو تو پھر واپس نہ کرنا چاہیے یہی حکم اس مشتبہ مال کی تحقیق کرنے کا بھی ہے کہ اگر وہ مشتبہ مال دینے والا آزردہ خاطر نہ ہو تو تب اس مال کی تحقیق کی جائے اور اگر وہ تحقیق کرنے سے آزردہ خاطر ہو تو پھر تحقیق بھی نہ کی جائے کیونکہ کسی مسلمان کو آزردہ

خاطر کرنا حرام ہے جب کہ مشتبہ مال کی تحقیق کرنا ورع (تقوی) ہے اور اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ ورع کے لیے حرام کا ارتکاب نہ کرنا چاہیے ہاں جس مال کے بارے میں بالکل تحقیق ہو کہ یہ حرام محض ہے تو پھر اس کو واپس کر دینا بہر صورت ضروری ہے اگر چہ دینے والا آزردہ خاطر ہی کیوں نہ ہو البتہ اگر اس مال کو واپس کرنے میں کسی فتنہ انگیزی کا خوف ہو تو پھر اسے بھی واپس نہ کرے بلکہ اسے لے کر کسی مضطرب کو دیدے اور اگر خود مضطر ہو تو اسے اپنے استعمال میں لے آئے۔ جس بازار میں حرام مال کی تجارت ہوتی ہو اس بازار سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ اس میں خرید و فروخت نہ کرے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں مال حرام ہے مشتبہ ہے اس کی تحقیق و تفتیش ضروری نہیں کیونکہ حرمت و شبہ کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں ہر جگہ اور ہر چیز کی تحقیق و تجسس محض وسوسہ ہے۔ غیر مشروع کسب کی اجرت بھی جرام ہے مثلاً مردوں کے لیے ریشمی کپڑے سینا یا مردوں کے لیے سونے کے زیور بنانا اسی طرح غیر مشروع خرید و فروخت سے حاصل ہونے ولا نفع و مال بھی حرام ہے ی سے محتکر ہ غلہ بیچنا تمام تجارتوں میں سب سے بہتر تجارت بزازی ہے اسی طرح تمام پیشوں میں سب سے بہتر پیشہ مشک بنانا و سینا ہے۔ خرید و فروخت میں کھوٹے سکوں کو پھیلانا قطعاً ناجائز ہے اگر کھوٹے ہاتھ لگیں تو انھیں کنویں وغیرہ میں ڈال کر ضائع کر دینا چاہیے۔ اسی طرح ہر تاجر اور دوکاندار کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاملات میں مکر و فریب سے کام نہ لے بات بات پر قسم نہ کھائے کسی چیز میں اگر کوئی عیب ہو تو اسے خریدار سے پوشیدہ نہ رکھے اپنی اشیاء کی تعریف و توصیف حقیقت سے زیادہ نہ کرے کوئی چیز کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت نہ کرے جو اسے حرام کام میں استعمال کرے مثلاً انگور کسی شراب ساز کو نہ بیچے یا ہتھیار وغیرہ کسی ڈاکو و قزاق وغیرہ کے ہاتھ فروخت نہ کرے دستکار و صنعت گر اپنی

بنائی ہوئی چیز میں کھوٹ ملاوٹ اور غلط چیزوں کی آمیزش نہ کرے کیونکہ ایسی چیز سے حاصل ہونے والی اجرت و قیمت حرام ہوتی ہے ناپ تول میں کمی نہ کرے غبن و دھوکہ دہی میں اپنا دامن ملوث نہ کرے ہمہ وقت یہ تصور رکھے کہ ناجائز طریقوں اور حرام ذرائع سے حاصل ہونے والا ایک پیسہ بھی جنت میں داخل ہونے سے روک دے گا تھوڑے منافع پر اکتفاء کرے کہ یہ مستحب ہے اور جس تجارت و حرفت میں مشغول ہو اور اس سے اس کی ضروریات پوری ہو جاتی ہوں تو اسی پر قناعت کرے اس کی موجودگی میں دوسری تجارتوں اور دوسرے کاروبار کے ذریعے زیادہ کمانے کی حرص نہ رکھے بلکہ اپنے بقیہ اوقات کو آخرت کی بھلائیوں کو حاصل کرنے میں صرف کرے کیونکہ صرف اس دنیا کی فانی زندگی کی راحت و تعیش کے حصول میں ہمہ وقت لگے رہنا اور آخرت کی ابدی زندگی کی سعادتوں سے بے پروا ہو جانا عقل و دانش سے بعید تر بات ہے۔

صرف حلال مال کھانے کی فضیلت اور حرام مال سے بچنے کا اثر

حدیث:

وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الله طيب لا يقبل إلا طيبا وإن الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين فقال: (يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا)

وقال: (يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم)

ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء: يا رب يا رب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذي بالحرام فأنى يستجاب لذلك؟". رواه مسلم

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمام کمی اور عیوب سے پاک ہیں اس پاک ذات کی بارگاہ میں صرف وہی صدقات و اعمال مقبول ہوتے ہیں جو شرعی عیوب اور نیت کے فساد سے پاک ہوں۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے جس چیز (یعنی حلال مال کھانے اور اچھے اعمال) کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے اسی چیز کا حکم تمام مومنوں کو بھی دیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے آیت (یا ایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا) (یعنی اے رسولو حلال روزی کھاؤ اور اچھے اعمال کرو) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آیت (یا ایہا الذین امنوا کلوا من طیبات مارزقنکم) (یعنی اے مومنو تم صرف وہی پاک و حلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطاء کیا ہے) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بطور مثال ایک شخص کا حال ذکر کیا کہ وہ طول طویل سفر اختیار کرتا ہے پراگندہ بال اور غبار آلودہ ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب اے میرے رب یعنی وہ اپنے مقاصد کے لیے دعا مانگتا ہے حالانکہ کھانا اس کا حرام لباس اس کا حرام شروع سے اب تک پرورش اس کی حرام ہی غذاؤں سے ہوئی پھر کیونکر اس کی دعا قبول کی جائے۔ (مسلم)

تشریح

اس ارشاد گرامی میں پہلے تو حلال مال کمانے کی فضیلت اور اس کا حکم بیان کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کہ خود پاک ہے اور حلال رزق کو اس کی جناب پاک میں اس وجہ سے ایک نسبت حاصل ہے کہ حلال رزق بھی حرمت کی نجاستوں سے پاک ہوتا ہے تو تقاضاء عبودیت یہی ہے کہ بندہ حلال ہی رزق کھائے تاکہ اس پاک و حلال رزق کی وجہ

سے اس بندہ کو بارگاہ الٰہی میں تقرب کی دولت حاصل ہوء اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بتایا ہے کہ حرام مال سے اجتناب نہ کرنے کا اثر دعا کا قبول نہ ہونا ہے چنانچہ اس بات کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مثال کے ذریعے ظاہر فرمایا ہے کہ ایک شخص حج یا اورعبادات کے لیے طول طویل سفر اختیار کرتا ہے وہ ان مقامات مقدسہ تک پہنچنے میں پوری مشقت وجد وجہد کرتا ہے جہاں مانگی جانے والی دعا باب قبولیت تک پہنچتی ہے یہاں تکہ کہ وہ ان مقامات تک پہنچ جاتا ہے وہاں پہنچ کر وہ اس حال میں دست سوال اٹھاتا ہے کہ سفر کی مشقت وطوالت کی وجہ سے اس کے بال پراگندہ ہیں پورا جسم گرد وغبار سے آلودہ ہے اور تضرع والحاح کی پوری کیفت اس پر طاری ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی دعا بظاہر قبول ہونی چاہیے کیونکہ اول تو ایک عبادت گزار بندہ ہے پھر وہ مسافر بھی ہے اور مسافر کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی دعا باب قبولیت تک پہنچ کر رہتی ہے دوسرے یہ کہ اس جگہ دعا مانگ رہا ہے جہاں مانگی جانے والی ہر دعا کی لاج رکھی جاتی ہے غرضیکہ قبولیت دعا کے تمام آثار موجود ہیں مگر اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی کیوں اس لیے کہ جاننے والا جانتا ہے کہ وہ حرام مال سے پرہیز نہیں کرتا گویا اس کی ساری محنت ومشقت اور اس کی ساری عبادت وحالت اس کی دعا کو صرف اس لیے موثر نہیں بنا سکی وہ حرام مال کھاتا ہے حرام لباس پہنتا ہے اور کمائی کے حرام ذرائع سے اجتناب نہیں کرتا اس سے معلوم ہوا کہ دعا کی قبولیت حلال رزق پر موقوف ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ دعا کے دو بازو ہیں (جن کے سہارے وہ دعا باب قبولیت تک پہنچتی ہے) ایک تو اکل حلال دوسرا صدق مقال یعنی حلال کھانا اور سچ بولنا۔

مشتبہ چیزوں سے بھی اجتناب کرنا چاہیے

حدیث؛

وعن النعمان بن بشیر قال :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :"الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات لا یعلمہن کثیر من الناس فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشك أن یرتع فیہ ألا وإن لكل ملك حمی ألا وإن حمی اللہ محارمہ ألا وإن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كلہ وإذا فسدت فسد الجسد كلہ ألا وهی القلب"

ترجمہ؛

حضرت نعمان ابن بشیر راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حلال ظاہر ہے حرام ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے لہٰذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو پاک ومحفوظ کرلیا (یعنی مشتبہ چیزوں سے بچنے والے کے نہ تو دین میں کسی خرابی کا خوف رہیگا اور نہ کوئی اس پر طعن و تشنیع کرے گا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہوگیا اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ پر چراتا ہے اور ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں گھس کر چرنے لگیں۔ جان لو ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ حرام چیزوں ہیں اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست حالت میں رہتا ہے یعنی جب وہ ایمان و عرفان اور یقین کے نور سے منور رہتا ہے تو اعمال خیر اور حسن اخلاق واحوال کی وجہ سے پورا جسم

درست حالت میں رہتا ہے اور جب اس ٹکڑے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے یاد رکھو گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے (بخاری و مسلم)

تشریح:
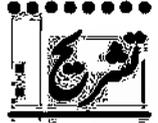
حلال ظاہر ہے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ چیزیں تو وہ ہیں جن کا حلال ہونا سب کو معلوم ہے نیک کلام اچھی باتیں وہ مباح چیزیں ہیں جن کو کرنا یا جن کی طرف دیکھنا درست ہے شادی بیاہ کرنا اور چلنا پھرنا وغیرہ وغیرہ اسی طرح حرام ظاہر ہے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا حرام ہونا نص کے ذریعہ بالکل واضح طور پر معلوم ہو گیا ہے جیسے شراب خنزیر مردار جانور ※ جاری خون زنا سود جھوٹ غیبت چغل خوری امرد اور اجنبی عورت کی طرف بہ نظر بد دیکھنا وغیرہ وغیرہ ایسے ہی کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی حرمت یا حلت کے بارے میں دلائل کے تعارض کی بناء پر کوئی واضح حکم معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہیں یا حلال ایسی کتنی ہی چیزیں ہیں جن کے حلال ہونے کی دلیلیں بھی ہیں اور حرام ہونے کی بھی اس صورت میں کوئی واضح فیصلہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں دونوں طرف کی دلیلوں میں سے کسی ایک طرف کی دلیل کو اپنی قوت اجتہاد اور بصیرت فکر و نظر کے ذریعہ راجح قرار دے کر کوئی واضح فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بہر کیف مشتبہ چیز کے بارے میں علماء کے تین قول ہیں۔ 1 ایسی چیز کو نہ حلال سمجھا جائے نہ حرام اور نہ مباح یہی قول سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔ - 2 ایسی چیز کو حرام سمجھا جائے- 3 ایسی چیز کو مباح سمجھا جائے اب ان تینوں اقوال کو ذہن میں رکھ کر مشتبہ کو بطور مثال اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا ایک دوسری

عورت نے آ کر کہا کہ میں نے ان دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے اس صورت میں وہ منکوحہ عورت اس شخص کے حق میں مشتبہ ہوگئی کیونکہ ایک طرف تو عورت کا بیان ہے کہ میں نے چونکہ ان دونوں کو دودھ پلایا ہے اس لیے یہ دونوں رضاعی بہن بھئی ہوئے اور ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی بہن کے درمیان نکاح درست نہیں ہوتا لہٰذا اس دلیل کا تو یہ تقاضا ہے کہ اس نکاح کو قطعاً ناجائز کہا جائے مگر دوسری طرف نکاح کے جائز رہنے کی یہ دلیل ہے کہ صرف یہ ایک عورت کی بات ہے جس پر کوئی شرعی گواہی نہیں ہے اس پر کیسے یقین کرلیا جائے کہ یہ عورت صحیح ہی کہہ رہی ہے ہوسکتا ہے کہ یہ محض بدنیتی کی وجہ سے یہ بات کہ کر ان دونوں کے درمیان افتراق کرانا چاہتی ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ نکاح جائز اور درست ہے دلائل کے اس تعارض کی وجہ سے لا محالہ یہی حکم ہوگا کہ یہ ایک مشتبہ مسلہ ہوگیا ہے اس لیے اس شخص کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس عورت کو اپنے نکاح میں نہ رکھے کیونکہ مشتبہ چیز سے اجتناب ہی اولی ہے مشتبہ چیز کی دوسری مثال یہ ہے کہ مثلا ایک شخص کے پاس کچھ روپے ہیں جن میں سے کچھ تو جائز آمدنی کے ہیں اور کچھ ناجائز آمدنی کے اس صورت میں وہ سب روپے اس شخص کے حق میں مشتبہ ہیں لہٰذا اس کو ان روپیوں سے اجتناب و پرہیز کرنا چاہیے۔ ارشاد گرامی میں حرام چیزوں کو ممنوعہ چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کوئی حاکم کسی خاص چراگاہ کو دوسروں کے لیے منوع قرار دے دیتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو اس ممنوعہ چراگاہ سے دور رکھیں اسی طرح جو چیزیں شریعت نے حرام قرار دی ہیں وہ لوگوں کے لیے ممنوع ہیں کہ ان کے ارتکاب سے اجتناب و پرہیز واجب وضروری ہے اور مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہونے کو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ (منڈیر) پر عام جانور چرانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ

جس طرح چرواہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو ممنوعہ چراگاہ سے دور رکھ کر چرائے تاکہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں نہ گھس جائیں اور اگر وہ اپنے جانوروں کو ممنوعہ چراگاہ کی مینڈ پر چرائے گا تو پھر اس بات کا ہر وقت احتمال رہے گا کہ اس کے جانور ممنوعہ چراگاہ میں گھس جائیں جس کے نتیجہ میں اسے مجرم قرار دے دیا جائے گا اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ مشتبہ چیزوں سے دور رہے تاکہ محرمات حارم چیزوں میں مبتلا نہ ہو جائے اس کے بعد آپ نے مذکورہ بالا تشبیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جان لو کہ ہر بادشاہ کا ایک ایسا ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے جس میں جانور چرانا جرم سمجھا جاتا ہے (یہ گویا زمانہ جاہلیت کے بادشاہوں اور حکام کے بارے میں خبر دی ہے یا یہ کہ مسلمانوں میں سے ان بادشاہوں اور حکام کے بارے میں خبر دی ہے جو غیر عادل ہیں کیونکہ کسی علاقہ کی گھاس کو جانوروں کے چرنے سے روک کو ممنوعہ چراگاہ قرار دینا درست نہیں ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ممنوعہ علاقہ حرام چیزیں ہیں کہ جن میں مبتلا ہونا لوگوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا جو کوئی اس ممنوعہ علاقہ میں داخل ہوگا یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کرے گا اسے مستوجب عذاب قرار دیا جائے گا اور پھر ان حرام چیزوں میں بھی بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے مرتکب کی بخشش ہی نہیں ہوگی جیسے شرک اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہیں کہ چاہے ان کے مرتکب کو بخشے چاہے نہ بخشے البتہ سچے دل کے ساتھ توبہ استغفار سے ہر چیز بخشی جائے گی۔ حضرت شیخ علی متقی نے اس موقع پر یہ ترتیب ضروری مباح مکروہ حرام کفر قائم کر کے لکھا ہے کہ جب بندہ اپنی معاشی تمدنی اور سماجی زندگی کے تمام گوشوں میں اس قدر ضرورت پر اکتفاء کر لیتا ہے جس سے اس کا وجود اور اس کی عزت باقی رہے تو وہ اپنے دین میں ہر خطرہ سے سلامت رہتا ہے مگر جب حد ضرورت سے گزرنے کی

کوشش کرتا ہے تو حد مکروہات میں داخل ہوجاتا ہے یہاں تک کہ حرص وہوس حد مکروہات سے نکال کر محرمات کی مد میں داخل کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اگلا قدم کفر میں پہنچ جاتا ہے نعوذ باللہ من ذلک۔ حدیث کے آخر میں انسانی جسم میں گوشت کے اس ٹکڑے کی اہمیت بیان کی گئی ہے جسے دل کہا جاتا ہے چنانچہ فرمایا کہ جب وہ ٹکڑا بگڑ جاتا ہے یعنی انکار شک اور کفر کی وجہ سے اس پر ظلمت طاری ہوجاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ارتکاب گناہ ومصیبت کی وجہ سے پورا جسم بگڑ جاتا ہے لہٰذا ہر عاقل و بالغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو خواہشات نفسانی میں منہمک ہونے سے روکے تاکہ وہ آگے بڑھ کر مشتبہ چیزوں کی حد میں داخل نہ ہوجائے کیونکہ جب دل خواہشات نفسانی کی طرف چل پڑتا ہے تو پھر اللہ کی پناہ وہ تمام حدوں کو پھلانگتا ہوا ظلمت کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ آخر میں یہ سمجھ لیجئے کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بدن کی بھلائی و بہتری حلال غذا پر موقوف ہے کیونکہ حلال غذا سے دل کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور دل کی صفائی ہی سے تمام بدن اچھی حالت میں رہتا ہے بایں طور کہ اس کے ایک ایک عضو سے اچھے اعمال ہی صادر ہوتے ہیں اور تمام اعضاء کا برائی کی طرف میلان ختم ہوجاتا ہے۔ اور اب ایک بات یہ جان لیجئے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث علم و مسائل کے بڑے وسیع خزانے کی حامل ہے نیز جن حدیثوں پر اسلامی شرائع و احکام کا مدار ہے وہ تین ہیں ایک تو حدیث (انما الاعمال بالنیات) دوسری حدیث (من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ) اور تیسری یہی ہے حدیث (الحلا ل بین) الخ۔

حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہے

حدیث:

وعن جابر أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول عام الفتح وهو بمكة :"إن الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والأصنام ". فقيل :يارسول الله أرأيت شحوم الميتة؛ فإنه تطلى بها السفن ويدهن بها الجلود ويستصبح بها الناس؛ فقال :"لا هو حرام ". ثم قال عند ذلك :"قاتل الله اليهود إن الله لما حرم شحومها أجملوه ثم باعوه فأكلوا ثمنه"

ترجمہ:

حضرت جابر سے روایت ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کے سال مکہ میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے شراب مردار خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے جب آپ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ہمیں مردار کی چربی کا حکم بھی بتائیے جو کشتیوں پر ملی جاتی ہے نیز اس سے چمڑوں کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ (گھروں میں) اس سے چراغ جلاتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مردار کی چربی بھی حرام ہے اس لیے اس سے یہ فائدے اٹھانے جائز نہیں پھر آپ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت فرمائے جب اللہ تعالیٰ نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو یہود (نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ) چربی کو پگھلاتے اور بیچ ڈالتے اور پھر اس کی قیمت کھا جاتے (بخاری و مسلم)

تشریح:

عطاء نے لکھا ہے کہ شراب وغیرہ کے مذکورہ بالا حکم میں باجا (کبی) بھی داخل ہے کہ اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہے نیز اگر کوئی شخص کسی باجے کو تلف کر دے تو اس پر ضمان یعنی

مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ حضرت امام شافعی کا مسلم یہ ہے کہ مردار کی چربی کی خرید و فروخت تو جائز نہیں ہے لیکن اس چربی سے فائدہ اٹھانا یعنی اس کو کھانے اور آدمی کے جسم پر ملنے کے علاوہ اور کام میں استعمال کرنا جائز ہے خواہ کشتی پر ملے خواہ چراغ میں جلائے اور خواہ کسی اور کام میں لائے اسی طرح ان کے مسلک کے مطابق جو گھی یا زیت یا اور کوئی تیل نجاست پڑ جانے کی وجہ سے نجس ہو گیا ہو تو اس کو چراغ میں جلانے یا اس کا صابون بنانا جائز ہے جب کہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح مردار کی خرید و فروخت ناجائز ہے اسی طرح اس سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا یعنی اس کی کسی بھی چیز کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے کیونکہ مردار کی حرمت بطریق عموم ثابت ہے البتہ دباغت کیا ہوا چمڑا اس سے مستثنی ہے کیونکہ اس کا جواز خصوصی طور پر ثابت ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے متبعین علماء نے نجس زیت کو بیچنے کی اجازت دی ہے البتہ ان کے نزدیک نجس تیل کو چراغ میں جلانا بالخصوص مسجد میں جلانا مکروہ ہے۔ حدیث کے آخر میں یہودیوں کی ایک خاص عیاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کے لیے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو انھوں نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ چربی کو پگھلا کر اس کو بیچ دیتے تھے اور پھر اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والے مال کو اپنے استعمال میں لے آتے اور یہ کہتے تھے کہ اللہ نے تو چربی کھانے سے منع کیا ہے اور ہم چربی نہیں کھاتے بلکہ اس کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتے ہیں گویا وہ جاہل چربی کو پگھلا کر یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے چربی کی حقیقت کو بدل دیا ہے کہ پگھلنے کے بعد وہ چربی نہیں رہ گئی ہے اس لیے اس صورت میں حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی اس عیارانہ چال کی وجہ سے ان کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا اس سے یہ

بات معلوم ہوئی کہ ایسا حیلہ اختیار کرنا کہ جس کے سبب سے حرام کا ارتکاب ہوتا ہو بالکل غلط ہے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کسی چیز کی قیمت حکم کے اعتبار سے اسی چیز کے تابع ہے کہ اگر وہ چیز حرام ہوگی تو اس کی قیمت بھی حرام ہوگی اور جو چیز حلال ہوگی اس کی قیمت بھی حلال ہوگی۔

سود کا بیان

سود ایک معاشرتی لعنت وعفریت ہے جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی غربت کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غریب کے سکتے وجود سے سرمایہ دار کی ہوس کو غذا بخشی ہے چنانچہ اس لعنت میں مبتلا ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں تنبیہ کی ہے ایت (فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ) پھر اگر تم اس سود خوری چھوڑنے کے حکم پر عمل نہ کرو تو پس اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو اسلام نے تجارت اور قرض دونوں میں سود کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا ارتکاب گناہ کبیرہ بتایا ہے جو مسلمان سود کے حرام ہونے کا قائل نہ ہو اسلامی قانون کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔ یہ لعنت بہت پرانی ہے اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا طریقہ رائج تھا چنانچہ قریش مکہ اور یہود مدینہ میں اس کا عام رواج تھا اور ان میں صرف شخصی ضرورتوں مثلاً قرض وغیرہ ہی کے لیے نہیں بلکہ تجارتی مقاصد کے لیے بھی سود کا لین دین جاری تھا۔ اسی طرح سود کی تباہ کاریاں بھی ہمیشہ ہی تسلیم شدہ رہی ہیں اور اس کو اختیار کرنے والے بھی کبھی اس کے مضر اثرات سے منکر نہیں رہے ہیں البتہ ایک نئی بات یہ ضرور ہوئی ہے کہ جب سے یورپ کے دلال دنیا کی مسند اقتدار و تجارت پر چھائے ہیں انھوں نے مہاجنوں اور یہودیوں کے اس خاص کاروبار کو نئی نئی شکلیں اور نئے نئے نام دے کر اس کا دائرہ اتنا وسیع

کر دیا ہے کہ وہی سود جو پہلے انسان کی معاشرتی زندگی کا ایک گھن سمجھا جاتا تھا آج معاشیات
اقتصادیات اور تجارت کے لیے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے اور سطحی ذہن وفکر رکھنے والوں کو
یقین ہوگیا ہے کہ آج کوئی تجارت یا صنعت یا اور کوئی معاشی نظام سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا
اگر چہ آج بھی اہل یورپ ہی میں سے وہ لوگ جو تقلید محض اور عصبیت سے بلند ہو کر وسیع نظر سے
معاملات کا جائزہ لیتے ہیں اور جو معاشیات کا وسیع علم ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر
گہری نظر بھی رکھتے ہیں خود ان کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ سود معاشیات اور اقتصادی زندگی کے لیے
ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ایک ایسا کیڑا ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں لگ گیا ہے اور جب تک اس
کیڑے کو نہ نکالا جائے گا دنیا کی معیشت جو جو اضطراب وہیجان ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔ اس میں
شبہ نہیں کہ آج دنیا میں سود کا لین دین جتنا وسیع ہوگیا ہے اور دنیا کے اس کونے سے لے کر اس
کونے تک تمام ہی تجارتوں میں اس کا جال جس طرح بچھا دیا گیا ہے افراد واشخاص کی کیا
حیثیت اگر کوئی پورا طبقہ و جماعت بلکہ کوئی پورا ملک بھی اس سے نکلنا چاہے تو اس کو اس کے سوا
اور کچھ حاصل نہ ہوگا کہ یا تو اپنی تجارت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے یا نقصان برداشت کرتا رہے یہی
وجہ ہے کہ اب تو عام مسلمان تاجر الگ رہے وہ دیندار و پرہیز گار مسلمان تاجر جن کی اعتقادی و عملی
زندگی بڑی پاکیزہ اور مثالی ہے اب انھوں نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ سود جو حرام ترین چیز
اور بدترین سرمایہ ہے اس سے کس طرح نجات حاصل کریں جس کا نتیجہ یہ ہے ان دیندار اور
پابند شریعت مسلمانوں اور ایک خالص دیندار مہاجن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ لہذا سود کی ہمہ
گیری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اس عام مجبوری کا سہارا لے کر اتنی بڑی لعنت سے بالکل
بے پروا ہو کر بیٹھ جائیں اور ان کے دل میں ذرہ برابر کھٹک بھی پیدا نہ ہو کہ وہ کتنی بڑی حرام چیز

میں مبتلا ہیں آج سود کے بارے میں جو تاویلیں کی جاتی ہیں یا اس کو جو نئی نئی شکلیں دی جاتی ہیں یاد رکھئے وہ سب اسی درجے میں حرام ہیں جس درجے میں خود سود کی حرمت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی معاملات کو اس انداز میں استوار کریں جس سے حتی الامکان اس لعنت سے نجات مل سکے اگر موجودہ معاشی نظام میں اس حد تک تبدیلی ان کے بس میں نہیں ہے کہ جس میں سود کا دخل نہ ہو تو کم سے کم اپنی زندگی اور نجی معاملات ہی کو درست کریں تاکہ سود کی لعنت سے اگر بالکل نجات نہ ملے تو کم از کم اس میں کمی ہی ہو جائے اور مسلمان ہونے کا یہ ادنیٰ تقاضہ تو پورا ہو کہ وہ حتی الامکان حرام سے بچنے کی فکر میں رہے۔ بہرکیف اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث ذکر ہوں گی جن کے ضمن میں حسب موقع سود کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ پہلے اس موضوع سے متعلق چند بنیادی باتیں بتادی جائیں،

ربا (سود) کا معنیٰ:

لغت کے اعتبار سے ربا کے معنیٰ زیادتی بڑھوتری بلندی کے آتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو،

ربا اور سود میں فرق

" قرآن کریم میں جس چیز کو لفظ ربا کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے اس کا ترجمہ اردو میں عام طور پر سود کیا جاتا ہے جس کیوجہ سے عموماً لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ربا اور مروجہ سود دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یعنی جس چیز کو عربی میں ربا کہتے ہیں اسی کو اردو میں سود کہا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ربا ایک عام اور وسیع مفہوم کا حامل ہے جبکہ مروجہ سود ربا کی

ایک قسم یا اس کی ایک شاخ ہے کیونکہ مروجہ سود کے معنی ہیں روپیہ کی ایک متعین مقدار ایک متعین میعاد کے لیے قرض دے کر متعین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینا۔ بلاشبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر صرف اسی ایک صورت یعنی قرض وادھار پر نفع وزیادتی لینے کا نام ربا نہیں ہے بلکہ ربا کا مفہوم اس سے بھی وسیع ہے کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وحی الہی کی روشنی میں ربا کے مفہوم کو وسعت دے کر لین دین اور خرید وفروخت کے معاملات کی بعض ایسی صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں جن میں چیزوں کے باہم لین دین یا ان کی باہمی خرید و فروخت میں کمی بیشی کرنا بھی ربا ہے اور ان میں ادھار لین دین کرنا بھی ربا ہے اگر چہ اس ادھار میں اصل مقدار پر کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر سرابر لیا دیا جائے۔

ربا کی قسمیں اور ان کے احکام :

ربا کے مذکورہ بالا وسیع مفہوم کے مطابق فقہا نے ربا کی جو قسمیں مرتب کی ہیں ان میں سے عام طور پر یہ پانچ قسمیں بیان کی جاتی ہیں 1 رباءقرض 2 رباء رہن 3 رباء شراکت 4 رباء نسیہ 5۔رباء فضل رباء قرض : کا مطلب ہے قرض خواہ قرض دار سے بحسب شرط متعینہ میعاد کے بعد اپنے اصل مال پر کچھ زائد مقدار لینا اس کی مثال مروجہ سود کی صورت ہے یعنی ایک شخص کسی کو اپنے روپیہ کی ایک متعین مقدار ایک متعین میعاد کے لیے اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ اتنا روپیہ اس کا ماہوار سود کے حساب سے دینا ہوگا اور اصل روپیہ بدستور باقی رہے گا ربا کی یہ صورت کلیۃً حرام ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ رباء رہن : کا مطلب ہے بلا کسی مالی معاوضہ کے وہ نفع جو مرتہن کو راہن سے یا شئی مرہونہ سے حاصل ہو اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص (یعنی راہن) اپنی کوئی مللکیت مثلاً زیور یا مکان کسی دوسرے شخص (یعنی مرتہن) کے پاس بطور

ضمانت رکھ کر اس سے کچھ روپیہ قرض لے اور وہ مرتہن اس رہن کی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھائے مثلاً اس مکان میں رہے یا اسے کرایہ پر چلائے اور یا یہ کہ اس رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ راہن سے نفع حاصل کرے بایں طور کہ قرض دی ہوئی رقم پر سود حاصل کرے رہن کی یہ دونوں ہی صورتیں حرام ہیں۔ رباء شراکت : کا مطلب ہے کسی مشترک کاروبار میں ایک شریک اپنے دوسرے شریک کا نفع متعین کر دے اور جملہ نقصانوں اور فائدوں کا خود مستحق بن جائے یہ بھی حرام ہے۔ رباءنسیہ : کا مطلب ہے دو چیزوں کے باہم لین دین یا دو چیزوں کے باہم خرید و فروخت میں ادھار کرنا خواہ اس ادھار میں اصل مال پر زیادتی لی جائے مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے اور دوسرا شخص اس کے بدلہ میں اسے ایک ہی من گیہوں دے مگر ایک دو دن یا ایک دو ماہ بعد دے یہ اس صورت کی مثال ہے کہ دو چیزوں میں باہم تبادلہ ہوا مگر یہ تبادلہ دست بدست نہیں ہوا بلکہ ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار معاملہ ہوا نیز اس ادھار میں اصل مال پر کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی کمی بیشی کے ساتھ ادھار لین دین کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے گا رباءنسیہ کی یہی وہ صورت ہے جو زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھی اور اب بھی مروجہ سود کی شکل میں موجود ہے اور ایک اعتبار سے یہ رباء قرض کی قسم میں بھی داخل ہے۔ رباء فضل : کا مطلب ہے دو چیزوں میں باہم کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لین دین ہو مثلاً ایک شخص کسی کو ایک من گیہوں دے اور اس سے اسی وقت اپنے ایک من گیہوں کے بدلہ میں سوا من گیہوں لے۔ رباء کی یہ دونوں قسمیں یعنی نسیہ اور فضل چونکہ باہم لین دین کی دو بنیادی صورتیں ہیں نیز لا علمی کی بناء پر عام طور پر لوگ ان میں سود کے پیدا ہونے والے حکم سے نابلد ہیں اس لیے مناسب ہے کہ ان کے احکام

بیان کرنے سے پہلے چند باتیں بطور تمہید و قاعدہ بیان کر دی جائیں تا کہ ان احکام کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ : 1 لین دین اور تجارت کا معاملہ جن چیزوں سے متعلق ہوتا ہے وہ تین قسم کی ہیں 1 یا تو ان کا لین دین وزن سے ہوتا ہے 2 یا کسی برتن سے ناپی جاتی ہے 3 یا نہ تو وزن کی جاتی ہیں اور نہ کسی برتن سے ناپی جاتی ہیں پہلی اور دوسری قسم کی مثال غلہ ہے کہ کہیں تو غلہ کو تول کر بیچنے کا دستور ہے اور کہیں برتن میں بھر کر ناپنے کا۔ لین دین اور خرید و فروخت میں جو چیزیں تولی جاتی ہیں ان کو موزون کہتے ہیں اور جو چیزیں ناپی جاتی ہیں ان کو مکیل کہتے ہیں کسی چیز کے موزون یا مکیل ہونے کی صفت کو اصطلاح فقہ میں قدر کہتے ہیں اس مختصر سے لفظ قدر کو ذہن میں رکھئے۔ : 2 ہر چیز کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے مثلاً گیہوں کا گیہوں ہونا چاندی کا چاندی ہونا اور کپڑے کا کپڑا ہونا اسی حقیقت کو جنس کہتے ہیں اور اس لفظ جنس کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ : 3 جن چیزوں کا باہم لین دین ہوتا ہے وہ کبھی تو قدر میں متحد اور مشترک ہوتی ہیں اور جنس میں مختلف ہوتی ہیں مثلاً گیہوں اور چنہ یہ دونوں چیزیں قدر میں مشترک یعنی یکساں ہیں کیونکہ دونوں موزون ہیں یا مکیل ہیں مگر جنس میں مختلف یعنی یکساں نہیں ہیں کیونکہ ایک کی حقیقت گیہوں ہے اور دوسرے کی حقیقت چنہ ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں باہم لین دین ہوتا ہے ان کی جنس تو متحد و یکساں ہوتی ہے مگر قدر میں یکسانیت نہیں ہوتی مثلاً ململ کا ململ سے تبادلہ کہ دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر چونکہ دونوں موزوں اور مکیل نہیں (کیونکہ ململ کی خرید و فروخت نہ تو تول کر ہوتی ہے اور نہ کسی برتن سے ناپ کر) اس لیے جب یہ دونوں قدر ہی نہیں تو قدر میں ایک کیسے ہوں گا یا بکری کا بکری سے تبادلہ کہ دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر چونکہ موزوں اور مکیل نہیں اس لیے نہ قدر اور نہ اتحاد قدر اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں

باہم لین دین ہوتا ہے ان کی جنس بھی ایک ہوتی ہے اور قدر میں بھی یکسانیت ہوتی ہے جیسے گیہوں کا گیہوں سے تبادلہ کہ ان دونوں کی جنس بھی ایک ہے اور قدر بھی ایک ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن دو چیزوں میں باہم لین دین ہوتا ہے ان میں نہ تو جنس کی یکسانیت ہوتی ہے اور نہ قدر کی جیسے روپیہ اور کپڑا یا روپیہ اور غلہ (گویا آج کل لین دین اور تجارت کی جو عام شکل ہے) کہ نہ تو ان کی جنس ایک ہے اور نہ قدر ایک ہے لہٰذا باہم لین دین اور تجارت کی جانیوالی چیزیں چار قسم کی ہوئیں 1 متحد القدر والجنس (یعنی دونوں کی جنس بھی ایک اور قدر بھی ایک 2 متحد القدر غیر متحد الجنس (یعنی دونوں کی قدر تو ایک مگر جنس الگ الگ 3 متحد الجنس غیر متحد القدر (یعنی دونوں کی جنس تو ایک مگر قدر الگ الگ 4 غیر متحد الجنس والقدر (یعنی دونوں کی نہ تو جنس ایک اور نہ قدر ایک) اس تمہید کو جان لینے کے بعد چیزوں کے باہم لین دین اور تجارت کے سلسلے میں وہ قاعدہ کلیہ سمجھ لیجئے جو اگر ذہن میں رہے تو نہ صرف اس باب کے احکام ومسائل سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی رباء اور سود جیسے گناہ سے بچنا آسان ہوگا وہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو چیزیں متحد القدر والجنس ہوں ان کے باہم تبادلہ وتجارت میں شرعی طور پر دو چیزیں ضروری ہیں ایک تو یہ کہ وہ دونوں چیزیں وزن یا پیمانے میں برابر ہوں دوسرے یہ کہ دونوں دست بدست ہوں مثلاً اگر ہم دو شخص آپس میں گیہوں کو گیہوں سے بدلنا چاہیں تو اس میں کمی بیشی درست نہیں ہے یعنی یہ درست نہیں کہ ہم میں سے ایک تو سیر بھر گیہوں دے اور دوسرا سوا سیر دے بلکہ دونوں ہی کو سیر سیر بھر یا سوا سوا سیر ہی دینا ضروری ہے اور نہ یہ درست ہے کہ ایک تو سر دست لے لے اور دوسرا کل یا پرسوں یا تھوڑی دیر کے بعد بلکہ ایک ہی مجلس میں اور ایک ہی وقت میں دونوں کو اپنا اپنا حق لینا واجب ہے اور جو چیزیں متحد القدر غیر متحد

الجنس ہوں یا متحد الجنس غیر متحد القدر رہوں ان دونوں کا حکم ایک ہے وہ یہ کہ ان کے باہم لین
دین میں کمی بیشی تو جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں مثلاً گیہوں کو چنے سے بدلنا چاہیں کہ ان دونوں کی
جنس تو الگ الگ ہے مگر قدر ایک ہے اس لیے ان دونوں کے تبادلہ میں کمی بیشی تو جائز ہو گی
کہ ایک شخص ایک سیر گیہوں دے اور دوسرا اس کے بدلے میں سوا سیر چنہ دے مگر ان کے
تبادلہ میں ادھار جائز نہیں ہوگا۔ یا اسی طرح ایک بکری اور دوسری بکری سے بدلنا چاہیں کہ ان
دونوں کی جنس تو ایک ہے مگر قدر ایک نہیں کیونکہ قدر تو موزون یا مکیل ہونے کو کہتے ہیں اور
بکری نہ مکیل ہے اور نہ موزون لہٰذا ان میں بھی کمی بیشی جائز ہے کہ ایک شخص تو ایک بکری دے
اور دوسرا اس کے بدلے میں دو بکریاں دے مگر ان کے تبادلے میں بھی ادھار جائز نہیں ہوگا
اور جو چیزیں نہ متحد الجنس ہوں اور نہ متحد القدر رہوں ان میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور نقد و ادھار کا
فرق بھی جائز ہے مثلاً روپیہ اور غلہ کی باہم تجارت (جیسا کہ آج کل رائج ہے کہ اشیاء کا لین دین
روپیہ کے ذریعہ ہوتا ہے) کہ ان دونوں کی نہ تو جنس ایک اور ان کی قدر ایک ہے لہٰذا اگر کوئی
شخص روپیہ دے کر غلہ خریدنا چاہے تو اس صورت میں کمی بیشی بھی جائز ہے کہ چاہے تو ایک روپیہ
کے بدلے میں ایک سیر غلہ لیا دیا جائے اور چاہے ایک روپیہ کے بدلے میں دو سیر غلہ لیا دیا
جائے اس طرح اس صورت میں ادھار لین دین بھی جائز ہے کہ چاہے تو دست بدست لین دین
ہو چاہے ادھار کی صورت میں اب اس قاعدہ کلیہ کا حاصل چار قاعدے ہوئے۔ : 1 اشیاء متحد
القدر و متحد الجنس کے لین دین میں برابری اور دست بدست ہونا واجب ہے : 2 اشیاء متحد
القدر و غیر متحد الجنس کے لین دین میں نہ برابری واجب ہے اور نہ دست بدست ہونا واجب ہے
: 3 اشیاء متحد الجنس غیر متحد القدر کے لین دین میں دست بدست ہونا ضروری ہے مگر برابری

ضروری نہیں : 4اشیاء متحد القدر غیر متحد الجنس کے لین دین میں دست بدست ہونا ضروری ہے مگر برابری ضروری نہیں ان تمام بنیادی اور تمہیدی باتوں کو ذہن میں رکھ اب رباء ان دونوں اقسام یعنی نسیہ اور فضل کے احکام کی جانب آئے جن کا تذکرہ شروع میں کیا گیا تھا چنانچہ اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں اتحاد جنس بھی پایا جائے اور اتحاد قدر بھی یعنی وہ دونوں متحد الجنس بھی ہوں اور متحد القدر بھی (جیسے گیہوں) تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس لین دین میں رباء نسیہ بھی حرام ہے اور رباء فضل بھی اور یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ جنس سے مراد ہے اس چیز کی حقیقت اور قدر سے مراد ہے اس چیز کا مکیل یا موزون ہونا کیونکہ لین دین اور تجارت کے معاملات میں شرعی معیار یہی کیل ہے یا وزن ۔اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شارع نے جس چیز کو مکیل (یعنی پیمانہ سے ناپی جانے والی) کہا ہے وہ موزون (یعنی تولی جانیوالی) نہیں ہوگی اگر چہ عرف عام اور رواج کے اعتبار سے وہ موزوں ہی ہوں اسی طرح جس چیز کو موزون کہا ہے وہ مکیل نہیں ہوگی اگر چہ عرف عام اور رواج کے اعتبار سے وہ مکیل ہو مثلاً گیہوں کو شارع نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جن کا لین دین پیمانہ سے ناپ کر ہوتا ہے اگر چہ آج کل عام طور پر گیہوں کا لین دین وزن کے ذریعے ہوتا ہے (گو بعض علاقوں میں اب بھی اس کا لین دین ناپ کر ہی ہوتا ہے) اس لیے گیہوں کا گیہوں کے ساتھ لین دین کرنا وزن کے ذریعے جائز نہیں ہوگا اسی طرح چاندی اور سونے کو شارع نے چونکہ موزون کہا ہے اس لیے چاندی کا چاندی کے ساتھ یا سونے کا سونے کے ساتھ لین دین کیل کے ذریعے جائز نہیں ہوگا اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاملے میں شارع کا واضح حکم عرف عام اور رواج سے کہیں قوی اور برتر ہوتا ہے ہاں جن چیزوں کو شارع نے نہ مکیل کہا

ہے اور نہ موزوں ان کے لین دین عرف عام اور رواج ہی کا اعتبار ہوگا لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ حنفیہ میں سے حضرت امام ابو یوسف نے مطلق طور پر عرف عام اور رواج ہی کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک ان چیزوں کا لین دین وزن کے ذریعے جائز ہے جن کو شرعت نے مکیل کہا ہے بشرطیکہ عرف عام اور رواج وزن کے ذریعے ہی اس کے لین دین کا ہو چنانچہ کمال نے حضرت امام ابو یوسف ہی کے قول کو ترجیح دی ہے اور اسی بناء پر انھوں نے نقود مسکوکہ (یعنی سونے اور چاندی کے سکہ مثلاً اشرفی وغیرہ کا گنتی کے ذریعے بطور قرض لین دین یا آٹے کی وزن کے ذریعے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے نیز مستند ترین کتاب کافی میں بھی یہی ہے کہ حنفیہ کے ہاں اس بارے میں حضرت امام ابو یوسف ہی کے قول پر فتوی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ شارع نے گیہوں (یا دوسرے غلوں) کو مکیل کہا ہے لیکن ان کا لین دین وزن کے ذریعے بلاشبہ جائز ہے کیونکہ آج کل عام طور پر ان کا لین دین وزن ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

بہر کیف اتحاد جنس اور اتحاد قدر والی چیزوں کے لین دین کے بارے میں تو معلوم ہوگیا کہ ان میں رباء نسیہ بھی حرام ہے اور رباء فضل بھی۔ اسی طرح اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں جنس وقدر میں سے کسی ایک کا اتحاد پایا جائے مثلاً وہ متحد الجنس تو ہوں مگر متحد القدر نہ ہوں تو ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ایسی چیزوں کے لین دین میں رباء نسیہ تو حرام ہے مگر رباء فضل حرام نہیں ہے۔ لہٰذا اگر گیہوں کا گیہوں کے ساتھ یا چنے کا چنے کے ساتھ یا چونے کا چونے کے ساتھ یا سونے کا سونے کے ساتھ یا لوہے کا لوہے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل (یعنی کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لینا دینا) بھی حرام ہوگا اور نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) بھی حرام ہے اور نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) بھی حرام ہوگا کیونکہ یہاں اتحاد قدر بھی پایا جاتا

ہے اور اتحاد جنس بھی اور اگر گیہوں کا چنے کے ساتھ یا سونے کا چاندی کے ساتھ اور لوہے کا تانبے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل (یعنی کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لینا دینا) تو حلال ہوگا لیکن نسیہ (یعنی ادھار لینا دینا) حرام ہوگا کیونکہ یہاں صرف اتحاد قدر موجود ہے بایں طور کہ گیہوں اور چنے کا لین دین بھی کیل یا وزن کے ساتھ ہوتا ہے لوہے اور تانبے کا لین دین بھی وزن کے ساتھ ہوتا ہے اور چاندی کا لین دین بھی وزن کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یہاں اتحاد جنس موجود نہیں ہے اور اگر کسی کپڑے کے ایک ٹکڑے کا اس کپڑے کے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ یا گھوڑے کا گھوڑے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں بھی فضل حلال ہوگا اور نسیہ حرام ہوگا کیونکہ یہاں اتحاد جنس موجود ہے مگر اتحاد قدر نہیں ہے بایں طور کہ نہ تو کپڑا ہی مکیل یا موزون ہے اور نہ گھوڑا ہی مکیل یا موزون ہے جبکہ معیار شرعی مکیل یا موزون ہوتا ہے اور گز وغیرہ معیار شرعی نہیں ہے۔ اور اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہو جن میں نہ تو اتحاد قدر ہو اور نہ اتحاد جنس تو ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ایسی چیزوں کے لین دین میں فضل بھی حلال ہوگا اور نسیہ بھی مثلاً اگر گیہوں کا چاندی یا لوہے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل اور نسیہ دونوں جائز ہیں اس لیے کہ یہاں نہ اتحاد جنس ہے اور نہ اتاحد قدر بایں طور کہ گیہوں تو مکیل ہے اور چاندی یا لوہا موزون ہے اسی طرح لوہے کا سونے کے ساتھ یا سونے کا لوہے کے ساتھ لین دین کرنے کی صورت میں بھی فضل ونسیہ دونوں جائز ہیں کیونکہ یہاں بھی نہ اتحاد جنس ہے اور نہ اتحاد قدر بایں طور کہ سونا تولنے کے باٹ ترازو کی قسم الگ ہوتی ہے اور لوہا جن باٹ ترازو سے تولا جاتا ہے ان کی علیحدہ قسم ہوتی ہے گیہوں کا چونے کے لین دین کا پیمانہ الگ قسم کا ہوتا ہے (لیکن یہ ان علاقوں کی صورت ہے جہاں گیہوں اور چونے کا

لین دین وزن کے ساتھ نہیں بلکہ پیمانے کے ذریعے ہوتا ہے۔

سودخوروں کی ظاہری خوشحالی سے دھوکا نہ کھائیے :

آج کل سود کا کاروبار عام ہے چپہ چپہ پر سودخوروں کا لین دین جاری ہے ان کے یہاں ظاہری طور پر مال و دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے اسباب عیش وعشرت کی فراوانی ہر طرف رقصاں دیکھی جاتی ہے اسی لیے عام سطح میں لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آج کل تو سودخوروں کو بڑی سے بڑی راحت حاصل ہے وہ کوٹھیوں بنگلوں اور عالیشان عمارتوں کے مالک ہیں نوکر چاکر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں اس لیے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سودخوروں کو دنیا میں بھی راحت حاصل نہیں ہوتی اور ان کا مال وزر ان کا ساتھ نہیں دیتا حالانکہ غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح نظر آئے گی کہ سامان راحت اور راحت میں بڑا فرق ہے سامان راحت تو آپ کارخانوں اور فیکٹریوں اور بازاروں سے حاصل کر سکتے ہیں وہ سونے چاندی اور سکون کے عوض مل سکتا ہے لیکن جس چیز کا نام راحت ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے اور نہ کسی بازار سے دستیاب ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ایسے روحانی اطمینان اور قلب و دماغ کے ایسے سکون کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صورت میں براہ راست انسان کو عطا ہوتا ہے جو بعض اوقات بالکل بے سروسامان انسان اور جانوروں تک کو میسر آجاتا ہے اور بعض اوقات ہزاروں اسباب عیش و عشرت اور سامان راحت رکھنے کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتا ایک نیند کو لے لیجئے یہ نیند کیا ہے ایک راحت وسکون کا نام ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ ایک اعلیٰ قسم کی خواب گاہ بنوالیں جس میں ہوا روشنی کا پورا انتظام ہو عمدہ قسم کے اور آرام دہ پلنگ ہوں دلفریب و دل کش گدیلے بستر اور ملائم تکیے ہوں لیکن آپ خود بتائیے کیا ان سامانوں کے مہیا

ہوجانے پر نیند کا آجانا لازمی ہے اگر آپ کو خود اس کا تجربہ نہیں ہے تو وہ ہزاروں آدمی اس کا جواب نفی میں دیں گے جنہیں کسی عارضے کی وجہ سے نیند نہیں آتی ان کے لیے یہ سامان دھرے رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ خواب آور دوائیاں بھی جواب دے دیتی ہیں چنانچہ نیند کے سامان تو بازار سے آگئے لیکن نیند کسی بازار سے کسی بھی قیمت پر نہیں لائی جاسکتی اسی طرح دوسری لذتوں اور راحتوں کا حال ہے ان کے اسباب تو روپیہ پیسہ کے ذریعے حاصل ہوسکتے ہیں مگر ان راحتوں اور لذتوں کا حاصل ہونا ان اسباب کے باوجود بھی ضروری نہیں ہے یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت اور اطمینان کا نام نہ پائیں گے وہ اپنی حرص وہوس میں اپنی تجوریوں کو بھرنے اور اپنے ایک کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آتے ہیں کہ نہ ان کو اپنے کھانے پینے کا ہوش رہتا ہے نہ اپنی بیوی بچوں کا خیال ایمانداری سے بتائیے کیا اطمینان و راحت اسی طرح حاصل ہوتا ہے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مال و دولت کو بڑھانے کی ادھیڑ بن میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کا نام راحت ہے؟ کتنے بیوقوف ہیں وہ لوگ جنہوں نے اسباب راحت کا نام راحت رکھ لیا ہے اور جو حقیقی راحت ہے اس سے کوسوں دور ہیں۔ایک دنیادار انسان مال و دولت کے انبار اسی لیے جمع کرتا ہے کہ اسے دنیا کا اطمیان سکون اور راحت حاصل ہو اور وہ سماج و معاشرہ میں عزت و وقار کی زندگی بسر کر سکے لیکن سود خوروں کی راحت کا حال تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں ظاہری طور پر مال و دولت کی فراوانی اور عیش وعشرت اور راحت و آرام کے تمام تر اسباب کی موجودگی کے باوجود ان بدنصیبوں کو حقیقی راحت و اطمینان کی دولت نصیب نہیں ہوتی اور سکون قلب و دماغ جیسی اعلی نعمت میں مسلسل مبتلا رہنے کی وجہ سے طبعی طور پر بھی

بے رحم اور سنگ دل بن جاتا ہے اور اس کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبت زدہ اور افلاس کے مارے لوگوں کی مصیبت و مفلسی سے اور کم مایہ انسانوں کی کم مائیگی سے فائدہ اٹھائے اور ان کا خون چوس کر اپنے بدن کو سیم وزر سے پالے اس مقصد کے لیے وہ بھوک سے بلکتے معصوم بچوں کے ہاتھ سے سوکھی روٹی کا ٹکڑا چھیننے اور افلاس زدہ کی ستائی ہوئی باحیا عورت کے جسم پر لپٹے ہوئے کپڑے کا آخری چیتھڑا اتار لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا اس شقاوت اور سنگ دلی کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سود خور کی عزت اور وقار کے لیے کوئی گوشہ ہو آپ اپنی آبادی کے کسی بھی بڑے سے بڑے سود خور پر نظر ڈالئے اس کی تجوریاں سونے چاندی اور روپیوں کے کتنے ہی بڑے ذخیروں سے بھری پڑی ہوں اس کے گھر میں مال و دولت کے کتنے ہی خزانے محفوظ ہوں لیکن کیا لوگوں کی نظروں میں اس کی ادنٰی بھی وقعت ہوتی ہے بے کس و مجبور لوگ بھلے ہی اپنی ضرورت و احتیاج کی بناء پر اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں مگر ان کے دلوں میں بھی اس کے لیے عزت و احترام کا کوئی ادنٰی سا جذبہ نہیں ہوتا معاشرہ میں اس کی حیثیت اس درندے کے برابر نہیں ہوتی جو اپنے پنجوں سے انسانوں کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے نوچ کر انھیں ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل کر دیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے ہر طبقہ میں اس انسانی شرف و احترام سے بھی محروم رہتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے عزت و وقار کا پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔

آج کی بین الاقوامی بے چینی اور اقتصادی بدحالی سود خوروں ہی کی مسلط کی ہوئی ہے

بات جب چل نکلی ہے تو پھر سود خوری کے ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ سائنسی ارتقاء اور مادی عروج نے انسان کو یہ لینے کا سلیقہ کیا بخشا کہ سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ

تک بدل گئے آج کا انسانی ذہن علم و دانش کی فراوانی اور فہم وفراست کی پختگی کے دعوے کے باوجود غور وفکر کے ایک مخصوص نہج سے آگے نہیں بڑھ سکا آج کی دنیا نے انسان کے گرد خالص مادی سانچے میں ڈھلے ذہن جدید کے مصنوعی نظریات کا جو حصار کھینچ دیا ہے اس نے سوجھ بوجھ کی تمام صلاحیتوں کو سیم وزر کے ایک خالص ماحول میں مقید کر دیا ہے اور احساسات فکر ونظر کو حقیقی اچھائی اور برائی کی قوت امتیاز سے محروم کر کے صرف دینا کے وقتی اور ظاہری فائدوں اور تن آسانیوں کا اسیر بنا دیا ہے اسی لیے آج ہمیشہ کی تسلیم شدہ صداقتیں قابل انکار ہوگئی ہیں اور ہزاروں سال پرانے اٹل اور حقیقی نظریات قابل شکست وریخت سمجھے جانے لگے ہیں۔ اسلام کی یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ سود حرام ہے ہر فرد کے لیے ہر طبقہ کے لیے ہر زمانہ کے لیے اور ہر حالت میں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اگر چہ بظاہر پڑھے لکھے ہیں لیکن عہد حاضر کے مصنوعی افکار ونظریات نے انھیں دین وشریعت کے حقیقی راستے سے دور کر رکھا ہے اور ان کے ذہن وفکر پر موجودہ دور کی مخصوص چھاپ نے انھیں جہالت کی وادیوں میں بھٹکا رکھا ہے ان کے نزدیک نہ صرف حرمت سود جیسی مسلمہ حقیقت آج کے زمانہ میں ایک ناقبل عمل چیز ہے بلکہ مادی خوشحالی اور تجارتی کامیابیوں کی راہ میں ایک رکاوٹ بھی ہے ان کے نقطہ نظر سے آج کا معاشی نظام جو سود کی جکڑ بندیوں میں محصور ہے صرف ایک فرد ایک قوم ملک ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اقتصادی استحکام اور بنی نوع انسان کی معاشی خوشحالی کا ضامن ہے وہ بڑے بڑے سرمایہ دار ملک جنہوں نے سود کی شکل میں غریب قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادیات ومعاشیات کی روح کھینچ کر ان کو دنیا کا گرویدہ بنا دیا ہے ان دیوانوں کی نظر میں بنی نوع انسان کی معاشی فلاح و بہبود اور ان کے اقتصادی اطمینان کے واحد سہارے ہیں یہ لوگ

اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ سرمایہ دار طاقتوں نے غریب ملکوں اور اقتصادی بدحالی کی شکار قوموں کے لیے اپنے خزانوں کے جو منہ کھول رکھے ہیں وہ درحقیقت عالمی بھائی چارگی اور بین الاقوامی اقتصادی خوشحالی کے تئیں ان کے حقیقی جذبات ایثار و ہمدردی کا مظہر ہیں حالانکہ اگر ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آجائیگی کہ یہ سب کچھ اسی ہوس وعیاری کا ترقی یافتہ راستہ ہے جس پر چل کر پہلے تو ایک انسان نے دوسرا انسان کا خون چوسا ہے اور اب اسی راستہ پر گامزن ایک قوم اور ایک ملک دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں کا خون چوس رہے ہیں بس فرق اتنا ہی ہے کہ پہلے ایک فرد یا ایک طبقہ سود کی اقتصادی تباہ کاری کا شکار ہوا کرتا تھا اور اسے محسوس بھی کرتا تھا لیکن آج پورے پورے ملک اور پوری پوری قومیں سود کی اقتصادی تباہ کاری کا غیر محسوس طور پر شکار ہو کر اپنے باوقار وجود کو سود خوروں کے پاس رہن رکھ چکی ہیں۔ جن دانشوروں کی نظر دنیا کے ان اقتصادی منصوبوں پر ہے جن کے تحت سرمایہ دار ممالک پسماندہ قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کو ہر سال اربوں ڈالروں کے امدادی قرض دیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ممالک کس طرح سودی شکل میں ان غریب ملکوں کی اقتصادی دولت کو دونوں ہاتھو سے لوٹ کر اپنے ملک کے خزانے بھر رہے ہیں۔ اس حقیقت سے کون باخبر اور باہوش انسان انکار کر سکتا ہے کہ ان سود خور ملکوں کی سود خوری نے دنیا کے ان تمام غریب ملکوں کے اقتصادی نظام میں جو شومی قسمت سے اپنے وسائل اور اپنے دست وبازو کی قوت محنت پر بھروسہ نہ کر کے سرمایہ دار ملکوں کے جال فریب میں پھنس گئے ہیں غربت وافلاس اور مالی بدحالی کا ایسا زہر گھول دیا ہے کہ ان تمام تر معاشی ڈھانچہ اپنی جگہ چھوڑ چکا ہے اور اقتصادی موت کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اس صورت حال نے دنیا کے امن و

سکون کو بھی متزلزل کر کے رکھ دیا ہے آج آپ کو کتنے ہی ایسے ملک نظر آئیں گے جو ان کی سیاسی اور ملکی پالیسیوں کی بھینٹ پڑھ گئے ہیں کہ ان کی اقتصادی زندگی کا تمام دارومدار انھیں سود خوروں کے امدادی اور سودی قرضوں پر ہے ان مسائل کا حل چونکہ ان کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کے خلاف ہے اس لیے وہ ان کو دنیا پر اس طرح معلق کئے ہوئے کہ آج ان کی وجہ سے قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک اپنی داخلی بے چینیوں بے اطمینانیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو کر موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہیں اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آج پوری دنیا پر سیاسی بے اطمینانی اور اقتصادی بے چینی کا جو مہیب بادل چھایا ہوا ہے وہ دراصل سود خوروں کا مسلط کیا ہوا ہے جس سے کوندنے والی برق کسی بھی لمحہ بنی نوع انسان کے پورے وجود کو بھسم کرسکتی ہے۔

سود کے بارے میں ایک شبہ اور اس کا جواب

بعض پڑھے لکھے لوگ اس شبہ میں بھی مبتلا ہیں کہ قرآن کریم نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے وہ ایک خاص قسم کا ربا تھا جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا کہ کوئی غریب مصیبت زدہ شخص اپنی مصیبت دور کرنے کے لیے کسی سے قرض لے لیتا تھا اور قرض خواہ اس پر ایک متعین نفع سود لیا کرتا تھا یہ بیشک ایک سنگدلی کی بات تھی کہ کوئی شخص کسی کی مصیبت میں اس کی مدد کرنے کی بجائے الٹا اس کی مصیبت سے فائدہ اٹھائے۔ قرآن نے سود کی اس صورت کو حرام قرار دیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حرمت کا اطلاق آج کے زمانہ میں بھی سود کی اس صورت پر ہوسکتا ہے جو مہاجنوں اور دوسرے سود خوروں کے ہاں شخصی اور انفرادی طور پر رائج ہے کہ کوئی ضرورت مند وغریب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے خواہ کوئی چیز رہن وگروی رکھ کر یا

اور کسی اعتماد پر ان سے قرض لیتا ہے اور اس پر حسب شرط وتعیین سود ادا کرتا ہے لیکن آجکل تجارتوں بینکوں کمپنیوں اور اجتماعی اداروں کے ذریعہ جو سودی کاروبار ہوتا ہے اس کی صورت بالکل مختلف ہے جس کی وجہ سے اب سود دینے والے مصیبت زدہ لوگ نہیں رہے بلکہ متمول اور سرمایہ دار تجار ہیں جو غریبوں سے سود لینے کی بجائے خود ان کو دیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس صورت میں غریبوں کا ہی فائدہ ہے کہ بہت سے قلیل سرمایہ والے لوگ مذکورہ بالا ذرائع سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں لہٰذا موجودہ دور کے تجارتی سود پر حرمت کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے جواب کے سلسلے میں پہلے تو ایک بنیادی بات یہ جان لین چاہیے کہ شریعت کے کسی بھی حکم کا تعلق اصول اور کلیہ سے ہوتا ہے جزئیات اور اقسام کے اختلاف سے اس حکم کے نفاذ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ شریعت نے جس چیز کو اصولی طور پر حرام قرار دیا ہے وہ چیز اپنے تمام اجزاء اور اپنی تمام اقسام کے ساتھ حرام ہوگی یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس چیز کے کسی جزء یا کسی قسم کو محض اپنے خیال سے مستثنیٰ کر دے یا اس حکم کے اطلاق کو بلا کسی شرعی دلیل کے مقید ومحدود کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ اس حرمت کا تعلق اس شراب سے ہے جو پہلے زمانہ میں خراب قسم کے برتنوں میں سڑا کر بنائی جاتی تھی اب تو چونکہ صفائی ستھرائی کا بڑا اہتمام ہے مشینوں کے ذریعے سب کام ہوتا ہے اعلی درجہ کی شرابیں بنتی ہیں لہٰذا موجودہ دور کی شراب پر حرمت کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے تو ظاہر ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلامی شریعت کا ذرا سا بھی علم نہ رکھتا ہے یا اسلامی شریعت کے مزاج سے قطعاً ناواقف ہو۔ اس کے علاوہ اس پر بھی غور کیجئے کہ اس طرح احکام قرآن کو اپنے خیالات کے تابع کرنے کا دروازہ کھل جائے تو پھر کس چیز کی حرمت باقی رہ جائے گی قمار جوا چوری ڈاکہ زنا فواحش ان میں سے کون سی

برائی ایسی ہے جس کی موجودہ صورت پہلے زمانہ کی صورت سے مختلف نہیں ہے اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ان سبھی برائیوں کو جائز کہنا پڑے گا لہٰذا جب محض چولہ بدلنے سے کسی شخص کی حقیقت نہیں بدلا کرتی تو کوئی بھی برائی خواہ وہ کتنی صورت اختیار کرے اس کا حکم بھی کسی حال میں نہیں بدلے گا۔اس بات کو سمجھ لینے کے بعد اب ربا کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں ربا کی مخالفت کا ذکر ایک جگہ نہیں مختلف سورتوں کی کئی آیتوں میں آیا ہے اور چالیس سے زائد احادیث میں مختلف عنوان سے اس کی حرمت بیان کی گئی ہے ان میں سے کسی ایک جگہ کسی ایک لفظ میں بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ حرمت کا یہ حکم کسی خاص صورت یا کسی خاص مصلحت کے پیش نظر ہے۔حرمت ربا کی کسی بھی آیت یا کسی بھی حدیث سے یہ اشارہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حرمت صرف اس ربا کی ہے جو شخصی اغراض کے لیے لیا دیا جاتا تھا تجارتی سود اس سے مستثنیٰ ہے بلکہ اگر اس مسئلہ پر تاریخی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرے سے یہ خیال ہی غلط ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں سود کی صرف یہی صورت رائج تھی کہ کوئی مصیبت زدہ شخص یا غریب آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لے سود پر قرض کا معاملہ کرتا تھا اور تجارتی معاملات کے لیے سود پر روپیہ لینے دینے کا رواج نہیں تھا بلکہ آیات ربا کا شان نزول دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت ربا جب نزول ہوا ہے تو اس وقت شخصی اغراض کے لیے سودی لین دین کے علاوہ تجارتی معاملات کے لیے بھی سود کا لین دین رائج تھا کیونکہ عرب اور بالخصوص قریش تجارت پیشہ لوگ تھے جو تجارتی اغراض ہی کے لیے سود کا لین دین کرتے تھے چنانچہ حضرت عباس اور حضرت خالد بن ولید کے بارے میں امام بغوی نے لکھا ہے کہ یہ دونوں شرکت میں کاروبار کرتے تھے اور ان کا لین دین طائف کے بنو ثقیف کے ساتھ تھا۔حضرت عباس کی ایک بڑی رقم سود کے طور

پر بنوثقیف کے ذمہ واجب الادا تھی انھوں نے بنوثقیف سے اپنی سابقہ رقم کا مطالبہ کیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن کے اس حکم کے تحت کہ ربا حرام قرار دیدیا گیا ہے اپنے چچا حضرت عباس کو سود کی اپنی اتنی بڑی رقم چھوڑ دینے کا حکم دیدیا جس کا اعلان آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی یوں فرمایا حدیث (وربا الجاہلیۃ موضوع واول ربا اضع من ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب) زمانہ جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا ہے اور سب سے پہلا سود جسے میں اپنے سودوں میں سے چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے اس کے علاوہ اور بہت سے ایسے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ کے ساتھ اور ایک خاندان کے ساتھ سودی لین دین تھا پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ جن قبائل یا خاندان کے باہمی سودی لین دین کا ذکر منقول ہے وہ کسی فوری ضرورت یا مصیبت کے تحت قرض لینے کی حیثیت سے نہیں تھا بلکہ اس انداز ے سے تھا کہ ان کے درمیان یہ لین دین کاروباری اور تجارتی حیثیت سے مسلسل جاری تھا جیسے ایک تاجر سے یا ایک کمپنی دوسری کمپنی سے معاملہ کیا کرتی ہے بلکہ سودی کاروبار کرنے والے لوگ ربا کو بھی ایک قسم کی تجارت ہی سمجھا کرتے تھے جس کی تردید قرآن کو کرنی پڑی اور خرید وفروخت کے معاملات کو سود ہی کی ایک قسم سمجھنے والوں کے لیے سخت تہدید ووعید نازل ہوئی۔ اب رہی یہ بات کہ بینکوں کے سودی کاروبار سے غریب عوام کا نفع ہے کہ انھیں اپنی رقموں پر کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے تو یاد رکھئے کہ یہی وہ حسین فریب ہے جس کی بنیاد پر یورپین اقوام نے سود جیسی بدیہی اور ہمیشہ کی مسلم لعنت کو کاروبار کا ایک خوب صورت جام پہنایا اور عوام نے اس فریب میں مبتلا ہو کر سود کے چند ٹکوں کے لالچ میں اپنی پونجی کو بینکوں کے حوالہ کر دیا اس طرح پوری قوم کا سرمایہ سمٹ

کر بینکوں میں آگیا اور ادھر اس سرمایہ کو بڑے بڑے تاجروں اور بیوپاریوں نے بینکوں سے بطور قرض لے کر اپنے اپنے کاروبار کو وسعت دی اور اس سے جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا اس میں سے چند ٹکے بینکوں کو دے کر باقی سب اپنی تجوریوں میں بھر لیا بینک والوں نے ان ٹکوں میں کچھ حصہ پوری قوم کے ان لوگوں کو بانٹ دیا جنہوں نے اپنی پونجی بینک کے حوالہ کی تھی اس طرح سرمایہ دار نے تو اپنے دس ہار روپیہ سے ایک لاکھ روپیہ کما لیا اور بے چارے غریبوں کے حصہ میں کیا آیا صرف چند ٹکے اب بتائیے کہ ان بینکوں سے بھی اصل فائدہ کسے حاصل ہوا ہے؟ سرمایہ دار کو یا غریب کو؟ فریب خوردہ غریب تو اس متوقع فائدہ سے بھی محروم رہا جو وہ اپنی پونجی کو بینک کے حوالے کر دینے کی بجائے کسی چھوٹی موٹی تجارت میں لگا دینے حاصل کرتا اسے تو اتنی بھی سہولت نہ ملی کہ وہ بینک سے کوئی بڑی رقم قرض لے کر کاروبار کر سکتا کیونکہ بینک تو کسی غریب کو پیسہ دینے سے رہا وہ تو بڑے بڑے سرمایہ داروں اور ساکھ والوں کو قرض دیتا ہے لیکن اس کے برخلاف سرمایہ دار نے بینک سے کیا فائدہ حاصل کیا اس نے بینک سے بڑی بڑی رقمیں قرض کے نام پر لیں ان رقموں سے تجارت وصنعت کی بڑی بڑی منڈیوں پر اپنا اجارہ جمایا اور ہر قسم کے کاروبار پر قابض ہو گیا کسی کم سرمایہ والے کو مقابلہ ومسابے ذریعہ تجارت کے کسی میدان میں جمنے نہیں دیا اور انجام کار تجارت کا کاروبار جو پوری قوم کے لیے فائدہ مند اور ترقی کا ذریعہ تھا چند مخصوص لوگوں میں محدود ہو کر رہ گیا اور پھر آخر میں جا کر اس سودی کاروبار کی تان غریبوں ہی پر اس طرح ٹوٹی کہ جب تجارت کے اڈوں پر مخصوص سرمایہ دار ناگ بن کر بیٹھ گئے تو اشیاء کے نرخ بھی ان کے رحم وکرم پر رہ گئے جس کا نتیجہ وہ ہے جو آج ہر جگہ سامنے آ رہا ہے کہ سامان معیشت میں روز بروز گرانی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اشیاء کی قیمتیں اس طرح چڑھ رہی

ہیں کہ حکومتوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود قابو میں نہیں آرہی ہیں اور انجام کا فریب خود وہ عوام کو سود کے نام پر جو چند ٹکے ملے تھے ان کے تنیجہ میں سامان معیشت دوگنی تگنی قیمتوں تک پہنچا تو ان غریبوں کی جیب سے سود کے وہ چند ٹکے کچھ اور سود لے کر نکل گئے اور پھر لوٹ پھر کر انھیں سرمایہ داروں کی جیب میں پہنچ گئے لہٰذا بینکوں اور تجارتی اداروں کے سودی کاروبار کے اس فریب کا پردہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سودی کاروبار کا عام نتیجہ کسی بھی طرح غریبوں کے حق میں مفید نہیں ہوتا بلکہ یہ درحقیقت پوری قوم کی غربت و افلاس اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ کا ذریعہ ہے اور یہی وہ معاشی بے اعتدالی اور اقتصادی تباہ کاری ہے جو پوری قوم اور پورے ملک کی تباہی کا سبب بنتی ہے اس لیے اسلام نے سود کے ہر طریقہ اور ہر ذریعہ پر قدغن لگائی ہے خواہ وہ انفرادی و شخص اغراض کے لیے قرض لینے کی صورت میں ہو یا اجتماعی تجارت اور بینکوں کے کاروبار کی شکل میں کیونکہ دونوں ہی صورتوں میں غریب کا خون سودخوروں کی غذا بنتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا معراج کی رات میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے پیٹ گھروں مکانوں کی مانند بڑے بڑے تھے اور ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے بھی نظر آرہے تھے میں نے انھیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ جبرائیل (علیہ السلام) سے پوچھا کہ جبرائیل یہ کون لوگ ہیں انھوں بتایا کہ یہ سود خور ہیں (احمد ابن ماجہ)

ہم جنس اشیاء کے باہمی تبادلہ وتجارت میں ربا کی صورت

حدیث؛

وعن عبادة بن الصامت قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد". رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سونا سونے کے بدلے اور چاندی چاندی کے بدلے اور گیہوں گیہوں کے بدلے اور جو جو کے بدلے اور نمک نمک کے بدلے اگر لیا دیا جائے تو ان کا لین دین (مقدار) میں مثل بمثل یعنی برابر سرابر و دست بدست ہونا چاہئے اگر یہ قسمیں مختلف ہوں مثلاً گیہوں کا تبادلہ جو کے ساتھ یا جو کا تبادلہ کھجور کے ساتھ ہو تو پھر اجازت ہے کہ جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو (یعنی برابر سرابر ہونا ضروری نہیں ہے) البتہ لین دین کا دست بدست ہونا (اس صورت میں بھی) ضروری ہے (مسلم)

تشریح :

یہی وہ حدیث ہے جس نے ربا کے مفہوم کو وسعت دے کر خرید و فروخت اور لین دین کے بعض معاملات کو ربا اور سود قرار دیا ہے چنانچہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان کا باہمی تبادلہ یا ان کی باہمی خرید و فروخت کی جائے تو یہ ضروری ہے کہ لین دین برابر سرابر بھی ہو اور دست بدست بھی ہو برابر سرابر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اپنا

گیہوں بطور تبادلہ بیع دے تو اس سے اتنا ہی گیہوں لے جتنا خود دے دست بدست کا مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں معاملہ طے ہو اس مجلس میں دونوں فریق اپنا اپنا حق ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لیں یہ نہ ہونا چاہیے کہ ایک فریق تو نقد دے اور دوسرا یہ وعدہ کرے کہ میں بعد میں دے دوں گا اگر اس حکم کے برخلاف ہوگا کہ یا لین دین برابر نہ ہو یا دست بدست نہ ہو تو اس صورت میں وہ معاملہ ربا یعنی سود کے حکم میں داخل ہو جائے گا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث میں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے آیا ربا کا حکم انہی چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ چیزیں بطور مثال کے بیان فرمائی گئی ہیں اور دوسری کچھ اشیاء بھی اس حکم میں داخل ہیں اور اگر دوسری اجناس بھی داخل ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے۔
چنانچہ ائمہ مجتہدین کا یہ فیصلہ ہے کہ حدیث میں جن چھ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہیں اور انھوں نے اپنے اجتہاد سے کچھ اور چیزوں مثلاً لوہے چونے اور دیگر اجناس کو ان چھ چیزوں پر قیاس کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک ضابطہ بنانے کے لیے ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد سے ان چھ چیزوں میں ربا کی علت الگ الگ متعین کی ہے جس کی تفصیل یہ ہے:
حضرت امام مالک کے نزدیک ان چھ چیزوں میں سے سونے اور چاندی میں ربا کی علت تو ثمنیت (یعنی کسی چیز کی قیمت ہونے کی صلاحیت) ہے اور باقی چار چیزوں میں ربا کی علت قوت مذخر (یعنی محفوظ رہنے والی غذا) ہونا ہے اس اعتبار سے ان چھ چیزوں کے علاوہ بھی جن چیزوں میں ثمنیت پائی جائے گی یا جو چیزیں قوت مذخر ہوں گی ان سب میں ربا حرام ہوگا لہٰذا حضرت امام مالک کے مسلک میں ترکاریاں پھل اور کھانے کی ایسی اشیاء جو (کافی عرصے تک) محفوظ نہ رہ سکتی ہوں وہ چیزیں ہیں جن کے باہمی تبادلہ اور خرید وفروخت حضرت امام

شافعی کے نزدیک بھی سونے اور چاندی میں تو ربا کی علت ثمنیت ہےلیکن باقی چار چیزوں میں ربا کی علت محض قوت (یعنی صرف غذائیت) ہے۔لہٰذا ان کے مسلک میں ترکاریوں پھلوں اور ادویات کی چیزوں میں ربا کا حکم جاری ہوگا کہ ان چیزوں کے باہمی تبادلہ میں برابر سرابر لینا دینا تو جائز ہوگا مگر کمی بیشی کے ساتھ لین دین کرنا جائز نہیں ہوگا۔اسی طرح حضرت امام شافعی کے ہاں لوہا تانبا پیتل دھات چونا اور اسی قسم کی دوسری اشیاء وہ چیزیں ہیں جن کے باہم تبادلہ میں ربا کا حکم جاری نہیں ہوگا مثلاً ایک پیمانہ چونے کے بدلے میں دو پیمانے چونے کا لینا دینا درست ہے اسی طرح ایک سیر لوہے یا ایک سیر تانبے کے بدلے میں دو سیر لوہا یا دو سیر تانبا لینا دینا جائز ہے۔حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے ہاں اصولی طور پر ربا کی علت قدر مع الجنس ہے اس اعتبار سے حنفی مسلک میں سونے اور چاندی میں ربا کی علت چونکہ مکیل ہے اس لیے ہر اس چیز کے باہمی لین دین میں ربا کا حکم جاری ہوگا جو مکیل (یعنی پیمانے کے ذریعے لی دی جانیوالی) ہو جیسے چونا وغیرہ اور یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ شریعت نے جس چیز کے مکیل یا موزون ہونے کا حکم صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اس میں تبدیلی روا نہیں ہے مثلاً سونے اور چاندی کو شریعت نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جو وزن کے ذریعے لی دی جاتی ہیں اس لیے یہ دونوں موزون کے حکم میں ہیں اگرچہ عام رواج اس کے برخلاف ہو اسی طرح گیہوں جو کھجور اور نمک کو شریعت نے ان چیزوں میں شمار کیا ہے جو کیل یعنی پیمانے کے ذریعے لی دی جاتی ہیں اس لیے یہ چیزیں مکیل کے حکم میں ہیں اگرچہ عام رواج اس کے برخلاف ہو لہٰذا سونے یا چاندی کے باہم لین دین کے جائز ہونے میں وزن اور کیل ہی کا اعتبار ہوگا کہ اگر سونے کو سونے کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے لیا دیا جائے تو وزن کا برابر سرابر ہونا

ضروری ہے وزن میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہوگی اسی طرح باقی چار چیزوں کے باہم لین دین کے جائز ہونے میں کیل کا اعتبار ہوگا کیونکہ اگر چہ عام رواج کے مطابق ان چیزوں کا لین دین وزن کے ذریعے ہوتا ہے لیکن شرعی طور پر یہ چیزیں مکیل ہی کے حکم میں ہوں گی۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی کو ایک من گیہوں کے بدلے میں ایک ہی من گیہوں دے تو تو یہ لین دین جائز نہ ہوگا تاوقتیکہ دونوں طرف کے گیہوں پیمانے کے اعتبار سے برابر سرابر نہ ہوں (لیکن یہ بات بھی پہلے صاف کی جا چکی ہے کہ حنفیہ میں حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک مطلقاً ہر چیز کے مکیل یا موزون ہونے میں عام رواج کا اعتبار ہے اور حنفیہ کے ہاں اس پر عمل ہے) جو کھجور اور نمک کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں جس چیز کا موزون یا مکیل ہونا شریعت نے صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے اس کے بارے میں عام رواج ہی کا اعتبار ہوگا کہ اگر وہ چیز عام رواج کے مطابق وزن کے ذریعے لی دی جاتی ہوگی تو وہ شرعی طور پر بھی موزون ہی کے حکم میں ہوگی کہ اس کے باہم لین دین میں وزن کا برابر سرابر ہونا ضروری ہوگا۔ اس لیے لوہا اور تانبا چونکہ عام رواج کے مطابق وزن کے ذریعے لیا دیا جاتا ہے اس لیے ان کے باہم لین دین میں وزن کا برابر سرابر ہونا ضروری ہے اگر وزن میں کمی بیشی ہوگی تو یہ ربا کے حکم میں داخل ہوگا۔

نکاح کا بیان

نکاح کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا لیکن اس لفظ کا اطلاق مجامعت کرنے اور عقد کے معنی پر بھی ہوتا ہے کیونکہ مجامعت اور عقد دونوں ہی میں جمع ہونا اور ملنا پایا جاتا ہے لہٰذا اصول فقہ میں نکاح کے یہی معنی یعنی جمع ہونا بمعنی مجامعت کرنا مراد لینا چاہیے بشرطیکہ ایسا کوئی قرینہ نہ ہو جو اس معنی کے خلاف دلالت کرتا ہو۔ علماء فقہ کی اصطلاح میں نکاح اس خاص عقد و معاہدہ کو کہتے ہیں جو مرد و عورت کے درمیان ہوتا ہے اور جس سے دونوں کے درمیان زوجیت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے نکاح کی اہمیت نکاح یعنی شادی صرف دو افراد کا ایک سماجی بندھن، ایک شخصی ضرورت، ایک طبعی خواہش اور صرف ایک ذاتی معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ معاشرہ انسانی کے وجود و بقاء کا ایک بنیادی ستون بھی ہے اور شرعی نقطہ نظر سے ایک خاص اہمیت و فضیلت کا حامل بھی ہے۔

نکاح کی اہمیت اور اس کی بنیادی ضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے وقت سے شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک کوئی ایسی شریعت نہیں گزری ہے جو نکاح سے خالی رہی ہو اسی لیے علماء لکھتے ہیں کہ ایسی کوئی عبادت نہیں ہے جو حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر اب تک مشروع ہو اور جنت میں بھی باقی رہے سوائے نکاح اور ایمان کے چنانچہ ہر شریعت میں مرد و عورت کا اجتماع ایک خاص معاہدہ کے تحت مشروع رہا ہے اور بغیر اس معاہدہ کے مرد و عورت کا باہمی اجتماع کسی بھی شریعت و مذہب نے جائز قرار نہیں دیا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس معاہدہ کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور اس کے شرائط و احکام میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں اسلام نے جو شرائط مقرر کی ہیں جو احکام نافذ کئے ہیں اور جو قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں اس باب سے ان کی ابتداء ہو رہی

ہے۔نکاح کےفوائدوآفات نکاح کاجہاں سب سے بڑاعمومی فائدہ نسل انسانی کابقاءاور باہم توالد وتناسل کا جاری رہنا ہے وہیں اس میں کچھ مخصوص فائدے اور بھی ہیں جن کو پانچ نمبروں میں اس طرح بیان کیاجاسکتا ہے۔- 1 نکاح کرلینے سے ہیجان کم ہوجاتا ہے یہ جنسی ہیجان انسان کی اخلاقی زندگی کاایک ہلاکت خیز مرحلہ ہوتا ہے جواپنے سکون کی خاطر مذہب واخلاق ہی کی نہیں شرافت و انسانیت کی بھی ساری پابندیاں توڑ ڈالنے سے گریز نہیں کرتا،مگر جب اس کو جائز ذرائع سے سکون مل جاتا ہے تو پھر یہ پابند اعتدال ہوجاتا ہے اورظاہر ہے کہ جائز ذریعہ صرف نکاح ہی ہوسکتا ہے۔- 2 نکاح کرنے سے اپنا گھر بستا ہے خانہ داری کا آرام ملتا ہے گھریلو زندگی میں سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے اورگھریلو زندگی کے اس اطمینان وسکون کے ذریعہ حیات انسانی کوفکر وعمل کے ہر موڑ پر سہارا ملتا ہے۔- 3 نکاح کے ذریعہ سے کنبہ بڑھتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کومضبوط وزبردست محسوس کرتا ہے اورمعاشرہ میں اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے اپنا رعب داب قائم رکھتا ہے۔- 4 نکاح کرنے سے نفس مجاہدہ کاعادی ہوتا ہے کیونکہ گھربار اوراہل وعیال کی خبرگیری ونگہداشت اوران کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں جدو جہد کرنا پڑتی ہے اس مسلسل جدو جہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بے عملی اورلاپرواہی کی زندگی سے دور رہتا ہے جواس کے لیے دنیاوی طور پر بھی نفع بخش ہے اوراس کیوجہ سے وہ دینی زندگی یعنی عبادات وطاعات میں بھی چاق و چوبند رہتا ہے۔- 5 نکاح ہی کے ذریعہ صالح ونیک بخت اولاد پیدا ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ کسی شخص کی زندگی کاسب سے گراں مایہ سرمایہ اس کی صالح اورنیک اولاد ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہ صرف دنیا میں سکون و اطمینان اورعزت ونیک نامی کی دولت حاصل کرتا ہے بلکہ اخروی طور پر بھی فلاح

وسعادت کا حصہ دار بنتا ہے۔ یہ تو نکاح کے فائدے تھے لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو نکاح کی وجہ سے بعض لوگوں کے لیے نقصان وتکلیف کا باعث بن جاتی ہیں اور جنہیں نکاح کی آفات کہا جاتا ہے چنانچہ ان کو بھی چھ نمبروں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔۔ 1 طلب حلال سے عاجز ہونا یعنی نکاح کرنے کی وجہ سے چونکہ گھر بار کی ضروریات لاحق ہو جاتی ہیں اور طرح طرح کے فکر دامن گیر رہتے ہیں اس لیے عام طور پر طلب حلال میں وہ ذوق باقی نہیں رہتا جو ایک مجرد و تنہا زندگی میں رہتا ہے۔۔ 2 حرام امور میں زیادتی ہونا یعنی جب بیوی کے آجانے اور بال بچوں کے ہو جانے کی وجہ سے ضروریات زندگی بڑھ جاتی ہیں تو بسا اوقات اپنی زندگی کا وجود معیار برقرار رکھنے کے لیے حرام امور کے ارتکاب تک سے گریز نہیں کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ذہن وعمل سے حلال وحرام کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے اور بلا جھجک حرام چیزوں کو اختیار کرلیا جاتا ہے۔۔ 3 عورتوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونا۔ اسلام نے عورتوں کو جو بلند وبالا حقوق عطا کئے ہیں ان میں بیوی کے ساتھ اچھے سلوک اور حسن معاشرت کا ایک خاص درجہ ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں جو بیوی کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوں بلکہ بدقسمتی سے چونکہ بیوی کو زیردست سمجھ لیا جاتا ہے اس لیے عورتوں کے حقوق کی پامالی اور ان کے ساتھ برے سلوک وبرتاؤ بھی ایک ذاتی معاملہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حالانکہ یہ چیز ایک انسانی اور معاشرتی بداخلاقی ہی نہیں ہے بلکہ شرعی طور پر بھی بڑے گناہ کی حامل ہے اور اس سے دین ودنیا دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔۔ 4 عورتوں کی بدمزاجی پر صبر نہ کرنا عام طور پر شوہر چونکہ اپنے آپ کو بیوی سے برتر سمجھتا ہے اس لیے اگر بیوی کی طرف سے ذرا سی بھی بدمزاجی ہوئی تو ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے فوراً چھوٹ جاتا ہے۔۔ 5 عورت کی ذات

سے تکلیف اٹھانا بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی بدمزاجی و بداخلاقی کی وجہ سے اپنے شوہروں کے لیے تکلیف و پریشانی کا ایک مستقل سبب بن جاتی ہیں اس کی وجہ سے گھریلو ماحول غیر خوشگوار اور زندگی غیر مطمئن و اضطراب انگیز بن جاتی ہے۔ 6 بیوی بچوں کی وجہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی سے باز رہنا یعنی ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جو اپنی گھریلو زندگی کے استحکام اور بیوی بچوں کے ساتھ حسن معاشرت کے ساتھ ساتھ اپنی دینی زندگی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوں جب کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بیوی بچوں اور گھربار کے ہنگاموں اور مصروفیتوں میں پڑ کر دینی زندگی مضمحل و بے عمل ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عبادات وطاعات کا خیال رہتا ہے نہ حقوق اللہ کی ادائیگی پورے طور پر ہو پاتی ہے۔ نکاح کے ان فوائد وآفات کو سامنے رکھ کر اب یہ سمجھئے کہ اگر یہ دونوں مقابل ہوں یعنی فوائد وآفات برابر، برابر ہوں، تو جس چیز سے دین کی باتوں میں زیادتی ہوتی ہو اسے ترجیح دی جائے مثلا ایک طرف تو نکاح کا یہ فائدہ ہو کہ اس کی وجہ سے جنسی ہیجان کم ہوتا ہے اور دوسری طرف نکاح کرنے سے یہ دینی نقصان سامنے ہو کہ عورت کی بدمزاجی پر صبر نہیں ہو سکے گا تو اس صورت میں نکاح کرنے ہی کو ترجیح دی جائے کیونکہ اگر نکاح نہیں کرے گا تو زنا میں مبتلا ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ چیز عورت کی بدمزاجی پر صبر نہ کرنے سے کہیں زیادہ دینی نقصان کا باعث ہے۔ نکاح کے احکام- 1 حنفی مسلک کے مطابق نکاح کرنا اس صورت میں فرض ہوتا ہے جب کہ جنسی ہیجان اس درجہ غالب ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا میں مبتلا ہو جانے کا یقین ہو اور بیوی کے مہر پر اور اس کے نفقہ پر قدرت حاصل نہ ہو اور یہ خوف نہ ہو کہ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بجائے اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا برتاؤ ہوگا۔- 2 نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہو جاتا ہے جب کہ جنسی ہیجان کا

غلبہ ہو مگر اس درجہ کا غلبہ نہ ہو کہ زنا میں مبتلا ہو جانے کا یقین ہو، نیز مہر و نفقہ کی ادائیگی کی قدرت رکھتا ہو اور بیوی پر ظلم کرنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی شخص پر جنسی ہیجان کا غلبہ تو ہو مگر وہ مہر اور بیوی کے اخراجات کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو ایسی صورت میں اگر وہ نکاح نہ کرے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا جب کہ مہر اور نفقہ پر قادر شخص جنسی ہیجان کی صورت میں نکاح نہ کرنے سے گناہ گار ہوتا ہے۔ 3- اعتدال کی حالت میں نکاح کرنا سنت موکدہ ہے اعتدال کی حالت سے مراد یہ ہے کہ جنسی ہیجان کا غلبہ تو نہ ہو لیکن بیوی کے ساتھ مباشرت و مجامعت کی قدرت رکھتا ہو اور مہر و نفقہ کی ادائیگی پر بھی قادر ہو۔ لہٰذا اس صورت میں نکاح نہ کرنے والا گناہ گار ہوتا ہے جب کہ زنا سے بچنے اور افزائش نسل کی نیت کے ساتھ نکاح کرنے والا اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے۔ 4- نکاح کرنا اس صورت میں مکروہ ہے جب کہ بیوی پر ظلم کرنے کا خوف ہو یعنی اگر کسی شخص کو اس بات کا خوف ہو کہ میرا مزاج چونکہ بہت برا اور سخت ہے اس لیے میں بیوی پر ظلم و زیادتی کروں گا تو ایسی صورت میں نکاح کرنا مکروہ ہے۔ 5- نکاح کرنا اس صورت میں حرام ہے جبکہ بیوی پر ظلم کرنے کا یقین ہو یعنی اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ میں اپنے مزاج کی سختی و تندی کی وجہ سے بیوی کے ساتھ اچھا سلوک قطعاً نہیں کر سکتا بلکہ اس پر میری طرف سے ظلم ہونا بالکل یقینی چیز ہے تو ایسی صورت میں نکاح کرنا اس کے لیے حرام ہوگا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت نے نکاح کے بارے میں مختلف حالات کی رعایت رکھی ہے بعض صورتوں میں تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے بعض میں واجب اور بعض میں سنت موکدہ ہوتا ہے جب کہ بعض صورتوں میں نکاح کرنا مکروہ بھی ہوتا ہے اور بعض میں تو حرام ہو جاتا ہے لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اسی صورت کے مطابق عمل کرے جو اس کی حالت کے مطابق ہو۔ نکاح کے مستحبات جب کوئی شخص نکاح

کرنا چاہے خوہ مرد ہو یا عورت تو چاہیے کہ نکاح کا پیغام دینے سے پہلے ایک دوسرے کے حالات کی اور عادات واطوار کی خوب اچھی طرح جستجو کرلی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی ایسی چیز معلوم ہو جو طبیعت و مزاج کے خلاف ہو نیکی وجہ سے زوجین کے درمیان ناچاقی وکشیدگی کا باعث بن جائے۔ یہ مستحب ہے کہ عمر، عزت، حسب اور مال میں بیوی خاوند سے کم ہو اور اخلاق و عادات خوش سلیقگی و آداب حسن و جمال اور تقوی میں خاوند سے زیادہ ہو اور مرد کے لیے یہ بھی مسنون ہے کہ وہ جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اس کو نکاح سے پہلے دیکھ لے بشرطیکہ یہ یقین ہو کہ میں اگر اس کو پیغام دوں گا تو منظور ہو جائے گا۔ مستحب ہے کہ نکاح کا اعلان کیا جائے گا اور نکاح کی مجلس اعلانیہ طور پر منعقد کی جائے جس میں دونوں طرف سے اعزہ و احباب نیز بعض علماء و صلحا بھی شریک۔ اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ نکاح پڑھانے والا نیک بخت و صالح ہو اور گواہ عادل و پرہیزگار ہوں۔ ایجاب و قبول اور ان کے صحیح ہونے کی شرائط نکاح ایجاب و قبول کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے اور ایجاب و قبول دونوں ماضی کے لفظ کے ساتھ ہونے چاہئیں (یعنی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس سے یہ بات سمجھی جائے کہ نکاح ہو چکا ہے) جیسے عورت یوں کہے کہ میں نے اپنے آپ کو تمہاری زوجیت میں دیا، یا عورت کا ولی، مرد سے یہ کہے کہ میں نے فلاں عورت کا جس کا نام یہ ہے، تمہارے ساتھ نکاح کیا اور اس کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے منظور کیا یا ایجاب میں سے کوئی ایک ماضی کے لفظ کے ساتھ ہو جیسے عورت یہ کہے کہ مجھ سے نکاح کرلو یا عورت کا ولی، مرد سے یہ کہے کہ فلاں عورت سے جس کا نام یہ ہے نکاح کرلو اور اس کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے نکاح کرلیا۔ یا اس کا برعکس ہو، جیسے مرد یہ کہے کہ میں نے تمہارے ساتھ اپنا نکاح کرلیا اور اس کے جواب میں عورت یہ کہے کہ میں منظور کرتی ہوں

اور اگر مرد، عورت سے یوں کہے کہ کیا تم نے اپنے آپ کو میری زوجیت میں دیا؟ یا کہے کہ کیا تم نے مجھے قبول کیا اور اس کے جواب میں عورت (ہاں میں نے دیا یا ہاں میں نے قبول کیا کہنے کی بجائے) صرف یہ کہے کہ ہاں دیا۔ یا ہاں قبول کیا (یعنی لفظ" میں" نہ کہے) تو اس صورت میں بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ البتہ گواہوں کے سامنے صرف یہ کہنے سے کہ ہم بیوی خاوند ہیں، نکاح نہیں ہوتا۔ جس طرح ایجاب و قبول میں ماضی کا لفظ استعمال کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ایجاب و قبول میں خاص کر نکاح اور تزوج کا لفظ استعمال کیا جائے مثلا یوں کہا جائے کہ میں نے تمہارے ساتھ نکاح کیا یا تمہارے ساتھ تزویج کیا۔ یا نکاح و تزویج کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جائے مثلا یوں کہا جائے کہ میں نے تمہارے ساتھ نکاح کیا یا تمہارے ساتھ تزویج کیا یا نکاح و تزویج کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جائے جو نکاح کا مطلب صراحۃ ادا کرتا ہو جیسے مرد یوں کہے کہ میں نے تمہیں اپنی بیوی بنالیا یا یوں کہے کہ میں تمہارا شوہر ہو گیا یا یوں کہے کہ تم میری ہو گئیں۔ اور نکاح و تزویج یا اس کا ہم معنی لفظ صراحۃً استعمال نہ کیا جائے بلکہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس سے کنیۃً نکاح کا مفہوم سمجھا جاتا ہو تو یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ وہ لفظ ایسا ہو جس کے ذریعہ سے کسی ذات کامل کی ملکیت فی الحال حاصل کی جاتی ہو جیسے ہبہ کا لفظ یا صدقہ کا لفظ یا تملیک کا لفظ یا بیع و شراء کا لفظ جیسے بیوی یوں کہے کہ میں نے اپنی زوجیت تمہیں ہبہ کر دی، یا میں نے اپنی ذات تمہیں بطور صدقہ دیدی یا میں نے تمہیں اپنی ذات کا مالک بنا دیا یا یوں کہے کہ میں نے تمہیں اس قدر روپیہ کے عوض خرید لیا اور ان سب کے جواب میں مرد یہ کہے کہ میں نے قبول کیا لیکن اس کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ متکلم نے اس لفظ سے نکاح مراد لیا ہو اور کوئی قرینہ اس پر دلالت کرتا ہو اور اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو قبول

کرنیوالے نے متکلم کی مراد کی تصدیق کردی ہو نیز گواہوں نے بھی سمجھ لیا ہو کہ اس لفظ سے مراد نکاح ہے خواہ انھوں نے کسی قرینہ سے سمجھا ہو یا بتادینے سے سمجھا ہو۔ ایجاب وقبول کے وقت عاقدین (دلہا دلہن) میں سے ہر ایک کے لیے دوسرے کا کلام سننا ضروری ہے خواہ وہ بالاصالۃ (یعنی خود) سنیں خواہ بالوکالۃ (یعنی ان کے وکیل سنیں) اور خواہ بالولایۃ سنیں (یعنی ان کا ولی سنے) ایجاب وقبول کے وقت دو گواہوں کی موجودگی نکاح صحیح ہونے کی شرط ہے اور یہ گواہ خواہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہو، گواہوں کا آزاد ہونا ضروری ہے لونڈی یا غلام گواہوں کی گواہی معتبر نہیں ہوگی، اسی طرح گواہوں کا عاقل اور مسلمان ہونا بھی ضروری ہے مسلمانوں کی گواہی ہر حال میں کافی ہوگی خواہ وہ پرہیزگار ہوں یا فاسق ہوں اور خواہ ان پر حد قذف لگائی جاچکی ہو۔ گواہوں کا بینا ہونا یا زوجین کا رشتہ دار نہ ہونا شرط نہیں ہے، چنانچہ اندھوں کی گواہی اور زوجین کے رشتہ داروں کی گواہی معتبر ہوگی خواہ وہ زوجین کے یا ان میں سے کسی ایک کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، گواہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں ایجاب وقبول کے الفاظ کو ایک ساتھ سنیں اور سن کر یہ سمجھ لیں کہ نکاح ہو رہا ہے گو ان الفاظ کے معنی نہ سمجھیں (مثلا ایجاب وقبول کسی ایسی زبان میں ہو جسے وہ نہ جانتے ہوں) اگر دونوں گواہ ایجاب وقبول کے الفاظ ایک ساتھ نہ سنیں بلکہ الگ الگ سنیں تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے کہا کہ میری فلاں نابالغ لڑکی کا نکاح فلاں شخص کے ساتھ کردو اور اس شخص نے اس لڑکی کا نکاح اس باپ اور ایک دوسرے مرد کی موجودگی میں کیا تو یہ جائز ہوگا لیکن اگر باپ موجود نہ ہو تو پھر دونوں مردوں یا ایک مرد اور عورتوں کی موجودگی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوگا۔

اعلانِ نکاح:

نکاح کا اعلان کرنا مستحب ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ نکاح کا اعلان کرو اگر چہ دف بجا کر ہی کیوں نہ اعلان کرنا پڑے، دف بجانے کے سلسلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں چنانچہ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ دف بجانا تو حرام ہے یا مطلقا مکروہ ہے اور بعض علماء نے اس کو مطلقا مباح کہا ہے زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ بعض مواقع پر جیسے عید کے دن کسی معزز مسافر و مہمان کے آنے کے وقت اور نکاح کے موقع پر دف بجانا مباح ہے ان کے علاوہ اور کسی بھی وقت اور کسی بھی موقعہ پر دف بجانا حرام ہے۔ خطبہ علماء نے اسے خ کے پیش کے ساتھ یعنی خطبہ بھی صحیح کہا ہے اور خ کے زیر کے ساتھ یعنی خطبہ کو بھی صحیح قرار دیا ہے دونوں میں فرق یہ ہے خطبہ سے مراد نکاح کا پیغام بھیجنا اور خطبہ اس خطبے کو کہتے ہیں جو نکاح میں پڑھایا جاتا ہے چنانچہ یہاں عنوان میں خطبہ سے مراد نکاح کا پیغام بھیجنا (کہ جسے منگنی کہتے ہیں) بھی ہوسکتا ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ یہاں خطبہ سے وہی مراد ہے جو نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک عقد نکاح کے وقت خطبہ پڑھنا مسنون ہے شوافع کے نزدیک بھی مسنون ہے لیکن ان کے ہاں عقد نکاح ہی نہیں بلکہ ہر عقد مثلا بیع و شراء وغیرہ کے وقت بھی خطبہ پڑھنا مسنون ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم و بدعات شرط سے مراد وہ شرطیں ہیں جو نکاح میں ذکر کی جائیں خواہ وہ فاسد ہوں یا صحیح ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ نکاح جیسا پاکیزہ معاملہ بھی غیر مسلموں کی ناپاک رسموں اور ملکی رواجوں سے محفوظ نہیں رہا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کی غیر شرعی رسمیں جس کثرت اور شدت کے ساتھ مسلمانوں کے شادی بیاہ کے معاملات میں داخل ہوگئی ہیں اس نے نکاح کے اسلامی اور مسنون طریقے کو بالکل ہی اوجھل کر دیا ہے اور اب تو جس قدر رسمیں رائج

ہیں یا پہلے رائج تھیں ان سب کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہوگیا ہے تاہم اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ رسموں اور بدعتوں کا ذکر کر دیا جائے تا کہ ان سے بچنے کی کوشش کی جائے۔حرام باجوں اور مزامیر کا استعمال کرنا، ناچ گانے اور قوالی کا انتظام کرنا، سہرا باندھنا، کٹھ پتلیوں کے کھیل جیسی لغویات کرانا، گھربار کی غیر معمولی اور اسراف کی حد تک زیبائش و آرائش کرنا جیسے دیواروں کو کپڑے سے ڈھانکنا گھوڑے پر سواری کرنا بارات لے کر بلا ضرورت شہر میں پھرنا دلہا کا شہر و آبادی کے مزارات پر جانا اور وہاں کچھ نقد چڑھا کر پھر برأت میں شامل ہو جانا، بارات کے ساتھ ڈھول باجا ہونا، یا گانے والوں کا اور گانے والیوں کو بارت میں شامل کرنا، آتش بازی کے ذریعہ اپنا مال ضائع کرنا اور بارات میں مردوں کے سامنے عورتوں کا جلوہ آرائی کرنا یہ سب چیزیں بہت سی برائی کی ہیں اور حرام ہیں۔اسی طرح یہ چیزیں بھی حرام ہیں مثلاً نکاح کی مجلس میں مستور چیزوں کو ظاہر کرنا دلہا کو ریشمی مسند پر بٹھانا، دلہا کی پگڑی کو ڈوری سے ناپنا اور پھر اس ڈوری کو ٹوٹکا کرنے والے یا ساحر کو دے دینا تا کہ وہ اس کے ذریعہ دلہا دلہن کے درمیان محبت کے لیے کوئی ٹوٹکا کر دے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا باراتیوں اور دلہا کے قرابت داروں کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کرنا اور ان کی بے جا خوشامد و چاپلوسی میں ایسی باتیں کرنا جو بالکل جھوٹی ہوں۔ایسے ہی یہ چیزیں بھی حرام ہیں : دلہا کا حریر یا زعفرانی رنگ کا یا کسبنا اور یا ریشمی کپڑا پہننا (مردوں کے لیے ایسے کپڑے شادی کے علاوہ بھی پہننے حرام ہیں) دلہا کے سر سے پگڑی اتار کر دلہن کے سر پر رکھ دینا، دلہا کا دلہن کے گرد سات بار چکر لگانا اجنبی عورتوں کا دلہا کے پاس آنا اور اسے ہاتھ لگانا یا اس کے ناک کان پکڑنا اور اس کے ساتھ بے حیائی کی باتیں کرنا دلہا کا انگوٹھا دودھ کے ذریعہ عورت سے دھلوانا

عورتوں کا دلہا کو شکر کھلانا اور دودھ پلانا مصری کی ڈلی دلہن کے بدن پر رکھ کر دلہا سے کہنا اسے اپنے منہ سے اٹھا لو اور خلوت میں جب دلہا دلہن جمع ہوں تو عورتوں کا انھیں گھیرے رہنا۔ یہ سب چیزیں بدعت اور حرام ہیں جن کا شریعت وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے ان سے اجتناب کرنا انتہائی ضروری ہے۔

جوانوں کو نکاح کرنے کا حکم

حدیث؛

عن عبد الله بن مسعود قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء"

ترجمہ؛

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اے جوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص مجامعت کے لوازمات (یعنی بیوی بچوں کا نفقہ اور مہر ادا کرنے) کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح کرنا نظر کو بہت چھپاتا ہے اور شرم گاہ کو بہت محفوظ رکھتا ہے (یعنی نکاح کر لینے سے اجنبی عورت کی طرف نظر مائل نہیں ہوتی اور انسان حرام کاری سے بچتا ہے) اور جو شخص جماع کے لوازمات کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ رکھنا اس کے لیے خصی کرنے کا فائدہ دے گا (یعنی جس طرح خصی ہوجانے سے جنسی ہیجان ختم ہوجاتا ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے بھی جنسی ہیجان ختم ہوجاتا ہے (بخاری ومسلم)

تشریح :

اس خطاب عام کے ذریعہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جوانوں کو نکاح کی ترغیب دلاتے ہوئے نکاح کے دو بڑے فائدے ظاہر فرمائے ہیں ایک تو یہ کہ انسان نکاح کرنے سے اجنبی عورتوں کی طرف نظر بازی سے بچتا ہے اور دوسری طرف حرام کاری سے محفوظ رہتا ہے۔ جوانی کی حد انسان بالغ ہونے کے بعد جوان کہلاتا ہے لیکن جوانی کی یہ حد کہاں تک ہے؟ اس میں اختلاف ہے چنانچہ امام شافعی کے نزدیک جوانی کی حد تیس برس کی عمر تک ہے جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ ایک انسان چالیس برس کی عمر تک جوان کہلانے کا مستحق رہتا ہے۔

دیندار عورت سے نکاح کرنا بہتر ہے

حدیث؛

وعن أبي هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"تنكح المرأة لأربع : لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك"

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی عورت سے نکاح کرنے کے بارے میں چار چیزوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اول اس کا مالدار ہونا دوم اس کا حسب نسب والی ہونا سوم اس کا حسین وجمیل ہونا اور چہارم اس کا دین دار ہونا لہٰذا دیندار عورت کو اپنا مطلوب قرار دو اور خاک آلودہ ہوں تیرے دونوں ہاتھ (بخاری ومسلم)

تشریح :

حسب ونسب والی سے مراد وہ عورت ہے جو نہ صرف اپنی ذات میں شرف و بلندی اور وجاہت رکھتی ہو بلکہ وہ جس خاندان وقبیلہ کی فرد ہو وہ خاندان وقبیلہ بھی عزت ووجاہت اور شرف و بلندی کا حامل ہو چنانچہ انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی عورت سے بیاہ کرے جو باحیثیت و باعزت خاندان وقبیلہ کی فرد ہو تاکہ اس عورت کی وجہ سے اپنی اولاد کے نسب میں شرف و بلندی کا امتیاز حاصل ہو۔ بہر کیف حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ عورت سے نکاح کرنے کے سلسلہ میں مذکورہ چار چیزوں کو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں کہ کوئی شخص تو مالدار عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ بعض لوگ اچھے حسب ونسب کی عورت کو بیوی بنانا پسند کرتے ہیں بہت سے لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک حسین وجمیل عورت ان کی رفیقہ حیات بنے اور کچھ نیک بندے دین دار عورت کو ترجیح دیتے ہیں لہٰذا دین ومذہب سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ دین دار عورت ہی کو اپنے نکاح کے لیے پسند کرے کیونکہ اس میں دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی سعادت ہے۔ اور خاک آلودہ ہوں تیرے دونوں ہاتھ ویسے تو یہ جملہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے ذلت وخواری اور ہلاکت کی بددعا کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہاں اس جملہ سے یہ بددعا مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد دین دار عورت کو اپنا مطلوب قرار دینے کی ترغیب دلانا ہے۔

اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہو

حدیث؛

وعن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "لا یخلون رجل بامرأۃ إلا کان ثالثھما

الشیطان". رواہ الترمذی

ترجمہ:

حضرت عمر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب بھی کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں یک جا ہوتا ہے تو وہاں ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے (ترمذی)

تشریح:

جب دو اجنبی مرد و عورت کہیں خلوت میں جمع ہوتے ہیں تو وہاں شیطان فوراً پہنچ جاتا ہے جو ان دونوں کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان پر جنسی ہیجان کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ بدکاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہذا حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تم کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں یکجا ہونے کا کوئی موقع ہی نہ آنے دو کہ شیطان تمہارے درمیان آجائے اور تمہیں برائی کے راستہ پر لگا دے۔

عورتوں میں مخنث (ہجڑا) کے آنے کی ممانعت:

حدیث:

عن أم سلمة :أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم كان عندها وفی البیت مخنث فقال: لعبد اللہ بن أبی أمیة أخی أم سلمة :یا عبد اللہ إن فتح اللہ لكم غدا الطائف فإنی أدلك علی ابنة غیلان فإنها تقبل بأربع وتدبر بثمان فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم :"لا یدخلن هؤلاء علیكم"

ام المومنین حضرت ام سلمہ (رض) سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے پاس تشریف فرما تھے اور گھر میں ایک مخنث بھی موجود تھا وہ مخنث حضرت عبداللہ بن امیہ سے کہ جو حضرت ام سلمہ کے بھائی تھے کہنے لگا کہ عبداللہ اگر اللہ تعالیٰ نے کل آپ لوگوں کو طائف پر فتح بخشی تو میں آپ کو غیلان کی بیٹی دکھلاؤں گا جو چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ جاتی ہے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب اس مخنث کی بات سنی تو فرمایا کہ یہ مخنث تمہارے پاس نہ آیا کریں (بخاری ومسلم)

تشریح:

لفظ مخنث نون کے زیر کے ساتھ یعنی مخنث بھی لکھا پڑا جاتا ہے اور نون کے زبر کے ساتھ مخنث بھی استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ صحیح زیر کے ساتھ یعنی مخنث ہی ہے جب کہ مشہور زبر کے ساتھ یعنی عام طور پر مخنث لکھا پڑھا جاتا ہے مخنث اس شخص کو کہتے ہیں جو عادات واطوار بول چال اور حرکات و سکنات میں عورتوں کے مشابہ ہو جس کو ہمارے ہاں زنانہ اور زنخا کہتے ہیں۔ یہ مشابہت کبھی تو خلقی طور پر ہوتی ہے اور کبھی مصنوعی طور پر اختیار کی جاتی ہے خلقی طور پر جو مشابہت ہوتی ہے اس میں کوئی گناہ نہیں کیونکہ یہ ایک قدرتی چیز ہوتی ہے جس میں انسانی اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ ہاں جو مشابہت مصنوعی ہوتی ہے کہ بعض مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے رہن سہن عادات واطوار اور بول چال میں اپنے آپ کو بالکل عورت ظاہر کرتے ہیں یہ بہت برائی اور گناہ کی بات ہے ایسے لوگ لعنت کے مستحق ہیں کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان عورتوں پر اللہ کی لعنت ہو جو مردوں کے مشابہت اختیار کرتی ہیں اور ان مردوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو

جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ یہاں حدیث میں جس مخنث کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ہئیت تھا بعض نے اس کا نام ماطع لکھا ہے اس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات کے گھروں میں آیا جایا کرتا تھا کیونکہ ازواج مطہرات کا یہ گمان تھا کہ یہ خلقی طور پر اوصاف مردانگی سے عاری اور جذبات نفسانی سے خالی ہے اسے عورتوں کی طرف نہ کوئی رغبت وحاجت ہے اور نہ جنسیات سے اسے کوئی دلچسپی ہے بلکہ یہ آیت (غیر اولی الاربۃ) میں سے ہے جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے اور کہا ہے کہ ان سے پردہ کرنا عورتوں کے لیے واجب نہیں ہے مگر جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی یہ بات سنی جو جنسی معاملات میں اس کی دلچسپی کی مظہر تھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اندازہ ہوگیا کہ مخنث آیت (غیر اولی الاربۃ) میں سے نہیں ہے بلکہ اولی الاربۃ میں سے ہیں اور جنسیات کی طرف خواہش ورغبت رکھتے ہیں لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فورا منع کردیا کہ اب مخنث گھروں میں داخل نہ ہوا کریں اور عورتوں کے پاس آیا جایا نہ کریں۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ مخنث کے لیے گھروں میں داخل ہونے اور عورتوں کے پاس آنے جانے کی ممانعت ہے بلکہ خصی اور مجبوب کا بھی یہی حکم ہے اور پردہ وغیرہ کے سلسلہ میں تینوں ان مردوں کی مانند ہیں جن سے پردہ کرنا عورتوں پر واجب ہے۔ جو چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ جاتی ہے اس بات سے اس مخنث کا مقصد غیلان کی بیٹی تھی کہ جس کا نام بادیہ تھا کہ فربہی وتنومدی کو بیان کرنا تھا کیونکہ عام طور پر جس شخص کا جسم فربہ ہوتا ہے اس کے پیٹ پر چار شکن پڑے ہوتے ہیں جو سامنے سے چار ہی نظر آتے ہیں مگر پیچھے سے دیکھنے پر وہ آٹھ نظر آتے ہیں بایں طور کہ ان چاروں شکنوں کے سرے دونوں پہلوں کی طرف نمایاں

ہوتے ہیں لہٰذا مخنث نے جو یہ بات کہی تو اس کی مراد یہی تھی کہ غیلان کی بیٹی جب آتی ہے تو اس کے پیٹ پر چار شکن نظر آتے ہیں اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتی ہے تو پیچھے آٹھ شکن معلوم ہوتے ہیں جو دراصل پیٹ کے ان چاروں شکنوں کے وہ دونوں طرف کے سرے ہوتے ہیں جو دونوں پہلوں کی طرف نمایاں ہوتے ہیں حاصل یہ ہے کہ عرب کے لوگ چونکہ فربہ جسم والی عورتوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے تھے اس لیے اس مخنث نے غیلان کی بیٹی کی فربہی کو ظاہر کرنے کے لیے یہ طرز تعبیر ااختیار کیا۔

اولاد کا والد پر حق:

حدیث:

وعن أبي سعيد وابن عباس قالا :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه"

ترجمہ:

حضرت ابوسعید اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو چاہیے کہ وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اسے نیک ادب سکھائے (یعنی اسے شریعت کے احکام و آداب و زندگی کے بہترین طریقے سکھائے تاکہ وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و سربلند ہو) اور پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔ اگر لڑکا بالغ ہو اور غیر مستطیع ہو اور اس کا باپ اس اس کا نکاح کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہ کرے اور پھر وہ لڑکا برائی میں مبتلا ہو جائے یعنی جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جائے) تو

اس کا گناہ باپ پر ہوگا۔

صالح معاشرہ کی حقیقی بنیاد وہ نوخیز ذہن ہیں جو اپنے والدین اور سرپرست کی آغوش پرورش میں اعمال و کردار کی بنیادی تربیت حاصل کرتے ہیں اگر اس بنیادی تربیت کا فقدان ہوتا ہے تو کائنات انسانی کا ہر طبقہ بھیانک قسم کی برائیوں سے متاثر ہوتا ہے کیونکہ آگے چل کر یہی نوخیز معاشرہ کا فعال جزء بنتے ہیں اور ان کا ایک ایک فعل و عمل اپنے اثرات پیدا کرتا ہے۔ آج کے دور میں فحاشی و بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ جو بھی نئی نسل سامنے آتی ہے وہ اعمال و کردار اور ذہن و عقیدہ کی اس بنیادی تربیت سے یکسر محروم رہتی ہے جو والدین اور سرپرستوں کے زیر سایہ ملنی چاہیے۔ اسی لیے یہ حدیث اس اہم نکتہ کی طرف متنبہ کر رہی ہے اور والدین کو ان کے اس فریضہ سے آگاہ کر رہی ہے کہ جب ان کے لڑا پیدا ہو تو پہلے وہ اس کا اچھا نام رکھیں کیونکہ اچھا نام پوری زندگی پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے پھر جب وہ ہوش سنبھالے تو اس کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دیں بایں طور کہ اسے دین کی تعلیم دلوائیں اسلامی احکام و آداب سے روشناس کرائیں اور اسے زندگی کے اعلیٰ اصول اور اچھے طریقوں کے سانچے میں ڈھالیں تاکہ سب سے پہلے تو اس کا قلب و دماغ نیکی و برائی کے امتیاز کو جان لے اور پھر اس کا کردار اس پختگی کے حامل ہو جائے جو زندگی کے ہر راستہ پر اسے نیکی و بھلائی ہی کی طرف لے جائے۔ جب تعلیم و تربیت کا یہ مرحلہ گزر جائے اور وہ لڑکا بالغ ہو جائے تو اس کے بعد والدین کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ اس کی شادی کی طرف فوراً متوجہ ہوں تاکہ وہ مرد زندگی کی وجہ سے جنسی جذبات کی مغلوبیت کا شکار ہو کر برائیوں کے راستہ پر نہ لگ جائے چنانچہ اس فریضہ کی

اہمیت کو بتانے اور اس بات کو بتانے اور اس بات کی تاکید کے لیے بطور زجر و تہدید یہ فرمایا گیا کہ اگر کسی شخص نے اپنے بالغ لڑکے کی شادی نہیں کی اور وہ لڑکا جنسی بے راہ روی کا شکار ہو کر بدکاری میں مبتلا ہو گیا تو اس کا گناہ اور وبال باپ پر ہو گا۔اس بارے میں غلام اور لونڈی کا بھی وہی حکم ہے جو لڑکے کا ہے۔

جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان کا بیان

نکاح کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ عورت محرمات میں سے نہ ہو لہٰذا اس باب میں یہی بتایا جائے گا کہ کون کون عورتیں محرمات میں سے ہیں کہ جن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ان عورتوں کی تفصیل فقہ حنفی کی مشہور و معتمد کتاب فتاوی عالمگیری میں بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتاوی عالمگیری کی اس تفصیل کو یہاں ذکر کر دیا جائے۔محرمات کی تفصیل جو عورتیں محرمات میں سے ہیں ان کی نو قسمیں ہیں یا یوں کہیے کہ نکاح کے حرام ہونے کے نو سبب ہیں جن کی نمبر وار تفصیل یوں ہے

: پہلا سبب : نسبی رشتہ :

جو عورتیں نسبی رشتہ کے سبب حرام ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ماں بیٹی بہن پھوپھی خالہ بھتیجی اور بھانجی۔ لہٰذا ان رشتوں سے نکاح کرنا جماع کرنا اور ایسے کام کرنا جو جماع کے محرک اور سبب بن جاتے ہیں جیسے بوسہ لینا وغیرہ یہ سب کام ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ماں سے اپنی ماں بھی مراد ہے اور دادی اور نانی خوہ اوپر کے درجہ کی ہوں جیسے پردادی اور پرنانی وغیرہ) بھی مراد ہیں۔بیٹی کے حکم میں اپنی حقیقی بیٹی اپنے بیٹے کی بیٹی پوتی اپنی بیٹی کی بیٹی یعنی نواسی اور اس طرح نیچے تک سب شامل ہیں۔اسی طرح بہن خواہ حقیقی ہو خواہ سوتیلی صرف باپ شریک ہو اور خواہ اخیافی

صرف ماں شریک ہو سب حرام ہیں۔ بھتیجی اور بھانجی سے بھی تین طرح کی بھتیجیاں اور بھانجیاں یعنی حقیقی بھائی بہن کی اولاد، سوتیلے بھائی بہن کی اولاد اور اخیافی بھائی بہن کی اولاد مراد ہیں (اگر چہ نیچے درجہ کی ہوں کہ یہ سب محرمات میں سے ہیں۔ پھوپھی بھی تینوں طرح کی مراد ہیں یعنی حقیقی پھوپھی سوتیلی باپ شریک) پھوپھی اور اخیافی صرف ماں شریک پھوپھی اسی طرح پھوپھی کے حکم میں باپ کی پھوپھی اور دادا کی پھوپھی اور دادی کی پھوپھی بھی شامل ہیں کہ یہ سب پھوپھیاں بھی محرمات میں سے ہیں، ہاں پھوپھی کی پھوپھی حرام ہے یا نہیں اس میں تفصیل ہے۔ اگر مثلاً زید کی پھوپھی اس کے باپ کی حقیقی بہن ہو یا سوتیلی یعنی صرف باپ شریک بہن ہو تو اس پھوپھی کی پھوپھی زید کے لیے حرام ہو گی اور اگر زید کی پھوپھی اس کے باپ کی اخیافی (یعنی صرف ماں شریک) بہن ہو تو ایسی پھوپھی زید کے لیے حرام نہیں ہو گی۔ خالہ بھی کئی طرح کی مراد ہیں تفصیل یہ ہے کہ: اگر مثلاً سوتیلی خالہ اخیافی خالہ اپنے باپ کی خالہ اور اپنی ماں کی خالہ یہ سب خالائیں حرام ہیں لیکن خالہ کی خالہ کے بارے میں تفصیل ہے اگر مثلاً زید کی خالہ اس کی ماں کی حقیقی بہن ہو یا اخیافی یعنی صرف ماں شریک بہن ہو تو اس خالہ کی خالہ زید کے لیے حرام ہو گی یعنی اس سے زید کا نکاح نہیں ہو سکتا اور اگر زید کی خالہ اس کی ماں کی سوتیلی یعنی صرف باپ شریک بہن ہو تو ایسی خالہ حرام نہیں ہو گی اس سے زید کا نکاح جائز ہو گا۔

دوسرا سبب سسرالی رشتہ:

وہ عورتیں جو بسبب صہریت یعنی سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں ان کی چار قسمیں ہیں ایک ساس یعنی بیوی کی ماں دو یا ساس یعنی بیوی کی دادی، ننیا ساس یعنی بیوی کی نانی اور اس سے اوپر کے درجہ کی مثلاً بیوی کے باپ اور ماں کی دادی وغیرہ بیوی کی بیٹی اور بیوی کے

بیٹوں کی اولاد اور اس سے نیچے کے درجہ کی مثلاً بیوی کی نواسی کی اولاد وغیرہ یہ سب حرام ہیں بشرطیکہ بیوی سے جماع کرلیا ہو خواہ وہ بیوی کی بیٹی اس مرد کی پرورش میں ہو یا نہ ہو اور حنفی علماء نے بیوی کی بیٹیوں کی حرمت کے سلسلہ میں خلوت صحیحہ کو جماع کا قائم مقام قرار نہیں دیا یعنی بیوی کی بیٹیوں کی حرمت ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ مرد نکاح کے بعد بیوی سے جماع بھی کرلے اگر صرف خلوت صحیحہ ہوئی ہو یعنی جماع کرنے کا پورا موقع مل گیا ہو) مگر دونوں نے جماع نہ کیا ہو تو اس صورت میں اس بیوی کی بیٹی (جو دوسرے شوہر کے نطفہ سے ہو) کی حرمت ثابت نہیں ہوگی بہو یعنی بیٹے کی بیوی پوت بہو یعنی پوتے کی بیوی اور نواسی بہو یعنی نواسے کی بیوی اور اسے نیچے کے درجہ کی (یعنی پڑپوتے کی بیوی وغیرہ) اور ان عورتوں کے ساتھ ان کے شوہروں یعنی بیٹے اور پوتے وغیرہ نے جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو دونوں صورتوں میں حرام ہیں۔ ہاں لے پالک یعنی منہ بولے بیٹے کی بیوی حرام نہیں ہوتی یعنی مثلاً زید بکر کا منہ بولا بیٹا ہے تو زید کی بیوی بکر کے حق میں محرمات میں سے نہیں ہوگی اگر زید اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا وہ مرجائے تو بکر اس کی مطلقہ یا وہ بیوہ سے اپنا نکاح کرسکتا ہے باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں اور دادا اور نانا کی بیویاں یعنی سوتیلی دادی اور سوتیلی نانی اور اس سے اوپر کے درجہ کے یہ سب بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہیں نہ ان سے نکاح ہوسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے جماع ہوسکتا ہے۔ سسرالی رشتہ سے حرمت اس صورت میں ثابت ہوتی ہے جب کہ نکاح صحیح ہو فاسد نکاح سے حرمت ثابت نہیں ہوگی چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو زنا کرنیوالے کے لیے اس عورت کی ماں، دادی، نانی اور اس عورت کی بیٹی پوتی نواسی سب حرام ہوجائیں گی اسی طرح اس عورت کے لیے زنا کرنیوالے کے باپ دادا نانا اور اس عورت

کے لڑکے پوتے نواسے سب حرام ہوجائیں گے۔ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے جماع کیا
جس کی وجہ سے اس عورت کے پیشاب اور پاخانہ کا مقام ایک ہوگیا تو اس عورت کی ماں جماع
کرنیوالے کے لیے حرام نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس
نے عورت کے پیشاب کے مقام ہی میں جماع کیا ہے ہاں اگر جماع کے بعد وہ عورت حاملہ
ہوجائے اور یہ معلوم بھی ہوجائے کہ یہ حمل اسی شخص کے نطفہ سے قرار پایا ہے تو اس صورت میں
اس کی ماں اس کے لیے حرام ہوجائے گی۔ اور جس طرح یہ حرمت جماع کرنے سے ثابت ہوتی
ہے اسی طرح شہوت کے ساتھ) عورت کو چھونے بوسہ لینے اور شہوت کے ساتھ عورت کی شرمگاہ
کی طرف دیکھنے سے ثابت ہوجاتی ہے۔ اور یہ مذکورہ چیزیں یعنی چھونا وغیرہ خواہ نکاح کی صورت
میں پیش آئیں یا خواہ ملکیت کی صورت میں اور خواہ فجور کی صورت میں حنفیہ کے نزدیک یہ تینوں
یکساں ہیں۔ نیز حنفی علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں شبہ اور غیر شبہ برابر ہیں اور اس سلسلہ
میں شہوت کے ساتھ مباشرت (مرد وعورت کا شہوت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹنا) بھی
بوسہ کے حکم میں ہے اسی طرح معانقہ کا بھی یہی حکم ہے ایسے ہی اگر شہوت کے ساتھ دانتوں
سے اس کو کاٹا تو بھی یہی حکم ہے یعنی ان تمام صورتوں میں حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔ اگر کسی نے
شہوت کے ساتھ مرد کے عضو مخصوص کی طرف دیکھا یا شہوت کے ساتھ اس کو ہاتھ لگایا یا بوسہ لیا تو
اس صورت میں اس کے ساتھ حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی اور باقی دوسرے تمام اعضاء
کی طرف دیکھنے سے اور ان کو ہاتھ لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی ہاں اگر یہ دیکھنا یا
ہاتھ لگانا شہوت کے ساتھ ہو تو پھر بغیر کسی اختلاف کے حرمت ثابت ہوجائے گی۔ حرمت کے سلسلہ
میں عورت کی شرمگاہ کے ظاہری حصہ کو دیکھنے کا اعتبار نہیں ہے بلکہ اندر کے حصہ کو دیکھنے سے

حرمت ثابت ہوا کرتی ہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر مرد کسی کھڑی ہوئی عورت کی شرم گاہ کو دیکھ لے تو اس صورت میں حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ عورت جب کھڑی ہوئی ہو تو اس کی شرم گاہ کے اندرونی حصہ پر نظر نہیں پڑتی بلکہ شرمگاہ کے اندرونی حصہ پر اس وقت نظر پڑے گی جب وہ پشت سے تکیہ لگائے ہوئے بیٹھی ہو۔ اگر کسی مرد نے عورت کی شرمگاہ کے اندرونی حصہ کو اس طرح دیکھا کہ درمیان میں باریک پردہ یا شیشہ حائل تھا لیکن اندرونی حصہ نظر آرہا تھا تو بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص آئینہ دیکھ رہا تھا اور اس میں کسی عورت کی شرمگاہ نظر آگئی اور پھر مرد نے اس کو شہوت کے ساتھ دیکھا تو اس مرد پر نہ اس عورت کی ماں حرام ہوگی اور نہ بیٹی حرام ہوگی کیونکہ اس نے شرمگاہ کو نہیں دیکھا بلکہ اس کا برعکس دیکھا۔ اگر کوئی عورت پانی کے حوض کے کنارے پر یا پل پر بیٹھی ہو اور کسی مرد نے اس کا عکس پانی میں دیکھا اور پھر اس کے بعد وہ شہوت کے ساتھ پانی ہی میں اس کی شرمگاہ کا عکس دیکھتا رہا تو اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوگی ہاں اگر عورت پانی میں ہو اور مرد کی نگاہ اس کی شرمگاہ پر پڑھ جائے اور پھر اسے شہوت کے ساتھ دیکھے تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ کسی عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے سے حرمت ثابت ہونے کے سلسلے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قصدا چھوئے تب ہی حرمت ثابت ہوگی بلکہ چاہے قصداً چھوئے یا چاہے بھول کر چھوئے چاہے کسی کے زبردستی کرنے سے یا خود غلطی سے چھوئے اور چاہے نیند کی حالت میں چھوئے ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی۔ چنانچہ اگر کسی مرد نے جماع کرنے کے لیے اپنی بیوی کو نیند سے اٹھانا چاہا مگر غلطی سے اس کا ہاتھ لڑکی پر پڑھ گیا اور پھر یہ سمجھ کر کہ یہی میری بیوی ہے شہوت کے ساتھ اس کی چٹکی بھر لی اور وہ لڑکی بھی جوان تھی قابل شہوت تھی تو اس صورت میں اس مرد

کے لیے اس لڑکی کی ماں یعنی اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہوجائے گی۔ اگر کسی مرد نے
شہوت کے ساتھ عورت کے ان بالوں کو ہاتھ لگایا جو سر سے ملے ہوئے ہیں تو حرمت ثابت
ہوجائے گی اور اگر لٹکے ہوئے بالوں کو ہاتھ لگایا تو حرمت ثابت نہیں ہوگی مگر ناطفی نے اس
تفصیل کے بغیر مطلقا بالوں کے چھونے کو حرمت کا باعث لکھا ہے اسی طرح اگر مرد نے عورت
کے ناخن کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تو حرمت ثابت ہوجائے گی۔ یہ جو بتایا گیا ہے کہ عورت کو
شہوت کے ساتھ چھونا اور ہاتھ لگانا حرمت کو ثابت کردیتا ہے تو اس بارے میں یہ بات ملحوظ رہے
کہ عورت کو چھونے اور ہاتھ لگانے سے اسی صورت میں حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے جب کہ
دونوں کے درمیان کپڑا حائل نہ ہو اور اگر کپڑا حائل ہو تو وہ اس قدر باریک ہو کہ چھونے والے کا
ہاتھ بدن کی حرارت محسوس نہیں ہوتی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی خواہ اس کی وجہ سے مرد کے عضو
مخصوص میں ایستادگی ہی کیوں نہ ہوجائے، اسی طرح اگر کسی مرد نے عورت کے موزہ کے نیچے کا
حصہ چھوا تو حرمت ثابت ہوجائے گی ہاں اگر موزے پر چمڑا چڑھا ہوا ہو جس کی وجہ سے عورت
کے پاؤں کی ایڑھی چھونے والے کو محسوس نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ اگر کسی مرد نے عورت
کا بوسہ لیا ایسی حالت میں کہ دونوں کے درمیان کپڑا حائل ہو تو حرمت ثابت ہوجائے گی بشرطیکہ
بوسہ لینے والے کو عورت کے دانتوں کی یا ہونٹوں کی ٹھنڈک محسوس ہو۔ حرمت ثابت ہونے کے
لیے یہ ضروری نہیں کہ چھونے کے بعد دیر تک چھوتا ہی رہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی
نے شہوت کے ساتھ اپنی بیوی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ ہاتھ بیوی کی بجائے اپنی لڑکی کی
ناک پر پڑھ گیا اور اس کے ساتھ ہی شہوت زیادہ ہوگئی تو اس لڑکی کی ماں یعنی بیوی اس مرد
کے لیے حرام ہوجائے گی اگرچہ اس نے اپنا ہاتھ فوراً ہی ہٹالیا ہو۔ حرمت ثابت ہونے کے لیے

یہ شرط ہے کہ جس عورت کو ہاتھ لگایا جائے یا بوسہ لیا جائے اور وہ قابل شہوت ہو اور فتوی اس پر ہے کہ کم سے کم نو سال کی لڑکی قابل شہوت ہوتی ہے اس سے کم نہیں، چنانچہ اگر کسی مرد نے کسی ایسی نابالغہ لڑکی سے جماع کیا جو قابل شہوت نہ ہو یں تو حرمت ثابت نہیں ہوگی اس کے برخلاف اگر عورت اتنی بوڑھی ہو جائے کہ قابل شہوت نہ رہے تو وہ حرمت ثابت ہونے کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ وہ حرمت کے حکم میں داخل ہو چکی تھی اور بڑھاپے کی وجہ سے اس حکم سے باہر نہیں ہو سکتی جب کہ نابالغہ ابھی حرمت کے حکم میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ جس طرح حرمت ثابت ہونے کے لیے عورت کا قابل شہوت ہونا شرط ہے اسی طرح مرد کا بھی قابل شہوت ہونا شرط ہے۔ لہٰذا اگر چار سال کے بچہ نے مثلا اپنے باپ کی بیوی یعنی اپنی سوتیلی ماں سے جماع کر لیا تو اس کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر جماع کرنے والا ایسا بچہ ہو جس کے ہم عمر بچے عام طور پر جماع کر سکتے ہوں تو تو اس کا وہی حکم ہوگا جو بالغ کا ہوتا ہے اور اس بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ایسے بچہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ جماع کرنے پر قادر ہو عورت کی طرف اس کا میلان ظاہر ہوتا ہو اور عورتیں اس سے شرم کرتی ہوں۔ مذکورہ بالا چیزوں یعنی چھونے اور دیکھنے کے بارے میں شہوت یعنی ہیجان کا ہونا شرط ہے یعنی عورت کو ہاتھ لگانے بوسہ لینے اور شرم گاہ کے اندرونی حصہ کی طرف دیکھتے وقت اگر شہوت ہو تب حرمت ثابت ہوگی لہٰذا اگر یہ دونوں چیزیں بغیر شہوت کے پائی جائیں اور پھر بعد میں شہوت پیدا ہو تو حرمت ثابت نہیں ہوگی اور شہوت کا معیار مرد کے لیے یہ ہے کہ اس کے عضو مخصوص میں ایستادگی ہو جائے اور اگر ایستادگی پہلے سے تھی تو اس میں زیادتی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں یہی قول صحیح ہے اور اسی پر فتوی ہے لہٰذا اگر کسی مرد کے عضو مخصوص میں ایستادگی تھی ایسی حالت میں اس نے اپنی بیوی کو اپنے

پاس بلایا اور پھر اسی دوران کسی طرح اس کا عضو مخصوص اس کی لڑکی کی دونوں رانوں کے درمیان داخل ہوگیا تو اس صورت میں اگر اس کے عضو مخصوص کی ایستادگی میں زیادتی نہ پیدا ہوگئی ہو تو اس لڑکی کی ماں یعنی اس کی بیوی اس کے لیے حرام نہیں ہوگی۔اور شہوت کا معیار اس مرد کے لیے ہے جو جوان اور جماع کرنے پر قادر ہو اور اگر مرد بوڑھا ہو تو اس کے حق میں شہوت کا معیار یہ ہے کہ خواہش کے وقت اس کے قلب میں حرکت پیدا ہو جائے اگر پہلے سے حرکت نہیں تھی اور اگر قلب میں پہلے سے حرکت موجود تھی تو اس خواہش میں زیادتی ہو جائے اور عورت کے لیے اس اس مرد کے لیے جس کا عضو مخصوص کٹا ہوا ہو شہوت کا معیار یہ ہے کہ قلب میں خواہش پیدا ہو اور ہاتھ لگانے وغیرہ سے جنسی لذت حاصل ہو۔اگر خواہش وغیرہ پہلے سے موجود نہ تھی اور اگر یہ پہلے سے موجود تھی تو اس میں زیادتی ہو جائے اور یہ بات ملحوظ رہے کہ مرد و عورت میں سے کسی ایک میں شہوت کا ہونا حرمت ثابت ہونے کے لیے کافی ہو۔ہاتھ لگانے یا بوسہ لینے وغیرہ سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے اس میں یہ شرط اور ضروری ہے کہ انزال نہ ہو اگر ہاتھ لگانے یا شرمگاہ کی طرف دیکھنے کے وقت انزال ہوگیا تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اب انزال ہونے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ چھونا وغیرہ جماع لینے کا سبب نہیں بنا۔اگر کسی مرد نے عورت کی مقعد کی طرف دیکھا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی اسی طرح اگر کسی مرد نے عورت کے پیچھے کی طرف بدفعلی کی تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ایسے ہی اگر مرد کے ساتھ جماع کے افعال کئے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔اگر کسی مرد نے اپنی بیوی کے ساتھ حرمت مصاہرت کا اقرار کیا تو اس کا اعتبار کیا جائے گا اور ان دونوں یعنی میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی اسی طرح اگر مرد نکاح سے قبل زمانہ کی طرف حرمت کی نسبت کرے یعنی اپنی

بیوی سے یوں کہے کہ میں نے تم سے نکاح کرنے سے پہلے تمہاری ماں سے جماع کیا تھا تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا اور دونوں میں جدائی کرادی جائے گی لیکن اس عورت کا پورا مہر (جو نکاح کے وقت متعین ہوا تھا) واجب ہوگا عقد واجب نہیں ہوگا اور اس اقرار کے لیے مداومت شرط نہیں یعنی صرف ایک مرتبہ اقرار کرلینا کافی ہے بار بار اقرار کرنا ضروری نہیں ہے اسی لیے اگر کوئی شخص اپنے اقرار سے رجوع کر لے یعنی ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد پھر انکار کر دے تو قاضی اس نکاح کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا ہاں اگر اس نے واقعتہً غلط اقرار کیا تھا تو عنداللہ وہ عورت اس کی بیوی رہے گی اگرچہ ظاہراً قاضی جدائی کرادے گا۔ اگر کسی شخص نے ایک عورت کے بارے میں یہ کہا کہ میری رضاعی ماں ہے (یعنی اس عورت نے مجھے دودھ پلایا ہے) اور پھر کچھ عرصہ بعد جب اس عورت سے نکاح کرنا چاہے اور یہ کہے کہ میں نے پہلے غلط کہا تھا کہ یہ میری رضاعی ماں ہے تو اس صورت میں اس کے لیے اس عورت سے نکاح کرنا استحسانا جائز ہوگا۔ اگر کسی شخص نے عورت کا بوسہ لیا اور پھر کہنے لگا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا یا عورت کو چھوا اور یا اس کی شرم گاہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو بوسہ لینے کی صورت میں تو فوراً حرمت کا حکم لگا دیا جائے گا جب تک کہ یہ یقین نہ ہوجائے کہ اس نے واقعی شہوت کے ساتھ بوسہ نہیں لیا تھا اور دوسری دونوں صورتوں میں حرمت کا حکم فوراً لگا دیا جائے گا جب یہ یقین ہوجائے کہ یہ چیز شہوت کے ساتھ سرزد ہوئی ہے تو حرمت کا حکم لگایا جائے گا اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ بوسہ عام طور پر شہوت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور بوسہ کی بنیاد ہی شہوت پر ہوتی ہے بخلاف چھونے اور دیکھنے کے کہ یہ دونوں فعل بغیر شہوت کے بھی سرزد ہوتے ہیں مگر یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب کہ شرمگاہ کے علاوہ کسی اور عضو کو چھوا ہو اور اگر کسی شخص نے عورت کی

شرمگاہ کو چھوا ہو اور پھر کہا کہ یہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو ایسی صورت میں اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے عورت کی چھاتی پکڑ لی اور کہا کہ شہوت کے ساتھ نہیں پکڑی تھی تو اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اسی طرح اگر عورت کے ساتھ جانور پر سوار ہوا تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ ہاں اگر عورت کی پشت پر سوار ہو کر دریا کو پار کیا اور کہا کہ اس وقت شہوت نہیں تھی تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔ ایک شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار کیا کہ میں نے فلاں عورت کو شہوت کے ساتھ چھوا ہے یا اس کا بوسہ لیا ہے اور ان لوگوں نے اس کے اس اقرار کی گواہی دی تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اسی طرح اگر گواہ یہ کہیں کہ فلاں شخص نے فلاں عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا تھا یا بوسہ لیا تھا تو ان کی گواہی مانی جائے گی کیونکہ شہوت ایک ایسی چیز ہے جو فی الجملہ معلوم ہو جاتی ہے چنانچہ جن لوگوں کے عضو میں حرکت ہوتی ہے اس کو دیکھ کر اور جن کے عضو میں حرکت نہیں ہوتی ان کے بارے میں دوسری علامتوں سے شہوت کا معلوم ہو جانا ممکن ہوتا ہے۔ قاضی علی سعدی فرماتے ہیں کہ اگر نشہ میں مدہوش کسی شخص نے اپنی لڑکی کو پکڑ کر اپنے بدن سے لپٹایا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر جب اس سے جماع کرنے کا ارادہ کیا تو لڑکی نے کہا کہ میں تمہاری لڑکی ہوں، یہ سن کر اس شخص نے لڑکی کو چھوڑ دیا تو اس صورت میں بھی لڑکی کی ماں یعنی اس شخص کی بیوی اس کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اگر کسی شخص سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنی ساس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے جماع کیا ہے تو اس صورت میں بھی حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی اگرچہ سوال کرنے والے نے مذاق میں سوال کیا ہو اور اس شخص نے بھی از راہ مذاق ہی جواب دیا ہو پھر اس کے بعد وہ شخص لاکھ کہے کہ میں نے یہ بات غلط کہی تھی اس کا اعتبار نہیں کیا

جائے گا۔ اگر کسی شخص نے کسی ایسی لونڈی کے بارے میں جو اس کی ملکیت میں ہو یہ کہا کہ میں نے اس لونڈی سے جماع کیا ہے تو وہ لونڈی اس کے لڑکے کے لیے حلال نہیں ہوگی اور اگر اس نے کسی ایسی لونڈی کے بارے میں جو اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ کسی اور کی ہے یہ کہا کہ میں نے اس سے جماع کیا ہے تو اس صورت میں اس کے لڑکے کے لیے یہ جائز ہوگا کہ اپنے باپ کی اس بات کا اعتبار نہ کرے اور اس لونڈی کو اپنی ملکیت میں لے کر اس سے جماع کر لے اور اگر کسی شخص کو اپنے باپ کی میراث میں کوئی لونڈی ملی تو وہ اس سے جماع کر سکتا ہے جب تک کہ یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ باپ نے اس لونڈی کے ساتھ جماع کیا ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر شادی کی کہ وہ باکرہ ہے لیکن شادی کے بعد جب اس سے جماع کرنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باکرہ نہیں ہے پھر اس نے عورت سے پوچھا کہ تمہارا پردہ بکارہ کس طرح زائل ہوا ہے (یعنی تمہارے ساتھ کسی مرد نے جماع کیا ہے؟) عورت نے جواب دیا کہ تمہارے باپ نے اس صورت میں اگر وہ شخص خاوند اس کی بات کا اعتبار کرے تو نکاح ختم ہو جائے گا۔ اور عورت مہر کی حقدار نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ شخص اس کی بات کا اعتبار نہ کرے اور کہے کہ تم جھوٹ بولتی ہو تو نکاح باقی رہے گا۔ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کے لڑکے کے بارے میں کہا کہ اس نے مجھے شہوت کے ساتھ چھوا ہے لہٰذا میں اپنے شوہر کی بیوی نہیں رہی تو عورت کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ شوہر کے لڑکے کا قول معتبر ہوگا۔ کسی شخص نے اپنے باپ کی بیوی کا شہوت کے ساتھ زبردستی بوسہ لیا یا کسی باپ نے اپنے لڑکے کی بیوی کا شہوت کے ساتھ زبردستی بوسہ لیا اور شوہر نے کہا کہ یہ عمل شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو شوہر کی بات کا اعتبار کیا جائے گا اور یہ اسی کی بیوی رہے گی لیکن اگر شوہر نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ بوسہ لینا

واقعی شہوت ہی کے ساتھ تھا تو پھر دونوں میاں بیوی) میں جدائی ہوجائے گی اور شوہر پر مہر واجب ہوگا مگر شوہر وہ رقم جو اس نے مہر میں ادا کی ہے اس شخص سے وصول کرلے گا جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے بشرطیکہ اس نے فتنہ پھیلانے کے لیے یہ حرکت کی ہو اور اگر یہ حرکت فتنہ پھیلانے کے مقصد سے نہیں تھی تو پھر کچھ بھی وصول کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اور اگر اس مسئلہ میں بوسہ لینے کی بجائے باپ نے لڑکے کی بیوی سے یا لڑکے نے باپ کی بیوی سے جماع کرلیا تو اس صورت میں شوہر مہر میں دی ہوئی رقم کسی طرح بھی وصول نہیں کرسکتا کیونکہ جماع کرنیوالے پر حد واجب ہوگی اور ضابطہ یہ ہے کہ شرعی حد کے ساتھ کوئی مالی جرمانہ واجب نہیں ہوتا۔ کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کی باندی کے ساتھ نکاح کیا اور پھر اس کے قبل کہ اس کا خاوند جماع کرتا باندی نے شوہر کے لڑکے کا شہوت کے ساتھ بوسہ لیا خاوند نے دعوی کیا کہ میری بیوی نے میرے لڑکے کا بوسہ شہوت کے ساتھ لیا ہے مگر باندی کے آقا نے کہا کہ یہ غلط ہے، اس صورت میں نکاح ختم ہوجائے گا کیونکہ شوہر نے اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ میری بیوی نے شہوت کے ساتھ بوسہ لیا ہے لیکن شوہر پر پورا مہر واجب نہیں ہوگا بلکہ نصف مہر واجب ہوگا کیونکہ اس باندی کے مالک نے اس کی بات کو جھٹلایا ہے اس بارے میں لونڈی کا قول معتبر نہیں ہوگا کہ میں نے شہوت کے ساتھ بوسہ لیا تھا لہٰذا میرا پورا مہر دو۔ اگر کسی عورت نے لڑائی جھگڑے میں اپنے دادا کا عضو مخصوص پکڑ لیا اور کہا کہ میں نے شہوت کے ساتھ نہیں پکڑا تھا تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔ حرمت مصاہرت یا حرمت رضاعت کی وجہ سے نکاح باطل نہیں ہوتا بلکہ فاسد ہوجاتا ہے (جس کی وجہ سے جماع کرنا حرام ہوجاتا ہے لہٰذا شوہر کو چاہیے کہ طلاق دیدے اگر وہ طلاق نہ دے تو پھر قاضی دونوں کے درمیان جدائی کرادے)

چنانچہ جدائی سے پہلے اگر شوہر نے جماع کرلیا تو اس پر حد واجب نہیں ہوگی خواہ اس نے جماع شبہ میں مبتلا ہو کر ہی کیا ہو یا بغیر شبہ کے کیا ہو۔ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے حرام کاری کی یا ایسا کوئی بھی فعل کیا جس سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے جیسے چھونا وغیرہ اور پھر توبہ کرلی تو یہ شخص اس عورت کی لڑکی کا محرم ہی رہے گا اس لیے کہ اس کی لڑکی سے نکاح کرنا اس کے حق میں ہمیشہ کے لیے حرام ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محرمت، زنا سے ثابت ہو جاتی ہے اور ایسے ہی ان تمام چیزوں سے بھی ثابت ہو جاتی ہے جن سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے جیسے چھونا وغیرہ۔ اگر مثلاً زید نے خالدہ سے نکاح کیا اور زید کے لڑکے نے (جو خالدہ کے پیٹ سے نہیں ہے) خالدہ کی بیٹی سے جو خالدہ کے پہلے شوہر سے ہے) نکاح کرلیا یا خالدہ کی ماں سے نکاح کرلیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے عضو مخصوص پر کپڑا لپیٹ کر اپنی بیوی سے جماع کیا تو دیکھا جائے گا کہ وہ کپڑا باریک تھا اور مرد کے عضو مخصوص کو حرارت محسوس ہونے سے نہیں روکتا تھا تو وہ عورت جماع کے بعد پہلے شوہر کے لیے جس نے اسے طلاق مغلظہ دیدی تھی) حلال ہو جائے گی اور اگر کپڑا ایسا تھا جس کی وجہ سے اس کے عضو مخصوص کو حرارت محسوس نہیں ہو رہی تھی تو وہ عورت اپنے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

تیسرا سبب دودھ کا رشتہ :

یعنی وہ عورتیں جو رضاعت دودھ پلانے کی وجہ سے حرام ہیں چنانچہ تمام وہ رشتے جو نسبی اور سسرالی ہونے کی وجہ سے حرام ہیں رضاعت کی وجہ سے بھی حرام رہیں گے اگر کسی عورت نے کسی بچہ کو اس کی شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پلایا ہے تو ان دونوں میں ماں اور اولاد کا تعلق پیدا ہو جائے گا لہٰذا دودھ پلانیوالی عورت کا شوہر دودھ والے بچہ کا رضاعی باپ ہوگا جس کی وجہ

سے رضاعی ماں اور باپ کے تمام وہ رشتے دار اس بچہ کے لیے حرام ہوں گے جو حقیقی ماں اور باپ کی رشتہ داری کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ شیر خوارگی کی عمر میں مطلقاً دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے خواہ زیادہ دودھ پیا ہو خواہ کم پیا ہو اور کم کی آخری حد یہ ہے کہ دودھ کا پیٹ میں مطلقاً پہنچ جانا یقینی کے ساتھ معلوم ہو جائے۔ شیر خوارگی کی عمر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے قول کے مطابق تو تیس مہینہ تک ہے اور صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے قول کے مطابق دو برس تک ہے۔ اگر کسی بچہ نے شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پینا بند کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اس نے شیر خوارگی ہی کی عمر میں دودھ پیا تو یہ رضاعت کے حکم میں داخل ہوگا کیونکہ دودھ پلانا شیر خوارگی ہی کی مدت میں واقع ہوا ہے۔ شیر خوارگی کی مدت رضاعت گزر جانے کے بعد دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دودھ پلانے کی اجرت کے استحقاق کے سلسلے میں شیر خوارگی کی مدت دو برس ہی تسلیم کی گئی ہے چنانچہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور اس مطلقہ نے اس کے بچہ کو دو برس کی عمر کے بعد دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ بچہ کے باپ یعنی اپنے سابق شوہر سے کیا تو اس کا مطالبہ تسلیم نہیں ہوگا اور بچہ کے باپ کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنی مطلقہ کو دو برس کے بعد کے عرصہ کے دودھ پلانے کی اجرت دے ہاں اس کی مطلقہ نے دو برس کے عرصہ میں جو دودھ پلایا ہے اس کی اجرت دینے پر اسے مجبور کیا جائے گا۔ حرمت رضاعت جس طرح رضاعی ماں یعنی دودھ پلانے والی کی رشتہ داروں میں ثابت ہوتی ہے اسی طرح رضاعی باپ کے رشتہ داروں میں بھی ثابت ہوتی ہے اور رضاعی باپ سے مراد دودھ پلانے والی کا وہ خاوند ہے جس کے جماع کی وجہ سے دودھ اترتا ہے۔" رضیع،

یعنی دودھ پینے والے پر اس کے رضاعی ماں باپ اور ان رضاعی ماں باپ کے اصول یعنی ان کے باپ دادا وغیرہ) اور ان کے فروع یعنی ان کی اولاد خواہ وہ نسبی ہوں یا رضاعی سب حرام ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے دودھ پینے سے پہلے اس کی رضاعی ماں کے ہاں جو اولاد ہو چکی ہوگی یا اس کے دودھ پینے کے بعد جو اولاد ہوگی اور وہ اولاد خواہ اس کے رضاعی باپ سے ہو خواہ اس کی رضاعی ماں کے کسی دوسرے شوہر سے ہو یا اس کی رضاعی بہن اور بھائی بہن کی اولاد اس کے بھتیجے، بھتیجی اور بھانجے بھانجی ہوں گے، اسی طرح رضاعی باپ کا بھائی اس کا چچا ہوگا رضاعی باپ کی بہن اس کی پھوپھی ہوگی رضاعی ماں کا بھائی اس کا ماموں ہوگا۔ رضاعی ماں کی بہن اس کی خالہ ہوگی اور رضاعی ماں کا دادا اور اس کی دادی و نانی رضیع کا دادا اور اس کی دادی و نانی ہوگی۔ جس طرح رضاعت میں نسبی رشتوں کی حرمت ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسی طرح رضاعت میں حرمت مصاہرت یعنی سسرالی رشتہ کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے چنانچہ رضاعی باپ کی بیوی اور رضیع دودھ پینے والے پر حرام ہیں اور رضیع کی بیوی اس کے رضاعی باپ پر حرام ہے اسی دوسرے رشتوں کو بھی قیاس کیا جاتا ہے لیکن دو صورتیں مستثنیٰ ہیں اول تو یہ کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اپنے نسبی بیٹے کی بہن سے نکاح کرلے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے لیکن رضاعت یعنی دودھ کے رشتہ میں یہ جائز ہے کیونکہ کسی شخص کے نسبی بیٹے کی بہن اگر اس کے نطفہ سے ہے تو وہ اس کی حقیقی بیٹی ہوگی اور اگر اس کے نطفہ سے نہیں ہے تو پھر یہ یعنی اس کی سوتیلی بیٹی ہوگی جب کہ دودھ کے رشتہ میں یہ دونوں باتیں مفقود ہوتی ہیں چنانچہ اگر نسبی رشتہ میں بھی ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی بات نہیں پائی جائے گی تو نکاح درست ہوگا مثلاً کسی ایسی لونڈی کے بچہ پیدا ہوا جو دو آدمیوں کی مشترک مملوکہ ہے اور وہ دونوں شریک

اس بچہ پر اپنا اپنا دعوی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس بچہ کا نسب ان دونوں سے ثابت ہوگیا ہے، ادھر ان دونوں کے ہاں اپنی اپنی عورت سے ایک ایک بیٹی ہے تو اب ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے شریک کی بیٹی سے اپنا نکاح کرلے کیونکہ اس صورت میں دونوں باتوں میں اسے ایک بات بھی نہیں پائی گئی باوجودیکہ ان میں سے جس نے بھی دوسرے کی بیٹی سے نکاح کیا ہے اس نے گویا اپنے نسبی بیٹے کی بہن سے نکاح کیا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے نسبی بھائی کی ماں سے نکاح کرے اور دودھ کے رشتہ میں یہ جائز ہے کیونکہ نسبی رشتہ میں یا تو یہ صورت ہوگی کہ وہ دونوں اخیافی یعنی سسرالی صرف ماں شریک) بھائی ہوں گے اسی طرح دونوں کی ماں ایک ہی ہوگی یا یہ صورت ہوگی کہ وہ دونوں سوتیلے صرف باپ شریک بھائی ہوں گے اسی طرح بھائی کی ماں اپنے باپ کی بیوی ہوگی جب کہ دودھ کے رشتہ میں یہ دونوں باتیں مفقود ہوتی ہیں۔ دودھ شریک بھائی کی بہن سے یعنی جس نے اس کی ماں کا دودھ پیا ہے اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے جس طرح کہ نسبی رشتہ میں جائز ہے مثلاً زید کا ایک سوتیلا بھائی ہے جس کا نام بکر ہے اور بکر کی ایک اخیافی بہن ہے یعنی دونوں کی ماں تو ایک ہے مگر باپ الگ الگ ہیں تو بکر کی اس اخیافی بہن سے نکاح کرنا زید کے لیے جائز ہوگا جو بکر کا سوتیلا بھائی ہے۔ دودھ شریک بھائی کی ماں یعنی جس نے اس کی ماں کا دودھ پیا ہے اس کی ماں) محرمات میں سے نہیں ہے اسی طرح رضاعی چچا رضاعی ماموں رضاعی پھوپھی اور رضاعی خالہ کی ماں بھی محرمات میں سے نہیں۔ اپنی رضاعی پوتی کی ماں سے نکاح کرنا جائز ہے اسی طرح اپنے رضاعی بیٹے کی دادی اور نانی سے بھی نکاح کرنا جائز ہے۔ رضاعی بیٹے کی پھوپھی اس کی بہن کی ماں اس کی بھانجی اور اس کی

پھوپھی کی بیٹی سے بھی نکاح کرنا جائز ہے، اسی طرح عورت کو اپنی رضاعی بہن کے باپ اپنے رضاعی بیٹے کے بھائی اپنے رضاعی پوتے کے باپ اور اپنے رضاعی بیٹے کے دادا اور ماموں سے نکاح کرنا جائز ہے جب کہ نسبی رشتہ میں یہ سب محرمات میں سے ہیں جن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا۔کسی شخص نے اپنی بیوی کو جس کے دودھ اترا ہوا تھا طلاق دیدی پھر اس مطلقہ نے عدت کے دن گزار کر ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اور اس دوسرے خاوند نے اس سے جماع کیا تو اس بارے میں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب اس دوسرے خاوند کے نطفہ سے اس کے بچہ پیدا ہوگا تو اس عورت کے دودھ کا سبب بھی دوسرا خاوند قرار پائے گا اس کے دودھ سے پہلے خاوند کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا ہاں اگر دوسرے خاوند سے حاملہ نہیں ہوگی تو اس دودھ کا سبب پہلا ہی خاوند سمجھا جائے گا۔لیکن اگر یہ صورت ہو کہ دوسرے شوہر سے حاملہ تو ہوئی مگر ابھی بچہ پیدا نہیں ہوا ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب تک اس دوسرے شوہر کا بچہ پیدا نہ ہوجائے دودھ پہلے شوہر ہی کا کہلائے گا۔ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن اس سے کبھی بھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا پھر (بغیر کسی ولادت کے) اس کے دودھ اتر آیا اور وہ دودھ اس نے کسی دوسرے کے بچے کو پلایا تو وہ دودھ اسی عورت کا کہلائے گا اس کے خاوند کا اس دودھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔اس صورت میں اس دودھ پینے والے بچہ اور اس شخص کی اس اولاد کے درمیان جو دوسری بیوی سے ہو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا جس کے نتیجہ میں اس کے ہاں ولادت ہوئی اور پھر اس عورت نے کسی دوسری لڑکی کو دودھ پلایا تو اس زنا کرنیوالے اس کے باپ دادا اور اس کی اولاد کو اس دودھ پینے والی لڑکی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا ہاں زنا کرنیوالے کا چچا اور اس کا

ماموں نکاح کرسکتا ہے جس طرح کہ زنا کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالی لڑکی سے زنا کرنیوالے کا چچا اور ماموں نکاح کرسکتا ہے۔کسی شخص نے شبہ میں مبتلا ہو کر یعنی کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک عورت سے جماع کیا جس سے وہ حاملہ ہوگئی اور پھر اس نے کسی بچہ کو دودھ پلایا تو یہ بچہ اس جماع کرنیوالے کا رضاعی بیٹا ہوگا اس پر یہ قیاس کیا جانا چاہیے کہ جن صورتوں میں بچہ کا نسب جماع کرنیوالے سے ثابت ہوتا ہے انہی صورتوں میں رشتہ رضاعت بھی اس سے ثابت ہوگا اور جن صورتوں میں بچہ کا نسب جماع کرنے والے سے ثابت نہیں ہوتا اس صورت میں رشتہ رضاعت دودھ پلانیوالی عورت سے ثابت ہوگا۔کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اس سے عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔عورت نے اپنے بچہ کو دودھ پلایا اور بعد میں دودھ خشک ہوگیا کچھ عرصہ کے بعد دودھ پھر اتر آیا اور اس نے کسی دوسرے لڑکے کو وہ دودھ پلایا تو اس لڑکے کے لیے اس شخص کی اس اولاد سے نکاح کرنا جائز ہوگا جو اس دودھ پلانیوالی عورت کے علاوہ کسی دوسری بیوی کے بطن سے ہو۔کسی کنواری لڑکی کے دودھ اتر آیا اور اس نے وہ دودھ کسی بچی کو پلایا تو یہ اس بچی کی رضاعی ماں ہوگی اور رضاعت کے تمام احکام دونوں کے حق میں ثابت ہوں گے لہٰذا اگر کسی شخص نے اس کنواری لڑکی سے نکاح کیا اور جماع سے پہلے اسے طلاق دیدی تو اس شخص کے لیے اس دودھ پینے والی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا (کیونکہ اس صورت میں بیوی کی بیٹی کا بھی یہی حکم ہے) اور اگر جماع کے بعد طلاق دی تو اس لڑکی سے نکاح کرنا ناجائز ہوگا۔اگر کسی ایسی لڑکی کے دودھ اتر آیا جس کی عمر نو برس سے کم تھی اور پھر اس نے وہ دودھ ایک لڑکے کو پلایا تو اس سے دونوں کے درمیان حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ حرمت رضاعت اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے جب کہ دودھ نو برس یا نو برس سے

زائد کی عمر میں اترے۔ اسی طرح اگر کسی کنواری لڑکی کی چھاتیوں میں زرد رنگ کا پانی اتر آیا تو
اس کے پلانے سے بھی حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ کسی عورت نے ایک بچہ کے منہ میں
اپنی چھاتی داخل کر دی لیکن بچہ کا اس کی چھاتی سے دودھ چوسنا معلوم نہیں ہوا تو اس صورت میں
شک کی وجہ سے حرمت رضاعت کا حکم نافذ نہیں کیا جائے گا البتہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ حرمت
ثابت ہو جائے۔ کسی عورت کی چھاتی سے زرد رنگ کی بہنے والی پتلی چیز بچہ کے منہ میں پہنچ گئی تو
حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی اور یہی کہا جائے گا کہ یہ دودھ ہی ہے جس کا رنگ متغیر ہو گیا
ہے۔ اگر کسی مرد کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا اور اس نے کسی بچہ کو پلا دیا تو اس سے حرمت
رضاعت ثابت نہیں ہوگی اور حرمت ثابت ہونے کے لیے زندہ اور مردہ عورت کے دودھ کا
یکساں حکم ہے۔ اور اگر دو بچوں نے کسی ایک چار پائے جانور کا دودھ پیا تو اس سے حرمت
رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ رضاعت کا حکم دارالاسلام اور دارالحرب دونوں جگہ یکساں ہے لہٰذا
اگر کسی کافر عورت نے دارالحرب میں کسی کافر بچہ کو دودھ پلایا اور پھر وہ دودھ پلانیوالی اس کے
قرابت دار اور دودھ پینے والا بچہ مسلمان ہو گئے یا وہ دارالحرب میں اسلام ہی کی حالت میں
تھے اور پھر دارالحرب سے دارالاسلام میں آگئے تو پھر رضاعت کے تمام احکام نافذ ہوں گے۔
جس طرح عورت کی چھاتی سے دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اسی طرح بچہ
کے منہ میں دودھ ڈال دینے یا ناک میں نچوڑ دینے سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی
ہے البتہ کان میں ٹپکانے عضو مخصوص کے سوراخ میں ڈالنے حقنہ کے ذریعہ استعمال کرنے اور
مقعد میں اور دماغ اور پیٹ کے زخم میں ڈالنے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی اگرچہ
دودھ ان زخموں کے ذریعہ دماغ اور پیٹ میں پہنچ جائے۔ لیکن حضرت امام محمد کے نزدیک

حقنہ کے ذریعہ استعمال کرنے سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔اگر غذا کی کسی چیز میں دودھ مل گیااور اسے آگ پر پکا کر کھانا بنالیا گیا جس کی وجہ سے دودھ کی حقیقت بدل گئی تو اس کو کھانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی خواہ دودھ غالب ہو یا مغلوب ہو اور اگر دودھ ملی ہوئی چیز آگ پر پکائی نہیں گئی تو اس صورت میں بھی اس کو کھانے سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ اس چیز میں دودھ غالب نہ ہو اور اگر وہ دودھ غالب ہوگا تو بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک حرمت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ جب بہنے والی چیز جمی ہوئی چیز میں مخلوط ہوگئی تو بہنے والی چیز اس جمی ہوئی چیز کے تابع ہوگئی اور مشروبات کی قسم سے خارج ہوگئی یعنی پینے کے قابل نہیں رہی اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ جس چیز میں دودھ مخلوط ہوگیا اگر وہ غالب نہ ہو اور اب بھی وہ دودھ بہنے کے قابل ہو تو اس کے پینے سے حرمت ثابت ہوجائیگی۔

اگر عورت کا دودھ (کسی جانور مثلا) بکری کے دودھ میں مخلوط ہوگیا اور عورت کا دودھ غالب ہے تو اس کے پینے سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔اسی طرح اگر عورت نے اپنے دودھ میں روٹی بھگوئی اور روٹی نے دودھ کو جذب کرلیا یا اپنے دودھ میں ستو گھولا اور پھر وہ روٹی یا ستو کسی بچہ کو کھلادیا تو اگر اس میں دودھ کا ذائقہ موجود ہو تو حرمت ثابت ہوجائے گی۔لیکن ذائقہ کی موجودگی کی شرط اسی صورت میں ہے جب کہ اس کو لقمہ لقمہ کر کے کھلایا جائے اور اگر گھونٹ گھونٹ کر کے پلایا گیا تو پھر اگر ذائقہ موجود نہ ہو تب بھی حرمت ثابت ہوجائے گی، اگر عورت کا دودھ پانی یا دوا یا جانور کے دودھ میں مخلوط ہوگیا تو اس میں غالب کا اعتبار ہوگا یعنی اگر وہ دودھ غالب ہوگا تو اس کو پینے سے حرمت ثابت ہوجائے گی اور اگر پانی وغیرہ غالب ہوگا تو حرمت ثابت نہیں ہوگی) اس طرح اگر عورت کا دودھ کسی بھی پتیل سیال چیز یا کسی بھی جمی ہوئی چیز میں مخلوط ہوجائے تو

غالب کا اعتبار ہوگا اور غالب سے مراد یہ ہے کہ اس کا رنگ بو اور ذائقہ تینوں چیزیں یا ان میں سے کوئی ایک چیز محسوس و معلوم ہو۔ اور اگر دونوں چیزیں یعنی دودھ اور وہ چیز جس میں دودھ مخلوط ہوگیا ہے برابر ہوں تو حرمت کا ثابت ہونا ضروری ہو جائے گا کیونکہ دودھ مغلوب نہیں ہے۔ اگر دو عورتوں کا دودھ باہم مل گیا ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک اس عورت سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی جس کا دودھ زیادہ اور غالب ہو لیکن حضرت امام محمد یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں دونوں عورتوں سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی حضرت امام ابوحنیفہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ہے اور یہی قول زیادہ صحیح اور اقرب الی الاحتیاط ہے اور اگر دونوں عورتوں کا دودھ برابر ہو تو متفقہ طور پر یعنی ان تینوں ائمہ کے نزدیک مسئلہ یہی ہے کہ دونوں عورتوں کے ساتھ حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ اگر کسی عورت نے اپنے دودھ کا چھاچھ یا دہی یا پنیر اور یا ماوا وغیرہ بنالیا اور اسے کسی بچہ کو کھلا دیا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ اس پر رضاعت یعنی دودھ پینے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بستی و گاؤں کی کسی عورت نے ایک بچی کو دودھ پلایا مگر بعد میں یہ کسی کو بھی یاد و معلوم نہیں رہا کہ وہ دودھ پلانیوالی عورت کون تھی اور پھر اس بستی کے کسی شخص نے اس لڑکی سے نکاح کرلیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا۔ عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بلا ضرورت کسی بچی کو اپنا دودھ نہ پلائیں اور اگر کسی بچہ کو اپنا دودھ پلائیں تو یاد رکھیں یا لکھ لیا کریں عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بلا ضرورت دوسروں کے بچوں کے منہ میں اپنی چھاتی دے دیتی ہیں اور انھیں دودھ پلا دیتی ہیں اور پھر بعد میں انھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کس بچہ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اس کی وجہ سے حرمت رضاعت کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی ہوتی ہے لہٰذا اس بارے میں احتیاط

ضروری ہے۔ دودھ خواہ پہلے پلایا ہو خواہ بعد میں پلایا گیا ہو حرمت رضاعت بہر صورت ثابت ہو جائے گی پہلے اور بعد میں کوئی فرق نہیں ہوگا لہٰذا اگر کسی شخص نے ایک شیر خوار بچی سے نکاح کرلیا اور پھر بعد میں اس شخص یعنی خاوند کی نسبی یا رضاعی ماں نے یا بہن نے یا لڑکی نے آ کر اس کو اپنا دودھ پلا دیا تو یہ بچی اس شخص کے لیے حرام ہو جائے گی اور اس پر نصف مہر واجب ہوگا لیکن اس نصف مہر کے طور پر جو رقم وہ ادا کرے گا اسے وہ مرضعہ یعنی دودھ پلانیوالی سے وصول کرلے گا بشرطیکہ اس دودھ پلانیوالی نے محض شرارت یعنی نکاح ختم کرانے کے لیے اپنا دودھ پلا دیا ہو اور اگر اس نے شرارت کی نیت سے دودھ نہ پلایا ہو بلکہ وہ بچی بھوک سے بلک رہی تھی اور اس عورت نے ہمدردی کے جذبہ سے اسے دودھ پلا دیا تو پھر خاوند اس سے اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ کسی شخص نے دو شیر خوار بچیوں سے نکاح کیا اس کے بعد ایک اجنبی عورت نے آ کر ان دونوں بچیوں کو ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے دودھ پلا دیا تو وہ دونوں بچیاں شوہر کے لیے حرام ہو جائیں گی اور پھر اس کے بعد وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے جسے وہ پسند کرے نکاح کرسکتا ہے۔ اور اگر اس کے نکاح میں دو کی بجائے تین بچیاں ہوں اور اس عورت نے ان تینوں کو ایک ساتھ دودھ پلایا تو وہ تینوں حرام ہو جائیں گی اس کے بعد وہ ان تینوں میں سے جس سے چاہے نکاح کرسکتا ہے۔ اور اگر تینوں کو یکے بعد دیگرے پلایا تو پہلی دو تو حرام ہو جائیں گی اور تیسری اس کی بیوی رہے گی اور اگر پہلے تو دو بچیوں کو ایک ساتھ دودھ پلایا اور اس کے بعد تیسری کو پلایا تو بھی یہی حکم ہوگا۔ اور اگر پہلے ایک لڑکی کو پلایا اور بعد میں دو کو ایک ساتھ پلایا تو تینوں حرام ہو جائیں گی اور ان میں سے ہر ایک بچی کا نصف مہر اس پر واجب ہوگا جسے وہ دودھ پلانے والی سے وصول کرے گا بشرطیکہ اس نے شرارت کی نیت سے

دودھ پلایا ہو اور اگر اس کے نکاح میں چار بچیاں ہوں اور اس عورت نے ان چاروں بچیوں کو ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے دودھ پلایا ہو تو چاروں حرام ہو جائیں گی اور اگر پہلے ایک کو اور پھر تین کو ایک ساتھ پلایا ہو تو بھی یہی حکم ہوگا اور اگر پہلے تین کو ایک ساتھ اور بعد میں چوتھی کو پلایا تو چوتھی حرام نہیں ہوگی۔ اگر کسی شخص نے ایک بڑی عورت سے اور ایک شیر خوار بچی سے نکاح کیا اور پھر بڑی نے چھوٹی کو اپنا دودھ پلا دیا تو شوہر کے لیے دونوں حرام ہو جائیں گی اب اگر اس شخص نے بڑی سے جماع نہیں کیا تھا تو اس کو کچھ مہر نہیں ملے گا اور چھوٹی کو اس کا آدھا مہر دینا واجب ہوگا جسے وہ بڑی سے وصول کرے گا بشرطیکہ اس نے شرارت کی نیت سے اسے دودھ پلایا ہو اور اگر اس نے دودھ شرارت کی نیت سے نہیں پلایا تو اس سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا اگرچہ اس بڑی کو یہ معلوم ہو کہ یہ چھوٹی بچی میرے شوہر کی بیوی ہے۔ رضاعت دودھ پلانے کا ثبوت دو باتوں میں سے کسی ایک بات سے ہو جاتا ہے ایک تو اقرار یعنی کوئی عورت خود اقرار کرے کہ میں نے فلاں کو دودھ پلایا ہے اور دوسرے گواہی یعنی گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں عورت نے فلاں بچے کو دودھ پلایا ہے) اور رضاعت کے سلسلہ میں گواہی یا تو دو مردوں کی معتبر ہوتی ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی بشرطیکہ وہ عادل ہوں۔ (حرمت رضاعت کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان) جو تفریق جدائی ہوتی ہے وہ قاضی کے حکم کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور جب دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں کسی میاں بیوی کے درمیان رضاعت کے رشتہ کی گواہی دیں اور اس کی بنیاد پر قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دے تو عرت کو کچھ نہیں ملے گا بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو اور اگر جماع ہو چکا ہوگا تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہوگی وہ مہر خاوند پر واجب ہوگا

اور نفقہ وسکنہ یعنی کھانے پینے کا خرچ اور رہنے کے لیے مکان واجب نہیں ہوگا۔ اگر دو عادل مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں نے نکاح ہو جانے کے بعد شادی شدہ عورت کے سامنے گواہی دی اور کہا کہ شوہر کے ساتھ تمہارا رشتہ رضاعت ثابت ہوتا ہے) تو اس عورت کے لیے شوہر کے ساتھ رہنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ شہادت صحیح ہے بایں طور کہ جس طرح یہ شہادت اگر قاضی کے سامنے دی جاتی تو رضاعت ثابت ہو جاتی اور وہ دونوں کے درمیان تفریق کرا دیتا ہے) اسی طرح جب یہ شہادت عورت کے سامنے آئے گی تو اس کا حکم بھی وہ یہی ہوگا اور اگر رضاعت کی یہ خبر صرف ایک شخص دے اور اس عورت کے دل میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے تو شوہر سے پرہیز کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہے۔ ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد ایک دوسری عورت نے آ کر ان دونوں میاں بیوی سے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اس مسئلہ کی چار صورتیں ہوں گی۔- 1 اگر دونوں میاں بیوی نے اس عورت کا اعتبار کر لیا تو نکاح فاسد ہو جائے گا اور عورت کو کچھ مہر نہیں ملے گا بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو۔- 2 اگر دونوں میاں بیوی نے اس عورت کا اعتبار نہ کیا تو نکاح بحالہ باقی رہے گا لیکن اگر وہ عورت جس نے رشتہ رضاعت کی خبر دی ہے) عادل ہے تو پھر احتیاط کا تقاضہ یہی ہوگا کہ خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ دے اب اگر اس نے چھوڑ دیا تو بہتر ہے کہ خاوند نصف مہر دیدے اور عورت کے لیے بہتر یہ ہے کہ کچھ نہ لے بشرطیکہ چھوڑنا جماع سے پہلے ہو اور اگر چھوڑنے سے پہلے جماع ہو چکا ہو تو مرد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کا پورا مہر بھی دیدے اور عدت کے ایام پورے ہونے تک نفقہ وسکنہ بھی دے اور عورت کے لیے بہتر یہ ہے کہ مہر مثل و مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہو وہ لے لے اور نفقہ وسکنہ نہ لے اور اگر خاوند نے بیوی کو نہیں چھوڑا

یعنی اس نے طلاق نہیں دی) تو بیوی کو خاوند کے پاس رہنا جائز ہے اسی طرح اگر دو عورتوں نے یا ایک مرد اور ایک عورت نے یا دو غیر عادل مردوں نے یا غیر عادل ایک مرد اور دو عورتوں نے رضاعت کی گواہی دی تو اس کا بھی یہی حکم ہوگا یعنی خاوند کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔ 3 اگر خاوند نے اس عورت کا اعتبار کیا اور بیوی نے اعتبار نہیں کیا تو نکاح فاسد ہو جائے گا اور مہر دینا واجب ہوگا۔ 4 اگر بیوی نے اس عورت کا اعتبار کیا مگر خاوند نے اس کا اعتبار نہیں کیا تو نکاح بحالہ باقی رہے گا لیکن بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خاوند سے قسم کھلوائے کہ وہ واقعتہً اس عورت کی بات کو صحیح نہیں سمجھتا) اور اگر خاوند قسم کھانے سے انکار کر دے تو دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی۔ ایک مرد نے کسی عورت سے نکاح کیا اور پھر کہنے لگا کہ یہ میری رضاعی بہن ہے یا اس کی طرف اسی قسم کے کسی اور رضاعی رشتہ کی نسبت کی اس کے بعد اس نے کہا کہ مجھے وہم ہو گیا تھا میں نے جو کچھ کہا تھا غلط تھا تو استحساناً ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کرائی جائے گی بشرطیکہ وہ اپنی اس دوسری بات پر قائم رہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا غلط ہے) اور اگر وہ اپنی پہلی بات پر قائم رہے اور یہ کہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا صحیح ہے تو اس صورت میں دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی پھر اس کے بعد وہ اپنی پہلی بات سے انکار کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر عورت نے اپنے خاوند کی اس بات کی تصدیق کر دی تو اس کو کچھ مہر نہیں ملے گا بشرطیکہ اس کے ساتھ جماع نہ ہوا ہو) اور اگر اس عورت کے ساتھ جماع ہو چکا ہو اور وہ اپنے خاوند کی اس بات کی تصدیق نہ کرے تو مرد پر اس کا پورا مہر اور نفقہ و سکنہ واجب ہوگا۔ اور اگر مرد نے کسی عورت کے بارے میں اس سے نکاح کرنے سے پہلے یہ کہا کہ یہ میری رضاعی بہن ہے یا رضاعی ماں ہے اور پھر بعد میں کہنے لگا

مجھے وہم ہو گیا تھا یا مجھ سے چوک ہو گئی تھی (یعنی میں نے پہلے جو کچھ کہا تھا غلط ہے) تو اس شخص کو اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہو گا۔ اور اگر اپنی سابقہ بات پر قائم رہا یعنی بعد میں اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا وہ صحیح ہے تو اس صورت میں اس عورت سے اس کو نکاح کرنا جائز نہیں ہو گا اور اگر وہ اس کے باوجود نکاح کرلے تو ان دونوں کے درمیان جدائی کرادی جائے گی اور اگر وہ اپنے سابقہ اقرار ہی سے مکر جائے (یعنی یہ کہنے لگے کہ میں نے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ یہ میری رضاعی ماں یا بہن ہے) لیکن دو شخص اس بات کی گواہی دیں کہ اس نے اقرار کیا تھا تو پھر اس صورت میں ان کے درمیان جدائی کرادی جائے گی۔ اگر کسی عورت نے کسی مرد کے بارے میں اقرار کیا کہ یہ میرا رضاعی باپ رضاعی بھائی یا رضاعی بھتیجا ہے لیکن مرد نے اس کا انکار کیا اور اس کے بعد پھر عورت نے بھی اپنے قول کی تردید کی اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی تو اس عورت سے نکاح جائز ہو جائے گا اور اسی طرح اگر مرد نے اس عورت سے نکاح کر لیا قبل اس کے کہ وہ عورت اپنے قول کی تردید کرتی تو نکاح صحیح ہو گا۔ اگر کسی مرد نے کسی عورت سے جو اس کے نکاح میں ہو اپنے نسبی رشتہ کا اقرار کیا یعنی یوں کہا کہ یہ عورت میری حقیقی ماں ہے یا حقیقی بہن ہے یا حقیقی بیٹی ہے اور اس عورت کا نسب کسی کو معلوم نہیں ہے نیز وہ مرد یہ صلاحیت رکھتا ہے (یعنی اس کے بارے میں یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ عورت اس کی ماں یا بیٹی ہو تو) اس مرد سے دوبارے پوچھا جائے گا اب اگر وہ یہ کہے کہ مجھے وہم ہو گیا تھا یا میں چوک گیا تھا، یا میں نے غلط کہا تھا تو استحساناً ان کا نکاح باقی رہے گا اور اگر دوبارہ پوچھے جانے پر اس نے یہ کہا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہی صحیح ہے تو پھر دونوں میں تفریق کرادی جائے گی۔ اور اگر مرد یہ صلاحیت نہیں رکھتا یعنی ان دونوں کی عمر میں اس قدر تفاوت ہے کہ وہ اس بات کا امکان نہیں

رکھتا) کہ وہ عورت جس عمر کی ہے اس عمر کی کوئی عورت اس کی حقیقی ماں یا اس کی حقیقی بہن ہو سکے تو نسب ثابت نہیں ہوگا اور ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے گی اور اگر مرد نے اپنی بیوی کے بارے میں کہا کہ یہ میری حقیقی لڑکی ہے اور پھر بعد میں اپنی اس بات کی تردید بھی نہیں کی بلکہ اس پر اصرار کرتا رہا حالانکہ لوگوں کو اس لڑکی کا نسب معلوم ہے (یعنی دنیا جانتی ہے کہ یہ لڑکی اس کی نہیں ہے بلکہ دوسرے کی ہے) تو ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے گی اور اسی طرح اگر اس نے یہ کہا کہ یہ میری حقیقی ماں ہے حالانکہ لوگوں کو اس کا نسب معلوم ہے (یعنی سب جانتے ہیں کہ یہ اس کی ماں نہیں ہے) تو اس صورت میں بھی دونوں کے درمیان تفریق نہیں کرائی جائے گی

چوتھا سبب جمع کرنا:

یعنی وہ عورتیں جو دوسری عورتوں کے ساتھ جمع ہو کر محرمات میں سے ہو جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔(۱) اجنبی عورتوں کو جمع کرنا (۲) ذوات الارحام کو جمع کرنا پہلی قسم یعنی اجنبی عورتوں کو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جس قدر نکاحوں کی اجازت دی ہے ان سے زیادہ نکاح کرنا چنانچہ شریعت نے آزاد مرد کو ایک وقت میں چار نکاح تک کی اجازت اور غلام کو ایک وقت میں دو نکاح تک کی اجازت دی ہے لہٰذا کسی آزاد شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کو جمع کرے (یعنی چار سے زیادہ عورتوں کو اپنی بیوی بنائے) اور غلام کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں دو سے زیادہ عورتوں کو جمع کرے آزاد شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ایک وقت میں جتنی چاہے بغیر نکاح باندیاں رکھے باندیاں رکھنے کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے لیکن غلام کو بغیر نکاح باندی رکھنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا

آقا اجازت دیدے آزاد شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اور وہ چار عورتیں خواہ آزاد ہوں خواہ باندیاں ہوں اور آزاد دونوں ملی جلی ہوں۔ اگر کسی شخص نے پانچ عورتوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کیا تو پہلی چار کا نکاح جائز اور پانچویں کا باطل ہوگا اور اگر پانچوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو پانچوں کا نکاح باطل ہوگا اسی طرح اگر کسی غلام نے تین عورتوں سے نکاح کیا تو یہی تفصیل ہوگی کہ ان تینوں سے یکے بعد دیگرے نکاح کرنے کی صورت میں تو پہلی دونوں کا نکاح صحیح ہو جائے گا اور تیسری کا باطل ہوگا اور اگر تینوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو تینوں کا نکاح باطل ہوگا۔ اگر کسی حربی کافر نے پانچ کافرہ عورتوں سے نکاح کیا اور پھر وہ سب یعنی پانچوں بیویاں اور شوہر مسلمان ہو گئے تو اگر یہ پانچوں نکاح یکے بعد دیگرے ہوئے تھے تو پہلی چار بیویاں جائز رہیں گی اور پانچویں بیوی سے جدائی کرادی جائے گی اور اگر پانچوں نکاح ایک ہی عقد میں ہوئے تھے تو پانچوں کا نکاح باطل ہو جائے گا اور ان پانچوں سے شوہر کی جدائی کرادی جائے گی۔ اگر کسی عورت نے ایک عقد میں دو مردوں سے نکاح کیا اور ان میں سے ایک شخص کے نکاح میں پہلے سے چار عورتیں تھیں تو اس کا نکاح اس دوسرے شخص کے ساتھ صحیح ہوگا (جس کے نکاح میں پہلے چار بیویاں نہیں تھیں اور اگر ان دونوں کے نکاح میں پہلے سے چار بیویاں تھیں یا ان میں سے کسی ایک کے بھی نکاح میں چار عورتیں نہیں تھیں تو یہ نکاح کسی کے ساتھ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ جمع کرنے کی دوسری قسم یعنی ذوات الارحام کو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھا جائے گا جو آپس میں ذی رحم اور نسبی رشتہ دار ہوں چنانچہ دو بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے اسی طرح دو بہنوں کو باندی بنا کر ان سے جماع کرنا بھی حرام ہے یعنی اگر دو بہنیں بطور باندی کسی کی

ملکیت میں ہوں تو دونوں سے جماع نہ کیا جائے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے خواہ وہ دونوں نسبی حقیقی بہنیں ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں۔ اس بارے میں اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ ایسی دو عورتیں جو ایک دوسرے کی رشتہ دار ہوں اور ایسا رشتہ ہو کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو مرد فرض کرلیا جائے تو آپس میں ان دونوں کا نکاح درست نہ ہو خواہ وہ رشتہ نسبی حقیقی ہو یا رضاعی ہو تو ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہوتا لہٰذا جس طرح دو حقیقی یا رضاعی بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے اسی طرح لڑکی اور اس کی حقیي یا رضاعی پھوپھی کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا حرام ہے ایسے ہی کسی لڑکی اور اس کی حقیقی یا رضاعی خالہ یا اسی قسم کی کسی اور رشتہ دار کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں کسی عورت اور اس کے پہلے خاوند کی لڑکی کو جو اس عورت کے بطن سے نہیں ہے) بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہے کیونکہ اگر اس عورت کو مرد فرض کرلیا جائے تو اس کے شوہر کی اس لڑکی سے اس کو نکاح کرنا جائز ہوگا بخلاف اس کے عکس کے کہ اگر اس لڑکی کو مرد فرض کرلیا جائے تو اس کے لیے اس عورت یعنی باپ کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا) اسی طرح کسی عورت اور اس کی باندی کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز ہے بشرطیکہ پہلے اس باندی سے نکاح کیا ہو۔

اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا تو نکاح باطل ہوگا اور ان دونوں کو ان کے شوہر سے جدا کرادیا جائے گا اور پھر یہ جدائی اگر دخول یعنی جماع سے پہلے ہوگی تو ان دونوں کو مہر کے طور پر کچھ نہیں دلوایا جائے گا اور اگر جدائی دخول کے بعد ہوگی تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہوگی وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو دیا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے مختلف عقد میں یعنی یکے بعد دیگرے نکاح کیا تو جو نکاح بعد میں ہوگا وہ فاسد ہو جائے گا

اور شوہر کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کرے اگر وہ خود سے علیحدگی اختیار نہ کرے اور قاضی کو اس کا علم ہو جائے تو قاضی علیحدگی کرادے۔ اور پھر یہ علیحدگی اگر دخول جماع سے پہلے واقع ہوگئی تو علیحدگی کے احکام (یعنی مہر وعدت وغیرہ) میں سے کوئی حکم نافذ نہیں ہوگا اور اگر دخول کے بعد علیحدگی واقع ہوگئی تو مہر مثل اور مہر متعین میں سے جس کی مقدار کم ہوگی وہ مہر مل جائے گا اور اس پر عدت واجب ہوگی اور اگر بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب ثابت ہوگا اور اس شخص کو اپنی بیوی یعنی پہلی منکوحہ سے اس وقت تک علیحدہ رہنا ہوگا جب تک کہ اس کی بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے اور اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے دو عقدوں میں یعنی یکے بعد دیگرے نکاح کرلیا مگر یہ معلوم نہیں کہ کس بہن سے پہلے اور کس بہن سے بعد میں نکاح کیا تھا تو ایسی صورت میں شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ وہ بیان کرے اگر وہ بیان کردے کہ فلاں بہن سے پہلے اور فلاں بہن سے بعد میں نکاح کیا تھا تو اس بیان کے مطابق عمل کیا جائے (یعنی پہلی کا نکاح باقی اور دوسری کا نکاح باطل قرار دیا جائے اور اگر شوہر بھی بیان نہ کرسکے تو پھر قاضی ان دونوں ہی سے شوہر کی علیحدگی کرادے، علیحدگی کے بعد ان دونوں کو نصف مہر ملے گا بشرطیکہ دونوں کا مہر برابر ہو اور عقد کے وقت متعین ہوا ہو اور یہ علیحدگی بھی جماع سے پہلے واقع ہوئی ہو اور اگر دونوں کا مہر برابر نہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے مہر کا چوتھائی حصہ ملے گا اور اگر عقد کے وقت مہر متعین نہ ہوا تو آدھے مہر کی بجائے ایک جوڑا کپڑا دونوں کو دیا جائے گا۔ اور اگر یہ علیحدگی جماع کے بعد ہوئی ہو تو ہر ایک کو اس کا مہر پورا ملے گا۔ اور ابو جعفر ہندوانی فرماتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ کا یہ حکم اس وقت ہوگا جب کہ ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعوی کرے کہ پہلے مجھ سے نکاح ہوا تھا اور گواہ کی ایک کے بھی پاس نہ ہوں تو دونوں کو نصف مہر دلایا جائے گا لیکن اگر

دونوں یہ کہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم میں سے کس کا نکاح پہلے ہوا ہے تو ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا جب تک کہ دونوں کسی ایک بات پر متفق ہو کر صلح نہ کرلیں اور دونوں کے صلح کی صورت یہ ہوگی کہ وہ دونوں قاضی کے پاس جا کر یہ کہیں کہ ہم دونوں کا مہر ہمارے خاوند پر واجب ہے اور ہمارے اس مطالبہ میں کوئی تیسرا دعوی دار شریک نہیں ہے (یعنی ہمارے خاوند پر مہر کی جو رقم واجب ہے اس میں ہم دونوں کے علاوہ اور کسی تیسری عورت کا کوئی حق نہیں ہے) لہٰذا ہم دونوں اس بات پر صلح و اتفاق کرتی ہیں کہ نصف مہر لے لیں اس کے بعد قاضی فیصلہ کر دے گا اور اگر ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنا نکاح پہلے ہونے پر گواہ پیش کئے تو مرد پر نصف مہر واجب ہوگا جو دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا اس حکم میں تمام علماء کا اتفاق ہے نیز دو بہنوں کے سلسلہ میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایسی تمام عورتوں میں بھی جاری ہوں گے جن کا جمع کرنا (یعنی جن کو یک وقت اپنے نکاح میں رکھنا) حرام ہے اور اگر یہ شخص یعنی جس نے دو بہنوں سے ایک عقد میں نکاح کر لیا تھا اور یہ نکاح باطل ہونے کی وجہ سے ان دونوں بہنوں اور اس کے درمیان علیحدگی کرا دی تھی) ان دونوں بہنوں کے علیحدہ ہو جانے کے بعد پھر ان دونوں میں سے کسی ایک سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کرسکتا ہے بشرطیکہ علیحدگی جماع سے پہلے ہوئی ہو اور اگر یہ علیحدگی جماع کے بعد ہوئی تھی تو اس صورت میں دونوں بہنوں کی عدت گزر جانے سے پہلے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر ایک عدت میں ہے اور دوسری کی عدت پوری ہوگئی ہے تو اس بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا جو عدت میں ہے دوسری سے اس وقت تک نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک اس بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے جو عدت میں ہے۔ اور اگر علیحدگی سے پہلے ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جماع ہو گیا تھا تو اس

بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا جس سے جماع ہو چکا تھا اور اگر اس بہن سے نکاح کرنا چاہے جس سے جماع نہیں ہوا تھا تو) اس سے اس وقت تک نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک اس بہن کی عدت پوری نہ ہو جائے جس سے جماع ہوا تھا، ہاں اگر اس بہن کی عدت پوری ہو جائے جس سے جماع ہوا تھا تو پھر ان دونوں میں سے جس سے چاہے نکاح کر سکتا ہے۔ جس طرح بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے اسی طرح بیک وقت دو باندی بہنوں سے جنسی لطف حاصل کرنا یعنی مساس و جماع کرنا بھی جائز نہیں ہے (یعنی اگر کسی شخص کی ملکیت میں بیک وقت دو بہنیں بطور باندی ہوں تو وہ ان دونوں سے جنسی تلذذ حاصل نہ کرے بلکہ ان میں سے کسی ایک ہی سے مساس و جماع وغیرہ کرے) کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے جنسی لطف لینے کے بعد دوسری بہن حرام ہو جائے گی اس دوسری بہن سے اسی وقت جنسی لطف حاصل کر سکتا ہے جب کہ پہلی بہن کو اپنے اوپر حرام کرلے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک باندی خریدی اور اس سے جماع کرلیا پھر اس کے بعد اس کی بہن کو خرید لیا تو صرف پہلی ہی سے جماع کر سکتا ہے دوسری سے جماع اس وقت تک حرام ہوگا جب تک کہ پہلی کو اپنے لیے حرام نہ کرلے اور حرام کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو کسی سے اس کا نکاح کردے یا اپنی ملکیت سے نکال دے یا آزاد کردے یا کسی کو ہبہ کردے یا فروخت کردے یا صدقہ کردے اور یا مکاتب بنادے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ بعض حصہ کو آزاد کرنا کل حصہ کو آزاد کرنے کے مترادف ہے (مثلاً کسی نے اپنی باندی سے کہا کہ میں نے تیرا آدھا حصہ یا تیرا چوتھائی حصہ آزاد کیا تو یہ کل کو آزاد کرنے کے مرادف ہوگا اور اس سے جماع کرنا ناجائز ہوگا) اسی طرح اس کے بعض حصہ کو اپنی ملکیت سے نکالنا کل کو اپنی ملکیت سے نکالنے کے مرادف

ہوگا۔اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ پہلی مجھ پر حرام ہے تو اس کو کہہ دینے کی وجہ سے دوسری سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا جیسا کہ ایک کے حیض ونفاس اور احرام وروزہ کی وجہ سے دوسری حلال نہیں ہوجاتی یعنی جس طرح اگر ایک بہن حیض وغیرہ کی حالت میں حرام ہوجاتی ہے تو محض اس کی وجہ سے اس کی دوسری بہن حلال نہیں ہوجاتی اسی طرح فقط اتنا کہہ دینا کہ پہلی میرے لیے حرام ہے دوسری کو حلال کردینے کے لیے کافی نہیں ہے) اگر کسی شخص نے ان دونوں بہنوں سے جماع کرلیا جو بطور باندی اس کی ملکیت میں تھیں تو اس کے بعد ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ جماع نہیں کرسکتا تاوقتیکہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دوسری کو اپنے لیے حرام نہ کرلے۔اگر کسی شخص نے ان دونوں باندی بہنوں میں سے کہ جو بیک وقت اس کی ملکیت میں تھیں کسی ایک کو فروخت کردیا لیکن وہ کسی عیب کی وجہ سے لوٹ کر آگئی یا اس کو ہبہ کردیا تھا لیکن اپنے ہبہ کو ختم کرکے اسے واپس لے لیا یا اس کا نکاح کردیا تھا مگر اس کے شوہر نے اس کو طلاق دیدی اور اس کی عدت بھی پوری ہوگئی تو ان صورتوں میں وہ شخص ان میں سے کسی ایک سے بھی جماع نہ کرے تاوقتیکہ دوسری بہن کو اپنے لیے حرام نہ کرلے۔کسی شخص نے ایک باندی سے نکاح کرلیا اور اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے اس کی بہن کو خرید لیا تو اس کے لیے خریدی ہوئی باندی سے جنسی لطف حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ فراش یعنی زوجیت کا استحقاق نفس نکاح سے ثابت ہوجاتا ہے اس لیے اگر وہ خریدی ہوئی باندی سے جماع کرے گا تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے فراش یعنی زوجیت کا استحقاق) میں دو بہنوں کو جمع کیا اور یہ حرام ہے۔اگر ایک شخص نے اپنی باندی سے جماع کرلیا اور اس کے بعد اس کی بہن سے نکاح کیا تو یہ نکاح صحیح ہوگا اور جب نکاح صحیح ہوگیا تو اب وہ باندی سے جماع نہ کرے گا اگرچہ ابھی تک منکوحہ سے

جماع نہ کیا ہو اور اس منکوحہ سے اس وقت تک جماع نہ کرے جب تک کہ اپنی باندی یعنی منکوحہ کی بہن کو مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے اپنے لیے حرام نہ کر لے اور اگر اس نے اپنی باندی کی بہن سے ایسی صورت میں نکاح کیا کہ اس باندی سے جماع نہیں ہوا ہے تو پھر منکوحہ سے جماع کر سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی باندی سے جماع کے بعد اس کی بہن سے نکاح کیا مگر وہ نکاح کسی وجہ سے فاسد ہو گیا تو محض نکاح سے وہ باندی حرام نہ ہوگی ہاں اگر نکاح کے بعد وہ منکوحہ سے جماع کر لے تو باندی سے جماع کرنا حرام ہو جائے گا۔ اگر دو بہنوں نے کسی شخص سے یہ کہا کہ ہم نے اتنے مہر کے عوض تمہارے ساتھ اپنا نکاح کیا اور یہ الفاظ دونوں کی زبان سے ایک ساتھ ادا ہوئے اور اس شخص نے ان میں سے ایک کا نکاح قبول کر لیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا اور اگر پہلے خود اس شخص نے ان دونوں بہنوں سے یہ کہا کہ میں نے تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ہزار روپیہ کے عوض اپنا نکاح کیا اور ان میں سے ایک نے قبول کر لیا اور دوسری نے انکار کر دیا تو دونوں کا نکاح باطل ہوگا۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنا نکاح کروانے کے لیے ایک آدمی کو اپنا وکیل بنایا اور پھر کسی دوسرے آدمی کو بھی اسی کام کے لیے اپنا وکیل بنا دیا اس کے بعد ان دونوں میں سے ہر ایک وکیل نے ایک ایک عورت سے اس شخص کا نکاح ان عورتوں کی اجازت کئے بغیر کر دیا اور پھر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں عورتیں رضاعی بہنیں ہیں، نیز ان دونوں وکیلوں کی زبان سے نکاح کے الفاظ ایک ساتھ ادا ہوئے تھے تو اس صورت میں دونوں عورتوں کے نکاح باطل ہوں گے، اسی طرح اگر یہ دونوں نکاح ان عورتوں کی اجازت سے ہوں یا ایک کی اجازت سے اور ایک کی بغیر اجازت تو بھی یہی حکم ہوگا۔ ایک شخص مثلاً زید نے دو بہنوں سے نکاح کیا حالانکہ ان میں سے ایک بہن کسی

دوسرے شخص کے نکاح میں تھی یا کسی دوسرے شوہر کے طلاق دینے کی وجہ سے ابھی عدت کے دن گزار رہی تھی تو اس صورت میں زید کا نکاح صرف دوسری بہن کے ساتھ صحیح ہوگا۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی یا ایک طلاق بائن یا تین طلاق دی یا نکاح فاسد ہو جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہو گیا یا شبہ ہو کر کسی عورت سے جماع کر لیا غرضیکہ ان میں سے کسی بھی صورت کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ عورت کہ عدت کے دن گزار رہی ہو تو اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے وہ شخص نکاح نہیں کر سکتا اور جس طرح اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں اسی طرح اس کی کسی بھی ایسی رشتہ والی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں جو اس کے لیے ذوات الارحام میں سے ہو اور دونوں کا بیک وقت کسی ایک کے نکاح میں رہنا حرام ہو (مثلاً اس کے زمانہ عدت میں اس کی بھتیجی سے نکاح کرنا جائز نہیں) اور اسی طرح اس کے زمانہ عدت میں اس کے علاوہ مزید چار عورتوں سے نکاح کرنا بھی حلال نہیں۔ اگر کسی شخص نے اپنی باندی کو جو ام ولد یعنی اس کے بچہ کی ماں تھی آزاد کر دیا تو جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے اس کی بہن سے شادی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ البتہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کے زمانہ عدت میں اس کے ماسوا چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہوگا جب کہ صاحبین یعنی حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس کے زمانہ عدت میں اس کی بہن سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔ اگر کسی شوہر نے کہا کہ میری مطلقہ بیوی نے بتایا کہ اس کی عدت کے دن پورے ہو گئے ہیں (لہذا میں اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہوں) تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ طلاق دیئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟ اگر طلاق دیئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے جس میں عدت پوری ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں تو شوہر کا قول معتبر نہیں ہوگا اس طرح اس کی مطلقہ

بیوی کا یہ کہنا کہ میری عدت پوری ہوگئی ہے قابل اعتبار نہ ہوگا ہاں اگر وہ کوئی ایسی صورت بیان کرے جس میں عدت پوری ہونے کا احتمال ہو جیسے وہ یہ بیان کرے کہ طلاق کے دوسرے دن میرا حمل جس کے اعضاء پورے تھے ساقط ہوگیا ہے تو اس صورت میں اس کا قول معتبر ہوگا۔ اور طلاق کو اتنا عرصہ گزر چکا ہو کہ اس میں عدت پوری ہونے کا امکان ہو تو اگر عورت اپنے شوہر کے قول کی تصدیق کر دے یا اس مجلس میں موجود نہ ہو تو شوہر کا قول معتبر ہوگا اور اس کیلئے بیک وقت چار دوسری عورتوں سے یا سابقہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہوگا بلکہ حنفی علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اگر بیوی شوہر کو جھٹلا دے تو بھی شوہر کا قول معتبر ہوگا۔ کسی شخص کی بیوی مرتد ہو کر دارالحرب چلی جائے تو شوہر کے لیے اس کی عدت پوری ہونے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے جیسا کہ اس کے مرجانے کی صورت میں اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز ہے پھر اگر وہ مرتدہ عورت مسلمان ہو کر دارالحرب سے لوٹے اور اس کا شوہر اس کی بہن سے نکاح کر چکا ہو تو اس کی بہن کا نکاح فاسد نہیں ہوگا اور اگر وہ بہن کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے لوٹے تو حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو اس صورت میں بھی وہ شخص اس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد یہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص اس صورت میں اس کی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا۔ ایسی دو عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے جو ایک دوسرے کی پھوپھی یا ایک دوسرے کی خالہ ہوں اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید نے عمرو کی ماں سے اور عمرو نے زید کی ماں سے نکاح کیا اور ان دونوں کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں تو ان میں ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کی پھوپھی ہوگی یا یہ کہ مثلاً زید نے عمرو کی لڑکی سے اور عمرو نے زید کی لڑکی سے نکاح کیا اور ان کے ہاں لڑکیاں پیدا

ہوئیں تو ان میں سے ہر ایک لڑکی کی خالہ ہوگی اور ان دونوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے ایسی دو عورتوں سے نکاح کرلیا جن میں سے ایک تو اس شخص کے لیے حرام تھی خواہ اس کی محرم ہونے کی وجہ سے یا شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اور یا بت پرست ہونے کی وجہ سے اور دوسری عورت ایسی تھی جس سے اس شخص کو نکاح کرنا جائز تھا تو ایسی صورت میں اس کا اس عورت کے ساتھ نکاح صحیح ہوگا جو اس کے لیے حلال تھی اور اس عورت کے ساتھ نکاح باطل ہوگا جو اس کے لیے حرام تھی اور مقرر کردہ کل مہر اسی عورت کو ملے گا جس کے ساتھ نکاح صحیح ہوا ہے یہ حکم امام اعظم ابوحنیفہ کے قول کے مطابق ہے اور اگر اس شخص نے نکاح کے بعد اس عورت سے جماع کرلیا جس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے حلال نہیں تھا تو اس کو مہر مثل ملے گا خواہ وہ کسی مقدار میں ہو اور مقرر کردہ کل مہر اس عورت کو ملے گا جس کے ساتھ نکاح کرنا حلال تھا۔

پانچواں سبب مملوکہ ہونا :

یعنی وہ باندیاں جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے جب کہ پہلے سے آزاد عورت نکاح میں ہو اسی طرح آزاد عورت سے اور باندی سے ایک ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ مدبر یعنی وہ لونڈی جس سے اس کا آقا کہہ دے کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہو جائے گی) اور ام ولد (یعنی وہ باندی جس کے پیٹ سے اس کے آقا کا بچہ پیدا ہو) اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر کسی شخص نے ایک عقد میں ایک آزاد عورت اور ایک باندی سے نکاح کیا تو آزاد عورت کا نکاح صحیح ہوگا اور باندی کا نکاح باطل ہو جائے گا بشرطیکہ وہ آزاد عورت ایسی ہو جس سے نکاح کرنا اس کے لیے جائز تھا اگر وہ آزاد عورت ایسی ہو جس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز نہیں تھا جیسے وہ اس کی پھوپھی یا

خالہ تھی تو پھر باندی کا نکاح باطل نہیں ہوگا اور اگر کسی شخص نے پہلے باندی سے نکاح کیا اور پھر آزاد عورت سے نکاح کیا تو دونوں کا نکاح صحیح ہوگا۔ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو جو ایک آزاد عورت ہے طلاق بائن یا تین طلاق دیدیں اور وہ ابھی تک اپنی عدت کے دن گزار رہی تھی کہ اس شخص نے ایک باندی سے نکاح کرلیا تو اس صورت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا قول تو یہ ہے کہ باندی کا نکاح جائز نہیں ہوگا اور امام ابو یوسف و امام محمد یہ فرماتے ہیں کہ جائز ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طلاق رجعی کی عدت کے دوران کسی باندی سے نکاح کرلے تو اس کے بارے میں متفقہ طور پر یہ مسئلہ ہے کہ اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص نے ایک باندی اور ایک ایسی آزاد عورت کے ساتھ نکاح کیا جو نکاح فاسد یا جماع بشبہ کی عدت کے دن گزار رہی تھی تو باندی کا نکاح صحیح ہو جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اپنی منکوحہ باندی کی طلاق رجعی کی عدت کے دوران کسی آزاد عورت سے نکاح کیا اور پھر اپنی اس منکوحہ باندی سے رجوع کرلیا (یعنی اپنی دی ہوئی طلاق واپس لے کر پھر اسے بیوی بنا لیا) تو یہ جائز ہوگا۔ کسی غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر ایک آزاد عورت سے نکاح کیا اور اس سے جماع بھی کرلیا اور پھر آقا کی اجازت کے بغیر کسی باندی سے بھی نکاح کرلیا اور اس کے بعد اس کے آقا نے اس کو دونوں سے نکاح کی اجازت دیدی تو اس صورت میں آزاد عورت کا نکاح صحیح اور باندی کا باطل ہو جائے گا۔ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کی باندی سے اس کی اجازت کے بغیر نکاح کرلیا لیکن اس کے ساتھ جماع نہیں کیا اور پھر کسی آزاد عورت سے بھی نکاح کرلیا اور اس کے بعد باندی کے مالک نے نکاح کی اجازت دیدی تو اس صورت میں بھی باندی کا نکاح صحیح نہیں ہوگا اور اگر کسی شخص نے ایک باندی سے اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اور پھر اس

باندی کی لڑکی سے جو آزاد تھی نکاح کرلیا اور اس کے بعد باندی کے مالک نے باندی کے نکاح کی اجازت دیدی تو لڑکی کا نکاح صحیح ہوگا باندی کا نکاح صحیح نہ ہوگا۔ ایک شخص مثلاً زید کے ایک بالغہ لڑکی اور ایک بالغہ باندی ہے زید نے کسی شخص سے کہا کہ میں نے دونوں کا نکاح اتنے مہر کے عوض تمہارے ساتھ کردیا اس شخص نے باندی کا نکاح قبول کرلیا تو یہ نکاح باطل ہوگا اور اگر اس کے بعد اس شخص نے آزاد لڑکی کا نکاح قبول کرلیا تو یہ نکاح جائز ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود کسی باندی سے نکاح کرلے اور وہ باندی خواہ مسلمان ہو یا اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی) تو نکاح صحیح ہو جائے گا لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے استطاعت وقدرت رکھنے کے باوجود باندی سے نکاح کرنا مکروہ ہے۔ اگر کسی شخص نے ایک ہی عقد میں چار باندیوں اور پانچ آزاد عورتوں سے نکاح کیا تو صرف باندیوں کا نکاح صحیح ہوگا۔

چھٹا سبب تعلق حق غیر :

یعنی ان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے جن کے ساتھ کسی دوسرے مرد کا حق متعلق ہو۔ چنانچہ جو عورت کسی کے نکاح میں ہو، یا کسی کی عدت میں ہو اور عدت خواہ طلاق کی ہو یا موت کی یا نکاح فاسد کی کہ جس میں جماع ہوگیا تھا اور یا شبہ نکاح کی تو ایسی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اگر کسی شخص نے انجانے میں دوسرے کی منکوحہ عورت سے نکاح کرلیا اور اس کے ساتھ جماع بھی کرلیا تو اب جب کہ ان میں جدائی ہوگی تو عورت پر عدت واجب ہوگی اور اگر وہ شخص جانتا تھا کہ یہ دوسرے کی بیوی ہے تو جدائی کے بعد اس عورت پر عدت واجب نہیں ہوگی اور اس کے خاوند کے لیے اس سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا اور اگر اس کا خاوند اسے طلاق دیدے تو

صاحب عدت کے لیے زمانہ عدت میں اس سے نکاح کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ عدت کے علاوہ اور کوئی مانع موجود نہ ہو۔ جس عورت کو زنا کا حمل ہو اس سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن جب تک ولادت نہ ہو جائے خاوند کو اس سے جماع کرنا ناجائز ہے اور اسباب جماع یعنی بوسہ اور مساس وغیرہ بھی ناجائز ہیں اور اگر اس حاملہ زنا سے وہ شخص نکاح کرے جس نے اس کے ساتھ زنا کیا تھا تو اس کا نکاح بھی صحیح ہوگا اور وہ وضع حمل سے قبل جماع بھی کرسکتا ہے اور وہ عورت نفقہ کی مستحق ہوگی۔ ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا کچھ عرصہ بعد میں عورت کا حمل ساقط ہوگیا جس کے اعضاء ظاہر ہو چکے تھے اب اگر یہ اسقاط حمل نکاح سے چار ماہ یا اسے زائد عرصہ بعد ہوا ہے تو نکاح جائز ہوگا اور اگر چار مہینہ سے کم عرصہ میں یہ اسقاط ہوا ہے تو نکاح جائز نہیں ہوگا اس لیے کہ حمل کے اعضاء چار مہینہ سے کم میں ظاہر نہیں ہوتے (حاصل یہ کہ اگر اسقاط نکاح سے چار ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد ہوا ہے اور حمل کے اعضاء ظاہر ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ حمل اسی شخص کا ہے جس نے نکاح کیا ہے اور اگر چار ماہ سے کم عرصہ میں اسقاط ہوا ہے اور حمل کے اعضاء ظاہر ہیں تو پھر یہ احتمال ہوگا کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں تھی اور اس کا یہ حمل ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوتا اور ایسی حاملہ عورت جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس کا حمل فلاں شخص کے جائز نطفہ سے ہے تو متفقہ طور پر یہ مسئلہ ہے کہ اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور امام ابو یوسف نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی ایسی عورت ہو جو حربی کافر سے حاملہ ہوئی ہو اور وہ ہجرت کر کے یا باندی بنا کر دار الاسلام میں لائی گئی ہو تو اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔ لیکن جب تک اس کے ہاں ولادت نہ ہو جائے اس سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا۔ امام طحاوی نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے لیکن

حضرت امام محمد نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ اس صورت میں نکاح جائز نہیں ہوتا اسی پر امام کرخی نے اعتماد کیا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی ام ولد باندی کا نکاح کسی کے ساتھ کر دیا درآنحالیکہ وہ اپنے آقا سے حاملہ تھی تو یہ نکاح باطل ہوگا ہاں اگر وہ حاملہ نہ ہو تو پھر نکاح صحیح ہوگا۔ ایک شخص نے اپنی باندی سے جماع کیا اور اس کے بعد کسی سے اس کا نکاح کر دیا تو نکاح جائز ہو جائے گا لیکن آقا کے لیے یہ مستحب ہوگا کہ وہ اپنے نطفہ کی حفاظت کی خاطر اس باندی سے استبراء کرائے (یعنی ایک حیض آنے کے بعد اس کو خاوند سے جماع کرانے دے اور جب یہ نکاح جائز ہوگیا تو خاوند کے لیے استبراء کا انتظار کئے بغیر) اس سے جماع کرنا بھی جائز ہوگا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام ابویوسف کا قول ہے اور حضرت امام محمد کا یہ قول ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس کا خاوند اس کے استبراء کے بغیر اس سے جماع کرلے۔ فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت امام محمد کا قول مبنی بر احتیاط ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ میں ائمہ کا یہ اختلاف قول اس صورت میں ہے کہ جب آقا نے باندی کا نکاح استبراء کرائے بغیر کر دیا ہو اور اگر نکاح سے پہلے استبراء ہو چکا تھا یعنی آقا سے مجامعت کے بعد باندی کو ایک حیض آگیا تھا تو اس صورت میں سب کا متفقہ قول یہی ہے کہ خاوند کو استبراء کے بغیر اس سے جماع کرنا جائز ہوگا۔ کسی شخص نے ایک عورت کو زناء کراتے دیکھا اور پھر بعد میں خود اس سے نکاح کرلیا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام ابویوسف کے نزدیک اس استبراء سے پہلے بھی اس سے جماع کرنا جائز ہوگا لیکن حضرت امام محمد کا اس صورت میں بھی یہی قول ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس کا خاوند اس سے استبراء کے بغیر جماع کرلے۔ اگر کوئی شخص اپنے لڑکے کی باندی

سے نکاح کرلے تو حنفیہ کے نزدیک یہ نکاح جائز ہوجائے گا۔ اگر کسی عورت کو قید کرکے دارالحرب سے دارالاسلام لایا گیا اور اس کا شوہر ساتھ نہیں ہے تو اس پر عدت واجب نہ ہوگی اور اس سے کوئی بھی شخص نکاح کرسکتا ہے اسی طرح اگر کوئی عورت مسلمان ہوکر دارالحرب سے ہجرت کرکے دارالاسلام آجائے تو امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اس پر بھی عدت واجب نہیں ہوگی اور اس سے کوئی بھی شخص نکاح کرسکتا ہے لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اس پر عدت واجب ہوگی۔ جب تک اس کی عدت پوری نہ ہوجائے) اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا لیکن اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس سے جماع کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہوگا جب تک کہ ایک حیض آجانے کی وجہ سے استبراء نہ ہوجائے۔

ساتواں سبب اختلاف مذہب :

یعنی وہ عورتیں جن کے مشترک ہونے کی وجہ سے ان سے نکاح کرنا حرام ہے چنانچہ آتش پرست اور بت پرست عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں خواہ وہ آزاد ہوں یا باندی اور بت پرستوں کے حکم میں وہ عورتیں بھی داخل ہیں جو سورج اور ستاروں کی پرستش کرتی ہیں یا اپنی پسندیدہ تصویروں کی پوجا کرتی ہیں یا یونانی حکماء کے نظریہ کے مطابق اللہ کے بے کار معطل ہونے کا عقیدہ رکھتی ہیں یا زندقہ (یعنی دہریت) میں مبتلا ہیں یا فرقہ باطنیہ اور فرقہ اباحیہ سے تعلق رکھتی ہیں فرقہ باطنیہ سے وہ فرقہ مراد ہے جو قرآن کے باطنی معنی کا عقیدہ رکھتا ہے اور فرقہ اباحیہ سے مراد وہ فرقہ ہے جس کے ہاں دنیا کا ہر کام خواہ وہ اچھا ہو یا برا کرنا جائز ہے) اسی طرح ہر اس مذہب کو ماننے والی عورت بھی اسی حکم میں داخل ہے جس کو اختیار کرنا کفر کا باعث ہو اسی طرح اپنی اس باندی سے جو آتش پرست مشرکہ ہو جماع کرنا بھی ناجائز ہے۔ مسلمان کو کتابیہ یعنی یہودی یا عیسائی

عورت سے جو دارالحرب میں رہتی ہو اور ذمیہ کافرہ یعنی مسلمانوں کے ملک میں خراج دے کر رہنے والی) عورت سے شادی کرنا جائز ہے خواہ وہ آزاد ہو یا باندی ہو لیکن اولی یہی ہے کہ ان سے بھی شادی نہ کی جائے اور نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور بغیر ضرورت کے کھایا جائے۔ اگر کسی مسلمان نے کسی یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کر لی تو اس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے عبادت خانہ (یعنی گرجا گھر وغیرہ (نہ جانے دے اور نہ اسے اپنے گھر میں شراب بنانے دے لیکن مسلمان شوہر کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اپنی عیسائی یا یہودی بیوی کو حیض ونفاس کے منقطع ہونے اور جنابت لاحق ہونے پر غسل کے لیے مجبور کرے۔ اگر کسی مسلمان نے دار الحرب میں کتابیہ حربیہ سے نکاح کر لیا تو اس کا نکاح جائز ہو جائے گا لیکن مکروہ ہوگا اور پھر اس نکاح کے بعد دونوں میاں بیوی دارالاسلام آجائیں تو دارالحرب میں کیا ہوا نکاح باقی رہے گا۔ ہاں اگر یہ صورت ہو کہ شوہر دارالاسلام آجائے اور بیوی کو وہیں چھوڑ آئے تو تباین دارین (ملک بدل جانے) کی وجہ سے دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔ جو لوگ کسی آسمانی مذہب کے پیروکار ہوں اور ان کے فرقہ کے لے آسمانی کتاب بھی ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت شیث (علیہ السلام) کے صحیفے اور حضرت داؤد (علیہ السلام) کی کتاب زبور وغیرہ تو وہ لوگ اہل کتاب میں شمار ہوں گے اور ان کی عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بھی جائز ہے اور ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا بھی حلال ہوگا۔ اگر کسی شخص کے والدین میں سے ایک تو کتابی یعنی یہودی یا عیسائی ہو اور دوسرا آتش پرست ہو تو وہ شخص اہل کتاب میں شمار کیا جائے گا۔ ایک مسلمان نے کسی کتابیہ عورت سے شادی کی اور پھر وہ عورت اپنا مذہب تبدیل کر کے) آتش پرست ہوگئی تو وہ اپنے مسلمان شوہر کے لیے حرام ہو جائے گی اور دونوں کی شادی کالعدم

قرار پائیگی اور اگر یہودی عورت سے شادی کی اور پھر وہ عیسائی ہوگئی یا عیسائی عورت سے شادی کی اور شادی کے بعد وہ یہودی ہوگئی تو اس صورت میں نکاح باقی رہے گا۔ اس بارے میں اصول وضابطہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ تبدیل مذہب کے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ خاوند بیوی میں سے جس نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب قبول کیا ہے وہ کوئی ایسا مذہب تو نہیں ہے کہ اگر وہ دونوں از سر نو شادی کریں تو اس مذہب کی وجہ سے ان کی شادی جائز نہ ہوسکے (مثلا آتش پرستی ایسا مذہب ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی آتش پرست عورت سے شادی کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا) چنانچہ اگر وہ مذہب ایسا ہوگا جس کے پیروکار اور مسلمان کے درمیان شادی بیاہ سرے سے جائز ہی نہیں ہوتا تو خاوند وبیوی میں سے جو بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اس مذہب کو قبول کرے گا شادی کالعدم ہوجائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ اگر مسلمان خاوند اور یہودی یا عیسائی بیوی میں سے کوئی بھی مجوسیت (یعنی آتش پرستی) اختیار کرلے اور اس کی وجہ سے ان دونوں کی شادی فاسد ہوجائے تو اس کے بعد کیا حکم ہوگا؟ تو اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر شادی کے فاسد ہونے کا سبب عورت بنی ہے یعنی بیوی نے مجوسیت اختیار کرلی ہے تو دونوں کے درمیان جدائی ہوجائے گی اور اسے نہ مہر ملے گا اور نہ متعہ بشرطیکہ اس نے جماع سے پہلے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو اور اگر اس نے اس وقت مجوسیت کو اختیار کیا جب کہ اس کا شوہر اس سے جماع کرچکا تھا تو پھر اس کو پورا مہر دیا جائے گا اور اگر شادی کے فاسد ہونے کا سبب مرد بنا ہے یعنی خاوند نے اپنا مذہب چھوڑ کر مجوسیت کو اختیار کرلیا ہے اور خاوند وبیوی میں جدائی ہوگئی ہے تو اسے عورت کو مقررہ مہر کا آدھا دینا ہوگا بشرطیکہ یہ صورت حال جماع سے پہلے ہی واقع ہوچکی ہو اور اگر مہر مقرر نہیں تھا تو متعہ ایک جوڑا کپڑا دینا ہوگا اور اگر جماع کے بعد ایسا ہوا تو

پھر اس عورت کو پورا مہر دینا واجب ہوگا۔ جو مسلمان مرتد ہو گیا ہو اس کا نکاح نہ تو کسی مرتدہ سے جائز ہوتا ہے نہ کسی کافرہ سے اور نہ کسی مسلمان عورت سے، اسی طرح جو مسلمان عورت مرتدہ ہو جائے اس کا نکاح بھی کسی کے ساتھ جائز نہیں ہوتا۔ کسی مسلمان عورت کی شادی نہ تو مشرک سے جائز ہوتی ہے اور نہ کتابی یعنی یہودی یا عیسائی سے۔ بت پرست و آتش پرست عورت کی شادی ہر مشرک و کافر سے صحیح ہو جاتی ہے مگر مرتد کے ساتھ صحیح نہیں ہوتی۔ ذمی کافروں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے اگرچہ ان کے مذاہب مختلف ہوں۔ مسلمان کے لیے اپنی مسلمان بیوی کی موجودگی میں کتابیہ یعنی یہودی یا عیسائی عورت) سے اور اپنی کتابیہ بیوی کی موجودگی میں مسلمان عورت سے عقد ثانی جائز ہے اور نوبت یعنی شب گزاری کے لیے باری مقرر کرنے کے سلسلے میں دونوں کے حقوق برابر ہوں گے۔

آٹھواں سبب مالک ہونا :

یعنی وہ عورتیں جو مالک ہونے کے سبب سے اپنے مملوک غلام کے لیے حرام ہیں۔ چنانچہ کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے غلام سے نکاح کرے اسی طرح اس کو اس غلام کے ساتھ بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہے جو اس کے اور کسی دوسرے شخص کے درمیان مشترک ہو۔ اگر نکاح کے بعد خاوند بیوی میں کوئی بھی ایک دوسرے کے کل یا جزء کا مالک ہو جائے تو نکاح باطل ہو جائے گا۔ اگر کسی مرد نے اپنی لونڈی سے نکاح کر لیا یا اس لونڈی سے نکاح کیا جس کا وہ جزوی مالک ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ لیکن اس بارے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے زمانہ میں لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت کا بالکل رواج نہیں رہا اور نہ آج کے دور میں وہ شرائط و قیود پائی جاتی ہیں جن کی موجودگی میں لونڈی سے جماع جائز ہوتا ہے اسی لیے بعض

علماء لکھتے ہیں کہ اگر کہیں لونڈی رکھنے کا کوئی رواج ہو تو اس سے جماع نہ کرنا چاہیے بلکہ) اس لونڈی سے نکاح کر لینا چاہیے تا کہ اگر واقعۃً لونڈی نہ ہو بلکہ آزاد عورت ہو تو نکاح کی وجہ سے اس سے جماع کرنا جائز ہو جائے اگر کسی آزاد مرد نے اپنی بیوی کو جو کسی کی باندی ہو شرط خیار کے ساتھ خرید لیا تو اس صورت میں اس کا نکاح باطل نہیں ہوگا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا قول ہے۔

نواں سبب طلاق :

یعنی وہ عورتیں جو طلاق سے حرام ہو جاتی ہیں چنانچہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو جو آزاد عورت ہو تین طلاق دیدیں تو اس کے بعد اس سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا ہاں اگر وہ عورت اپنی عدت پوری کر کے) دوسرے کسی مرد سے نکاح کرلے اور دونوں میں مجامعت ہو جائے اور پھر وہ مرد اس کو طلاق دیدے تو عدت گزرنے کے بعد پہلے شوہر کے لیے اس سے نکاح کرنا جائز ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص نے کسی باندی سے نکاح کیا اور پھر اسے دو طلاقیں دیدیں تو اس کے بعد اس سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا اور جس طرح اس سے نکاح کرنا جائز نہیں اسی طرح اس کو باندی بنا کر اس سے جماع کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ایک شخص نے کسی کی باندی سے نکاح کیا اور پھر طلاق دیدیں اس کے بعد اس کو خرید کر آزاد کر دیا اب اگر وہ اس سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اس صورت میں جائز ہوگا کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ مرد اس کے ساتھ جماع کرے اور پھر اس کو طلاق دیدے اور جب عدت کے دن پورے ہو جائیں تو وہ شخص یعنی پہلا شوہر اس سے نکاح کر لے۔

....

حدیث؛

وعن عائشة قالت :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة". رواه البخاری

......

ترجمہ؛

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ دودھ پینے کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہوتے ہیں جو پیدائش کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں (بخاری)

....

تشریح :

یعنی جو رشتے نسب کی وجہ سے ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں وہی رشتے دودھ پینے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کے لیے حرام ہو جاتے ہیں مثلاً جس طرح نسبی یعنی حقیقی بہن اپنے بھائی کے لیے حرام ہے اسی طرح رضاعی بہن بھی حرام ہے۔ ہاں کچھ مسائل ایسے ہیں جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں چنانچہ بعض صورتوں میں نسبی رشتہ اور رضاعی رشتہ کے درمیان فرق ہو جاتا ہے جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ رضاعت سے نکاح حرام ہو جاتا ہے اور نظر و خلوت اور مسافرت حلال ہو جاتی ہے (یعنی مثلاً رضاعی ماں بیٹے کے درمیان نکاح تو حرام ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کی طرف نگاہ ڈالنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں اٹھنا بیٹھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تنہا سفر کرنا جائز ہو جاتا ہے لیکن رضاعی رشتہ پر نسبی رشتہ کے تمام احکام نافذ نہیں ہوتے چنانچہ رضاعی رشتہ میں نہ تو ایک دوسرے کا وراث ہوتا ہے، نہ ایک دوسرے پر نان ونفقہ واجب ہوتا ہے، نہ ایک دوسرے کی ملکیت میں آجانے سے آزادی مل جاتی ہے اور اگر دودھ پلانیوالی اپنا دودھ پینے والے کو قتل

کر دے تو اس کے ذمہ سے اس کا قصاص بھی ساقط نہیں ہوتا چنانچہ ان تمام صورتوں میں وہ دونوں رضاعی رشتہ دار بالکل اجنبیوں کی طرح ہوتے ہیں۔

مہر کا بیان

مہر حقوق زوجیت حاصل ہونے کے اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ مہر کے نہ دینے کی نیت نہ ہونا نکاح کے صحیح ہونے کی ایک شرط ہے یعنی اگر کوئی شخص نکاح کے وقت یہ نیت کرلے کہ مہر دیا ہی نہ جائے گا تو اس کا نکاح صحیح نہ ہوگا۔ نکاح کے وقت مہر کا ذکر کرنا نکاح صحیح ہونے کے لیے شرط نہیں ہے اگر مہر کا ذکر نہ کیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا اور شوہر پر مہر مثل واجب ہوگا۔ مہر کی مقدار : نہ تو شریعت نے مہر کے لیے کسی خاص مقدار کو متعین کر کے اسے واجب قرار دیا ہے اور نہ اس کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر کی گئی ہے بلکہ اسے شوہر کی حیثیت و استطاعت پر موقوف رکھا ہے کہ جو شخص جس قدر مہر دینے کی استطاعت رکھتا ہو اسی قدر مقرر کرے البتہ مہر کی کم سے کم ایک حد ضرور مقرر کی گئی ہے تاکہ کوئی شخص اس سے کم مہر نہ باندھے، چنانچہ حنفیہ کے مسلک میں مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم (۶۲ء 30 گرام چاندی) ہے اگر کسی شخص نے اتنا مہر باندھا جو دس درہم یعنی (۶۲ء۳۰ گرام چاندی) کی قیمت سے کم ہو تو مہر صحیح نہیں ہوگا۔ حضرت امام مالک کے نزدیک کم سے کم مہر کی آخری حد چوتھائی دینار ہے اور حضرت امام شافعی و حضرت امام احمد یہ فرماتے ہیں کہ جو بھی چیز ثمن یعنی قیمت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو اس کا مہر باندھنا جائز ہے۔ ازواج مطہرات اور صاجزادیوں کا مہر : ام المومنین حضرت ام حبیبہ کے علاوہ تمام ازواج مطہرات اور حضرت فاطمہ کے علاوہ تمام صاجزادیوں کا مہر پانچ سو درہم چاندی کی مقدار ۱۰۷۵ ماشہ یعنی ایک کلو ۵۳۰

گرام ہوتی ہے۔آجکل کے نرخ کے مطابق ایک کلو ۵۳۰ گرام چاندی کی قیمت تقریباً ۹۱۸ روپے ہوتی ہے۔ام المومنین ام حبیبہ کا مہر چار ہزار درہم یا چار سو دینار تھا، چار ہزار درہم بارہ ہزار چھ سو ماشہ یعنی بارہ کلو ۲۴۷ گرام چاندی کے بقدر ہوتے ہیں اور چاندی کے موجودہ نرخ کے مطابق اس کی قیمت سات ہزار تین سو اڑتالیس (۷۳۴۸) روپیہ ہوتی ہے۔حضرت فاطمہ زہراء کا مہر چار سو مثقال نقرہ تھا، چار سو مثقال اٹھارہ سو ماشہ یعنی ایک کلو ۷۵۰ گرام چاندی کے بقدر ہوتے ہیں اور چاندی کے موجودہ نرخ کے مطابق اس کی قیمت ایک ہزار پچاس روپیہ ہوتی ہے۔اس قدر چاندی کے ساتھ روپے کی یہ مطابقت آج کل کے دور میں درست نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں روپے کی قیمت بہت زیادہ گر چکی ہے۔ ہاں ہر زمانے میں چاندی کی قیمت معلوم کر کے روپے کی تعیین کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ازواج مطہرات کے مہر کی مقدار

حدیث؛

وعن أبي سلمة قال :سألت عائشة :كم كان صداق النبي صلى الله عليه وسلم قالت: كان صداقه لأزواجه اثنتي عشرة أوقية ونش قالت :أتدري ما النش؟ قلت :لا قالت: نصف أوقية فتلك خمسمائة درهم .رواه مسلم .ونش بالرفع في شرح السنة وفي جميع الأصول

ترجمہ؛

حضرت ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہ (رض) پوچھا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی ازواج مطہرات کا کتنا مہر مقرر کیا تھا؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی ازواج کے لیے بارہ اوقیہ اور ایک نش کا مہر مقرر فرمایا تھا۔ پھر حضرت عائشہ نے پوچھا کہ جانتے ہو نش کسے کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں انھوں نے فرمایا کہ ایک نش آدھے اوقیہ کے برابر ہوتا ہے اس طرح بارہ اوقیہ ایک نش کی مجموعی مقدار پانچ سو درہم کے برابر ہوئی کیونکہ ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے) اس روایت کو مسلم نے نقل کیا اور شرح السنہ اور اصول کی تمام کتابوں میں لفظ نش نون کے پیش کے ساتھ یعنی نش منقول ہے

تشریح :

پانچ سو درہم کے موجودہ وزن اور موجودہ حیثیت کی تفصیل ابتداء باب میں بیان کی جا چکی ہے اس حدیث سے شوافع یہ استدلال کرتے ہیں کہ پانچ سو درہم کا مہر باندھنا مستحب ہے۔ یہاں ایک خلجان پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمام ازواج مطہرات کی مقدار پانچ سو درہم بتائی ہے حالانکہ حضرت ام حبیبہ کا مہر چار ہزار درہم یا چار سو دینار تھا اور حضرت ام حبیبہ بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ مطہرہ تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے تمام ازواج مطہرات کے مہر کی مقدار بتائی ہے جن کا مہر خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقرر فرما دیا تھا جب کہ حضرت ام حبیبہ کا مہر حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے باندھا تھا۔

بھاری مہر کی ممانعت

حدیث؛

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال: ألا لا تغالوا صدقة النساء فإنها لو كانت

مکرمة فی الدنیا وتقوی عند الله لکان أولاکم بها نبی الله صلی الله علیه وسلم ما علمت
رسول الله صلی الله علیه وسلم نکح شیئا من نسائه ولا أنکح شیئا من بناته علی أکثر
من اثنتی عشرة أوقیة. رواه أحمد والترمذی وأبو داود والنسائی وابن ماجه والدارمی

حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا خبردار! عورتوں کا بھاری مہر نہ باندھو اگر بھاری مہر باندھنا دنیا میں بزرگی و عظمت کا سبب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقوی کا موجب ہوتا تو یقیناً نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے زیادہ مستحق تھے (آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھاری سے بھاری مہر باندھتے) مگر میں نہیں جانتا کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر اپنی ازواج مطہرات سے نکاح کیا ہو یا اس سے زیادہ مہر پر اپنی صاجزادیوں کا نکاح کرایا ہو (احمد ترمذی ابوداؤد نسائی ابن ماجہ دارمی)

تشریح:

تقوی سے مراد زیادہ تقوی ہے اور آیت کریمہ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) 49۔ الحجرات 13 :) (یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے بڑے مرتبے والا وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو کہ بموجب اللہ تعالیٰ کے نزدیک امتیاز عطا کرنیوالی بزرگی فضیلت کا مستحق بناتا ہے حاصل یہ کہ بھاری مہر باندھنے سے نہ صرف یہ کہ دنیا میں کوئی عظمت و بزرگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک امتیازی بزرگی وفضیلت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا اور جب اس کی وجہ سے نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دین کا کوئی نفع تو پھر اس لا حاصل چیز کو کیوں اختیار کیا جائے ازواج مطہرات کے مہر کے سلسلہ میں تین روایتیں ہیں جو

بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں ایک تو حضرت عائشہ کی روایت ہے دوسری روایت یہ ہے کہ جس میں بارہ اوقیہ یعنی چار سو اسی درہم کی مقدار ذکر کی گئی ہے اور ایک روایت آگے آئے گی جس میں حضرت ام حبیبہ کے مہر کی مقدار چار ہزار درہم ذکر ہوگی ان تینوں روایتوں میں سے حضرت ام حبیبہ کے مہر والی روایت کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کا مہر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے باندھا تھا اور نجاشی بادشاہ نے بھی اتنا زیادہ مہر محض آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم وتکریم کے پیش نظر باندھا تھا۔ اب رہی حضرت عائشہ اور حضرت عمر کی روایتیں تو دونوں کے درمیان بھی درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ نے مہر کی اصل مقدار کی وضاحت کرتے ہوئے اوقیہ کے ساتھ کسر یعنی آدھے اوقیہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور حضرت عمر نے صرف اوقیہ کا ذکر کیا کسر کو چھوڑ دیا اس کے علاوہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمر نے بارہ اوقیہ سے زیادہ کی نفی اپنے علم کے مطابق کی ہے یعنی حضرت عمر کو صرف بارہ اوقیہ ہی کا علم ہوگا اور حضرت عائشہ نے جو ایک نش آدھا اوقیہ زیادہ ذکر کیا ہے وہ حضرت عمر کے علم میں نہیں آیا ہوگا۔ یہ بات ملحوظ ہے کہ حضرت عمر نے یہاں صرف اولی اور افضل کو بیان کیا ہے یعنی ان کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ بہتر اور افضل و اولی یہ ہے کہ مہر کم ہی باندھا جائے جس کی مسنون مقدار بارہ اوقیہ ہے ورنہ تو جہاں تک جواز کا تعلق ہے یہ بتایا جا ہی چکا ہے کہ اس سے زیادہ مہر باندھنا بھی جائز ہے۔

ولیمہ کا بیان

ولیمہ اس کھانے کو کہتے ہیں جو نکاح میں کھلایا جاتا ہے اور چونکہ ولیمہ مشتق ہے التیام سے جس کے معنی اجتماع کے ہیں اس لیے اس کھانے کو ولیمہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اجتماع زوجین کی

تقریب میں کھلایا جاتا ہے۔ ولیمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا وقت اکثر علماء کے قول کے مطابق ولیمہ مسنون ہے جب کہ بعض علماء اسے مستحب کہتے ہیں اور بعض حضرات کے نزدیک یہ واجب ہے اسی طرح ولیمہ کے وقت کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں۔ بعض علماء تو یہ فرماتے ہیں کہ ولیمہ کا اصل وقت دخول یعنی شب زفاف کے بعد ہے بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ ولیمہ عقد نکاح کے وقت کھلانا چاہیے اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ عقد نکاح کے وقت بھی کھلانا چاہیے اور دخول کے بعد بھی۔ دو دن سے زیادہ وقت تک ولیمہ کھلانے کے بارے میں بھی علماء کے مختلف قول ہیں ایک طبقہ تو اسے مکروہ کہتا ہے یعنی علماء کے اس طبقہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ دو دن تک کھلایا جاسکتا ہے اس سے زیادہ وقت تک کھلانا مکروہ ہے حضرت امام مالک کے ہاں ایک ہفتہ تک کھلانا مستحب ہے لیکن اس سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا انحصار خاوند کی حیثیت و استطاعت پر ہے اگر وہ صرف ایک ہی وقت پر اکتفا کرے اور اگر کئی دن اور کئی وقت تک کھلانے کی استطاعت رکھتا ہے تو کئی دن اور کئی وقت تک کھلا سکتا ہے۔ ضیافت کی قسمیں : مجمع البحار میں لکھا ہے کہ ضیافت یعنی دعوت کی آٹھ قسمیں ہیں (ولیمہ) (خرس، اعذار، وکیرہ، نقیعہ، وضیمہ، عقیقہ، مادبہ : چنانچہ ولیمہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ کے موقعہ پر کی جائے۔ خرس اس دعوت کو کہتے ہیں کہ جو بچہ کی پیدائش کی خوشی میں کی جائے اعزار اس دعوت کو کہتے ہیں جو ختنہ کی تقریب میں کی جائے وکیرہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو مکان بننے کی خوشی میں کی جائے نقیعہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو مسافر کے آنے کی تقریب میں کی جائے عقیقہ اس دعوت کو کہتے ہیں جو بچہ کا نام رکھنے کی تقرب میں کی جائے اور مادبہ ہر اس دعوت کو کہتے ہیں جو بلا کسی خاص تقریب کے کی جائے ضیافت کی یہ تمام قسمیں مستحب ہیں البتہ ولیمہ کے بارے میں

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ دعوت واجب ہے۔

ولیمہ کرنے کا حکم۔

حدیث؛

عن أنس :أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأی علی عبد الرحمن بن عوف أثر صفرة فقال :"ما هذا ؟"قال :إني تزوجت امرأة علی وزن نواة من ذهب قال :"بارك الله لك أولم ولو بشاة

ترجمہ؛

حضرت انس کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبدالرحمن بن عوف کے بدن یا کپڑے پر زعفران کا زرد نشان دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیا ہے عبدالرحمن نے کہا کہ میں نے ایک نواۃ سونے کے عوض ایک عورت سے نکاح کیا ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مبارک کرے تم ولیمہ کرو یعنی کھانا پکوا کر کھلاؤ اگرچہ وہ ایک بکری کا ہو (بخاری ومسلم)

تشریح :

حضرت عبدالرحمن کے کپڑوں پر یا ان کے بدن پر زعفران کا نشان دیکھ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمانا کہ یہ کیا ہے؟ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس زعفران کے لگنے کا سبب دریافت فرمایا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چونکہ مردوں کو خلوق استعمال کرنے سے منع فرماتے تھے (خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے بنتی ہے) اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان الفاظ

کے ذریعہ ان کو تنبیہ فرمائی کہ جب مردوں کے لیے یہ ممنوع ہے تو تم نے کیوں لگائی چنانچہ عبدالرحمن نے جواب دیا کہ میں نے قصداً انہیں لگائی ہے بلکہ دلہن سے اختلاط کی وجہ سے بغیر میرے قصد اور بغیر علم کے لگ گئی ہے۔ قاضی کہتے ہیں کہ جس طرح نش بیس درہم اور اوقیہ چالیس درہم کے برابر وزن کو کہتے ہیں اسی طرح نواۃ پانچ درہم کے برابر وزن کا نام ہے۔ لہٰذا ایک نواۃ سونے کے عوض کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس عورت کا مہر پانی درہم کے برابر یعنی پونے سولہ ماشہ سونا مقرر کیا ہے۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ نواۃ سے نواۃ تمر یعنی کھجور کی گٹھلی مراد ہے اور بظاہر یہی مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس صورت میں حضرت عبدالرحمن کے کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے کھجور کی گٹھلی کے بقدر سونے کا مہر باندھا ہے۔ تم ولیمہ کرنا اگرچہ ایک بکری کا ہو اس طرح کی عبارت تقلیل کم سے کم مقدار بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے اور یہاں تکثیر مراد ہے یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ اگرچہ زیادہ خرچ ہو تب بھی ولیمہ کرو اور تکثیر مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بکری کو ایک قلیل ترین مقدار کے اظہار کے لیے ذکر کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مالی اور اقتصادی حالت بہت کمزور تھی لوگ ستو اور اسی قسم کی دوسری کم تر چیزوں کے ذریعہ ولیمہ کی سنت پوری کیا کرتے تھے پھر یہ کہ خود حضرت عبدالرحمن بن عوف کی مالی حیثیت اس وقت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے سامنے بکری جیسی چیز کو کم سے کم مقدار کی صورت میں بیان فرماتے۔

خلع اور طلاق کا بیان

خلع کا مطلب : خلع خ کے پیش کے ساتھ خلع خ کے زبر کے ساتھ) اسم ہے خلع کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو نکالنا اور عام طور پر یہ لفظ بدن سے کسی پہنی ہوئی چیز مثلاً کپڑے اور موزے وغیرہ اتارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن شرعی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی ہیں ملکیت نکاح کو مال کے عوض میں لفظ خلع کے ساتھ زائل کرنا یا ملکیت نکاح ختم کرنے کے لیے لفظ خلع کے ساتھ اپنی عورت سے مال لینا اس شرعی اصطلاح کی توضیح یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے اور دونوں میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے اور مرد طلاق بھی نہ دیتا ہو تو عورت کو جائز ہے کہ کچھ مال دے کر اپنا مہر دے کر نجات حاصل کرلے مثلاً اپنے مرد سے کہے کہ اتنا روپیہ لے کر خلع کر دو یعنی میری جان چھوڑ دو یا یوں کہے کہ جو مہر تمہارے ذمہ ہے اس کے عوض میری جان چھوڑ دو اس کے جواب میں مرد کہے کہ میں نے چھوڑ دی تو اس سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑھ جائے گی اور دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔ مظہر نے لکھا ہے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ اگر مرد عورت سے کہے کہ میں نے اتنے مال کے عوض تم سے خلع کیا اور بیوی کہے کہ میں نے قبول کیا اور پھر میاں بیوی کے درمیان جدائی واقع ہو جائے تو آیا یہ طلاق ہے یا فسخ ہے، چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ یہ طلاق بائن ہے حضرت امام شافعی کا زیادہ صحیح قول بھی یہی ہے لیکن حضرت امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ یہ فسخ ہے اور حضرت امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے اگر میاں بیوی کے باہمی اختلاف کی بنیاد شوہر کی زیادتی و سرکشی ہو اور شوہر کی اس زیادتی و سرکشی کی وجہ سے بیوی خلع چاہتی ہو تو اس صورت میں شوہر کے لیے یہ مکروہ ہے کہ وہ خلع کے معاوضہ کے طور پر کوئی چیز مثلاً

روپیہ وغیرہ لے اور اگر میاں بیوی کے باہمی اختلاف کی بنیاد بیوی کی نافرمانی وسرکشی ہو یعنی بیوی کی نافرمانی و بداطواری کی وجہ سے خلع کی نوبت آئی ہو تو اس صورت میں شوہر کے لیے یہ مکروہ ہے کہ وہ اس خلع کے عوض میں اس قدر رقم لے کہ اس نے عورت کے مہر میں جو رقم دی ہے اس سے بھی زیادہ ہو۔

نکاح وطلاق کے الفاظ ہنسی میں منہ سے نکالے جائیں تو حکم ثابت ہو جاتا ہے

حدیث؛

وعن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "ثلاث جدهن جد وهزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة". رواه الترمذي وأبو داود وقال الترمذي: هذا حديث حسن غريب

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن کا قصد کرنا بھی قصد ہے اور ہنسی مذاق میں منہ سے نکالنا بھی قصد ہے نکاح طلاق رجعت (ابوداؤد)

تشریح:

جد کے معنی ہیں کسی کام میں سعی وکوشش کرنا لیکن یہاں اس کے یہ معنی مراد ہیں کہ جو لفظ جس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو اس کو زبان سے ادا کرتے وقت وہی معنی مراد لیے جائیں مثلا لفظ نکحت میں نے نکاح کیا زبان سے جب ادا کیا جائے تو اس کے معنی یعنی نکاح کرنا ہی مراد لیا جائے یا جب لفظ طلقت میں نے طلاق دی زبان سے ادا کیا جائے تو اس کے معنی یعنی طلاق دینا

ہی مراد لیا جائے اور لفظ ھزل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی لفظ زبان سے ادا کیا جائے مگر اس کے معنی مراد نہ ہوں۔ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں خواہ ان کے معنی مراد ہوں یا مراد نہ ہوں۔ چنانچہ اگر دو اجنبی مرد و عورت کے درمیان ہنسی ہنسی میں دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول ہو جائے تو بھی نکاح ہو جاتا ہے اور وہ دونوں میاں بیوی بن جاتے ہیں یا اگر کوئی ہنسی مذاق میں طلاق دیدے تو بھی طلاق پڑھ جائے گی اسی طرح طلاق رجعی کے بعد ہنسی ہنسی میں رجوع کرنے سے بھی رجعت ثابت ہو جاتی ہے ان تین چیزوں کے علاوہ اور چیزیں مثلاً بیع و شراء وغیرہ اس طرح ہنسی مذاق میں وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔

عقیقہ کا دن

حدیث:

عن بريدة قال : كنا في الجاهلية إذا ولد لأحدنا غلام ذبح شاة ولطخ رأسة بدمه فلما جاء الإسلام كنا نذبح الشاة يوم السابع ونحلق رأسه ونلطخه بزعفران . رواه أبو داود وزاد رزين :ونسميه

ترجمہ:

حضرت بریدہ (رض) کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ہمارا یہ دستور تھا کہ جب ہم میں سے کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا اور اس (بکری) کا خون اس (لڑکے) کے سر پر لگاتا، لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا، تو ہم (بچے کی پیدائش کے) ساتویں دن بکری ذبح کرتے، اس کا سر مونڈتے اور اس کے سر پر زعفران لگاتے (ابوداؤد) اور رزین کی روایت میں یہ الفاظ بھی

ہیں کہ ہم (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھتے۔

واضح رہے کہ اکثر احادیث کے بموجب بچہ کا عقیقہ اس کی پیدائش کے ساتویں دن ہونا چاہیے اور حضرت امام شافعی وحضرت امام احمد یہ فرماتے ہیں کہ اگر ساتویں دن عقیقہ کرنا ممکن نہ ہو سکے تو پھر چودھویں دن کیا جائے، اگر چودھویں دن بھی نہ کر سکے تو اکیسویں دن، ورنہ اٹھائیسویں دن، پھر پینتیسویں دن علی ہذا القیاس۔ ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا عقیقہ ظہور نبوت کے بعد کیا تھا، کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ پیدائش کے دن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عقیقہ ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن اول تو اس روایت کی اسناد ضعیف ہے، دوسرے معنوی طور پر بھی یہ روایت بعد سے خالی نہیں ہے۔ حضرت امام مالک کے نزدیک عقیقہ کی ہڈیاں توڑنی درست نہیں (بلکہ گوشت نکال کر ہڈیوں کو دفن کر دیا جائے، جب کہ حضرت امام شافعی کے نزدیک اس کی ہڈیاں توڑنا درست ہے۔ نیز شوافع کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر عقیقہ کا گوشت پکا کر صدقہ کیا جائے تو بہتر ہے اور اگر حلاوت یعنی لڑکے کے اچھے اخلاق وطوار کے ساتھ تفاول کے پیش نظر اس گوشت کو کوئی میٹھی چیز پکا کر صدقہ کی جائے تو اور بہتر ہے۔

کھانوں کا بیان

کھانے کے تین آداب

حدیث:

عن عمر بن أبي سلمة قال : كنت غلاما في حجر رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت يدي تطيش في الصفحة. فقال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم "سم الله وكل بيمينك وكل مما يليك

ترجمہ:

حضرت عمر بن ابی سلمہ (رض) کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پرورش و تربیت میں تھا (ایک دن میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا) اور میرا ہاتھ رکابی میں جلدی جلدی گھوم رہا تھا (یعنی جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، میں اپنے سامنے سے کھانے کے بجائے ادھر ادھر ہاتھ ڈال رہا تھا) چنانچہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا کہ" بسم اللہ کہو دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اس جانب سے کھاؤ جو تمہارے نزدیک ہے (یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔" (بخاری ومسلم)

تشریح:

اس حدیث میں کھانے کے تین بنیادی آداب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا ادب تو یہ ہے کہ کھانے کی ابتداء بسم اللہ کہہ کر ہونی چاہیے۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے اور تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانے کے برتن میں اپنے سامنے سے کھانا چاہیے۔ جمہور علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا تینوں باتوں کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ استحباب

کے طور پر ہے۔اسی طرح دوسری روایت میں کھانے کے بعد اللہ کی حمد و شکر کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر ایک دستر خوان پر کئی آدمی کھانے بیٹھیں تو سب لوگ بسم اللہ کہیں! جب کہ بعض علماء کے نزدیک کہ جن میں حضرت امام شافعی بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ محض ایک آدمی کا بسم اللہ کہہ لینا سب کے لیے کافی ہو جائے گا۔پانی یا دوا وغیرہ پینے کے وقت بسم اللہ کہنے کا بھی وہی حکم ہے جو کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا ہے۔

دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہیے

حدیث؛

وعن ابن عمر قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إذا أكل أحدكم فليأكل بيمينه وإذا شرب فليشرب بيمينه". رواه مسلم

ترجمہ؛

حضرت ابن عمر (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے،تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب کوئی چیز پیئے،تو دائیں ہاتھ سے پیئے یعنی پانی وغیرہ کا برتن داہنے ہاتھ سے پکڑے۔" (مسلم)

تشریح؛

اس حدیث میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بظاہر وجوب کے لیے ہے۔جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو سلمہ ابن اکوع (رض) نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا تو فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اس شخص نے کہا کہ میں داہنے ہاتھ سے کھانے کی قدرت نہیں رکھتا (راوی کا

بیان ہے کہ اس شخص کا داہنا ہاتھ درست تھا، اس نے محض تکبر سے یہ الفاظ کہے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (اللہ کرے) تجھے داہنے ہاتھ سے کھانے کی طاقت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ شخص (کبھی بھی) اپنا داہنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف نہیں اٹھا سکا اس طرح طبرانی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (ایک دن) سلبیہ اسلمیہ کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھا تو اس کے لیے بد دعا فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاعون میں مبتلا ہو کر مرگئی! تاہم جمہور علماء جن کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے کا حکم وجوب کے طور پر نہیں ہے بطریق استحباب ہے وہ ان روایتوں کو زجر وتنبیہ اور مصالح شریعت پر محمول کرتے ہیں۔

چھری کانٹے سے کھانے کا مسئلہ

حدیث:

وعن عمرو بن أمية أنه رأى النبي صلى الله عليه وسلم يحتز من كتف الشاة في يده فدعي إلى الصلاة فألقاها والسكين التي يحتز بها ثم قام فصلى ولم يتوضأ

ترجمہ:

حضرت عمرو بن امیہ (رض) سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا، کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بکری کا شانہ جو آپ کے ہاتھ میں تھا چھری سے کاٹتے تھے، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو (اسی دوران) نماز کے لیے بلایا گیا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شانے کو اور اس چھری کو کہ جس سے وہ شانہ کاٹ رہے تھے وہیں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور نماز ادا کی، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اس وقت) وضو نہیں کیا (کیونکہ آپ (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) وضو سے تھے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھاتے وقت گوشت یا کھانے کی کوئی چیز کاٹ کر کھانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو اور اگر وہ گوشت یا کوئی بھی چیز گلی ہوئی اور نرم ہو کہ اس کو چھری سے کاٹنے کی ضرورت نہ ہوتی ہو، تو پھر چھری سے کاٹ کر کھانا مکروہ ہوگا، کیونکہ اس طرح بلا ضرورت چھری کانٹے سے کھانا عجمیوں (یعنی غیر مسلموں کے) تکلفات میں شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ دوسری فصل میں بیان ہوگا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ داعی حق (نماز کے لیے بلانے والے یا اذان) کی آواز سن کر کھڑے ہو جانے اور نماز میں پہنچ جانا چاہیے اگر چہ کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے جب کہ کھانے کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو اس کھانے کی طرف شدید احتیاج نہ ہو، یعنی اتنی بھوک نہ ہو کہ اگر وہ کھانا کھائے بغیر اٹھ کر نماز کے لیے چلا گیا تو نماز میں جی نہ لگے اور اس بات کا خوف نہ ہو کہ نماز سے واپس آنے کے بعد پھر کھانا نہیں ملے گا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے کہ ان کے نزدیک آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

لہسن، پیاز کھا کر مسجد و مجالس ذکر وغیرہ میں مت جاؤ

حدیث:

وعن جابر أن النبی صلی الله علیه وسلم قال :"من أکل ثوما أو بصلا فلیعتزلنا" أو قال :"فلیعتزل مسجدنا أو لیقعد فی بیته" . وإن النبی صلی الله علیه وسلم أتی بقدر فیه

خضرات من بقول فوجد لها ريحا فقال :"قربوها" إلى بعض أصحابه وقال :"كل فإني أناجي من لا تناجي"

......

ترجمہ:

حضرت جابر (رض) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "جو شخص لہسن یا (کچی) پیاز کھائے ہوئے ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ ہم سے الگ رہے یعنی ہماری مجالس میں نہ آئے یا یہ فرمایا کہ تو اس کو چاہیے کہ وہ (کہیں جانے کے بجائے) اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔" اور (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک ہانڈی لائی گئی جس میں از قسم ترکاری سبزیاں تھیں (یعنی لہسن، پیاز اور گندنا وغیرہ) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس میں بو محسوس ہوئی تو اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے (کسی خادم سے) فرمایا کہ اس کو اس (فلاں شخص) کے پاس لے جاؤ اور پھر (اس شخص کو) مخاطب کر کے فرمایا کہ اس کو تم کھاؤ میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں جس ہستی کے ساتھ سرگوشیاں کرتا ہوں اس کے ساتھ تم سرگوشی نہیں کرتے۔" (بخاری و مسلم)

......

تشریح:

جو حکم مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہے کہ لہسن وغیرہ کھا کر اس میں نہ جایا جائے یہی حکم دیگر مساجد و مجالس خیر کا بھی ہوگا اور اگر اس احتمال کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ اس ارشاد گرامی میں مفرد لفظ مسجد سے مراد جنس ہے (کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لفظ مسجد بول کر تمام مساجد مراد لی ہیں) تو پھر اس تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، علاوہ ازیں بعض روایت میں مساجدنا یعنی ہماری مساجد کا لفظ منقول ہے، اس صورت میں تو تمام مساجد کے لیے یہ حکم بالکل صریح

ہوگا۔ اولیقعد فی بیتہ میں حرف او (یعنی یا) اگر راوی کے شک کے اظہار کے لیے ہے تو مراد یہ ہوگئی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یا تو فلیعتزلنا تو اس کو چاہیے کہ وہ ہم سے الگ رہے) فرمایا تھا یا یہ فرمایا تھا کہ فلیعتزل مسجدنا (تو اس کو چاہیے کہ ہماری مسجد سے دور رہے) اور یا یہ فرمایا تھا کہ من اکل ثوما او بصلا فلیقعد فی بیتہ یعنی جو شخص لہسن یا پیاز کھائے ہوئے ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے، کسی دوسرے کے پاس نہ جائے خواہ مسجد میں خواہ مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اولیقعد فی بیتہ میں حرف اور راوی کے شک کے اظہار کے لیے نہ ہو، بلکہ تنویع وتقسیم کے لیے ہو اور اس کا تعلق ما قبل کے فقرہ یعنی فلیعتزل مسجدنا سے ہو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ لہسن پیاز کھا کر مسجد میں آنا مکروہ ہے کہ وہاں ملائکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ موجود رہتے ہیں اور ان چیزوں کو کھا کر عام لوگوں کے ساتھ اختلاط ومجالست مباح ہے اور یا اس سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مطلق اختلاط ومجالست سے باز رہے کیونکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔" اس ہستی" سے مراد حضرت جبرائیل (علیہ السلام) اور ملائکہ ہیں مطلب یہ تھا کہ یہ فرشتے میرے پاس آتے رہتے ہیں اور میں ان سے بات چیت کرتا ہوں جب کہ تمہارے ساتھ یہ چیز نہیں ہے اس لیے جو چیز (یعنی لہسن پیاز وغیرہ کھانا) میرے لیے جائز نہیں وہ تمہارے لیے جائز ہے اس ارشاد گرامی میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے ہم نشین ومصاحب کی طبیعت وعادات اور اس کے حل کی رعایت ملحوظ رکھے اور اس کی جائز خوشی ومرضی کو پورا کرے۔

پانی کو تین سانس میں پینے کی خاصیت

حدیث؛

عن أنس قال :کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتنفس فی الشراب ثلاثا .متفق علیہ.وزاد مسلم فی روایۃ ویقول :"إنہ أروی وأبرأ وأمرأ"

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پانی پینے کے درمیان تین مرتبہ سانس لیتے تھے (بخاری ومسلم) اور مسلم نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ۔۔۔اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے کہ اس طرح (کئی سانس میں پانی پینا اچھی طرح سیراب کرتا ہے اور پیاس کو بجھاتا ہے بدن کو صحت بخشتا ہے اور خوب ہضم ہوتا ہے اور معدہ میں بڑی آسانی کے ساتھ جاتا ہے۔"

تشریح"

تین مرتبہ سانس لیتے تھے" یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پانی تین سانس میں پیتے تھے، حضرت انس (رض) نے یہ بات اکثر کے اعتبار سے بیان کی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر وبیشتر اسی طرح پانی پیتے تھے اور بعض روایتوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں دو سانس میں بھی پینے کا ذکر آیا ہے بہرحال تین یا دو سانس میں پینے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر مرتبہ برتن کو منہ سے جدا کر لیتے تھے۔

ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا حرام ہے:

حدیث:

وعن أبي هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار". رواه البخاري

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" ازقسم ازار (یعنی پائجامہ وغیرہ) کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ (بخاری)

تشریح:

مطلب یہ ہے کہ ٹخنوں سے نیچے پیر کے جتنے حصہ پر تہبند وغیرہ لٹکا ہوا ہوگا وہ پورا حصہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ عمل یعنی ٹخنے سے نیچے تہبند وغیرہ لٹکانا) ایک مذموم عمل ہے اور دوزخیوں کا کام ہے ٹخنے سے نیچے ازار وغیرہ لٹکانے کے مسئلہ میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس سلسے میں جو احادیث منقول ہیں ان میں زیادہ تر ازار کے لٹکانے کا ذکر ہے اور ازار لٹکانے والے کے حق میں بہت سخت وعیدیں بھی بیان کی گئی ہے یہاں تک کہ ایک روایت کے مطابق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دن ایک شخص کو اس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے پائچے ٹخنوں سے نیچے تھے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو دوبارہ وضو کرنے اور نماز لوٹانے کا حکم دیا اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ شعبان کی پندرھویں شب میں سب (مسلمانوں) کی بخشش کی جاتی ہے علاوہ عاق، مدمن خمر اور مسبل ازار کے کہ ان لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ساری وعیدوں اور

ممانعت کا تعلق محض ازار ہی سے نہیں ہے بلکہ سب کپڑوں سے ہے یعنی بدن پر جو بھی کپڑا ضرورت سے زائد اور سنت کے دائرے سے باہر ہوگا اس پر مذکورہ ممانعت کا حکم عائد ہوگا جہاں تک ازار کی تخصیص کا تعلق ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ میں چادر اور ازار عام طور پر لباس ہوتا تھا اس لیے اس کے استعمال کی کثرت کی بنا پر اس کا ذکر کیا گیا ویسے بعض روایتوں میں ازار کے ساتھ دوسرے کپڑوں جیسے قمیص اور پگڑی کا بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے چنانچہ آگے دوسری فصل میں حضرت ابن عمر (رض) کی یہ روایت نقل ہوگی کہ الا سبال فی الا زار والقمیص والعمامۃ من جر منہا شیأ خیلاء الخ اسی طرح اسی فصل میں ابھی اوپر حضرت ابن عمر (رض) ہی کی جو روایت گزری ہے اس میں مطلق کپڑے کا ذکر ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ لباس میں ضرورت سے زائد کپڑا رکھنے کی ممانعت کا تعلق ہر کپڑے سے ہے بہر حال عزیمت یعنی اولی درجہ یہ ہے کہ ازار یعنی تہبند و پائجامہ کو نصف پنڈلی تک رکھا جائے چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا تہبند نصف پنڈلی ہی تک رکھتے تھے البتہ رخصت یعنی اجازت و آسانی کا درجہ ٹخنوں تک ہے کہ تہبند و پائجامے کو زیادہ سے زیادہ ٹخنوں تک رکھا جاسکتا ہے کرتے وقمیص اور عباد شیروانی وغیرہ کے دامن کا بھی یہی حکم ہے اسی طرح قمیص و کرتے وغیرہ کی آستینوں کی مسنون لمبائی یہ ہے کہ وہ بندوست یعنی ہاتھ کے جوڑ تک ہوں عمامہ کا شملہ زیادہ سے زیادہ اتنا چھوڑا جانا چاہیے جو نصف پشت تک رہے جو شملہ لمبائی یا چوڑائی میں اس سے زائد ہوگا وہ بدعت اور اس زائد لٹکانے میں شمار ہوگا جو ممنوع ہے چنانچہ بعض علاقوں اور شہروں کے لوگ اپنے لباس میں جو زائد از ضرورت کپڑا استعمال کرتے ہیں جیسے ضرورت سے زائد لمبی لمبی آستینوں اور وسیع و عریض دامنوں والے کرتے کئی کئی گز کے پاجامے اور

شلواروں اور بڑے بڑے عمامے اور پگڑ کا رواج بعض جگہ پایا جاتا ہے وہ خلاف سنت ہے بلکہ یہ زائداز ضرورت کپڑے صرف کرنا اگر تکبر وغرور کی نیت سے ہوگا تو اس کو حرام کہیں گے اور اگر لوگوں کی دیکھا دیکھی یا کسی رواج کے تحت ہوگا تو اس کو مکروہ کہا جائے گا کپڑوں میں ضرورت سے زائد لمبائی چوڑائی رکھنا عورتوں کے لیے بھی ممنوع ہے لیکن مردوں کی بہ نسبت ایک بالشت کے بقدر زائد ہونا جائز ہے بلکہ اتنی زائد مقدار تو مستحب ہے جو پردہ پوشی کے بقدر ہو۔

طب اور جھاڑ پھونک کا بیان

"طب" عام طور پر طاء کے زیر کے ساتھ مستعمل ہے، لیکن سیوطی کہتے ہیں کہ یہ لفظ طاء کے زبر، زیر اور پیش تینوں کے ساتھ منقول ہے، اس کے معنی ہیں" علاج کرنا، دوا کرنا" بعض مواقع پر اس لفظ کو طاء کے زیر کے ساتھ" سحر" کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہم اسی اعتبار سے" مطبوب" اس شخص کو کہتے ہیں جس پر سحر (جادو) کیا گیا ہو۔ طب کا تعلق جسم (ظاہر) سے بھی ہوتا ہے اور نفس (باطن) سے بھی، چنانچہ حفظان صحت اور دفع مرض کے ذریعہ بدن کے علاج معالجہ کو جسمانی طب کہتے ہیں اور باطنی ہلاکت وتباہی تک پہنچانے والے افکار واعمال اور بری عادات واطوار کے ترک وازالہ کے ذریعہ نفس کا علاج کرنے کو طب نفسانی کہتے ہیں، جس طرح طب کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح دوا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو جسمانی اور طبعی، خواہ وہ مفردات کی شکل میں ہو یا مرکبات کی شکل میں (جیسا کہ ظاہری دوائیں ہوتی ہیں) اور دوسری قسم روحانی ولسانی ہے، جو قرآن کریم اور قرآن کریم کے حکم میں شامل دوسری چیزوں کی صورت میں ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے لوگوں کے علاج واصلاح کے لیے ظاہری وطبعی دواؤں کو بھی اختیار فرماتے تھے اور باطنی وروحانی معالجہ کو بھی۔" رقی" اصل میں" رقیہ" کی جمع ہے جس

کے معنی افسون کے ہیں ہماری زبان میں اس کو منتر اور روزمرہ کی بول چال میں جھاڑ پھونک بھی کہا جاتا ہے، علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآنی آیات، منقول دعاؤں اور اسماء الٰہی کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے ان کے علاوہ ایسے منتروں کے ذریعہ بھی جائز ہے جن کے الفاظ وکلمات کے معنی معلوم ہوں اور وہ دین وشریعت کے مخالف نہ ہوں جن منتروں کے الفاظ وکلمات ایسے ہوں کہ ان کے معنی معلوم نہ ہوں یا ان کے الفاظ وکلمات دین وشریعت کی تعلیمات واحکام کے برخلاف ہوں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے اسی طرح وہ اہل عزائم وتکثیر جو علم نجوم ورمل کی مدد لے کر عملیات کرتے ہیں اور حفظ ساعات وتعین اوقات جیسی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں ان کا یہ طریقہ بھی اہل دیانت وتقویٰ کے نزدیک مکروہ وحرام ہے۔

طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مروج طب میں فرق اور اس کی وجہ

اس موقع پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اگرچہ علماء نے حتی الامکان طب نبوی (علیہ السلام) اور مروجہ طب میں مطابقت وموافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں فرق ضرور موجود ہے اسی لیے صاحب سفر السعادۃ نے لکھا ہے کہ طب نبوی (ظاہری طور پر) طباء کے قواعد واصول کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتی کیونکہ طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مصدر وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے ظاہر ہے کہ جو طب وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو یا جو علاج معالجہ قلب نبوت اور کمال عقل کا بتایا ہوا اس کا کامیاب ہونا اور اس کے ذریعے شفا پانا درجہ یقین کا حامل ہے اس کے برخلاف اطباء وحکماء کی جو طب ہے اور ان کے اصول وقواعد کے مطابق جو علاج معالجہ ہوتا ہے اس کا کلیۃ کامیاب اور افادیت بخش

ہونا یقینی درجہ کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس میں غلطی وخطا ہونے کا بھی گمان ہے کیونکہ اس طب کی بنیاد انسانی ذہن وتجربہ پر ہے اس اعتبار سے یہ طب اس طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے برابر ہو ہی نہیں سکتی جس کی بنیاد وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے۔ طب نبوی اور مروجہ طب کے درمیان یہی فرق ہے جو بعض مواقع پر کچھ لوگوں کو شک شبہ اور الجھن میں ڈال دیتا ہے چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی مرض کا ایسا علاج تجویز فرمایا ہے جو فن طب کے اصول وقواعد کے خلاف ہے تو وہ مختلف قسم کے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ انھیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ جس طب کے اصول وقواعد کی بات کرتے ہیں وہ چونکہ انسان کے اپنے ذہن اور اپنی عقل وتدبیر کی پیداوار ہے اس لیے اس میں غلطی وخطا کا ہونا اور حقیقت حال تک نہ پہنچنا عین ممکن ہے جب کہ طب نبوی کا مصدر وحی الٰہی اور قلب نبوت ہے جس میں کسی خطا کا امکان ہی نہیں ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی مرض کا جو بھی علاج تجویز فرمایا ہے اس کے بارے میں تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا ناقص علم اور ذہن اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ علاج مرض کے مطابق نہ ہو مثال کے طور پر یہاں حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق بعض اطباء سخت حیرانی اور الجھن میں مبتلا ہوئے ہیں کیونکہ شہد اپنے خواص کے اعتبار سے سہل اور پیٹ جاری کرنے والا ہے لہٰذا دستوں کے روکنے کے لیے شہد پلانے کا حکم نبوی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بظاہر اطباء کے اصول وقواعد کے بالکل خلاف ہے بناء بریں وہ اطباء کہتے ہیں کہ ہر مرتبہ شہد پلانے کے بعد دستوں میں زیادتی کا ہونا اسی وجہ سے تھا کہ شہد اسہال پیدا کرتا ہے؟ اس بارے میں ایک بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک بالکل مخصوص نوعیت کا معاملہ تھا جس میں دوا کی تاثیر سے

زیادہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا کی برکت اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعجاز سے وہی شہد اس کے حق میں شفایابی کا ذریعہ بن گیا اور وہ اچھا ہوگیا، یہ بات اگرچہ حسن اعتقاد کے نقطہ نظر سے ایک اچھی تعبیر وترجمانی ہے جو اہل ایمان کو مطمئن کرسکتی ہے اور پھر وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ محض اس واقعہ پر قیاس کرکے طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مروج طب کے اصول وقواعد کے متضاد قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن اس کے علاوہ اگر فنی نقطہ نظر سے بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تجویز کردہ اس علاج پر پوری تحقیق اور گہری نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مریض کو شہد پلانے کا حکم دینا اطباء کے اصول وقواعد کے خلاف نہیں تھا۔ کیونکہ دستوں کا آنا جس طرح بدہضمی کی وجہ سے ہوتا ہے اسی طرح وہ فاسد مادہ بھی دست جاری ہونے کا سبب بنتا ہے جو جمع ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جو دست معدے میں جمع ہونے والے فاسد مادہ کی وجہ سے آتے ہیں ان کو بند کرنا اور اس مادے کو باہر نکالنا ضروری ہوتا ہے اور اس کا بہترین علاج شہد ہے۔ خصوصًا شہد کو گرم پانی میں ملا کر پلانا بہت مفید ہے کہ وہ مادہ کو دفع کرتا ہے اور خارج بھی کردیتا ہے پس وہ شخص جو بدہضمی کا شکار تھا اور اس کے معدے میں فاسد مادہ بھی جمع ہوگیا تھا اس کے لیے بہترین علاج یہی تھا کہ شہد پلا کر اس کے معدے میں جمع ہوجانے والا فاسد مادہ نکالا جائے چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو شہد پلانے کا حکم دیتے رہے یہاں تک کہ جب اس کا معدہ فاسد مادے سے بالکل صاف ہوگیا تو وہ اچھا ہوگیا، اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص ذہن میں رکھنے کی ہے کہ علاج معالجہ میں حسن اعتقاد اور معالج کی تشخیص وتجویز پر مکمل اعتبار وبھروسہ بنیادی چیز ہے، چنانچہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے معالج کے بارے میں بھی کسی

قسم کے شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے حسن اعتقاد نہیں ہوتا تو اس کا مزاج معالج کے اس علاج کو قبول نہیں کرتا اور شفا یابی سے محروم رہتا ہے خواہ وہ معالج کتنے ہی اونچے درجے کا کیوں نہ ہو اس کے برخلاف اگر وہ شخص پورے یقین و اعتقاد کے ساتھ کوئی انتہائی معمولی درجہ کا بھی علاج کرتا ہے تو وہ علاج اس کے لیے فائدہ مند ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ اپنا علاج کرے جس کی کامیابی یقینی ہے اور اس کو اس علاج سے فائدہ نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ایمان میں کھوٹ ہے اور اس کو یقین و اعتقاد کی نعمت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے کسی مرض کا علاج طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کو اپنا یقین کامل اور اپنا اعتقاد مضبوط کرنا چاہیے اور پھر صدق نیت و اخلاص عمل کے ساتھ اس علاج کو اختیار کرنا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں، امراض باطنی و روحانی اور فساد و ذہن کے لیے شفاء کامل کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص قرآن کریم کو اخلاص وخلوص کے جذبہ سے سیکھتا ہے اور پڑھتا ہے اس کی تعلیمات پر یقین و اعتقاد کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ اس کے قلب و روح کو یقیناً جلا و شفا حاصل ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو شخص عدم اخلاص و قبول اور بے یقینی و بے اعتمادی کے ساتھ قرآن کریم کو سیکھتا پڑھتا ہے تو اس کے باطن میں اور زیادہ برائی اور اس کے قلوب میں اور زیادہ فساد پیدا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے حدیث کے الفاظ کذب بطن اخیک (تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) کو مریض کے عدم صدق نیت اور عدم خلوص اعتقاد پر بھی محمول کیا ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ تمہارے بھائی نے چونکہ شہد کو یقین و اعتقاد اور اخلاص و

قبول کے ساتھ نہیں پیا ہے، اس لیے فائدہ ہونے کے بجائے اس مرض میں زیادتی ہوگئی ہے۔

دوا صرف ایک ظاہری ذریعہ ہے حقیقی شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے

حدیث:

وعن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل داء دواء فإذا أصیب دواء الداء برأ بإذن اللہ. رواہ مسلم.

ترجمہ:

حضرت جابر (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر بیماری کی دوا ہے، لہٰذا جب وہ بیماری کے موافق ہو جاتی ہے تو بیمار اللہ کے حکم یعنی اس کی مشیت وارادہ سے اچھا ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

تشریح"

اللہ کے حکم" کی قید اس لیے لگائی گئی ہے تا کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ مرض سے شفایابی کا اصل میں تعلق دوا سے ہے اور مریض کو صحت بخشنے میں علاج ومعالجہ حقیقی اور مستقل بالذات موثر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں شفایابی تو محض اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ پر موقوف ہے، دوا اور علاج ومعالجہ محض ایک ظاہری ذریعہ اور وسیلہ ہے، کسی بھی مرض پر کوئی دوا اسی وقت اثر انداز ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ روایت حمیدی میں اس کی تفصیل یوں منقول ہے کہ ایسا کوئی بھی مرض نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو چنانچہ جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جس کے ساتھ ایک پردہ ہوتا ہے وہ فرشتہ اس پردہ کو بیمار کے مرض اور دوا

کے درمیان حائل کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیمار جو بھی دوا استعمال کرتا ہے وہ مرض کو نہیں لگتی اور شفا حاصل نہیں ہوتی یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہوتی ہے کہ بیمار اچھا ہو جائے تو وہ فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ مرض اور دوا کے درمیان سے پردہ اٹھا دیا جائے اس کے بعد بیمار جب دوا پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس دوا کے ذریعہ اس کو شفا دیدیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی مرض لاحق ہو جائے تو اس کا علاج کرنا اور دوا مستحب ہے، چنانچہ صحابہ کرام اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سے ان حضرات کے نظریہ کی بھی تردید ہوتی ہے جو علاج معالجہ اور دواء کی افادیت وضرورت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چیز کی طرح مرض بھی قضا و قدر کے زیر اثر ہے اس لیے کسی بیمار کا علاج کرنا لا حاصل ہے۔ جمہور علماء جو علاج و معالجہ کے قائل ہیں کی دلیل مذکورہ احادیث ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ بیشک امراض کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن امراض کے ازالہ کے ذرائع پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جس طرح مرض و بیماری قضا و قدر کے تابع ہے اسی طرح علاج و معالجہ کرنا بھی تقدیر الٰہی ہی سے ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ ہر انسان کی موت کا وقت بالکل اٹل ہے جس کی موت جس صورت میں لکھی جا چکی ہے اسی صورت میں آ کر رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود اپنی حفاظت وسلامتی کے ذرائع اختیار کرنا اور اپنی جان کو کسی حادثہ یا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یا میدان جنگ میں دشمنان دین کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ حاصل یہ کہ جان وصحت کی حفاظت وسلامتی کے لیے دوا وغیرہ جیسے اسباب ذرائع اختیار کرنا نہ تو حکم الہی کے خلاف ہے اور نہ توکل کے منافع ہے جیسا کہ کھانے کے ذریعہ بھوک کو دفع کرنا توکل کے منافع نہیں ہے چنانچہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر توکل کرنے والا

کون انسان ہوسکتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سید المتوکلین تھے، لیکن اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علاج بھی کرتے تھے اور بیماری کو دور کرنے کے ذرائع اختیار فرماتے تھے۔

جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج کرنے کی اجازت

حدیث:

وعن أنس قال رخص رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الرقية من العين والحمة والنملة. رواه مسلم. (متفق عليه)

ترجمہ:

حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جھاڑ پھونک کے ذریعہ نظر بد، ڈنک اور نملہ کا علاج کرنے کی اجازت دی ہے۔" (مسلم)

تشریح:

" افسوں" سے مراد وہ جھاڑ پھونک ہے، جس میں حصول شفا کے لیے منقول دعائیں اور قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں، " نظر بد" ایک حقیقت ہے جس کو بعض حضرات نے " زہر" سے تعبیر کیا ہے ان حضرات کا کہنا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بچھو کے ڈنک اور سانپ کے منہ میں زہر رکھا ہے اسی طرح بعض آدمیوں کی آنکھوں میں بھی زہر رکھا ہے کہ ان کی نظر جس چیز کو بھی لگ جاتی ہے خواہ وہ انسان ہو یا مال و اسباب، زمین جائیداد ہو یا کھیتی و باغات اور جانور ہو، اس کو کھا جاتی ہے۔ چنانچہ نظر بد کے دفیعہ کے لیے دعا و تعویذ اور جھاڑ پھونک نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مقصد کے لیے مختلف دعائیں بھی تعلیم فرمائی ہیں جو

دعاؤں کے باب میں گزر چکی ہیں۔ "ڈنک" سے مراد زہریلہ ڈنک ہے جیسے بچھو کا ڈنک، سانپ کا ڈسنا بھی اسی کے حکم میں ہے اگر کسی شخص کو بچھو ڈنک مار دے یا سانپ ڈس لے تو اس کا زہر اتارنے کا بہترین ذریعہ جھاڑ پھونک ہے۔ "نملہ" اصل میں چیونٹی کو کہتے ہیں لیکن یہاں وہ پھوڑا مراد ہے جو آدمی کے پہلو میں ہو جایا کرتا ہے، کبھی یہ پھوڑا چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں بھی ہوتا ہے جو پسلی کے اوپر نکل آتی ہیں۔ نملہ پھوڑے میں آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور غالباً اسی مناسبت سے اس پھوڑے کو نملہ کہا گیا ہے اور اگر نملہ چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں ہو تو اس میں وجہ مشابہت یہ ہوگی کہ وہ پھنسیاں چیونٹیوں کی طرح پھیلی اور بکھری ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ ہر مرض کا علاج کرنا جائز ہے، اس صورت میں خاص طور پر ان تین چیزوں کا ذکر محض اس لیے کیا گیا ہے کہ دوسرے امراض کی بہ نسبت ان تینوں میں جھاڑ پھونک کا اثر زیادہ اچھا ہوتا ہے اسی طرح جس روایت میں بطور حصر یہ فرمایا گیا ہے کہ جھاڑ پھونک صرف ان تین چیزوں میں جائز ہے اس کی تاویل بھی یہی ہوگی علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جن الفاظ وکلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے ان سے اجتناب کی خاطر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو جھاڑ پھونک کرنے سے منع فرما دیا تھا پھر جب ان تینوں چیزوں میں جھاڑ پھونک کی اہمیت اور لوگوں کو اس سے حاصل ہونے والے فائدے کی بنا پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان تین چیزوں میں منتر پڑھ کر پھونکنے کی اجازت دیدی بشرطیکہ اس منتر میں مشرکانہ الفاظ وکلمات استعمال نہ ہوں یہاں تک کہ بعد میں اس اجازت کو عام کر دیا گیا کہ کسی بھی مرض میں منقول دعاؤں اور قرآنی آیات کے ذریعہ جھاڑ

پھونک کی جا سکتی ہے۔

حدیث؛

وعن عوف بن مالك الأشجعي قال كنا نرقي في الجاهلية فقلنا يا رسول الله كيف ترى في ذلك؟ فقال اعرضوا على رقاكم لا بأس بالرقى مالم يكن فيه شرك. رواه مسلم.

ترجمہ؛

حضرت عوف بن مالک اشجعی (رض) کہتے ہیں کہ ہم زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کے ذریعہ منتر پڑھا کرتے تھے (جب اسلام کا زمانہ آیا تو) ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان منتروں کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم ان منتروں کو پڑھ کر مجھ کو سناؤ جب تک ان میں شرک نہ ہو میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔" (مسلم)

تشریح؛

جب تک ان میں شرک نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جس منتر وافسوں میں جن وشیاطین کے اسماء اوران سے استعانت نہ ہو اوران کے مفہوم ومعنی ایسے نہ ہوں جن سے کفر لازم آتا ہے تو ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ ایسے الفاظ و کلمات پر مشتمل منتر وافسوں کے ذریعہ جھاڑ پھونک جائز نہیں ہے۔جن کے مفہوم ومعانی معلوم نہ ہوں البتہ بعض ایسے منتر جن کے الفاظ وکلمات صحیح روایت میں شارع سے منقول ہیں اوران کے مفہوم ومعانی معلوم نہیں ہیں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے۔واضح رہے کہ جس طرح شیطان ازل ہی سے انسانی عداوت میں مبتلا ہے اسی طرح جنات بھی بالطبع انسان کے

ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے جنات وشیاطین آپس میں ایک دوسرے کے دوست ورفیق ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی انسان پر جنات کا سایہ واثر ہوتا ہے اور اس سایہ واثر کو دور کرنے کے لیے ایسے منتر وافسوں پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام اور ان سے استعانت ہوتی ہے تو جنات اس منتر وافسوں کو قبول کر کے اس انسان کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح بعض اوقات مار گزیدہ (سانپ کا ڈسا ہوا) شخص اصل میں جنات کے زیر اثر ہوتا ہے، بایں طور پر کہ کوئی شریر جن سانپ کی صورت اختیار کر کے کسی انسان کو ڈس لیتا ہے لیکن لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کو درحقیقت سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔ جب ایسے شخص پر منتر پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام ہوتے ہیں تو وہ زہر جو حقیقت میں جن کا اثر ہوتا ہے اس شخص کے بدن سے زائل ہوجاتا ہے اس طرح گویا جنات وشیاطین دونوں انسان کی گمراہی کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ علماء امت کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ کتاب اللہ اور اسماء وصفات الٰہی کے بغیر افسوں ومنتر پڑھنا اور جھاڑ پھونک کرنا جائز نہیں ہے، سب سے زیادہ مہتم بالشان" خود قرآن مجید" ہے کہ اس کا ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ کائنات انسانی کے لیے تاثیر وشفا اور خیر وبرکت کا خزانہ ہے اور جن کا فائدہ یقینی ہے اور پھر اس میں بھی بعض سورتیں اور آیتیں جھاڑ پھونک کے لیے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں جیسے سورت فاتحہ، معوذتین آیت الکرسی اور وہ آیات کریمہ جو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے مفہوم پر مشتمل ہیں، اسی طرح وہ دعائیں اور عملیات بھی افضل ہیں جو احادیث صحیحہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول وثابت ہیں۔ سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں منقول ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کسی ایسے مال واسباب وغیرہ یا بچے پر نظر ڈالے جو اس کو اچھا لگتا ہو تو چاہیے کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کہے (تاکہ اس

مال یا بچے کو نظر نہ لگے) اسی حضرت عثمان غنی (رض) کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے ایک بہت ہی خوبصورت بچے کو دیکھا تو فرمایا کہ اس کی تھوڑی کے گڑھے میں ذرا سی سیاہی لگا دو، تا کہ اس کو نظر نہ لگے۔

نظر بد کا لگنا ایک حقیقت ہے

حدیث:

وعن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال العین حق فلو کان شیء سابق القدر سبقتہ العین وإذا استغسلتم فاغسلوا ۔ رواہ مسلم.

ترجمہ:

حضرت ابن عباس (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نظر بد حق ہے یعنی نظر لگنا ایک حقیقت ہے اگر تقدیر پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی تو وہ نظر ہی ہوتی اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے تو تم دھو دو۔ (مسلم)

تشریح:

نظر حق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر میں کسی چیز کا کھب جانا اور اچھا لگنا خواہ وہ چیز جاندار یعنی انسان وحیوان ہو، یا غیر جاندار جیسے مال واسباب ہو اور پھر اس چیز پر دیکھنے والے کی نظر کا اثر انداز ہو جانا ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جو تقدیر الٰہی سے متعلق ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے سحر و جادو کی طرح بعضوں کی نظر میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جس چیز کو لگ جاتی ہے اس کی ہلاکت وتباہی اور نقصان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر تقدیر الٰہی پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز

ہوتی کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا مرکز اور۔۔۔ومنبع،تقدیر الٰہی ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت کا اثر ونفوذ بھی تقدیر الٰہی سے پابستہ ہے اور چھوٹے سے چھوٹے تک کی حرکت و سکون بھی تقدیر الٰہی کے بغیر ممکن نہیں،گویا کوئی چیز بھی تقدیر کے دائرہ سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔اگر بالفرض کوئی چیز ایسی طاقت رکھ سکتی کہ وہ تقدیر کے دائرہ کو توڑ کر نکل جائے تو وہ نظر بد ہوتی کہ وہ تقدیر کو بھی پلٹ دیتی اور اس پر غالب آجاتی،گویا یہ بات اشیاء میں تاثیر نظر کی شدت اور اس کے سرعت نفوذ کو زیادہ سے زیادہ کے ساتھ بیان کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے۔اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے۔" اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کو نظر لگتی تھی اس کے ہاتھ پاؤں اور زیر ناف حصے کو دھو کر وہ پانی اس شخص پر ڈالتے تھے جس کو نظر لگتی تھی اور اس چیز کو شفا کا ذریعہ سمجھتے تھے اس کا سب سے ادنٰی فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اس ذریعہ سے مریض کا وہم دور ہو جاتا تھا۔چنانچہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی اجازت دی اور فرمایا کہ اگر تمہاری نظر کسی کو لگ جائے اور تم سے تمہارے اعضاء دھو کر مریض پر ڈالنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس کو منظور کرلو اعضاء جسم کو اس مقصد کے لیے دھونے کا طریقہ دوسری فصل کے اخیر میں ذکر ہوگا"۔۔۔واضح رہے کہ جمہور علماء اہل حق کا مسلک تو یہی ہے کہ جاندار خواہ وہ انسان ہو یا حیوان اور اموال میں جائیداد وغیرہ میں نظر کی تاثیر یعنی نظر لگنے سے نقصان پہنچنا ثابت ہے جب کہ بعض لوگ جیسے معتزلہ وغیرہ اس کے منکر ہیں جیسا کہ وہ اموال وغیرہ میں دوا اور صدقہ وخیرات کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جس چیز کا وقوع پذیر ہونا مقدر میں لکھ دیا گیا ہو اس میں کسی اور چیز کا دخل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تقدیر کے لکھے کو کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔لیکن وہ لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ تقدیر عالم اسباب

کے ساتھ کوئی تضاد و منافات نہیں رکھتی، چنانچہ نظر کی تاثیر اور سببیت اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے اس میں اس طرح کی خاصیت رکھ دی ہے کہ وہ ہلاکت و نقصان کا سبب بن جائے علاوہ
ازیں علماء اہل حق کے مسلک کی دلیل کے یہ ارشاد گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) "العین الحق"
ہے کہ جب شارع (علیہ السلام) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ نظر کی تاثیر برحق ہے تو اس کا
اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے۔ رہی بات یہ کہ نظر لگنے کی کیفیت وصورت کیا ہوتی ہے اور
اس کی وجہ سے نظر زدہ کو نقصان وضرر کیسے پہنچتا ہے تو اس سلسلے میں علماء نے مفصل بحث کی ہے
اور لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بعض ایسے لوگوں نے جن کی نظر عام طور پر کسی نہ کسی کو لگتی رہتی ہے بیان
کیا کہ جب ہمیں کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری
آنکھوں سے حرارت نکل رہی ہو، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نظر لگانے والے کی آنکھ سے
ایک خاص قسم کی حرارت سمیہ نکلتی ہے جو ہوا میں مخلوط ہو جاتی ہے اور وہ ہوا پھر نظر زدہ تک پہنچتی
ہے تو اس کے نقصان و ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے جیسا کہ بعض قدیم محققین کے مطابق اس
سانپ کی زہر کی کیفیت ہوتی ہے جو محض اپنی نظر کے ذریعہ زہر کو منتقل کرتا ہے کہ اس کی نظر جس
پر بھی پڑ جاتی ہے اس تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے حاصل یہ کہ دکھائی نہ
دینے والی کوئی شئے نظر لگانے والے کی نظر سے تیر کی طرح روانہ ہوتی ہے اور اگر کوئی ایسی چیز
درمیان میں نہ ہوتی ہے جیسے حرز و تعویذ اور دوا وغیرہ تو وہ شئے نظر زدہ تک نہیں پہنچتی اور اس
میں اثر و نفوذ نہیں کرتی بلکہ اگر وہ حرز و تعویذ قوی و مضبوط قسم کا ہوتا ہے تو وہ شئے نظر لگانے والے
ہی کی طرف پلٹ آتی ہے جیسا کہ اگر مقابل کے پاس سخت و مضبوط سپر ہوتا ہے تو تیر مارنے
والے کا تیر سپر سے ٹکرا کر الٹا مارنے والے کو آکر لگتا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے جس طرح بعض

لوگوں کی نظر میں مذکورہ خاصیت وتاثیر پیدا کی ہے اسی طرح نفوس کاملہ یعنی اہل اللہ اور کاملین کو بھی اس نظر بد کے دفعیہ کی قوت اور اس میں تصرف کی طاقت عطا فرمادی ہے تاکہ وہ عوام کو دعا وتعویذ کے ذریعہ نظر بد کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں۔

خواب کا بیان

"خواب" کے معنی ہیں وہ بات جو انسان نیند میں دیکھے "محققین" کہتے ہیں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو محض خیال کہ دن بھر انسان کے دماغ اور ذہن پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں، وہ خواب میں متشکل ہو کر نمودار ہو جاتی ہیں، دوسری طرح کا خواب وہ ہے جو شیطانی اثرات کا عکاس ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر ڈراؤنے خواب نظر آیا کرتے ہیں اور تیسری طرح کا خواب وہ ہے جو منجانب اللہ بشارت اور بہتری کو ظاہر کرتا ہے، خواب کی یہی تیسری قسم" رویاء صالحہ" کہلاتی ہے اور اس کی حقیقت علماء اہل سنت کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سونے والے کے دل میں علوم معرفت اور ادراکات واحسان کا نور پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ وہ جاگنے والے کے دل کو علوم و معرفت اور ادرکات واحساسات کی روشنی سے منور کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ بلاشک وشبہ اس پر قادر ہے، کیونکہ نہ تو بیداری قلب انسانی میں نور بصیرت کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہے اور نہ نیند اس سے مانع۔واضح رہے کہ سونے والا اپنے خواب میں جن باتوں کا ادراک واحساس کرتا ہے اور جن چیزوں کو اس کا نور بصیرت دیکھتا ہے وہ دراصل وقوع پذیر ہونے والی چیزوں کی علامت واشارہ ہوتا ہے اور یہی علامت واشارہ تعبیر کی بنیاد بنتا ہے۔کبھی یہ علامت واشارہ اتنا غیر واضح ہوتا ہے کہ اس کو عارفین ومعبرین ہی سمجھ پاتے ہیں اور کبھی اتنا واضح ہوتا ہے کہ عام انسانی ذہن بھی اس کی مراد پالیتا ہے۔جیسا کہ بادل کو دیکھ کر بارش کے وجود کی طرف ذہن خود بخود چلا

جاتا ہے۔

اچھا خواب اور برا خواب

حدیث:

وعن أبي قتادة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الرؤيا الصالحة من الله والحلم من الشيطان فإذا رأى أحدكم ما يحب فلا يحدث به إلا من يحب وإذا رأى ما يكره فليتعوذ بالله من شرها ومن شر الشيطان وليتفل ثلاثا ولا يحدث بها أحدا فإنها لن تضره

ترجمہ:

حضرت ابوقتادہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس سے وہ خوش ہو تو چاہیے کہ خواب کو صرف اس شخص کے سامنے بیان کرے جس کو وہ دوست و ہمدرد سمجھتا ہے (جیسے علماء و صلحاء اور اقرباء نیز وہ اس خواب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس کی حمد و تعریف کرے جیسا کہ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت میں منقول ہے) اور جب ایسا خواب دیکھے جس کو وہ پسند نہیں کرتا تو چاہیے کہ اس خواب کی برائی اور شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور شیطان کو دور کرنے کے قصد سے تین مرتبہ تھتکار دے نیز اس خواب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے (خواہ دوست ہو یا دشمن) اس لیے وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (بخاری، ومسلم)

تشریح:

برا خواب شیطان کی طرف سے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ اچھے اور برے دونوں طرح کے خواب کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے اور دیکھنے والا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دیکھتا ہے، لیکن برا خواب شیطانی اثرات کا عطاس ہوتا ہے اور چونکہ اس خواب سے انسان کو پریشانی ہوتی ہے اس لیے اس پر شیطان کو بہت خوشی ہوتی ہے، حاصل یہ کہ اچھا خواب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو بشارت ہوتی ہے تاکہ وہ بندہ خوش ہو اور اس کا وہ خواب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے حسن سلوک اور امید آوری کا باعث اور شکر الٰہی کے اضافہ کا موجب بنے جب کہ غم گین اور پریشان کرنے والا جھوٹا خواب شیطانی اثرات کے تحت ہوتا ہے جس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان کو غم گین و پریشان کر کے ایسی واہ پر ڈال دے جس سے وہ بدگمانی اور نا امیدی اور تقرب الٰہی و تلاش حق کی راہ میں سست روی کا شکار ہو جائے۔ وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کو مال کی حفاظت و برکت اور دفع بلیات کا سبب بنایا ہے اسی طرح اس نے مذکورہ چیزوں یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے، تین دفع تھتکارنے اور کسی کے سامنے بیان نہ کرنے کو برے خواب کے مضر اثرات سے سلامتی کا سبب قرار دیا ہے۔

چند خوابوں کی تعبیر

حدیث:

وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اقترب الزمان لم يكد يكذب رؤيا المؤمن ورؤيا المؤمن جزء من ستة وأربعين جزءا من النبوة وما كان من

النبوة فإنه لا یکذب. قال محمد بن سیرین وأنا أقول الرؤیا ثلاث حدیث النفس وتخویف الشیطان وبشری من الله فمن رأی شیئا یکرهه فلا یقصه علی أحد ولیقم فلیصل قال وکان یکره الغل فی النوم ویعجبهم القید ویقال القید ثبات فی الدین. قال البخاري رواه قتادة ویونس وهشام وأبو هلال عن ابن سیرین عن أبي هریرة وقال یونس لا أحسبه إلا عن النبی صلی الله علیه وسلم فی القید. وقال مسلم لا أدری هو فی الحدیث أم قاله ابن سیرین؛ وفی روایة نحوه وأدرج فی الحدیث قوله وأکره الغل ... إلی تمام الکلام.

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جس وقت کہ زمانہ قریب ہوگا تو مومن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا اور مومن کا خواب نبوت کا چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے اور جو چیز نبوت کے اجزاء میں ہو وہ جھوٹی نہیں ہوا کرتی۔" حضرت محمد بن سیرین جو (ایک جلیل القدر تابعی اور فن تعبیر خواب کے امام ہیں) فرماتے ہیں کہ اور میں (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول احادیث کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو نفس کا خیال، دوسرے شیطان کا ڈرانا اور تیسرے اللہ کی طرف سے بشارت پس جو شخص کوئی برا خواب" (ڈراؤنا) دیکھے تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور (یہ کرے کہ خواب دیکھنے کے بعد) اٹھے اور (نفل) نماز پڑھ لے تاکہ نماز کی برکت و نورانیت کے سبب اس کے دل کو اطمینان نصیب ہو اور خواب کی برائی کا جو وہم و وسوسہ دل میں پیدا ہوگیا ہے وہ جاتا رہے گا) نیز ابن سیرین فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے

(یعنی تعبیر خواب کے ماہر علماء کہتے ہیں) کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے یہ پوری روایت (جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد اور ابن سیرین کے قول پر مشتمل ہے) بخاری و مسلم نے نقل کی ہے لیکن روایت کے آخری جزو کے بارے میں دونوں کو تردد ہے چنانچہ امام بخاری کہتے ہیں کہ اس حدیث کو یعنی پوری روایت کو یا صرف اسی جزو کو کہ جس میں قید کا ذکر ہے قتادہ، یونس، ہشیم اور ابوہلال نے محمد بن سیرین سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے (ابتدائی جزو بطریق مرفوع اور آخری جزو بطریق موقوف) نقل کیا ہے اور یونس نے کہا ہے کہ میرا گمان ہے کہ یہ حدیث کا وہ جزو جس میں ابن سیرین نے قید کا ذکر کیا ہے یعنی یہ الفاظ یعجبھم القید والقید ثبات فی الدین) حضرت ابوہریرہ (رض) کا قول نہیں ہے بلکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے (گویا بخاری کے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ابن سیرین نے نقل کرنے والے ایک راوی یونس کے مطابق روایت کا وہ جزو کہ جس میں طوق کا ذکر ہے، حضرت ابوہریرہ (رض) یا ابن سیرین کا اپنا قول ہے، البتہ وہ جزو کہ جس میں قید کا ذکر ہے حضرت ابوہریرہ (رض) یا ابن سیرین کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ حدیث مرفوع یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے جس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ابوہریرہ (رض) نے اور ابوہریرہ (رض) سے محمد بن سیرین نے نقل کیا ہے[1]) اور امام مسلم نے جو (ابن سیرین سے روایت نقل کر کے) یہ کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ (جزء کہ جس میں قید کے الفاظ ہیں) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث کے الفاظ ہیں یا ابن سیرین کا اپنا قول ہے، مسلم کی ایک اور روایت میں اسی طرح کے الفاظ ہیں نیز مسلم نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) یا محمد بن سیرین نے حدیث میں ادراج کیا ہے۔ بایں طور کہ انھوں نے کہا

میں طوق کو دیکھنا اچھا سمجھتا ہوں۔۔۔الخ۔(گویا مسلم کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا پورا آخری جزو، جو طوق اور قید کے ذکر پر مشتمل ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد نہیں ہے، بلکہ حضرت ابوہریرہ (رض) یا محمد بن سیرین کا اپنا قول ہے نیز بخاری و مسلم کے ان اقوال کی روشنی میں قال وکان یکرہ کی ضمیروں کی حقیقت حال بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ ان ضمیروں کو کس کی طرف راجع ہونا چاہیے!"

تشریح:

جس وقت کہ زمانہ قریب ہوگا کے تین معنی بیان کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد قرب قیامت کا آخری زمانہ ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت کے قریب مومن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا دوسرے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد موت کے زمانہ سے قریب ہونا ہے یعنی جس مومن کی موت کا زمانہ قریب ہوتا ہے اس کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا یہ معنی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے بعض مشائخ سے نقل کئے ہیں تیسرے یہ کہ اس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں دن رات برابر ہوتے ہیں چنانچہ جس زمانہ میں دن رات برابر ہوتے ہیں ان میں انسانی مزاج اعتدال پر ہوتا ہے اور ذہن وفکر کی صلاحتیں صحت وسلامت روی کے ساتھ کام کرتی ہیں ایسے دنوں میں دیکھا جانے والا خواب ذہنی وجسمانی خلل و انتشار سے محفوظ اور زیادہ سچا ہوتا ہے چوتھے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد وہ زمانہ ہے جب سال مہینہ کی طرح مہینہ ہفتہ کی طرح ہفتہ دن کی اور دن ساعت کی طرح گزرنے لگے علماء نے لکھا ہے کہ ایسا زمانہ حضرت امام مہدی کے دور میں آئے گا کیونکہ اس وقت حضرت امام مہدی کے عدل وانصاف اور رعایا پروری کی وجہ سے سب ہی

لوگ آسودگی ومسرت اور بے فکری کے دن گزاریں گے اور ظاہر ہے کہ آسودگی و بے فکری کے دن بڑی سرعت کے ساتھ گزرتے معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی طویل زمانہ کیوں نہ ہو اس کے برعکس عسرت وتنگی اور محنت مشقت کے دن اتنے بھاری معلوم ہوتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی مختصر عرصہ کیوں نہ ہو ایک ایک دن پہاڑ کی طرح گزرتا ہے، لہٰذا حضرت مہدی کے زمانہ میں بھی خواب صحیح و درست ہوں گے کیونکہ وہ راستی کا زمانہ ہوگا، ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ شخص جتنا زیادہ راست باز ہوگا اس کا خواب اتنا ہی سچا ہوگا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد گرامی سے چونکہ مطلق خواب سچا ہونا اور اس کی توصیف وفضیلت واضح ہوتی تھی تو اس لیے خواب کی قسمیں بیان کرنے کے لیے حضرت محمد بن سیرین کا ایک قول نقل کیا گیا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خواب کی ہر قسم نہ تو سچی ہوتی ہے اور نہ قابل تعبیر ولائق اعتبار، بلکہ خواب کی صرف وہی قسم تعبیر ولائق اعتبار ہوتی ہے جس کو حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور آئندہ پیش آنے والے واقعات وحادثات کی خبر وعلامت قرار دیا جاتا ہے۔ ابن سیرین نے خواب کی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم نفس کا خیال ہے، یعنی انسان دن بھر جن امور میں مشغول رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں وہی رات میں بصورت خواب متشکل ہو کر نظر آتی ہیں مثلاً ایک شخص اپنے پیشہ و روزگار میں مصروف رہتا ہے اور اس کا ذہن وخیال انھیں باتوں کی فکر اور ادھیڑ پن میں لگا رہتا ہے جو اس کے پیشہ و روزگار سے متعلق ہیں تو خواب میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں، یا ایک شخص اپنے محبوب کے خیال میں مگن رہتا ہے اور اس کے ذہن پر ہر وقت اسی محبوب کا سایہ رہتا ہے تو اس کے خواب کی دنیا پر بھی وہی محبوب چھایا رہتا ہے غرض کہ عالم بیداری میں جس شخص کے ذہن وخیال پر جو چیز زیادہ

چھائی رہتی ہے وہی اس کو خواب میں نظر آئے گی لہٰذا اس طرح کے خواب کا کوئی اعتبار نہیں۔
دوسری قسم ڈراؤنا خواب ہے، یہ خواب اصل میں شیطانی اثرات کا پرتو ہوتا ہے، شیطان چونکہ ازل سے بنی آدم کا دشمن ہے اور جس طرح وہ عالم بیداری میں انسان کو گمراہ کرنے اور پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح نیند کی حالت میں بھی وہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا، چنانچہ وہ انسان کو خواب میں پریشان کرنے اور ڈرانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے کبھی تو وہ کسی ڈراونی شکل وصورت میں نظر آتا ہے جیسے وہ دیکھتا ہے کہ میرا سر قلم ہو گیا وغیرہ وغیرہ اسی طرح خواب میں احتلام کا ہونا کہ موجب غسل ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی وجہ سے نماز فوت یا قضا ہو جاتی ہے اسی شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتا ہے پہلی قسم کی طرح یہ قسم بھی بے اعتبار اور ناقابل تعبیر ہوتی ہے۔ خواب کی تیسری قسم وہ ہے کہ جس میں منجانب اللہ بشارت کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے خواب میں بشارت دیتا ہے اور اس کے قلب کے آئینہ میں بطور اشارات وعلامات ان چیزوں کو مشکل کر کے دکھاتا ہے جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے۔ یا جن کا تعلق مومن کی روحانی وقلبی بالیدگی و طمانیت سے ہوتا ہے وہ بندہ خوش ہو اور طلب حق میں تر و تازگی محسوس کرے، نیز حق تعالیٰ سے حسن اعتقاد اور امید آوری رکھے خواب کی یہی وہ قسم ہے جو لائق اعتبار اور قابل تعبیر ہے اور جس کی فضیلت وتعریف احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح کا خواب بے اعتبار ہے اور اس کی کوئی تعبیر نہیں تو اس کو کسی کے سامنے بیان کرنا عبث ولا حاصل ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ جب اس قسم کے خواب کو کسی کے سامنے بیان کرے گا اور سننے والا خواب کی ظاہری حالت کے پیش نظر اس کی

خراب تعبیر دے گا۔ تو اس کی وجہ سے فاسد وہم میں مبتلا ہونا اور بدشگونی لینا لازم آئے گا نیز دل و دماغ مختلف قسم کے اندیشوں اور وسوسوں سے پریشان ہو جائیں گے، مزید برآں خواب کے وقوع پذیر ہونے میں خواب کو ایک خاص تاثیر حاصل ہے کہ خواب کو سننے والا جو تعبیر دیتا ہے اللہ تعالیٰ سے ویسا ہی وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔" قال وکان یکرہ الغل الخ" میں لفظ قال اور کان کی ضمیروں کے بارے میں شارحین حدیث نے کئی احتمال لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قال کی ضمیر محمد بن سیرین کی طرف سے راجع ہو جیسا کہ ماقبل کی عبارت قال محمد بن سیرین سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے اور اس بنا پر کان یکرہ کی ضمیریں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف راجع ہوں، اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی وہی ہوں گے جو ترجمہ میں بیان کئے گئے یعنی حضرت محمد بن سیرین نے کہا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے کیونکہ گلے میں طوق کا ڈالا جانا دوزخیوں کی صفت ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے اذ الاغلال فی اعناقھم دوسرا احتمال یہ ہے کہ" قال" کی ضمیر تو ابن سیرین کی طرف راجع ہو اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابوہریرہ (رض) کی طرف راجع ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ابن سیرین نے کہا ہے، حضرت ابوہریرہ (رض) اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے اور حضرت ابوہریرہ (رض) کا اس بات کو اچھا نہ سمجھنا یا تو اس پر تھا کہ انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اسی طرح سنا ہوگا یا اپنے ان کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ قال کی ضمیر تو اس راوی کی طرف راجع ہو جس نے اس حدیث کو حضرت ابن سیرین سے نقل کیا ہے اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابن سیرین کی طرف راجع

ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ راوی نے کہا کہ حضرت ابن سیرین خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے،! بظاہر یہ تیسرا احتمال ایک طرح کی ترجیح رکھتا ہے کیونکہ حضرت ابن سیرین تعبیر خواب کے فن کے امام سمجھے جاتے ہیں اور ان سے اس طرح کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔ اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے یعنی کوئی شخص خواب میں دیکھتا کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اس کو قیدی بنالیا گیا ہے تو اس خواب کو اچھا سمجھتے تھے، بخاری نے اس جملہ میں جمع کا صیغہ یعنی لفظ یعجبہم نقل کیا ہے، لہٰذا ضمیروں کے سلسلے میں اوپر نقل کئے گئے احتمالات میں سے پہلے احتمال کی بنا پر یعجبہم کی ضمیر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کی طرف راجع ہوگی دوسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابوہریرہ (رض) اور ان کے تابعین کی طرف اور تیسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابن سیرین اور ان کے زمانہ کے تعبیر دینے والے علماء کی طرف راجع ہوگی۔ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھنا اس لیے اچھا ہے کہ دراصل برے امور، گناہوں اور کمزوری وگمراہی سے باز رہنے اور دینی احکامات وطاعت پر ثابت قدم رہنے کی علامت ہے جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا ہے۔ ویقال القید ثبات فی الدین (کہا جاتا ہے کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے) لیکن واضح رہے کہ یہ تعبیر اہل دین وطاعت کی نسبت سے ہے یعنی جو شخص دینی زندگی کا حامل اور عبادات وطاعات پر عامل ہوگا اور وہ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھے گا تو اس کے لیے تو مذکورہ تعبیر ہوگی اسی لیے تعبیر خواب کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بیمار یا قیدی، یا مسافر اور یا کوئی مصیبت زدہ شخص خواب میں دیکھے کہ میرے پیروں میں قید کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تو اس حق میں خواب کی یہ تعبیر ہوگی کہ وہ اپنے حال پر قائم رہے گا اسی طرح ایک ہی خواب کو دو مختلف حالت کے آدمی دیکھیں تو اس کی تعبیر ان کے حق میں

ان کی حالت کے مطابق الگ الگ ہوگی، مثلاً اگر کوئی تاجر یہ خواب دیکھے کہ وہ اپنا سامان لے کر کشتی پر بیٹھا ہوا ہے اور ہوا کشتی کے موافق چل رہی ہے تو اس کے حق میں خواب نقصان و ضرر سے سلامتی اور تجارت میں نفع کی علامت قرار پائے گا اور اگر یہی خواب کوئی سالک طریقت دیکھے تو اس کے حق میں یہ خواب شریعت کی اتباع اور مرتبہ حقیقت کو پہنچنے کی علامت قرار پائے گا۔

نیکی اور اچھائی کا بیان؛

اولاد پر ماں کے حقوق

حدیث؛

عن أبي هريرة قال قال رجل يارسول الله من أحق بحسن صحابتي؟ قال أمك. قال ثم من؟ قال أمك. قال ثم من؟ قال أمك. قال ثم من؟ قال أبوك. وفي رواية قال أمك ثم أمك ثم أمك ثم أباك ثم أدناك أدناك. متفق عليه

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ میری اچھی رفاقت یعنی میری طرف سے حسن سلوک و احسان اور خدمت گزاری کا سب سے زیادہ مستحق کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تیری ماں اس نے عرض کیا پھر کون؟ آپ نے فرمایا تمہارا باپ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپنے اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہارا باپ پھر تمہارا وہ عزیز جو نزدیک کی قرابت رکھتا

ہو۔ بخاری ومسلم)

اس دنیا کے معاشرہ کی اصلاح وفلاح دراصل باہمی حقوق ونگہداشت تعلق وقرابت کی پاسداری ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور احسان وبھلائی کے برتاؤ اور اس حسن سلوک میں فرق مراتب کے احساس پر منحصر ہے شریعت اسلامی کا تقاضا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جس تعلق وقربت کا رشتہ رکھتا ہے اور اس تعلق وقرابت میں جو فرق مراتب سے ادائیگی حقوق اور حسن سلوک کے باہمی معاملات میں اس کا لحاظ ضروری ہے ظاہر ہے کہ قرابت کے اعتبار سے ماں کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا اور اس کا تعلق سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا کسی شخص کے احسان وحسن سلوک اور خدمت گزاری کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہوسکتی ہے وہ ماں ہے ماں کے بعد باپ ہے اور پھر دوسرے قرابتی رشتہ دار ہیں لیکن ان قرابتی رشتہ داروں میں بھی تعلق وقرابت کے درجات ومراتب کی رعایت کی جائے گی جو رشتہ دار اپنے رشتہ کے اعتبار سے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ مقدم رکھا جائے گا مذکورہ بالا حدیث میں اسی ضابطہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث کے الفاظ سے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ کسی شخص پر والدین کے ساتھ حسن سلوک وبھلائی کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ حمل کا بوجھ اٹھاتی ہے ولادت کی تکلیف ومشقت اور دودھ پلانے کی محنت وبرداشت کرتی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کے حق سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک وبھلائی اور اس کی خدمت ودیکھ بھال کرنا زیادہ واجب ہے اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت

دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو جائے مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے ان ابن ہو اورلڑ کا اگر ماں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو باپ ناراض ہوتا ہے اور اگر باپ کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے تو ماں آزردہ ہوتی ہے تو ایسی صورت میں یہ درمیانی راہ نکالی جائے گی کہ تعظیم و احترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دے اور خدمت گزاری نیز مالی امداد و عطا میں ماں کے حق کو فوقیت دے۔ ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے بلکہ ان کے مرتبہ و درجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر اپنی پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کر دے تب بھی ان کے تئیں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تاہم شریعت نے کچھ چیزیں ایسی بیان کر دی ہیں جو زیادہ اہمیت کی ہیں اور جن کا لحاظ ہر صورت میں ہونا چاہیے مثلاً سب سے پہلے تو یہ کہ ان کی جائز خواہشات کی تکمیل اور ان کی اطاعت و فرمان برداری کو لازم جانا جائے اور ان کی رضا و خوشنودی کو اپنے حق میں ایک بڑی سعادت سمجھی جائے اپنی حثیت و استطاعت کے ان کی ضروریات اور ان کے آرام و راحت میں اپنا مال و اسباب خرچ کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جو ان کی شان کے مطابق ہو اولاد ان کے سامنے تواضع و انکساری اختیار کرے ان کے سامنے ملائمت و نرمی اور خوشامدی و عاجز کا رویہ اپنائے اور جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کرتے تا آنکہ وہ راضی اور خوش ہوں، ان کی اطاعت و فرمان برداری میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن اطاعت و فرمان برداری ان ہی امور میں کی جانی چاہیے جو مباح ہوں ان کے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہیے جس سے ان کی شان میں بے ادبی و گستاخی ظاہر ہوتی ہو اور نہ ان کے ساتھ تکبر و انانیت کے ساتھ پیش آنا چاہیے خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں بات چیت کے وقت اپنی آواز کو ان کی آواز سے اونچی نہ

کرے اور نہ ان کا نام لے کر ان کو یاد مخاطب کرنا چاہیے کسی کام میں ان سے پہل نہ کرنا چاہیے اور نہ ان کے مقابلہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر والدین غیر شرعی امور کے مرتکب ہوں تو ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے وقت بھی ادب کو اور نرمی و ملائمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے اور ایک دفعہ کہنے پر وہ باز نہ آئیں تو پھر سکوت اختیار کرلیا جائے اور ان کے حق میں دعا و استغفار کرتے رہنا چاہیے اور یہ بات قرآن کی اس آیت سے اخذ کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم کی طرف سے اپنے باپ کے سامنے نصیحت و موعظت کا ذکر ہے۔

والدین کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

حدیث:

وعن المغيرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن الله حرم عليكم عقوق الأمهات ووأد البنات ومنع وهات. وكره لكم قيل وقال وكثرة السؤال وإضاعة المال .متفق عليه

ترجمہ:

حضرت مغیرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ ماں کی نافرمانی کرکے اس کا دل دکھا جائے لڑکیوں کو زندہ درگور کیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ فقر محتاجی اور عار کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے اور بخیلی و گدائی اختیار کی جائے نیز قیل وقال سوال کی زیادتی اور مال ضائع کرنے کو تمہارے لیے مکروہ قرار دیا جائے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح:

خاص طور پر ماں کا ذکر کرنا اس سبب سے ہے کہ اولاد پر ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ ماں کا حق باپ سے تین گنا ہے یا اس تخصیص کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ماں طبعی طور پر باپ سے زیادہ حساس اور کمزور دل ہوتی ہے باپ تو اولاد کی بڑی سے بڑی اذیت رسانی کو برداشت کر لیتا ہے لیکن ماں اپنی اولاد کی طرف سے ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو جاتی ہے اگر اولاد اس کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت و فرمان برداری کرنے میں معمولی بھی غفلت و کوتاہی کرتی ہے تو اس کا دل فوراً متاثر ہو جاتا ہے اور سخت تکلیف محسوس کرتی ہے اور یہ بات ہے کہ اولاد کی تقصیر و کوتاہی سے جس قدر ماں درگزر کرتی ہے اتنا درگزر باپ نہیں کرتا اور اس کا سبب بھی ماں کا کمزور دل ہونا ہے۔ "منع یا منع کے معنی روکنے کے ہیں اور اس سے مراد بخیل اور کنجوسی ہے۔" ھات" دراصل لفظات کے معنی میں ہے جو ایتاء کا صیغہ امر ہے اور جس کے معنی ہیں لاؤ دو یہاں لفظ کو مانگنے کے اور سوال کرنے یعنی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ منع و ھات سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال پر دوسرے لوگوں کا جو حق واجب ہو تو اس کو ادا نہ کرے اور دوسروں کے مال میں سے وہ چیز لے جو اس کے لیے حلال نہیں بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف مال میں منع وہات کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ ہر طرح کے حقوق واجبہ کو ادا نہ کرنا حرام ہے اور ان کا تعلق خواہ مال و ذر سے ہو یا افعال و احوال سے اور خواہ قوال و گفتار سے ہو اخلاق و کردار سے اسی طرح کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرنا اور مانگنا جو دوسروں پر کسی بھی طرح کے حق کے طور پر واجب نہ ہو اور دوسروں کو کسی ایسی چیز کی ادائیگی و انجام دہی کی محنت و کلفت میں مبتلا کرنا جو ان پر واجب نہیں ہے حرام ہے۔"

قیل وقال" یہ ایک محاورہ ہے جو ہماری زبان میں بھی اسی طرح مستعمل ہے اس کا اطلاق عام طور پر بے فائدہ بحث ومباحثہ، ردوکد اور حجت وتکرار پر ہوتا ہے یہاں حدیث میں بھی قیل وقال کو مکروہ قرار دینے کا مطلب بے فائدہ باتیں کرنے اور بک بک لگانے سے منع کرنا ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب بے فکر لوگ کہیں آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو ادھر ادھر کی لایعنی باتوں میں لگ جاتے ہیں نہ کسی گفتگو کا کوئی با مقصد موضوع ہوتا ہے اور نہ کسی بات کا کوئی دینی و دنیاوی فائدہ ان کی بات چیت کا زیادہ تر موضوع غلط وسلط واقعات کو نقل کرنا اور جھوٹے سچے اقوال کو بیان کرنا ہوتا ہے چنانچہ جب کوئی شخص کہ فلاں شخص نے ایسا ایسا کہا فلاں آدمی نے اس طرح کہا تو فلاں شخص نے یوں جواب دیا غرضیکہ اسی طرح کے بے سروپا اور لغو باتیں کر کے اور گپ شپ میں مشغول رہ کر وقت جیسی قابل قدر شئے کو ضائع کرتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ قیل وقال کی ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس بحث ومباحثہ اور باہمی بات چیت کا مقصد کسی مسئلہ معاملہ کی تحقیق اور حصول معلومات نہ ہوں ہاں اگر کسی معاملہ کی تحقیق حصول معاملہ میں اور دوسرے نیک مقصد کے لیے باتوں میں مشغول رہا جائے اور لوگوں کے اقوال بیان کئے جائیں تو اس پر مذکورہ ممانعت کا اطلاق نہیں ہوگا بعض حضرات نے قیل قال کی مراد بہت زیادہ باتیں کرنا اور لکھنا ہے اور واضح کیا ہے کہ بہت زیادہ باتیں کرنا دل پر غفلت ومردنی طاری کرتا ہے بے حسی اور لاپرواہی میں مبتلا کرتا ہے اور وقت کو ضائع کرتا ہے۔" کثرۃ السوال" یعنی سوال کی زیادتی کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ دوسرے لوگوں کے احوال و معاملات کی بہت زیادہ پوچھا پاچھی اور تجسس معلومات کرنا دوسرے کے یہ اپنے علم کی برتری کو ظاہر کرنے یا کسی کو امتحان وآزمائش میں مبتلا کرنے یا لاحاصل بحث ومناظرہ کی خاطر

بہت زیادہ علمی سوالات کرنا اور کسی بات کو بہت زیادہ گھما پھرا کر پوچھنا اور تیسرے یہ کہ اس ممانعت کے مخاطب خاص طور پر صحابہ تھے جنہیں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دینی احکام و مسائل میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ سوالات نہ کریں اور نہ ادھر ادھر کے معاملات میں آپ سے پوچھ پاچھ کیا کریں کیونکہ سوالات کی زیادہ کثرت اور غیر ضروری پوچھا پاچھی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طبیعت ناگوار ہوتی ہے بلکہ زیادہ پوچھنا احکام و مسائل میں شدت وسختی اور مزید پابندیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا آیت (لاتسئلوعن اشیاء)۔" اضاعۃ المال" یعنی مال کو ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنے روپے کو اسراف یعنی فضول خرچیوں میں بہایا جائے یا اس کو ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس کا حق تعالیٰ کی طاعت وخوشنودی سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا سارا مال اور روپیہ یا اس کا کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو دیدے مگر اس کے وہ عزیز و اقارب اور متعلقین محروم رہیں جو نہ صرف اپنے تعلق کی وجہ سے بلکہ اپنے احتیاج و ضرورت کی بنا پر بھی اس کے مال اور روپیہ اور پیسہ پر اپنا حق رکھتے ہوں یا کوئی شخص اپنے مال و اسباب اور دولت کو پانی میں ڈال دے یا نذر آتش کر دے اور یا کسی ایسے فاسق کو دیدے جو اس کو گناہ و معصیت کے کاموں میں خرچ کرے۔ اضاعۃ المال کے مذکورہ بالا مسئلہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں سمجھنا چاہیے کہ اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جہاں کرچ کرنا ہے حرام یا مکروہ ہے وہاں اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو صرف بلاشبہ اسراف اور ضائع کرنا کہلائے گا لیکن یہ دونوں صورتوں میں بالکل واضح ہیں اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اشتباہ اس جگہ ہے جہاں کرچ کرنا بظاہر معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اچھی طرح غور وفکر کیا جائے تو اس خرچ کے نتیجہ سے برائیاں اور ظاہری

باطنی خرابیاں نکلتی ہیں مثلاً بلا ضرورت دور دراز کے علاقوں میں مکانات بنوانا، مکانات میں بے ضرورت تعمیر و ترمیم کر کے ان کو وسیع کرنا اور ان کی ناروا آرائش و زیبائش کرنا اور اس کی خاطر مال خرچ کرنا جہاں جس قدر خرچ کرنے کی ضرورت ہو وہاں اس سے زائد خرچ کرنا، محض نفس و طبیعت کے حظ اور مزہ لذت حاصل کرنے کے لیے حد اعتدال سے زیادہ اچھے اچھے کھانے کھانا بڑائی جتانے اور اپنے کو برتر ثابت کرنے کے لے اعلی پوشاک پہننا اور اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لیے اونچے درجہ کی طرف معاشرت اختیار کرنا اور ان سب صورتوں میں فقراء مساکین اور مفلس و قلاش لوگوں کی ضروریات سے صرف نظر کرنا اور ان کی خستہ حالی و محتاجگی کی قطعاً کوئی رعایت نہ کرنا جیسا کہ خالص دنیادار اور فضول خرچ کرنے والوں کا شیوہ ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر اپنا مال اور روپیہ پیسہ خرچ کرنا اگرچہ شریعت کے ظاہری حکم کی روشنی میں حرام قرار نہ پائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے اخراجات قلب و طبیعت پر تنگی و سختی اور بے مروتی طاری ہونے کا سبب بنتے ہیں اس صورت حال سے سماج و معاشرہ میں غیر فطری عدم توازن و ناہمواری کی فضا بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے مختلف قسم کی برائیوں ظہور میں آتی ہیں۔ اسی طرح برتن باسنوں ہتھیاروں اور استعمال میں آنے والی دوسری چیزوں کو سونے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے مزین کرنا، خرید و فروخت کے معاملات میں اس طرح لاپرواہی برتنا کہ نہ تو مال کے ڈوبنے کا خوف ہو جیسے ادھار لین دین کی مدت کو ضرورت سے زائد بڑھانے اور نہ اپنے روپے پیسے کی حفاظت کا لحاظ ہو جیسے ایسی تجارت یا معاملہ میں اپنا روپیہ لگانا جس میں نقصان کا یقین ہو یا کسی چیز کو خواہ مخواہ بلا ضرورت گراں قیمت پر خریدنا اس طرح کی چیزیں بھی اسراف یعنی فضول خرچی اور اپنے مال کو ضائع کرنے کے حکم میں داخل

ہیں۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک فراخی رزق اور درازی عمر کا ذریعہ ہے

حدیث؛

وعن أنس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من أحب أن يبسط له في رزقه وينسأ له في أثره فليصل رحمه. متفق عليه. (متفق عليه)

ترجمہ؛

حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت وفراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے یعنی اس کی عمر دراز ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح؛

"اثر" اصل میں پیروں کے اس نشان کو کہتے ہیں جو چلتے وقت زمین پر پڑتا ہے اور وہ نشان گویا زندگی کی علامت ہوتا ہے جو شخص مرگیا اس کا نشان قدم زمین پر نہیں پڑا اس اعتبار سے عرب میں مدت عمر کو اثر کہا جانے لگا۔ حدیث کے اس جملہ اس کے رزق میں وسعت فراخی اور اس کی موت تاخیر کی جانے کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی عقیدے میں رزق کا تعلق تقدیر سے ہے کہ جس شخص کے مقدر میں جس قدر رزق لکھ دیا گیا ہے اس کو اسی قدر ملے گا اس میں نہ کمی ہوسکتی ہے اور نہ زیادتی ہوسکتی ہے اور اسی طرح موت کا وقت بھی متعین ہے جس کی موت کا جو وقت کاتب تقدیر نے لکھ دیا ہے اس وقت سے نہ ایک لمحہ پہلے موت آسکتی ہے اور نہ ایک لمحہ بعد جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے، آیت (فاذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃ

ولایستقدمون) ۔ پھر جب وہ میعاد ختم ہوگی یعنی عمر پوری ہوگی اس وقت نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے ۔لہذا اس واضح عقیدے کی روشنی میں حدیث کے مذکورہ بالا جملے کے معنی کیا ہوں گے اس کا جواب یہ ہے کہ رزق میں وسعت فراخی اور درازی عمر سے مراد رزق میں برکت کا محسوس ہونا، شب و روز کا خوشی و مسرت اور اطمینان وسکون کے ساتھ گزرنا عمر کے بیشتر لمحات کو طاعات وعبادات کی زیادہ سے زیادہ توفیق حاصل ہونا اور قلب کو نورانیت اور باطن کو صفائی و پاکیزگی کا نصیب ہونا ہے یا درازی عمر سے مراد دنیا جہان میں نام کو نیک بقا حاصل رہنا ہے یا یہ کہ درازی عمر سے اولاد صالح مراد ہے جو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے حق میں دعاو مغفرت اور ایصال ثواب کرتی ہے اور اس کے نیک نام کو باقی رکھتی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ بقائے اولاد مردہ کے لیے پیدائش ثانی ہے یعنی صاحب اولاد شخص مرنے کے بعد بھی اس اولاد کی صورت میں ایک طرح سے اپنا وجود باقی رکھتا ہے ۔اور اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رزق وعمر کے بارے میں مذکورہ بالا عقیدہ اور حدیث کے مفہوم کے درمیان کوئی ایسا تضاد نہیں ہے جس کو دور کرنے کے لیے دقیق تاویلات اختیار کی جائیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنے کو فراخی ورزق اور درازی عمر کا سبب قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا کیا ہے چنانچہ وہ جس کے رزق میں وسعت، فراخی اور عمر درازی کرنا چاہتا ہے اس کو رشتہ داروں کے تئیں ادائے حقوق کی توفیق بخش دیتا ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جس کو تقدیر الٰہی میں ترمیم وتغیر کا نام دیا جائے زیادہ سے زیادہ اس بات کو خلق کی نسبت سے محو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسے لوح محفوظ میں لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر ساٹھ

سال کی ہے لیکن اگر یہ شخص اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے تو اس کی عمر چالیس سال کا اضافہ ہو جائے۔ اس مسئلہ میں بحث کی خاطر علمی اور تحقیقی طور پر بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ صرف شارع نے جو بیان کر دیا ہے اور جس طرح فرمایا ہے بس اسی پر ایمان اور اعتقاد رکھا جائے نہ کہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں چنانچہ سعادت کی نشانی میں ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جتنا ارشاد فرمادیا ہے اسی کو اختیار کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور دور دراز کی بحثوں اور تحقیقی موشگافیوں میں الجھ کر اپنے ذہن وفکر کو بوجھل نہ بنایا جائے۔

صلہ رحمی کی اہمیت

حدیث:

وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خلق الله الخلق فلما فرغ منه قامت الرحم فأخذت بحقوي الرحمن فقال مه؟ قالت هذا مقام العائذ بك من القطيعة. قال ألا ترضين أن أصل من وصلك وأقطع من قطعك؟ قالت بلى يا رب قال فذاك. متفق عليه

ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا یعنی اللہ نے تمام مخلوقات کو ان کی پیدائش سے پہلے ان صورتوں کے ساتھ اپنے علم ازلی میں مقدر کر دیا جن وہ پیدا ہوں گے جب اس سے فارغ ہوا تو رحم یعنی رشتہ ناتا

کھڑا ہوا اور پروردگار کی کمر تھام لی، پروردگار نے فرمایا کیا چاہتا ہے؟ رحم نے عرض کیا کہ یہ کاٹے جانے کے خوف سے تیری پناہ کے طلبگار کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے یعنی میں تیرے روبرو کھڑا ہوں اور تیرے دامن عزت وعظمت کی طرف دست سوال دراز ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن عزت وعظمت کی طرف دست سوال دراز کیئے ہوئے ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن کو جوڑنے کے بجائے اس کو تار تار کر دے۔ پروردگار نے فرمایا کہ تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو شخص رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کا ذریعہ) تجھ کو قائم رکھے اور اس کو میں بھی اپنے احسان وانعام اور اجر وبخشش کے ذریعہ قائم برقرار رکھوں گا اور جو شخص رشتہ داری کے تعلق کو پامالی کا ذریعہ تجھ کو منقطع کر دے میں بھی اپنے احسان وانعام کا تعلق اس سے منقطع کرلوں؟ رحم نے عرض کیا کہ پروردگار بیشک میں اس پر راضی ہوں پروردگار نے فرمایا اچھا تو یہ وعدہ تیرے لیے ثابت و برقرار ہے۔ (بخاری ومسلم)

"جب اس سے فارغ ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مخلوقات کو پیدا کر چکا اگرچہ ظاہری طور پر ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اس میں ایک لطیف نکتہ ہے کہ لغوی طور پر فراغت کا حقیقی مفہوم اپنے تحقق کے لیے پہلے اشتغال کا متقاضی ہوتا ہے یعنی فراغت کا مفہوم اس صورت پر صادق آتا ہے کہ جب کسی کام میں مشغولیت رہی ہو اور اس کام کے علاوہ دیگر امور سے باز رکھتی ہے اس لیے کہا جائے گا کہ جب اس سے فارغ ہوا میں فراغت اپنے اس حقیقی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ اس سے پاک منزہ ہے کہ اس کو ایک کام

دوسرے کام سے باز رکھے جیسا کہ ایک دعائے ماثورہ میں یوں آیا ہے، سبحان من لا تشغلہ شان عن شان،،۔"حقو" دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ازار باندھا جائے اور چونکہ ازار کو باندھنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو ملا کر باندھنا اس اعتبار سے یہاں اس لفظ کا تثنیہ استعمال کرتے ہوئے بحقوی الرحمن فرمایا گیا یعنی وہ جگہ جہاں ازار کے دونوں کنارے باندھے جاتے ہیں ویسے لفظ،حقو،کا اطلاق خود ازار باندھنے کی جگہ اور کمر جیسی چیزوں سے پاک ومنزہ ہے اس لیے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ یہ جملہ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اہل عرب کے ایک مخصوص اور اپنے بیان کا مظہر ہے اور یہاں جس بات کو بیان کرنا مقصود تھا ان کو انہی کے طرز کلام کی مثالی صورت میں واضح کیا گیا ہے چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی پناہ میں آنا چاہتا یا اس کی مدد کا خواہاں ہوتا جو اس کو سخت اضطراب و پریشانی میں ڈالنے والی ہوتی اور وہ پناہ یا مدد چاہنے کی اپنی ضروریات کو زیادہ اہمیت رکھتا اور تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا تو جس کی پناہ یا مدد درکار ہوتی اس کے حقو ازار پر دونوں ہاتھ مارتا تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور یہ پوچھنے پر مجبور ہو کہ تیرا مقصد کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے چنانچہ رشتہ ناطے کا اپنے کاٹے جانے سے اللہ کی پناہ مانگنے کے مفہوم ہے جو کسی انسان کو پکڑنے کا ہوتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل عرب کے ہاں جب کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یداہ مبسوطتان یعنی اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں تو اس سے مراد اس کی نہایت سخاوت وفیاضی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے خواہ وہ واقعتا ہاتھوں والا ہو یا خلقی طور پر سرے سے اس کے ہاتھ ہی نہ ہوں اور خواہ وہ ایسی ذات ہو جس کے لیے ہاتھوں کا وجود ہی محال ہو جیسے حق تعالیٰ کی ذات حاصل یہ ہے کہ اس طرح کے طرز کلام اہل عرب میں محاورہ کے طور پر بہت

مستعمل ہیں جن کے الفاظ اپنے حقیقی معنی کو ادا کرنے کے بجائے دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اور احادیث نبوی کا صدور اہل عرب ہی کے طرز کلام پر اور اسلوب بیان کے مطابق ہوا ہے اس لیے قرآن وحدیث کے ایسے مقام کہ جہاں اس طرح کے جملے آتے ہیں اور جن پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے اور ان کی تاویل وضاحت کے لیے یہ بات ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ویسے اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رحم یعنی رشتہ وناطہ کوئی ذات وجسم تو ہے نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر حق تعالیٰ سے پناہ کا طلبگار ہو بلکہ حقیقت میں وہ ایک معنی ہے لہٰذا اس کے لیے کھڑے ہونے اور پناہ چاہنے کے الفاظ استعمال کرنا بطور تشبیہ و تمثیل ہی ہو سکتا ہے جس سے اس بات کو واضح کرنا مراد ہے کہ رحم گویا ایک ہستی یا ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو کھڑا ہو اور حق تعالیٰ کی عزت وعظمت اور اس کی کبریائی کا دامن پکڑ کر پناہ کا طلب گار ہو۔ اسی طرح کی بات نووی نے بھی بیان کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ رحم جس کو جوڑا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے کوئی ذات یا جسم نہیں ہے بلکہ معانی میں سے ایک معنی ہے جو نہ کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس سے کلام وگفتگو ہو سکتی ہے لہٰذا اس کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی مراد دراصل رحم یعنی ناطے کی اہمیت کو ظاہر کرنا، ناطے کو جوڑنے والے کی فضیلت کو بیان کرنا اور ناطے کی مذمت کرنا ہے کیونکہ ناطے کو جوڑنا فی الجملہ واجب ہے اور اس کو توڑنا گناہ کبیرہ ہے اگرچہ صلہ رحم کے درجات متعین کر دیئے گئے ہیں جن میں سے بعض کو زیادہ اہمیت اور برتری حاصل ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ ترک مہاجرت یعنی میل ملاقات کو اختیار کرنا ہے کیونکہ صلہ رحم کا ایک ذریعہ کلام وملاقات بھی ہے اگرچہ وہ محض سلام کی حد تک ہو۔ واضح رہے کہ صلہ رحم کے ان درجات کے درمیان تفاوت واختلاف کی بنیاد مواقع وحالات اور ضرورت قدرت کے مختلف ہونے پر

ہے چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں رشتہ داری کے تعلق کی رعایت اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کی زیادہ اہمیت وضرورت ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں زیادہ اہم ہے اور بعض میں مستحب لہٰذا اگر کسی شخص نے ناتا جوڑنے کے حق کو جزوی طور پر ادا کیا اور اس کو پورے طور پر ادا نہیں کرسکتا تو اس کو ناتا توڑنے والا نہیں کہیں گے لیکن اگر کسی شخص نے رشتہ داری کے حقوق میں سے کسی ایسے حق کو پورا کرنے میں کوتاہی کی جس کو پورا کرنے پر وہ قادر تھا نیز اس حق کو پورا کرنا اس لیے مناسب بھی تھا تو اس شخص کو ناتا جوڑنے والا کہا جائے گا۔

خلاف شرع امور کی سرکوبی کا حکم

حدیث:

عن أبي سعيد الخدري عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان.

رواه مسلم

ترجمہ:

حضرت ابوسعید خدری (رض) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" تم میں سے جو شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے (یعنی جس چیز کو شریعت کے خلاف جانے) تو اس کو چاہیے کہ اس چیز کو اپنے ہاتھوں سے بدل ڈالے (یعنی طاقت کے ذریعہ اس چیز کو نیست ونابود کردے مثلا باجوں گاجوں اور آلات لہو ولعب کو توڑ پھوڑ دے، نشہ آور مشروبات کو ضائع کردے اور ہڑپ کی ہوئی چیز کو اس کے مالک کے سپرد کرادے وغیرہ وغیرہ) اور اگر وہ خلاف شرع امر کے مرتکب کے زیادہ قوی ہونے کی وجہ

سے ہاتھوں کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی خلاف شرع امور کے بارے میں وعید کی آیتیں اور احادیث کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی اس کو دل سے برا جانے قلبی کڑھن رکھے اور عزم و ارادہ پر قائم رہے کہ جب بھی ہاتھ یا زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت حاصل ہوگی تو اپنی ذمہ داری کو ضرور پورا کرے گا، نیز اس خلاف شرع امر کے مرتکب کو بھی برا جانے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرے) اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (مسلم)

......

تشریح:

برائیوں کے پھیلنے سے روکنے اور ان کا قلع قمع کرنے کی جو ذمہ داری اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ ہر برائی کا سر طاقت کے ذریعہ کچل دیا جائے بشرطیکہ اس طرح کی طاقت میسر ہو اور اگر یہ طاقت حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو روکنے کا فریضہ زبان کے ذریعہ ادا کیا جائے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر زبان کے ذریعہ بھی کسی برائی کی مذمت کرنے اور اس کو ختم کرنے کی ہمت نہ ہو تو پھر دل سے اس فریضہ کو انجام دیا جائے۔ یعنی کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اسے دل سے برا جانے اور اس کے مرتکب کے خلاف قلب میں عداوت و نفرت کے جذبات رکھے جائیں، اس درجہ کو ایمان کا سب سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان اس درجہ کمزور ہو جائیں کہ وہ کسی برائی کو مٹانے کے لیے ہاتھ اور زبان کی طاقت سے محروم ہوں تو سمجھا جائے کہ یہ ایمان کے لیے سب سے کمزور زمانہ ہے کہ اگر اہل ایمان طاقتور ہوتے تو وہ کسی برائی

کو اپنی قولی و فعلی طاقت کے ذریعہ مٹانے کی بجائے محض قلبی نفرت پر اکتفا نہ کرتے۔ یا، وذالک اضعف الایمان، کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کو محض قلبی طور پر برا جاننے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ ہاتھ اور زبان کے ذریعہ اس برائی کو مٹانے کی جدو جہد کرتا ہے، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ بہترین جہاد، ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ آیت (ولا یخافون لومۃ لائم) اور ان کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث میں پہلے حکم (یعنی برائی کو ہاتھ کے ذریعہ مٹانے) کا تعلق ان اہل ایمان سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے طاقت و اقتدار سے نوازا ہے یعنی بادشاہ و حاکم وغیرہ، چنانچہ طاقت و اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر و اقتدار میں سختی و شدت کے ساتھ برائیوں کی سرکوبی کریں اور برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں دوسرے حکم (یعنی برائی کو زبانی مذمت اور تلقین و نصیحت کے ذریعہ ختم کرنے) تعلق علماء کی ذات سے ہے۔ یعنی یہ اہل علم اور واعظین کا فریضہ ہے کہ وہ جن برائیوں کو دیکھیں اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعہ ان کی مذمت کریں اور عوام کو تلقین و نصیحت کے ذریعہ ان برائیوں سے روکیں اور تیسرے حکم (یعنی برائیوں اور ان کے مرتکبین کے خلاف دل میں نفرت کا جذبہ رکھنے کا تعلق عام مسلمانوں سے ہے، چنانچہ عام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خلاف شرع امور کو دیکھ کر محض اعراض و بے اعتنائی کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ ان امور کو دل سے برا جانیں اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف قلبی نفرت رکھیں۔ بعض حضرات نے حدیث کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ چیز یعنی کسی برائی کو دیکھ کر محض دل میں اس کو برا سمجھنے پر اکتفا کر لینا ایمان کے مراتب

میں سب سے کمزور مرتبہ ہے کیونکہ اگر کوئی مسلمان ایسی چیز کو دیکھے کہ جس کا دینی نقطہ نظر سے برا ہونا قطعی طور پر ثابت وظاہر ہو اور وہ اس چیز کو برا بھی نہ سمجھے بلکہ اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتے اور اس کو اچھا جانے تو مسلمان نہیں رہے گا بلکہ کافر ہو جائے گا۔ اس موقع پر اس بات کو بھی جان لینا چاہیے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم بھلائیوں یا برائیوں کی حیثیت کے تابع ہوتا ہے یعنی اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہے کہ اس کو اختیار کرنا واجب ہے تو اس کو اختیار کرنے کا حکم دینا (یعنی امر بالمعروف) بھی واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مستحب ہوگی تو امر بالمعروف بھی مستحب ہوگا، اسی طرح اگر کوئی خلاف شرع چیز حرام کا درجہ رکھتی ہو اس سے روکنا یعنی نہی عن المنکر واجب ہوگا اور اگر وہ چیز مکروہ ہو تو اس صورت میں نہی عن المنکر بھی مستحب ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امر بالمعروف ونہی وعن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کی وجہ سے کسی فتنہ وفساد کے پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو مثلاً اگر یہ ظاہر ہو کہ فلاں شخص کو کسی نیک کام کی تلقین کرنے کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا یا جو شخص کسی برے کام کا مرتکب ہے اگر اس کو اس برائی سے روکا گیا تو اس کے نتائج اور زیادہ فتنہ وفساد کی صورت میں نکلیں گے تو اس صورت میں اس فریضہ کی ادائیگی قطعا ضروری نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو قبول کئے جانے کا گمان بھی ہو، لہٰذا اگر یہ گمان ہو کہ جس شخص کو نیک کام کرنے کی تلقین کی جائے گی یا اس کو کسی برے کام سے روکا جائے گا تو وہ اس بات کو قبول نہیں کرے گا تو اس کو اس نیک کام کا حکم کرنا یا برے کام سے روکنا واجب نہیں ہوگا البتہ مستحسن ضرور رہے گا تا کہ شعار اسلام کا اظہار ہو جائے۔ امام نووی (رح) نے اس کے خلاف نقل کیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ حدیث کے الفاظ من رای منکم منکرا میں لفظ من کے ذریعہ مذکورہ حکم کا مخاطب

جن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے ان میں ملت کا ہر فرد شامل ہے، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور خواہ آزاد ہو یا غلام یہاں تک کہ فاسق بھی اس امر کا ذمہ دار ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ امر بالمعروف کے لیے شرط نہیں ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا حکم کرنے والا ہو وہ پہلے خود بھی اس نیکی پر عامل ہو اور بغیر اپنے عمل کے امر بالمعروف کا فریضۃ انجام دینا اس کے لیے درست نہ ہو کیونکہ جس طرح خود اپنے نفس کو کسی نیکی پر عمل کرنے کی تلقین کرنا ایک واجب چیز ہے اسی طرح ایک واجب امر یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کی جائے، لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک واجب ترک ہوتا تو اس کی وجہ سے دوسرے واجب کو ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ جس واجب کا ترک ہوگا اس کا گناہ بہر صورت لازم آئے گا۔ لہٰذا قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ۔ آیت (لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ) 61۔ الصف 2 :)۔ (یعنی تم اس چیز کو کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے) تو اس آیت کریمہ کا محمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس آیت کی مراد ترک عمل سے روکنا اور اس پر زجر وتنبیہ ہے نہ کہ دوسروں کو بھلائی کی تلقین کرنے سے منع کرنا مراد ہے، اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ جو شخص بھلائیوں کی تلقین کرتا ہے اور دوسروں سے نیک عمل اختیار کرنے کو کہتا ہے لیکن وہ خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتا تو یہ آیت کریمہ ایسے شخص کو متنبہ کرتی ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تم دوسروں کو بھلائی اور نیک عمل کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ نہایت غیر موزوں بات ہے کہ تم خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتے۔ لہٰذا آیت یہ بات قطعا ثابت نہیں کرتی کہ جو شخص خود نیک عمل اختیار نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیک عمل اختیار کرنے کی تلقین

نہیں کر سکتا، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیکی کی تلقین کرنے والا اگر خود بھی نیکی کو اختیار کرے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا، اس کی تلقین و نصیحت دوسروں پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ امام نووی (رح) نے شرح مسلم میں اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی جو ترتیب ذکر کی گئی ہے وہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے ذریعہ واجب ہے اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ کچھ روافض کا اس سے اختلاف ہے جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہٰذا جس شخص نے مذکورہ ترتیب کے مطابق اس فریضہ کو انجام دیا اور مخاطب نے اس کو قبول کرلیا تو سبحان اللہ اور اگر قبول نہ کیا تو وہ شخص اپنی ذمہ داری سے بہر حال سبکدوش ہو جائے گا، اس کے بعد اب اس پر کوئی اور چیز واجب نہیں ہوگی۔ نیز علماء نے کہا ہے کہ اس امر (یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کی فرضیت بطریق کفایہ ہے اور جو شخص اس فریضہ کی ادائیگی کی طاقت وقوت رکھنے کے باوجود اس ذمہ داری کو بلا کسی عذر کے پورا نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں یہ امر فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی برائی کسی ایسی جگہ رونما ہو رہی ہو کہ ایک شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا یا اس کے ازالہ کی قدرت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں رکھتا جیسے اپنی بیوی یا بیٹی کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اس برائی کو ختم کرنے کی ذمہ داری خاص طور سے اسی شخص پر عائد ہوگی۔ امام نووی (رح) نے یہ بھی لکھا ہے کہ عدم قبولیت کا گمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کو ساقط نہیں کرتا، لہٰذا اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ فلاں شخص کے سامنے بھلائی کی تلقین کرنا یا اس کو برے کام سے روکنا بے کار ہے کیونکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قبول نہیں کرے گا تو اس صورت میں بھی اس پر واجب ہوگا کہ وہ

اس شخص کو نیک کام کرنے کا حکم دے اور برائی کے راستہ سے روکے اور اس بات کی قطعا پروا نہ کرے کہ اس کی بات مانی جائے گی یا نہیں کیونکہ موعظت ونصیحت اول تو بذات خود بڑے فائدے رکھتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اور کبھی نہ کبھی ضرور اثر کرتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔آیت (فان الذکری تنفع المومنین)۔دوسرے یہ کہ محض اس گمان کی بنا پر کہ مخاطب تلقین ونصیحت سے کوئی اثر نہیں لے گا اپنی ذمہ داری سے اعراض نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہیے کہ لوگوں نے تو رسولوں تک کو جھٹلایا ہے اور پیغمبروں تک کی موعظت ونصیحت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے تو کیا ان رسولوں اور پیغمبروں نے حق بات پہچاننے کا فریضہ ترک کر دیا تھا۔قرآن نے جو بات رسول و پیغمبر کے بارے میں فرمائی ہے وہ ہر شخص پر صادق آتی ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے یعنی آیت (وما علی الرسول الا البلاغ المبین) (یعنی رسول کا کام بس یہ ہے کہ) اللہ کے احکام) صاف صاف پہنچا دے (ان احکام کا ماننا یا نہ ماننا دوسروں کا کام ہے۔واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف حاکم اور مقتدر مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ اس امر کی انجام دہی کے لیے حاکم اپنی طرف سے احکام جاری کردے، بلکہ اس کا حق عام لوگوں کو بھی پہنچتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو انجام دیں، بلکہ ایسے زمانہ میں جب کہ طاقت واقتدار رکھنے والے مسلمان اس فریضہ سے بالکل لاپرواہی برتتے ہیں۔خصوصیت سے عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں اور تمام مسلمانوں میں بھی زیادہ ذمہ داری علماء و مشائخ پر عائد ہوتی ہے،اسی طرح اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنا مخاطب صرف عام مسلمانوں ہی کو

نہیں ماننا چاہیے بلکہ خواص جیسے حاکموں وغیرہ کو بھی مناسب انداز میں بھلائیوں کی تلقین کرنی چاہیے اور وہ جن برائیوں میں مبتلا ہوں ان سے ان کو روکنا چاہیے، چنانچہ پچھلے زمانوں کے بزرگ صرف عوام الناس کو بھلائیوں کی تلقین نہیں کرتے تھے اور ان کو برائیوں سے روکنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ بادشاہوں حاکموں اور مقتدر مسلمانوں کے سامنے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی شخص کو کرنا چاہیے جو یہ علم رکھتا ہو کہ وہ جس چیز کا حکم دے رہا ہے یا جس چیز سے روک رہا ہے شریعت کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت و اہمیت ہے، چنانچہ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جن کا فرض و واجب ہونا یا جن کا حرام ہونا اس طرح ظاہر ہے کہ تمام مسلمان ان کو جانتے ہیں، جیسے نماز اور روزہ وغیرہ یا زنا اور شراب وغیرہ، تو ان چیزوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام مسلمان بھی شوق سے کر سکتے ہیں لیکن جو چیزیں کہ خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی، ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں عام مسلمانوں کو کوئی علم نہیں ہوتا جو اجتہاد سے تعلق رکھتی ہیں تو عوام کو ان طرح کی چیزوں میں سے صرف اسی چیز کو اختیار کرنے سے منع کرنا چاہیے جن کی ممانعت متفق علیہ ہو مختلف فیہ امور میں منع نہیں کرنا چاہیے خصوصاً ان حضرات کے مسلک کے مطابق کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے۔ آخر میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیں ان کو چاہیے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں خوش خلقی، نرمی اور تہذیب و متانت کا رویہ اختیار کریں اور وہ اس امر کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر انجام دیں نہ کہ کسی دنیاوی غرض و مقصد اور نفس کی خاطر، اس صورت میں مخاطب پر بات اثر بھی کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرماتا ہے اسی طرح جب کسی شخص کو

کوئی نصیحت کرنی ہو تو لوگوں کی موجودگی میں نہ کی جائے بلکہ تنہائی میں اور پوشیدہ طور پر اس کو نصیحت کرنی چاہیے کیونکہ لوگوں کی موجودگی میں کسی کو نصیحت کرنا، نصیحت نہیں بلکہ فضیحت ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک جامع خطبہ کا ذکر

حدیث:

وعن أبي سعيد الخدري قال قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم خطيبا بعد العصر فلم يدع شيئا يكون إلى قيام الساعة إلا ذكره حفظه من حفظه ونسيه من نسيه وكان فيما قال إن الدنيا حلوة خضرة وإن الله مستخلفكم فيها فناظر كيف تعملون ألا فاتقوا الدنيا واتقوا النساء وذكر إن لكل غادر لواء يوم القيامة بقدر غدرته في الدنيا ولا غدر أكبر من غدر أمير العامة يغرز لواؤه عند أسته. قال ولا يمنعن أحدا منكم هيبة الناس أن يقول بحق إذا علمه وفي رواية إن رأى منكرا أن يغيره فبكى أبو سعيد وقال قد رأيناه فمنعتنا هيبة الناس أن نتكلم فيه. ثم قال ألا إن بني آدم خلقوا على طبقات شتى فمنهم من يولد مؤمنا ويحيى مؤمنا ويموت مؤمنا ومنهم من يولد كافرا ويحيى كافرا ويموت كافرا ومنهم من يولد مؤمنا ويحيى مؤمنا ويموت كافرا ومنهم من يولد كافرا ويحيى كافرا ويموت مؤمنا قال وذكر الغضب فمنهم من يكون سريع الغضب سريع الفيء فإحداهما بالأخرى ومنهم من يكون بطيء الغضب بطيء الفيء فإحداهما بالأخرى وخياركم من يكون بطيء الغضب سريع الفيء وشراركم من يكون سريع الغضب بطيء الفيء. قال اتقوا الغضب فإنه جمرة على قلب ابن آدم ألا ترون إلى انتفاخ أوداجه؛ وحمرة عينيه؛ فمن أحس بشيء من ذلك فليضطجع وليتلبد بالأرض قال وذكر الدين فقال منكم من يكون حسن القضاء وإذا كان له أفحش في الطلب فإحداهما بالأخرى ومنهم من يكون سيء القضاء وإن كان له أجمل في الطلب فإحداهما بالأخرى وخياركم من إذا كان عليه الدين أحسن القضاء وإن كان له أجمل في الطلب وشراركم من إذا كان عليه الدين أساء القضاء وإن كان له أفحش في الطلب. حتى إذا كانت الشمس على

رؤوس النخل وأطراف الحيطان فقال أما إنه لم يبق من الدنيا فيما مضى منها إلا كما بقي من يومكم هذا فيما مضى منه. رواه الترمذي

ترجمہ:

حضور ابوسعید خدر (رض) کہتے ہیں کہ (ایک دن) عصر کے بعد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا: اس خطبہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (متعلقات دین میں سے) ایسی کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی جو قیامت تک پیش آسکتی ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان باتوں کو ذکر فرمایا: اور یاد رکھنے والے نے ان کو یاد رکھا اور بھولنے والا اس کو بھول گیا، (یعنی وہ باتیں اتنی تفصیل اور ہمہ گیری کے ساتھ بیان ہوئی کہ بعض لوگوں کو تو یاد رہیں اور بعض لوگوں کے حافظہ نے ان کو فراموش کر دیا) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس وقت جو کچھ فرمایا اس میں یہ بھی تھا کہ" دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا وہ دیکھتا ہے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ پس خبردار! تم دنیا سے بچنا اور عورتوں سے دور رہنا"۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا کہ" قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لیے ایک نشان (علامتی جھنڈا) کھڑا کیا جائے گا جو دنیا میں اس کی عہد شکنی کے بقدر ہوگا (یعنی جس شخص نے دنیا میں) جتنی زیادہ عہد شکنی کی ہوگی اس کا وہ نشان اسی قدر بلند و نمایاں ہوگا تاکہ میدان حشر میں اس کو عام طور پر پہچان لیا جائے کہ یہ عہد شکنی کا مرتکب ہے اور اس نے کتنی زیادہ عہد شکنی کی ہے اور اس طرح کا علامتی نشان ہر باعث حق و باطل کے لیے ہوگا تاکہ ایک دوسرے سے امتیاز کر کے پہچانا جاسکے جیسے اس دنیا میں امراء اور مقتدرین اپنے ساتھ کوئی علامتی نشان رکھتے ہیں اور ان کی

عہد شکنی امیر عامہ کی عہد شکنی سے زیادہ بڑی نہیں چنانچہ اس کا نشان اس کی مقعد کے قریب کھڑا کیا جائے گا (تا کہ اس کی زیادہ فضیحت و رسوائی ہو" حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا کہ" تم میں سے کسی کو بھی کوئی خوف و ہیبت حق بات کہنے سے باز نہ رکھے، جب کہ وہ حق بات سے واقف ہو (یعنی کوئی شخص کلمہ حق کہنے میں کسی کا کوئی خوف ولحاظ نہ کرے بلکہ اس کو برملا کہے) ہاں اس کی وجہ سے جان جانے کا خوف ہو تو معذوری ہے اگر چہ اس صورت میں بھی اس سے باز رہنا اولی ہوگا) ایک اور روایت میں اس جگہ ولا یمنعن احدا منکم ہیبۃ الناس ان یقول بحق کے بجائے) یہ ہے کہ" جب تم میں سے کوئی شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے تو لوگوں کا کوئی خوف و ہیبت اس کو خلاف شرع امر کی اصلاح وسرکوبی سے باز نہ رکھے"۔ (یہ بیان کر کے) حضرت ابوسعید خدری (رض) رو پڑے اور کہنے لگے کہ ہم نے خلاف شرع امر کو (اپنی آنکھ سے) دیکھا اور لوگوں کے خوف سے ہم اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکے۔ (اس کے بعد حضرت ابوسعید (رض) نے بیان کیا کہ) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا" جان لو کہ آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو مختلف جماعتوں اور متضاد اقسام ومراتب کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو مومن پیدا کیا جاتا ہے، جو (سن تمیز سے لے کر آخر عمر تک گویا ساری عمر) ایمان کی حالت میں زندہ رہتے ہیں اور ایمان ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے، جو کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) زندہ رہتے ہیں اور کفر ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہی ہیں جن کو مومن پیدا کیا جاتا ہے وہ ایمان ہی کی حالت میں (ساری عمر) رہتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے وہ کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) گزارتے ہیں

لیکن ان کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔" حضرت ابوسعید (رض) کہتے ہیں کہ (اس موقع پر) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غضب وغصہ کی قسموں کو بھی ذکر کیا، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "بعض آدمی بہت جلد غضب ناک ہوجاتے ہیں لیکن ان کا غضب وغصہ جلد ہی ختم بھی ہوجاتا ہے (یعنی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں ذرا سی بات پر جلد ہی غصہ آجاتا ہے لیکن ان کا غصہ جتنی تیزی کے ساتھ ہے اسی تیزی کے ساتھ فرو بھی ہوجاتا ہے) چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا بدل بن جاتا ہے (یعنی جلد غصہ آنا بری خصلت ہے اور غصہ کا جلد جاتے رہنا اچھی خصلت ہے، لہٰذا جس شخص میں یہ دونوں خصلتیں ہوں تو ان میں سے جو خصلت اچھی ہے وہ بری خصلت کی مکافات کردیتی ہے، اس طرح اس بارے میں وہ شخص نہ تو مدح وتحسین کا مستحق ہوتا ہے اور نہ برائی کا مستوجب، بلکہ دونوں خصلتوں کا حامل ہونے کی وجہ سے بین بین رہتا ہے، بایں اعتبار اس کے متعلق نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بہتر شخص ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بدتر شخص ہے) اور بعض آدمی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر سے جاتا ہے (ایسا شخص بھی ایک اچھی خصلت رکھتا ہے اور ایک بری خصلت کہ اگرچہ غصہ کا دیر میں آنا اچھا ہے لیکن اس کا دیر سے جانا برا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص بھی بین بین ہوتا ہے کہ اس کو ایک بہترین شخص کہا جاتا سکتا ہے اور نہ بدترین شخص، لہٰذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کو غصہ دیر سے آتا ہے اور جلد فرو ہوجاتا ہے جب کہ تم میں بدترین شخص وہ ہے جس کو جلد غصہ آئے اور دیر میں غصہ جائے"۔ (اس کے بعد) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "تم غصہ سے بچو (یعنی ایسا کام نہ کرو جس سے غصہ آئے یا یہ مطلب ہے کہ غصہ سے اللہ کی پناہ مانگو اور اس کے درجہ اس خصلت سے بچو (کیونکہ وہ غصہ ابن آدم کے قلب پر ایک دہلکتا ہوا انگارہ

ہے (یعنی غصہ آگ کے انگاہ کی طرح حرارت غریزیہ اور حدت جبلیہ رکھتا ہے جو نفس کی انگیٹھی میں دبا ہوا ہے اور جب خواہش نفس اس کو بھڑکاتی ہے تو اس کی حرارت اور تیزی قلب پر غالب آجاتی ہے اور عقل اپنا تصرف کرنے سے عاجز رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنے غصہ کی آگ میں دوسروں کو تو جلاتا ہے لیکن خود کو بھی جلا ڈالتا ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ (جب کوئی شخص غضب ناک ہوتا ہے تو) اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھوں سرخ ہوجاتی ہیں (یعنی یہ چیزیں دراصل اسی غصہ کی حرارت غریزیہ اور انجارات غلیظہ کے اٹھنے کا اثر ہوتی ہیں، اس طرح غضب ناک شخص کا ظاہر گویا اس کے باطن کا غماز ہوتا ہے) لہٰذا جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ اب غصہ آیا ہی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ فوراً پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے"۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرض کا بھی ذکر کیا (یعنی قرض قرض دار اور قرض خواہ کے احوال و اقسام کو بھی بیان کیا) چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ "تم میں سے بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ (قرض کی) ادائیگی میں تو اچھا رہتا ہے لیکن اپنا قرض وصول کرنے میں سختی کرتا ہے (یعنی اگر اس پر کسی کا قرض ہوتا ہے تو اس کو ادا کرنے میں صفائی معاملہ اور خوبی کا ثبوت دیتا ہے، لیکن جب اس کا قرض کسی پر ہوتا ہے تو اس کو قرض دار سے وصول کرنے میں سختی کرتا ہے بایں طور کہ مطالبہ و تقاضا کے وقت اس قرض دار کا کوئی ادب و لحاظ نہیں کرتا اور سختی و بدکلامی کے ذریعہ اس کو ایذاء پہنچاتا ہے اس طرح اس میں قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی بھی خصلت ہوتی ہے اور اصولی قرض میں برائی اختیار کرنے کی بھی خصلت چنانچہ اس کی دونوں خصلتوں میں سے ہر ایک دوسری کا بدل ہوجاتی ہے، لہٰذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی اچھے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول

کرنے میں بھی اچھے ہوں اور تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی برے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول کرنے میں بھی برے ہوں"۔ (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خطبہ میں یہ نصیحتیں فرمائیں) یہاں تک کہ جب سورج کا اثر صرف کھجوروں کی چوٹیوں اور دیواروں کے کناروں پر رہ گیا (یعنی جب دن آخر ہوگیا) تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا" یاد رکھو! اس دنیا کا جو زمانہ گزر چکا ہے اس کی بہ نسبت اب صرف اتنا زمانہ باقی رہ گیا ہے جتنا کہ آج کے دن کے گزرے ہوئے حصہ کی بہ نسبت یہ آخری وقت۔ (یعنی جس طرح آج کے دن کا قریب قریب پورا حصہ گزر چکا ہے اب بہت قلیل عرصہ باقی رہ گیا ہے"۔ (ترمذی)

تشریح:

"یہ دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے متعلقات کے ساتھ بظاہر اس قدر لذت آمیز اور خوش نما ہے کہ محض ظاہر حالت پر رکھنے والے لوگوں کو طبعی طور پر اس سے بہت مناسبت اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں اس کی حقیقت نہایت دلکش اور سرسبز وشاداب معلوم ہوتی ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں اہل عرب کے نزدیک جو چیز نرم ونازک ہوتی ہے اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے زیادہ مدت نہیں ٹھہرتی بلکہ جلد جاتی رہتی ہے اس کو وہ لوگ خضراوات یعنی سبزیوں اور ترکاریوں سے مشابہت دیتے ہوئے" خضراء" کہتے ہیں۔ بہرحال حدیث کے اس جملہ میں دراصل اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ دنیا مکروتصنع اور ظاہر حسن ولذات سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں کو اپنے ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھنے والے حسن و جمال پر فریفتہ کرتی ہے اور اپنی جھوٹی لذات وخواہشات کی طرف مائل کرتی ہے حالانکہ اس کی تمام تر دلکشی اور رنگینی اور خواہشات ولذات بہت جلد فناء کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تمہیں جو مال و دولت حاصل ہے اس کے بارے میں تم اس حقیقت کو جان لو کہ اس مال و دولت کے تم حقیقی مالک نہیں ہو بلکہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور تم صرف اس کے خرچ و تصرف میں خلیفہ اور وکیل کی حیثیت رکھتے ہو۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں کا خلیفہ قرار دیا ہے جو تم سے پہلے اس دنیا میں تھے اور ان کے اموال و جائیداد کو تمہاری سپردگی میں دے دیا ہے، لہٰذا وہ یہ دیکھتا ہے کہ تم اپنے اموال و املاک کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتے ہو اور اس میں کس طرح تصرف کرتے ہو یا کہ تم گزرے ہوئے لوگوں کے احوال و انجام سے کس طرح عبرت پکڑتے ہو اور ان کے چھوڑے ہوئے اموال و جائیداد میں کس طرح تصرف کرتے ہو۔" "تم دنیا سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دنیا کی حقیقت جان لی کہ وہ فناء ہو جانے والی چیز ہے اور اس کی کسی بھی چیز کو کوئی استحکام و دوام نہیں ہے تو پھر اس کے پیچھے پڑنا نہایت نازیبا اور غیر دانش مندی کی بات ہے، لہٰذا تم دنیا کو اس قدر حاصل کرنے کی خواہش و کوشش نہ کرو جو ضرورت و حاجت سے زیادہ ہو اور ضرورت و حاجت بھی وہ کہ جس سے آبرومندانہ زندگی کی بقاء دین کی مدد اور آخرت میں نفع حاصل ہو۔ اسی طرح "عورتوں سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حسن و جمال اور ناز و ادا کے مکروفریب اور ان کی ناروا محبت و شیفتگی کے جال سے اپنے آپ کو بچاؤ کہ مبادا یہ چیز مال و دولت جمع کرنے کی حرص اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے استغراق میں مبتلا کر دے جس کی وجہ سے تم علم و عمل کی راہ سے دور ہو جاؤ۔" امیر عامہ" سے مراد متغلبی ہے یعنی وہ شخص جو مسلمانوں کے معاملات اور ان کے ملک و شہر پر غالب و حکمران ہو گیا ہو اور عام لوگوں نے ارباب حل و عقد یعنی علماء اور دانشوران زمانہ کی رائے و

مشورہ کے بغیر اس شخص کو امیر و حاکم تسلیم کرلیا ہو اور اس کے حامی و مدد گار ہوں۔ اور حضرت ابو سعید (رض) کا رونا اس احساس کی بنا پر تھا کہ ہم نے کلمہ حق کہنے کے سلسلہ میں اس مرتبہ کو ترک کردیا جو اولی ہے اور وہ یہ کہ ہر حال میں حق بات کہی جائے خواہ اس کی پاداش میں جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ احساس محض ان کے کمال ایمان اور دین کے تئیں شدت احتیاط پر مبنی تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس مرتبہ کو ترک کرنا اسلامی تعلیمات کے قطعا خلاف نہیں تھا بلکہ ان احادیث پر عمل کرنے کی بناء پر تھا جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے ضعف واضمحلال کے زمانہ میں اور عجز و بے بسی کی صورت میں کلمہ حق کہنے سے سکوت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے جان و مال اور آبرو کی ہلاکت ونقصان کا خوف ہو۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اکابر صحابہ کرام (رض) جیسے عظیم انسان کو جو دین کے بارے میں انتہائی سخت و مضبوط تھے اور جو یقین و معرفت کی دولت سے پوری طرح مالا مال تھے اگر وہ اس وصف و مرتبہ کے باوجود، اہل باطل جیسے یزید وحجاج سفاک وغیرہ کے خوف سے اظہار حق کی قدرت نہیں رکھتے تھے تو ہم جیسے مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے جو اہل ایمان کے انتہائی ضعف واضمحلال کا زمانہ پائے ہوئے ہیں جن میں باعمل علماء اور ایمانی جرات وایثار رکھنے والے راہبر کم ہیں جو ریاکار مشائخ وصوفیاء کی کثرت رکھتے ہیں اور جن پر اکثر ظالم امراء وحکماء مسلط ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زمانہ صبر وتحمل، رضا بقضاء اور سکوت ویکسوئی اختیار کرنے اور بقدر بقاء زندگی معاشی ضروریات کے حصول پر قناعت کرنے کا ہے۔" بعض وہ ہیں جن کو مومن پیدا کیا جاتا ہے" یعنی ان کی پیدائش مومن ماں باپ کے یہاں یا مسلم آبادی یا شہر میں ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ان کو مومن کہا جاتا ہے، یہ

وضاحت اس لیے کی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص پیدا ہوتا ہے تو سن تمیز کو پہنچنے سے قبل اس کی طرف ایمان کی نسبت نہیں کی جاتی، یہ اور بات ہے کہ علم الٰہی کے اعتبار سے یا اس سے آئندہ زمانہ کی حالت کے اعتبار سے اس کی طرف ایمان کی نسبت کر دی جائے۔ اسی طرح "بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کافر ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں یا جن کی پیدائش کافروں کی آبادی اور ان کے شہر میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ کیونکہ اس ارشاد گرامی (کل مولود الخ) کی مراد یہ بتانا ہے کہ جو بھی شخص اس دنیا میں آتا ہے وہ فطری طور پر ہدایت وراستی قبول کرنے کی استعداد وصلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع پیش نہ آئے جو اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دے جیسا کہ خود اسی حدیث کے بعد کے الفاظ فابواہ یہودانہ الخ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں لوگوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ غالب واکثریت کے اعتبار سے ہیں، ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مومن پیدا ہوتے ہیں، کفر کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ ایمان ہی کی حالت پر ہوتا ہے، اسی طرح بعض وہ ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، ایمان کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ کفر کی حالت پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں قسمیں اس لیے ذکر نہ فرمائی گئی ہوں کہ یہاں حقیقی مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ہدایت وگمراہی میں اصل اعتبار خاتمہ کی حالت کا ہے اور یہ بات مذکورہ قسمیں بیان کرنے سے بھی اجمالی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔ "پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے" غصہ آنے کے وقت اس حالت کو اختیار کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ حالت نفسیاتی طور پر غصہ کو فرو کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ غصہ کے وقت زمین

سے لگ کر پہلو پر لیٹ جانا فوری طور پر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ جب میری حقیقت بس اتنی ہے کہ میں مٹی سے پیدا ہوا اور آخر کار مٹی ہی میں مل جاؤں گا تو مجھ کو تکبر نہ کرنا چاہیے بلکہ تحمل اور انکساری کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

مال وزر کا غلام بن جانے والے کی مذمت

حدیث:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "تعس عبد الدينار وعبد الدرهم وعبد الخميصة إن أعطي رضي وإن لم يعط سخط تعس وانتكس وإذا شيك فلا انتقش. طوبى لعبد آخذ بعنان فرسه في سبيل الله أشعث رأسه مغبرة قدماه إن كان في الحراسة كان في الحراسة وإن كان في الساقة كان في الساقة وإن استأذن لم يؤذن له وإن شفع لم يشفع".

رواه البخاري

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" ہلاک ہو وہ شخص جو دینار کا غلام ہو، درہم کا غلام ہو اور چادر کا غلام ہو (یعنی اس شخص کے لیے آخرت میں ہلاکت وتباہی مقدر ہے جس نے مال و دولت کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنالیا ہو، دنیاوی عیش وتمول کو معبود جبار کی رضا وخوشنودی پر ترجیح دیتا ہے اور طلب مال وحصول زر کی راہ میں ناجائز و حرام وسائل و ذرائع اختیار کرنے سے باز نہ رہتا ہو اور پھر جو کچھ کماتا ہو اس کو از راہ بخل جمع کر دیتا ہو کہ نہ اس مال کے حقوق کو ادا کرتا ہو نہ اللہ کی راہ میں اور اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کو خرچ کرتا ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنی شان وشوکت اور بڑائی جتانے کے لیے لباس فاخرہ زیب تن کرتا ہو اور نار وا طور پر زیب وزینت میں مبتلا ہو اور ایسے شخص کی علامت یہ ہے کہ)

جب اس کو (مال و دولت اور لباس فاخرہ) ملے تو خوش اور راضی ہو اور اگر نہ ملے تو ناراض وناخوش ہو (گویا اس کی طبیعت کا میلان ہمیشہ لوگوں کے مال وزر کی طرف رہتا ہو اور ہر وقت اس حرص میں مبتلا رہتا ہے کہ فلاں شخص سے فلاں چیز حاصل ہو جائے، چنانچہ اگر لوگ اس کی حرص وتمنا کو پورا کرتے ہیں تو وہ ان سے خوش رہتا ہے اور اگر ان کی طرف سے اس کی اس حرص وطمع کی تکمیل نہیں ہوتی تو ان سے ناخوش وناراض ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دینے یا نہ دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق اس کو مال و دولت اور سامان تعیش عطا کرتا ہے تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش وحرص کو پورا نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے تئیں اپنی ناراضگی ظاہر کرتا ہے) ایسے شخص کی اس مذموم خصلت کی وجہ سے گویا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکرر بددعا فرمائی کہ ہلاک ہو ایسا شخص اور ذلیل وسرنگوں ہو! اور (دیکھو) جب اس شخص کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو کوئی اس کو نہ نکالے (گویا تہدید وتنبیہ کے طور پر ایسے شخص کے حق میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا گیا کہ اگر ایسی مذموم خصلت رکھنے والا شخص کسی آفت و پریشانی میں مبتلا ہو جائے تو کوئی اس کی مدد واعانت نہ کرے۔ دنیاداروں اور حرص وطمع کے غلام لوگوں کی اس بدحالی کو ذکر کرنے کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چاہا کہ ان کے مقابلہ پر ان طالبان دین اور زاہدان دنیا کا بھی ذکر فرمائیں جو آخرت کی فلاح حاصل کرنے اور دین کو سربلند کرنے کے لیے محنت ومشقت اور جہاد کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مشغول رہتے ہیں، دنیا سے بے نیازی برتتے ہیں، ظاہری زینت و آرائش سے دور رہتے ہیں اور اہل دنیا کے طور طریقوں سے اپنے کو الگ رکھتے ہیں اور اس وجہ سے ظاہر پرستوں کی نظر میں نہایت کمتر وحقیر معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) نے فرمایا) سعادت وخوش بختی ہے اس بندے کے لیے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا ہے، اس کے سر کے بال پراگندہ اور قدم غبار آلود ہیں، اگر اس کو لشکر کی اگلی صفوں کے آگے نگہبانی پر مامور کیا جاتا ہے تو پوری طرح نگہبانی کرتا ہے (کہ کسی بھی وقت اپنی ذمہ داری کی انجام دہی سے نہ غافل رہتا ہے اور نہ سوتا ہے بلکہ ہر وقت پوری ہوشیاری وچستی کے ساتھ نگہبانی کرتا ہے) اور اگر اس کو لشکر کے پیچھے رکھا جاتا ہے تو لشکر کے پیچھے ہی رہتا ہے (یعنی وہ امیر لشکر اور مسلمانوں کی پوری تابعداری کرتا ہے کہ اس کو جس جگہ مامور کیا جاتا ہے وہیں اپنا فرض انجام دیتا ہے اور اس سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر پوری طرح عمل کرتا ہے، تکبر اور ضد واصرار نہیں کرتا) اور (خدا کے نزدیک اپنے اس مرتبہ وسعادت کے باوجود اپنے معاشرہ میں اس قدر سادگی، جاہ ومال اور شان وشوکت سے اس قدر بے نیازی اور اس قدر انکساری کے ساتھ رہتا ہے کہ دنیا دار اس کو کوئی وقعت واہمیت نہیں دیتے یہاں تک کہ) اگر وہ لوگوں کی محفلوں میں شریک ہونا چاہتا ہے تو اس کو شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جاتی۔

تشریح

"دینار و درہم کا غلام" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں جو چیز مذموم ہے وہ اس مال و دولت کی محبت اور دنیا داری میں مبتلا ہونا ہے، چنانچہ یہ خصلت (یعنی مال و دولت اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہونا) انسان کو مال کا بندہ بنا دیتی ہے کہ اس کی ہر سعی اور جدوجہد کا محور، اس کی ہر تمنا وخواہش کا مرکز اور اس کے ہر فعل وعمل کی بنیاد صرف مال وزر ہوتا ہے اس سے واضح ہوا کہ مال داری اور دولت مندی بذات خود کوئی مذموم چیز نہیں ہے، کسی

شخص کے پاس خواہ کتنا ہی مال و زر ہو اور وہ کتنا بڑا دولت مند ہو، اگر وہ دولت کی محبت میں گرفتار نہیں ہے تو اس کو برا نہیں کہیں گے۔ حدیث میں مال و دولت کے تعلق سے" دینار اور درہم" ہی کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں (جن کو سونا چاندی یا روپیہ پیسہ بھی کہا جا سکتا ہے) زر نقد ہیں کہ لین دین اور خرید و فروخت میں انھیں کا اعتبار ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ ہی تمام جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، اسی طرح اسباب معیشت میں صرف" چادر" کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ اصل میں "خمیصہ" اس خط دار چادر کو کہتے ہیں جو اس زمانہ میں لباس فاخرہ کا سب سے اعلیٰ مظہر سمجھی جاتی تھی اور اس کے استعمال سے عام طور پر تکبر و رعونت اور نمود و نمائش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، نیز لوگ اس چادر کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ اس کو اپنے سے جدا کرنا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا اس زمانہ کے دنیادار اس چادر کی خواہش و طلب اور اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہوتے تھے کہ جیسے انھوں نے اس چادر کی غلامی اختیار کر لی ہو۔ نقش اور انتقاش کے معنی ہیں" پیر سے کانٹا نکالنا" لہٰذا واذا شیک فلا انتقش کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال و دولت اور روپیہ پیسہ کا غلام بن جائے کہ نہ تو وہ ناجائز اور حرام وسائل و ذرائع سے کمانا اور دولت جوڑنا ترک کرتا ہو اور نہ اپنے روپیہ پیسہ کو حقداروں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون اور اس کی پشت پناہی سے گریز کریں۔ اور جب وہ کسی آفت میں پھنسے تو اس کی کوئی مدد نہ کریں، اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ پیر سے کانٹا نکالنا چونکہ مدد کرنے کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے لہٰذا اس سب سے ادنیٰ درجہ کی مدد سے بھی منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اس کو کوئی اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آجائے اور اس سے بھی زیادہ سخت حالات سے دوچار ہو تو اس کی مدد نہ کرنا بطریق اولیٰ جائز بلکہ

مطلوب ہوگا۔ یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ حدیث کے لفظ "تعس" کا یہ ترجمہ کہ "ہلاک ہو وہ شخص الخ" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس ارشاد کی مراد ایسے شخص کے حق میں بد دعا کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ ترجمہ کے پیش نظر اور شارحین کی اتباع کی بناء پر نقل کیا گیا ہے اور اگر یہ مراد لیا جائے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس لفظ کے ذریعہ اس شخص کے حق میں بد دعا نہیں فرمائی بلکہ اس بدترین خصلت کی مذمت اور اس خصلت کو اختیار کرنے والوں کو دنیاوی اور اخروی ذلت وخواری اور ان کے برے انجام کو بطور خبر ظاہر فرمایا تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہلاک ہوا وہ شخص الخ" اور یہ مراد بھی حدیث کے مغائر نہیں ہوگی۔

مالداری بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے

حدیث:

وعن أبي سعيد الخدري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إن مما أخاف عليكم من بعدي ما يفتح عليكم من زهرة الدنيا وزينتها". فقال رجل: يا رسول الله أو يأتي الخير بالشر؟ فسكت حتى ظننا أنه ينزل عليه قال: فمسح عنه الرحضاء وقال: "أين السائل؟". وكأنه حمده فقال: "إنه لا يأتي الخير بالشر وإن مما ينبت الربيع ما يقتل حبطا أو يلم إلا آكلة الخضر أكلت حتى امتدت خاصرتاها استقبلت الشمس فثلطت وبالت ثم عادت فأكلت. وإن هذا المال خضرة حلوة فمن أخذه بحقه ووضعه في حقه فنعم المعونة هو ومن أخذه بغير حقه كان كالذي يأكل ولا يشبع ويكون شهيدا عليه يوم القيامة". متفق عليه

......

حضرت ابوسعید خدری (رض) سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (صحابہ (رض) اور ان کے ذریعہ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا "اپنی وفات کے بعد تمہارے بارے میں مجھے جن چیزوں کا خوف ہے (کہ تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے (ان میں سے ایک چیز دنیا کی تروتازگی اور زینت بھی ہے (جو ملکی فتوحات و اقتدار کی صورت میں) تم کو حاصل ہوگی"۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا بھلائی اپنے ساتھ برائی بھی لائے گی؟ (یعنی ملکی فتوحات و اقتدار کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو جو مال غنیمت اور ساز و سامان حاصل ہوگا وہ تو ہمارے حق میں اللہ کی نعمت ہوگی اور ویسے بھی جائز وسائل و ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت اور رزق وغیرہ کی وسعت و فراخی ایک اچھی چیز ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت اور ایک اچھی چیز ہمارے لیے برائی و فتنہ اور ترک طاعات کا سبب و ذریعہ بن جائے؟) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (یہ سن کر) خاموش رہے (اور انتظار کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے تو جواب دیں) یہاں تک کہ ہم نے محسوس کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری (رض) کہتے ہیں کہ (تھوڑی دیر کے بعد) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے چہرہ مبارک سے پسینہ پونچھا (جو نزول وحی کے وقت آتا تھا) اور پھر فرمایا کہ وہ شخص کہاں ہے جس نے سوال کیا تھا؟ گویا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سائل کے سوال کی تحسین فرمائی (کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے تھے کہ اس شخص نے جو سوال کیا ہے اور اب اس کا جو جواب دیا جائے گا اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا) اور اس کے بعد فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ بھلائی

اپنے ساتھ برائی نہی لاتی (یعنی جائز ذرائع سے مال و دولت کا حاصل ہونا اور رزق میں وسعت وفراخی اور خوشحالی کا نصیب ہونا بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے اور اس کی وجہ سے کوئی برائی پیش نہیں آتی، بلکہ اصل میں برائی کا پیش آنا ان عوارض کی وجہ سے ہوتا ہے جو دولتمندی اور خوشحالی کے وقت لاحق ہو جاتے ہیں جیسے بخل و اسراف اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا اور اس کی مثال موسم بہار ہے جو زمین کے پیٹ سے گھاس وغیرہ اگاتا ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو اچھا اور فائدہ مند ہوتا ہے، البتہ اس سے ضرور نقصان اس وقت پہنچتا ہے جب کوئی چوپایہ اس کو ضرورت سے زائد کھائے اور بسیار خوری کے سبب ضرور ہلاکت میں مبتلا ہو جائے، چنانچہ خود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مثال کو یوں بیان فرمایا کہ) موسم بہار میں جو سبزہ اگاتا ہے (وہ حقیقت میں تو بھلائی وفائدہ کی چیز ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی نقصان و برائی لے کر زمین کے پیٹ سے نہیں اگتا مگر) وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے یا (اگر وہ مرتا نہیں تو) مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے (یعنی جو جانور اس سبزہ کو کھانے میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے وہ اس سبزہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے فعل یعنی زیادہ کھانے کی وجہ سے ضرور ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے) یہ کہ کھانے والے جانور نے اس سبزہ کو اس طرح کھایا کہ (جب بسیار خوری کی وجہ سے) اس کی دونوں کوکھیں پھول گئیں تو وہ سورج کے سامنے بیٹھ گیا (جیسا کہ جانور کی عادت ہوتی ہے کہ بدہضمی کی وجہ سے اس کا پیٹ پھول جاتا ہے تو وہ دھوپ میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کا پیٹ گرمی پا کر نرم ہو جاتا ہے اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے باہر نکل جاتا ہے اور پھر (جب) پتلا گوبر اور پیشاب کر کے (اس نے اپنا پیٹ ہلکا کر لیا تو) چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا یہ مال وزر بڑا سرسبز، تروتازہ اور نرم ودلکش ہے (کہ بظاہر آنکھوں کو

بہت بھاتا ہے، طبیعت کو بہت اچھا لگتا ہے جس کی وجہ سے دل چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو) لہٰذا جو شخص دنیا کے مال وزر کو حق کے ساتھ (یعنی بوقت ضرورت اور جائز وسائل و ذرائع سے) حاصل کرے اور اس کو اس کے حق میں (یعنی اس کے اچھے مصارف میں کہ خواہ واجب ہو یا مستحب) خرچ کرے تو وہ مال وزر اس کے حق میں (دین کا) بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے اور جو شخص اس مال وزر کو حق کے بغیر یعنی ناجائز طور پر حاصل کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو کھاتا رہتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا اور وہ مال وزر قیامت کے دن اس کے بارے میں (اس کے اسراف اور اس کی حرص وطمع کا) گواہ ہوگا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح:

حدیث کے ابتدائی جملوں کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بارے میں مجھے خدشہ ہے کہ جب تم دنیا کے ملکوں اور شہروں کو فتح کر کے اپنے تسلط و اقتدار کا جھنڈا لہراؤ گے اور اس کے نتیجہ میں تمہیں مال و دولت کی فراوانی اور خوشحالی نصیب ہوگی تو یہ چیز تمہیں عبادت وطاعت اور نیک اعمال سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی، نفع پہنچانے والے علوم (یعنی دینی علوم وفنون) سے لاپرواہ بنا دے گی اور عجب وتکبر، گھمنڈ وغرور، شان شوکت کا اظہار اور جاہ ومال سے محبت جیسی برائیاں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم آخرت کی زندگی کی فکر کرنے اور موت کے لیے تیاری کرنے کی بجائے دنیاوی امور میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔" پھر چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا" یعنی جب وہ جانور ضرورت سے زیادہ کھا لیتا ہے اور بدہضمی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اپنے طریقہ سے بدہضمی کا علاج کرتا ہے اور اپنے پیٹ کو صاف کر کے دوبارہ سبزہ چرنے لگتا ہے۔ یہ مثال اس شخص کی ہے جو انسانی خمیر میں شامل حرص وخواہشات کے

غلبہ کی وجہ سے بعض وقت اعتدال کی راہ سے بھٹک کر حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور پھر ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے لیکن اپنے طرز عمل سے جلد ہی رجوع کر لیتا ہے اور مستقل طور سے بے اعتدالی و گناہ کی راہ پر قائم نہیں رہتا بلکہ آفتاب ہدایت کی روشنی اس کو راہ راست کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور ندامت و توبہ کے ذریعہ اپنے نفس کو بے اعتدالی اور گناہ کی غلاظت سے پاک کر کے گویا اپنا علاج کر لیتا ہے۔ اس کے برخلاف پہلی قسم کی کہ جس کو" وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے" کے ذریعہ بیان فرمایا : اس شخص کی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نفس کی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، گناہ و معصیت پر قائم رہتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو توبہ و انابت اور رجوع و استغفار کی توفیق بھی نصیب نہیں ہو پاتی۔ ان دونوں قسموں پر غور کرنے سے ایک اور قسم سامنے آتی ہے جس کا تعلق اس شخص سے ہے جو سرے سے بے اعتدالی اور گناہ کی راہ اختیار نہیں کرتا اور نفس کی خواہشات اور ناروا تمناؤں کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ دنیا سے بے پروا ہوتا ہے اور اپنی تمام تر توجہ آخرت کے مفاد کی طرف مبذول رکھتا ہے، لہٰذا پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو اصطلاحی طور پر" ظالم" سے موسوم کیا جاتا ہے، دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو" مقتصد" یعنی میانہ رو کہا جاتا ہے اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو" سابق" یعنی بھلائیوں کو اختیار کرنے میں سبقت لے جانے والا کہا جاتا ہے۔ پس جو شخص" سابق" ہوتا ہے وہ سرے سے اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ ہی نہیں کرتا، جو شخص" مقتصد" ہوتا ہے وہ اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ تو کرتا ہے لیکن ان کو پھر دھو ڈالتا ہے اور جو شخص" ظالم" ہوتا ہے وہ ہاتھ آلودہ ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ مذکورہ مثال اور اس کی مطابقت کو بیان کرنے کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے" یہ مال و زر بڑا سرسبز تازہ اور نرم و دلکش ہے" سے اس حقیقت

کی طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا کے مال وزر، اس کے تئیں محبت اور اس کے مصارف کے تعلق سے انسانوں کے حالات وخیالات مختلف ہوتے ہیں کہ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو محض ضرورت وحاجت کے بقدر ہی مال واسباب کے حصول پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے بھی جائز و درست وسائل و ذرائع اختیار کرتے ہیں، نیز ان کے پاس جو مال واسباب اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو وہ اچھے مصارف میں خرچ کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مال ودولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی حرص وطمع کسی بھی حد پر قناعت نہیں کرتی، وہ نہ صرف یہ کہ ضرورت و احتیاج سے زائد مال وز حاصل کرنے کی سعی وکوشش کرتے ہیں اور اس کو جوڑنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ اس کے حصول میں جائز و ناجائز کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے، سخت سے سخت برائی کا ارتکاب کر کے اور حرام ذرائع کو اختیار کر کے دولت سمیٹتے رہتے ہیں، علاوہ ازیں ان کے پاس جو مال ودولت اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو حقداروں پر اور ان مصارف میں خرچ نہیں کرتے جو اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوتے ہیں اور مال ودولت کے تئیں ان کی یہ حرص وطمع ان کو اس شخص کی مانند بنا دیتی ہے جو کھاتا رہتا ہے مگر غلبہ حرص کی وجہ سے کبھی شکم سیر نہیں ہوتا یا ان کی حالت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو استسقاء کا مریض ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی سیراب نہیں ہوتا اور جتنا پانی پیتا ہے اسی قدر پیاس بھڑکتی ہے اور پیٹ پھولتا جاتا ہے۔ عارف باللہ حضرت خواجہ عبید اللہ نقشبندی (رح) کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا" یہ دنیا سانپ کی مانند ہے، لہٰذا جو شخص اس کا منتر جانتا ہے اس کے لیے تو دنیا کو حاصل کرنا جائز ہے لیکن دوسروں کے لیے جائز نہیں" جب لوگوں نے یہ سنا تو عرض کیا کہ حضرت! اس کا منتر کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: اس بات کا علم ہونا کہ اس (ادنی کے مال ودولت) کو کہاں

سے اور کس طرح حاصل کر رہا ہے اور کہا خرچ کر رہا ہے"

پانچ بہترین باتوں کی نصیحت

حدیث:

عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من أخذ عني هؤلاء الكلمات فيعمل بهن أو يعلم من يعمل بهن؟ قلت أنا يا رسول الله فأخذ بيدي فعد خمسا فقال اتق المحارم تكن أعبد الناس وارض بما قسم الله لك تكن أغنى الناس وأحسن إلى جارك تكن مؤمنا وأحب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما ولا تكثر الضحك فإن كثرة الضحك تميت القلب. رواه أحمد والترمذي وقال هذا حديث غريب

ترجمہ

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو مجھ سے پانچ باتوں کو سیکھے اور پھر ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرنے والا ہو۔ (حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ شخص میں ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (یہ سن کر) میرا ہاتھ پکڑا اور وہ پانچ باتیں گنائیں اور (اس طرح) بیان فرمایا۔ (۱) تم ان چیزوں سے بچو، جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اگر تم ان سے بچو گے تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ ہو گے۔ (۲) تم اس چیز پر راضی وشاکر رہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے، اگر تم تقدیر الہی پر راضی و مطمئن رہو گے تو تمہارا شمار تونگر ترین لوگوں میں ہوگا، یعنی جب بندہ اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن ہو جاتا ہے اور طمع وحرص سے پاک ہو کر زیادہ طلبی کی احتیاج نہیں رکھتا تو وہ مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے تونگری کا اصل مفہوم بھی یہی ہے۔ (۳) تم

اپنے ہمسایہ سے اچھا سلوک کرو (اگرچہ تمہارے ساتھ برا سلوک کرے) اگر تم ایسا کرو گے تو تم کامل مومن سمجھے جاؤ گے۔ (٤) تم زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ (اور اللہ کی یاد سے غافل) بنا دیتا ہے (اگر تم زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو گے تو تمہارا دل روحانی بالیدگی وتروتازگی اور نور سے بھرا رہے گا اور ذکر اللہ کے ذریعہ اس کو زندگی وطمانیت نصیب ہوگی)" اس روایت کو احمد نے نقل کیا ہے اور (ترمذی نے) کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح
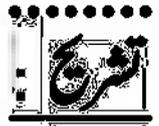
حدیث کے ابتدائی جملوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم، بذات خود افضل اشرف ہے کہ کسی شخص کا محض علم کا حاصل ہونا اس کی فضیلت کی دلیل ہے، ہاں اگر اس علم پر عمل پیرا ہونے کی دولت بھی نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی سعادت ہی نہیں کہ علم کا اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی عالم اپنے علم پر خود تو عمل نہ کرے البتہ تعلیم وتلقین کے ذریعہ اس علم کی روشنی دوسرے تک پہنچائے اور سیدھی راہ دکھانے کا فریضہ انجام دے تو اس کو اس صورت میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بے عمل عالم کا لوگوں کو نیکی وبھلائی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا درست ہے۔ "محارم" کے مفہوم میں ہر طرح کی ممنوع چیزوں کو اختیار کرنا اور جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو ترک کرنا شامل ہے لہٰذا تم "محارم" یعنی ان چیزوں سے بچو جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ممنوع اور حرام چیزوں سے اجتناب کرو بلکہ شریعت نے جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ترک کرنے سے بھی اجتناب کرو۔ محارم سے اجتناب کرنے والے کو سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ محارم سے اجتناب کرنا گویا ان فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے جو حق تعالیٰ

نے عائد کئے تھے۔اور ظاہر ہے کہ فرائض کو پورا کرنے سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے، جب کہ عام لوگ فرائض کو ترک کرتے ہیں یا ان کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور کثرت نوافل میں مشغول رہتے ہیں اور اس طرح وہ گویا اصول اور بنیاد کو تو ضائع کرتے ہیں اور فروعات وفضائل کو اختیار کرتے ہیں، مثلاً بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص پر روزوں کی قضا واجب ہوتی ہے مگر وہ اس قضا کو ادا کرنے کی طرف سے تو غافل رہتا ہے میں البتہ حصول علم اور فضل عبادات میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتا ہے، یا ایک شخص پر زکوۃ واجب ہوتی ہے یا لوگوں کے مالی حقوق اس کے ذمہ ہوتے ہیں مگر وہ زکوۃ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دیتا البتہ فقراء ومساکین پر خرچ کرنا اور مساجد ومدارس کی تعمیر واعانت یا اسی طرح کے دوسرے نافلہ امور میں پورے زوق وشوق کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔تقدیر الہی پر راضی ومطمئن ہونا اور اپنے مقسوم پر صابر وشاکر رہنا، بڑا اونچا مرتبہ ہے، جس شخص کو یہ مقام نصیب ہو جاتا ہے وہ حرص وطمع سے پاک رہتا ہے، زیادہ طلبی سے اپنا دامن چھپاتا ہے اور قلبی استغنا وتونگری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہیں کرتا۔منقول ہے کہ ایک شخص نے مشہور بزرگ حضرت سید ابوالحسن شاذلی سے کیمیا کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ (کیمیا) دو باتوں میں پوشیدہ ہے۔ایک تو یہ کہ تم مخلوق کو نظر سے گرادو (یعنی غیر اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا بنانے کے قابل نہ سمجھو اور اللہ کے سوا کسی اور سے اپنی حاجت کو وابستہ نہ کرو) او دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ امید وابستہ نہ کرو کہ وہ تمہیں اس چیز کے علاوہ کچھ اور بھی دے جو اس نے تمہاری قسمت میں لکھ دی ہے۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) نے فرمایا" اے انسان اس بات کو جان لے کہ جو چیز تیری قسمت میں لکھی جا چکی ہے وہ ہر حال میں تجھے ملے گی، خواہ تو طلب وسوال کی

راہ اختیار کر یا اس راہ کو ترک کر دے اور جو چیز تیری قسمت میں نہیں لکھی ہے وہ تجھ کو کسی حالت میں نہیں ملے گی۔ خواہ تو اس کی طلب کی کتنی ہی حرص رکھے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کتنی ہی سعی و کوشش اور محنت و مشقت برداشت کرے، لہٰذا (تجھے جو کچھ مل جائے) اس پر شاکر و صابر رہ، ہر حالت میں جائز و حلال چیز کو حاصل کرنا ضروری سمجھ اور اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن رہ تاکہ رب ذوالجلال تجھ سے راضی و خوش رہے۔ "تم جس چیز کو اپنے لیے پسند کرتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ دین و دنیا کی بہتری و بھلائی کی جس چیز کو تم خاص طور پر اپنے لیے پسند کرتے ہو اس چیز کو دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، یہاں تک کہ کافر کے لیے ایمان کو اور فاجر کے لیے توبہ و انابت کو پسند کرو"۔

بخل اور آرزو کی مذمت:

حدیث:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن النبی صلی الله علیه وسلم قال أول صلاح هذه الأمة الیقین والزهد وأول فسادها البخل والأمل. رواه البیهقی فی شعب الإیمان

ترجمہ:

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس امت کی پہلی نیکی، یقین کرنا اور زہد اختیار کرنا ہے اور اس امت کا پہلا فساد، بخل اور دنیا میں باقی رہنے کی آرزو کو دراز کرنا ہے۔ (بیہقی)

تشریح:

"یقین" سے مراد ہے اس بات پر کامل اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رازق ہے اور رزق پہنچانے کا

متکفل وضامن ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آیت (وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا) یعنی روئے زمین پر ایسا کوئی چلنے والا جاندار نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔" زہد اختیار کرنے" کا مطلب دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے سے بچنا اور دنیا کی نعمتوں ولذتوں سے بے اعتنائی ولا پرواہی برتنا ہے۔ حاصل یہ کہ دین وآخرت کی بھلائی وکامیابی کا مدار تقویٰ پر ہے جو زہد ویقین سے حاصل ہوتا ہے اور دین وآخرت کی خرابی کی جڑ، طمع ولالچ ہے جو بخل اور درازی عمر کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتقاد ویقین ہوتا ہے تو بخل کا مادہ فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ بخل کا سبب وہ بے یقینی ہوتی ہے جو رزق پہنچنے کے تئیں انسان اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے یعنی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس جو مال وزر ہے اگر میں نے اس کو انفاق وایثار کی صورت میں خرچ کر دیا تو پھر کل کہاں سے کھاؤں گا۔ اسی طرح جب زہد کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو دنیا میں باقی رہنے کی تمنا اور آرزوؤں کی درازی ختم ہو جاتی ہے اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ اس امت کا پہلا فساد بخل اور آرزو ہے۔ کیونکہ یہ دونوں خصلتیں رزاقیت حق پر یقین اور زہد کی ضد ہیں۔ "یقین" کی تعریف:
اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ "یقین" کا اصل مفہوم کیا ہے؟ چنانچہ حضرت شیخ عبدالوہاب متقی (رح) نے اپنے رسالہ "حبل المتین فی تحصیل الیقین" میں لکھا ہے کہ" اعتقاد کا جزم کی حد تک پہنچ جانا اور دلیل وبرہان کے ذریعہ اتنا مضبوط ومستند ہو جانا کہ حق کو ثابت کر دے "حکماء ومتکلمین کی اصطلاح میں" یقین" کہلاتا ہے، لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں اس مفہوم پر" یقین" کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تصدیق دل پر اس حد تک غالب نہ ہو جائے کہ دل پر اس کے تصرف وحکمرانی کا سکہ چلنے لگے۔ یا اس دل کو صرف انہی چیزوں کی

طرف مائل کرنے لگے جو شریعت کے مطابق ہوں اور ان چیزوں سے باز رہے جو شرعی احکام کے خلاف ہوں۔ مثلاً موت کا اعتقاد ہر شخص رکھتا ہے اور وہ اعتقاد نہ صرف جزم کی حد تک ہوتا ہے بلکہ دلیل و برہان کے ذریعہ اتنا مضبوط و مستند ہوتا ہے کہ وہ موت کو ایک اٹل حقیقت بھی ثابت کرتا ہے تو حکماء متکلمین کے نزدیک اس اعتقاد پر یقین کا اطلاق کیا جاسکتا ہے لیکن صوفیاء کے نزدیک وہ اعتقاد حقیقی معنی میں "یقین" نہیں کہلاسکتا اور اس اعتقاد کا حامل "صاحب یقین" شمار نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کے دل پر موت کی یاد غالب نہ ہو اور موت کا احساس اس حد تک اس پر متصرف و حکمران نہ ہو کہ وہ طاعات کی مشغولیت اور گناہ کے ترک کے ذریعہ ہر وقت موت کے لیے تیار رہے۔ واضح رہے کہ چار امور ایسے ہیں جو یقین کا محل ہیں۔ یوں تو وہ تمام چیزیں یقین کی متقاضی ہیں جن کی خبر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دی ہے لیکن ان تمام چیزوں کی اصل اور بنیاد ہونے کی حیثیت سے وہ چار امور اس درجہ کے ہیں کہ ان پر ہر سالک کو یقین رکھنا بنیادی طور پر ضروری ہے۔ ایک تو توحید، یعنی یہ پختہ اعتقاد رکھنا کہ جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے حق تعالیٰ ہی کی قدرت سے واقع ہوتا ہے دوسرے توکل، یعنی اس بات پر کامل یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کے متکفل وضامن ہے، تیسرے جزاء سزا کا اعتقاد، یعنی یہ یقین رکھنا کہ ہر عمل کی جزا و سزا مقرر ہے تمام اعمال پر ثواب عذاب کا مرتب ہونا لازمی امر ہے اور چوتھے یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام احوال کیفیات اور تمام حرکات وسکنات سے پوری طرح باخبر اور مطلع ہے پس توحید کے تئیں یقین کا فائدہ یہ ہوگا کہ مخلوقات کی طرف رغبت و التفات نہیں رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچنے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ ہوگا کہ یا تو حصول رزق کی طلب وکوشش میں میانہ روی اختیار کرے گا، یا اگر افلاس ونا داری کی صورت

میں غذائی ضروریات پوری نہ ہوں گی تو کسی تاسف اور بددلی میں مبتلا نہیں ہوگا، اعمال کے جزا وسزا کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ طاعات وعبادات کی مشغولیت اور اللہ کی رضاوخوشنودی کے حصول میں زیادہ سے زیادہ سعی وکوشش کرے گا اور گناہ ومعصیت کی زندگی سے اجتناب کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح کی طرح زیادہ سے زیادہ متوجہ رہے گا۔ یہ حضرت شیخ عبدالوہاب کے کلام کا خلاصہ تھا۔ اب آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت، رزق پہنچنے اور اللہ تعالیٰ نے رزق دینے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر کامل توکل اعتماد رکھنا، تمام روحانی و باطنی اعلیٰ مراتب میں سے ایک بہت بڑا مرتبہ ہے نیز سالک راہ حق کو یہ مرتبہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں اور تمام عبادات وطاعات میں قلبی فروغ واطمینان کا انحصار اس مرتبہ پر ہے۔ امام زمانہ، قطب وقت، حضرت الشیخ ابوالحسن شاذلی (رح) نے بڑی عارفانہ بات کہی ہے کہ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر بندہ اور اللہ کے درمیان پردہ کی طرح حائل ہوجاتی ہیں یعنی ان دونوں چیزوں کی وجہ سے بندہ معرفت حق حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے ایک تو رزق کا فکر اور دوسرے مخلوق کا خوف اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ سخت پردہ رزق کا فکر ہے۔ امام اصمعی (رح) سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کے سامنے سورت والذاریات کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچا آیت (وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ) 51۔ الذاریات 22 :) تو اس دیہاتی نے (جو بڑے غور کے ساتھ میری تلاوت سن رہا تھا) ایک دم کہا کہ بس کیجئے۔ اور پھر وہ اپنی اونٹنی کی طرف متوجہ ہوا، اس نے اس اونٹنی کو نحر کیا اور اس کا گوشت کاٹ بنا کر ان تمام لوگوں کے درمیان تقسیم کردیا

جو اس کے آس پاس موجود تھے، اس کے بعد اس نے اپنی تلوار اور کمان اٹھائی اور ان کو بھی توڑ کر پھینک دیا اور پھر بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، کافی عرصہ کے بعد میں ایک دن بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس دیہاتی سے ملاقات ہوگئی جو خود بھی طواف کر رہا تھا میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا، اس کا بدن بالکل سوکھ گیا تھا اور رنگ زرد ہوگیا تھا، اس نے مجھ کو دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ وہی سورت پھر پڑھیے جو آپ نے اس دن پڑھی تھی چنانچہ میں نے وہ سورت پڑھنی شروع کی اور جب اسی آیت یعنی (وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ) 51۔ الذاریات 22 :) پر پہنچا تو اس نے ایک چیخ ماری اور کہا آیت (قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا) 7۔ الاعراف 44 :)، اس کے بعد اس نے کہا کہ کچھ اور ؟ (یعنی اب آگے کی آیت پڑھیے) میں نے آگے کی آیت پڑھی (فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ) 51۔ الذاریات 23 :) اس نے آیت سن کر پھر ایک چیخ ماری اور کہنے لگا، یا اللہ پاک ہے تیری ذات، وہ کون بد بخت ہے جس نے اللہ کو اتنا غصہ دلایا کہ اس کو قسم کھانی پڑی؟ اس شخص کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے کہ پروردگار نے جو کچھ فرمایا اور جو وعدہ کیا اس پر اس نے یقین نہیں کیا یہاں تک کہ پروردگار کو قسم کھا کر اس بات کا یقین دلانا پڑا؟ اس دیہاتی نے تین مرتبہ یہی جملے ادا کئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

وہ چار آدمی جن کے حق میں دنیا بھلی یا بری ہے

حدیث:

وعن أبي كبشة الأنماري أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ثلاث أقسم

علیهن وأحدثکم حدیثا فاحفظوہ فأما الذی أقسم علیهن فإنه ما نقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر علیها إلا زادہ اللہ بها عزا ولا فتح عبد باب مسألة إلا فتح اللہ علیه باب فقر وأما الذی أحدثکم فاحفظوہ فقال إنما الدنیا لأربعة نفر عبد رزقه اللہ مالا وعلما فهو یتقی فیه ربه ویصل رحمه ویعمل للہ فیه بحقه فهذا بأفضل المنازل. وعبد رزقه اللہ علما ولم یرزقه مالا فهو صادق النیة ویقول لو أن لی مالا لعملت بعمل فلان فأجرهما سواء. وعبد رزقه اللہ مالا ولم یرزقه علما فهو یتخبط فی ماله بغیر علم لا یتقی فیه ربه ولا یصل فیه رحمه ولا یعمل فیه بحق فهذا بأخبث المنازل وعبد لم یرزقه اللہ مالا ولا علما فهو یقول لو أن لی مالا لعملت فیه بعمل فلان فهو نیته ووزرهما سواء. رواہ الترمذی وقال هذا حدیث صحیح

••••••

ترجمہ

حضرت ابوکبشہ انماری (ر) سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا” تین باتیں ہیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں اور میں تم سے ایک بات کہتا ہوں (یعنی تمہارے سامنے اپنی ایک حدیث بیان کرتا ہوں تم اس کو یاد رکھنا اوراس پر عمل پیرا ہونا پس وہ تین باتیں جن کی حقانیت وصداق پر میں قسم کھا سکتا ہوں، یہ ہیں کہ بندہ کا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے (صدقہ وخیرات) کی وجہ سے کم نہیں ہوتا (یعنی کسی بندہ کا اپنے مال کو اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے خرچ کرنا بظاہر تو اپنے مال کو کم کرنا اور گھٹانا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو کوئی نقصان اور گھاٹا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا صدقہ وخیرات کرنا دنیاوی طور پر بھی اس کے مال واسباب میں خیر وبرکت کا موجب ہے اور آخرت میں بھی حصول ثواب کا ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز کثرت وزیادتی کے حکم میں ہوگی نہ کہ نقصان کے حکم میں ۔جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور اس کا مال ناحق لے لیا جائے اور وہ بندہ اس ظلم وزیادتی

پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے (یعنی اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا ہونا اگرچہ ظاہری طور پر اس کی ذلت کے مترادف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرنے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس بندہ کی عزت ومرتبہ بڑھ جاتا ہے جیسا کہ جو شخص ظلم کرتا ہے اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کی ذلت بڑھ جاتی ہے، یا یہ مطلب کہ ظلم وزیادتی کا شکار ہونے والا بندہ اگرچہ وقتی طور پر ذلت وکمتری میں مبتلا ہوجاتا ہے مگر انجام کار اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی عزت ومرتبہ کو بڑھا دیتا ہے جیسا کہ ظالم اگرچہ وقتی طور پر سر بلند ہوجاتا ہے مگر آخرکار اپنے ظلم کی وجہ سے نہایت ذلت ورسوائی سے دوچار ہوتا ہے اور دنیا والوں کی نظر میں بری طرح گر جاتا ہے اگرچہ وہ کتنی ہی طویل مدت کے بعد اس انجام بد کو کیوں نہ پہنچے، چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ قدرت کی کرشمہ سازی صورت حال کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ ظالم ایک نہ ایک دن اپنی سربلندی کھو دیتا ہے اور کبھی زور آور ہونے کی وجہ سے جس شخص پر ظلم وزیادتی کیا کرتا تھا اپنے انجام کو پہنچ کر اسی مظلوم کو زیردست اور اس کے سامنے ذلیل وسرنگوں ہوجاتا ہے۔ اور جس بندہ نے اپنے نفس پر سوال کا دروازہ کھولا (یعنی ضرورت وحاجت کی وجہ سے نہیں بلکہ مال ودولت جمع کرنے اور خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے لوگوں سے مانگنا شروع کر دے) اللہ تعالیٰ اس کے لیے فقر وافلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے (یعنی اس کو طرح طرح کے احتیاج وافلاس میں مبتلا کر دیتا ہے یا اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کو بھی ختم کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نہایت خرابی میں پڑ جاتا ہے) اور رہی اس حدیث کی بات جس کو میں نے تمہیں سنانے کے لیے کہا تھا تو اب میں اس کو بیان کرتا ہوں (دھیان سے سنو اور) اس کو یاد رکھو، اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دنیا بس چار

آدمیوں کے لیے ہے (یعنی یہ دنیا اپنے مال و دولت کے احوال اور اپنی بھلائی برائی کے اعتبار سے چار طرح کے آدمیوں میں منحصر ہے) ایک تو وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و زر بھی عطا کیا اور علم کی دولت سے بھی نوازا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مال کو مصارف خیر میں خرچ کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور اس کے اثرات و کیفیات سے بھی باخبر ہے) پس وہ بندہ اپنے مال و دولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (یعنی اس کو حرام و ناجائز اور ناپسندیدہ حق امور میں خرچ نہیں کرتا) اس کے ذریعہ اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرتا ہے اور اس مال و زر میں سے اس کے حق میں مطابق اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرتا ہے (یعنی مال و دولت کے تئیں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق متعین کئے وہ ان کو احکام الٰہی کی تکمیل کے لیے ادا کرتا ہے، مثلاً زکوۃ نکالتا ہے، صدقہ وخیرات کرتا ہے، مالی کفارات ادا کرتا ہے اور ضیافت ایمانداری میں خرچ کرتا ہے چنانچہ اس بندہ کا بہت بڑا اور کامل ترین مرتبہ ہے (یعنی وہ بندہ دنیا میں اچھے خصائل واحوال سے متصف قرار دیا جاتا ہے یا آخرت میں اعلیٰ مراتب کا مستحق قرار پاتا ہے)۔ دوسرا وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو عطا کیا کہ جس کے ذریعہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مال کو کسی کام میں صرف کرنا اللہ کی رضاوخوشنودی اور ہر طرح کے اجروثواب کا باعث ہے اور کس کام میں خرچ کرنا اللہ کی ناراضگی اور ہر طرح کے خسران عذاب کا سبب ہے) لیکن اس کو مال عنایت نہیں فرمایا پس وہ بندہ (اپنے علم کے سبب سچی نیت رکھتا ہے اور حصول مال و دولت کی خواہش وآرزو رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں اس کے تئیں اچھے عمل کرتا جیسا کہ وہ فلاں شخص اپنے مال وزر کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے (یعنی جس طرح فلاں شخص کو اللہ نے علم صادق کے ساتھ مال

و دولت سے بھی سرفراز کیا ہے اور وہ اس مال کو اللہ کی رضاو خوشنودی کی خاطر اچھے کاموں میں خرچ کر کے، (یعنی ادائیگی زکوۃ، اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ دنیا وآخرت کی سرخروئی حاصل کر رہا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس علم کے ساتھ مال و دولت بھی عطا فرماتا تو میں بھی اس شخص کی طرح اپنے مال وزر کو اللہ کی رہ میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کرتا) چنانچہ دونوں شخصوں کا ثواب برابر ہے (یعنی اگر پہلا شخص مالدار ہونے کی وجہ سے اللہ کی راہ میں واقعتاً اپنا مال خرچ کرتا ہے اور یہ دوسرا شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتا لیکن سچی نیت رکھنے کے سبب وہی اجر وثواب پاتا ہے جو پہلے شخص کو ملتا ہے) تیسرا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے لیکن علم نہیں دیا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ اللہ سے ڈرے اور اپنے مال کو حقوق کی ادائیگی میں خرچ کرے) پس وہ بندہ بے علم ہونے کی وجہ سے اپنے مال کے بارے میں بہک جاتا ہے (بایں طور کہ اول تو لالچ وحرص اور دنیا کی محبت کی وجہ سے بخل کرتا ہے کہ کسی بھی اچھے کام اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا روادار نہیں ہوتا اور اگر کسی فلاحی، رفاہی کام یا کسی کی مدد واعانت میں کچھ خرچ بھی کرتا ہے تو مقصد محض نام ونمود اور اپنی بڑائی وثروت کا اظہار ہوتا ہے) وہ (اپنی بے عملی کے سبب) اس مال ودولت کے بارے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا ہے (یعنی آمدنی کے ایسے وسائل وذرائع سے اجتناب واحتیاط نہیں کرتا جو حرام وناجائز اور مشتبہ ہوتے ہیں اور نہ ایسے امور میں اپنا مال خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدہ حق ہیں) اور علم وتربیت کی کمی، نیز جذبہ ترحم وہمدردی کے فقدان اور حرص وبخل کی کثرت کی وجہ سے اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ مالی احسان وسلوک نہیں کرتا ہے اور نہ ان حقوق کی تعمیل کرتا ہے جو اس

کے مال و دولت سے متعلق ہیں (یعنی نہ تو زکوۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کے ذریعہ اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق مطالبات کی ادائیگی کی پروا کرتا ہے، چنانچہ یہ بندہ بدترین مرتبہ کا ہے۔ اور چوتھا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو مال عطا کیا ہے اور نہ علم دیا ہے (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ خیر وشر کے درمیان تمیز کر سکے اور یہ پہچان کر سکے کہ میرے حق میں کون سی چیز بہتر ہے اور کون سی چیز بری) پس وہ بندہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں بھی اس کو فلاں شخص کی طرح (برے کاموں میں) خرچ کرتا، چنانچہ یہ بندہ اپنی نیت کے سبب مغضوب ہے (یا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ پس یہ بندہ بری نیت رکھنے والا ہے) اور اس کا گناہ اس تیسرے شخص کے گناہ کے برابر ہے یعنی وہ تیسرا شخص اگرچہ اپنا مال برے کاموں میں خرچ کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوتا ہے اور یہ چوتھا شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے برے کاموں میں خرچ کرنے کا مرتکب نہیں ہوتا لیکن چونکہ برے کاموں میں خرچ کرنے کی نیت رکھتا ہے اس سبب سے اس کو بھی وہی گناہ ملتا ہے جو برے کاموں میں واقعتا خرچ کرنے والے کو ملتا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

تشریح

یہاں "نیت" کو "عزم" کے معنی پر محمول کرنا چاہیے کیونکہ انسان گناہ کی محض خواہش و نیت پر نہیں بلکہ "عزم" پر ماخوذ ہوتا ہے اور اصطلاح طور پر "عزم" اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں کسی گناہ کے کرنے کا خیال و ارادہ پیدا ہو اور وہ اس خیال و ارادہ کو پورا کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑے لیکن خارجی طور پر کوئی ایسا مانع حائل ہو جس کی وجہ سے وہ اس گناہ کے کرنے اور اس تک پہنچنے پر قادر نہ ہو، کہ اگر وہ مانع باقی نہ رہے اور اس کو قدرت حاصل

ہوجائے تو وہ بلا توقف اس گناہ کو کر ڈالے، مثلاً اگر کوئی شخص زنا کرنا چاہے اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں اس حد تک سعی وکوشش کرے گا کہ اگر کوئی خارجی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرے تو وہ بے جھجک اور بلا توقف زنا میں مبتلا ہوجائے تو اس کی اس خواہش و ارادہ کا اتنا پختہ (باسعی ہونا" عزم" کہلائے گا اور وہ اس عزم پر ماخوذ ہوگا اور اس کو اللہ کی نظر میں گناہ گار قرار دیا جائے گا کیونکہ" عزم" اگرچہ واقعتہً زنا نہیں ہے لیکن جس طرح زنا ایک گناہ ہے اسی طرح زنا کا عزم بھی ایک مستقل گناہ ہے۔اس موقع پر زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کردیا جائے، چنانچہ جاننا چاہیے کہ اول تو وسوسہ شیطان ہے، یعنی بغیر کسی کسب وارادہ کے دل میں کسی گناہ کا خیال خودبخود آجائے اور گزر جائے، جمے نہیں، اس کو" ہاجس" کہا جاتا ہے اور ہاجس پر کوئی مواخذہ نہیں۔لیکن اگر وہ خیال دل میں بیٹھ جائے اور طبیعت کے اندر جولانی وگردش کرنے لگے تو اس کو" خاطر" کہتے ہیں، خاطر بھی اس امت کے حق میں مرفوع اور قابل معافی قرار دیا گیا ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور یہ اس امت کے خصائص میں سے ہے۔اس کے بعد" ہم" کا نمبر آتا ہے۔" ہم" یہ ہے کہ گناہ کا وہ خیال دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اس گناہ کے قصد و ارادہ اور نیت کی صورت اختیار کرلے، حسنات (نیکیوں) میں تو" ہم" کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ کسی نیکی کی محض نیت اور اس کا قصد وارادہ، پوری نیکی کے مترادف قرار دیا جاتا ہے لیکن سیئات (گناہوں) کے معاملہ میں محض نیت اور ارادہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔اس کے بعد" عزم" ہے جس کی وضاحت پہلے کی جاچکی ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ عزم قابل مواخذہ ہے۔حدیث کے اس جملہ ویعمل اللہ فیہ بحقہ میں فیہ کی ضمیر حضرت شیخ عبدالحق (رح) نے تو مال کی طرف لوٹائی ہے (جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے) لیکن ملا علی

قاری (رح) نے فیہ کی ضمیر، مال کے بجائے، علم کی طرف لوٹائی ہے، اس صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ" اور وہ شخص اس علم کے تعلق سے اور اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرتا ہے باایں طور کہ اس علم پر عمل کر کے اور حقوق اللہ وحقوق العباد ادا کر کے اس علم کا حق ادا کرتا ہے، تاہم ملا علی قاری نے ابن مالک کی طرف منسوب کر کے یہ قول بھی لکھا ہے کہ فیہ کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، نیز حضرت شیخ نے لفظ یتخبط کے یہ معنی لکھے ہیں وہ شخص کہ جس کو صرف مال عطا ہوتا ہے علم حاصل نہیں ہوتا اپنی بے علمی اور بدعقلی کی وجہ سے اپنے مال و دولت کے معاملہ کوئی صحیح راہ اختیار نہیں کر پاتا اور اچھے اور برے مصارف کے درمیان تمیز نہ کر پانے کی وجہ سے اس کو ادھر ادھر خرچ کرتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مال زیادہ تر ان کاموں میں خرچ ہوتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدہ حق ہوتے ہیں۔ چنانچہ مابعد کے الفاظ لایتقی فیہ ربہ سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔لیکن ملا علی قاری نے اس جملہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ" وہ شخص مال و دولت کے حصول میں سخت بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت بس پیسہ کمانے اور دولت جمع کرنے کے چکر میں رہتا ہے اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اور ہر حرکت وسکون کا واحد محور حصول زر ہوتا ہے، علاوہ ازیں وہ اس مال و دولت کے تئیں طرح طرح کے احوال میں مبتلا ہوتا ہے کہ کبھی تو اس کو ادھر ادھر بے دریغ خرچ کرتا ہے اور کبھی اس طرح بخل وخست کرتا ہے کہ بنیادی ضروریات اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔

توکل اور صبر کا بیان

لغت میں وکل اوکول کا لفظ آتا ہے جس کے معنی ہیں سونپ دینا، سپرد کر دینا کسی پر بھروسہ کر کے کام چھوڑ دینا اس کا اسم وکالت اور رکالت ہے اسی لفظ سے توکل نکلا ہے جس کے معنی اپنے عجز و بیچارگی کو ظاہر کرنے اور دوسرے پر اعتماد و بھروسہ کرنے ہیں، اس کا اسم تکلان ہے، اصطلاح شریعت میں توکل اس کو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے معاملہ و کام کو اللہ کے سپرد کر دے اپنی تدبیر وسعی کو ترک کر دے اور اپنی ذاتی طاقت وقدرت سے بے پروا ہو کر تقدیر اور رضائے الٰہی پر کامل اعتماد کرے، یعنی اس بات پر یقین رکھے کہ اپنی تدبیر وسعی اور ذاتی طاقت وقدرت، اللہ کی مشیت اور اس کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتا، جو لکھا ہی نہیں گیا وہ رونما نہیں ہو سکتا۔ یوں تو توکل کا تعلق تمام امور اور معاملات پر ہوتا ہے لیکن اکثر اس کا استعمال رزق کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ توکل کا جو اصل مفہوم ہے وہ اس بات پر اعتماد و بھروسہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے رزق کا ضامن ہے۔ حصول معاش کے لیے جائز و حلال ظاہری وسائل و ذرائع کو ترک کرنا گو توکل کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اصل اعتماد و بھروسہ ان وسائل و ذرائع پر نہ ہو۔ چنانچہ توکل کا تعلق اصل میں دل سے ہے اگر دل میں حق تعالیٰ کے ضامن ہونے کا یقین جاگزین ہو گیا تو توکل کا مفہوم پورا ہو جائے گا۔ گویا اعضاء عمل کو معطل کر دینا اور ہاتھ پاؤں ڈال کر اپاہج بن جانا توکل کے صحیح ہونے کے لیے لازم نہیں ہو گا اور نہ حصول معاش کے لیے ظاہری تدبیر دستی کرنا اس کے منافی ہو گا رہی یہ بات کہ بعض زاہدان طریقت اور درویش صفت طالبان معرفت حصول معاش کے ظہری اسباب و وسائل کو ترک کر دیتے ہیں تو ان کا وہ عمل محض ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات سے ان کا مقصد یہ

ہوتا ہے کہ مقام توکل ثابت ہو جائے نفس زیادہ سے زیادہ ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہے اور نظر امید اسباب و ذرائع سے منقطع ہو جائے، نیز اس امر پر کامل یقین حاصل ہو جائے کہ ظاہری اسباب و ذرائع رزق پہنچنے کے لیے شرط کا درجہ نہیں رکھتے۔ بعض حضرات نے توکل کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر اعتماد و یقین کے سبب حصول معاش کے اسباب و ذرائع اور کسب وعمل کی پابندیوں سے مطلق آزاد ہو جانا، لیکن یہ توکل کا وہ مقام ہے جو ابتدائی حالت میں اختیار کیا جاتا ہے یا" آزاد" ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ ان اسباب و وسائلہ اور کسب وعمل، رزق پہنچنے کے لیے حقیقی موثر ومسبب ہیں، چنانچہ جو بندہ توکل کے آخری مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس مقام کا منتہی ہوتا ہے اس کا اسباب و وسائل اور کسب وعمل کو اختیار کرنا، اس کے حق میں توکل کے منافی نہیں ہوتا، اس کو اللہ کی رزاقیت پر کامل یقین واعتماد اس وقت بھی حاصل رہتا ہے جب وہ اپنی روزی کے لیے اسباب و وسائل اور کسب وعمل میں مشغول ہوتا ہے اور اس وقت بھی اس کے اس یقین واعتماد میں ذرہ برابر بھی رخنہ نہیں پڑتا جب وہ ان چیزوں کو بالکل ترک کر دیتا ہے، مثلاً اگر وہ منتہی کھجور کا پودا لگائے اور خرق عادت کے طور پر (یعنی خلاف عادت) وہ پودا اسی لمحہ بارآور ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت صناعی پر اس کا یقین واعتماد اس صورت میں اور اس صورت میں کہ کھجور کا پودا وہ عادت ومعمول کے مطابق کئی سال کے بعد پھل لائے یکساں ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے دنیاوی اسباب و وسائل کے ذریعہ اور ظاہری عوامل ومسببات کی تربیت کے ساتھ وجود پذیر ہوتی ہے تو اس صورت میں صانع کی کمال قدرت کا مشاہدہ زیادہ یقین واعتمال اور زیادہ پرتاثیر انداز میں ہوتا ہے کیونکہ اسباب کے بغیر یعنی خرق عادت کے طور پر جو چیز سامنے آتی ہے اس میں محض وہی

ایک فعل ہوتا ہے، جب کہ ظاہری اسباب ووسائل کے ذریعہ ظاہر ہونے والی چیز کتنے ہی مضبوط ومربوط افعال وحالات اور کتنے ہی محکم احکام وقوانین قدرت کا مظہر ہوتی ہے، علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ اسباب ووسائل کو ترک کر دینا گویا ان چیزوں کو معطل و بیکار بنا دینا ہے جن کو حق تعالیٰ نے انسان ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور جن کو اختیار کرنا منشاء قدرت کے خلاف نہیں ہے۔ عنوان باب کا دوسرا جزء صبر ہے لغت میں صبر کے معنی ہیں رکنا منع کرنا نفس کو کسی چیز سے باز رکھنا، فارسی میں اس کو شکیبائی کہتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں صبر اس کو کہتے ہیں کہ نیکی اور برائی کے درمیان کشمکش کے وقت اپنے نفس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ نیک کو اختیار کرے اور برائی سے باز رہے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ فرماتے ہیں کہ صبر کا مفہوم ہے ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ حظوظ نفس کے جال سے باہر آنا اور نفس کو اس کی محبوب و مرغوب چیزوں سے باز رکھنے پر کار بند رہنا۔ عوارف میں لکھا ہے" صبر" کی جو اقسام ہیں ان میں سب سے اعلیٰ قسم کا وہ صبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے تئیں کیا جائے بایں طور کہ اس کی طرف متوجہ وانابت، صدق و اخلاص کے ساتھ ہو، اس کی ذات صفات اور کمال قدرت میں استغراق ومراقبہ دوامی ہو اور نفس کی تمام خواہشات وخیالات کو یکسر منقطع کر دیا جائے۔ نیز بیان کیا کہ۔ صبر فرض بھی ہے اور نفل بھی، فرض صبر تو وہی ہے جو فرائض کی ادائیگی اور حرام چیزوں کے ترک کرنے پر اختیار کرنا پڑتا ہے اور نفل صبر کی جو صورتیں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ (۱) فقر و افلاس اور شدائد وآلام پر صبر کرنا۔ (۲) کوئی صدمہ وتکلیف پہنچنے پر صبر کرنا (۳) اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کو چھپانا۔ (٤) شکوہ وشکایت سے اجتناب کرنا۔ (٥) باطنی احوال وکرامات کو چھپانا۔ واضح رہے کہ فرض اور نفل دونوں طرح صبر کی بہت اقسام اور صورتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے

لوگ بہت ہیں جو صبر کی تمام ہی اقسام پر عامل و کاربند نہیں رہ سکتے جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اگرچہ صبر کی بہت اقسام ہیں اور ان کا اطلاق بہت سی صورتوں پر ہوتا ہے مگر عام طور پر اس کا اطلاق خصوصیت سے مصائب و آفات اور ناگوار و ناپسندیدہ امور کو انگیز کرنے پر ہوتا ہے، جیسا کہ "شکر" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اور اپنے اطلاق کے اعتبار سے اس کی بہت سی قسمیں ہیں مگر خاص طور پر اس کا استعمال حصول نعمت و رزق کی صورت میں ہوتا ہے۔

توکل اور صبر کے بارے میں کچھ مفید باتیں

جاننا چاہیے کہ جو چیزیں انسان کے لیے عبادت الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ان میں سب سے سخت رکاوٹ معاشی زندگی کے تفکرات یعنی کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا فکر و خیال ہے، ظاہر ہے کہ انسان کا نفس اپنے وجود و بقاء کے لیے جن چیزوں کا محتاج ہے ان کی طرف اس کا رجحان اور مطالبہ ایک فطری تقاضا ہے چنانچہ وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ میں ہر چیز سے باز آیا۔ زہد و تقویٰ بھی اختیار کیا، دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھتا، لیکن ان چیزوں کا کیا علاج کروں جو میرے وجود و بقا کے لیے ضروری ہیں۔ جیسے کھانا پینا اور لباس وغیرہ۔ اور یہ بھی بالکل ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں یوں ہی حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے حصول کے لیے کسب و عمل، جہد و سعی اور لوگوں کے ساتھ ربط و ضبط اور میل جول اختیار کرنا ضروری ہے پس شریعت نفس کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے وہ سب سے یقینی راہ دکھاتی ہے جس کو توکل کہا جاتا ہے، کیونکہ توکل بذات خود وہ واحد قوی ذریعہ ہے جس پر اگر انسان صدق و اخلاص کے ساتھ عامل ہو جائے تو اللہ کی طرف سے ضروریات زندگی کی تکمیل خود بخود ہونے لگتی ہے اور اس راہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے نہ صرف نفس کی تشویش رفع ہو جاتی ہے بلکہ کمال

ایمان کا درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف توکل کو ترک کر دینے والا نہایت سخت تفکرات و اوہام میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اس کو سکون و اطمینان کے ساتھ طاعت وعبادات کا موقع نصیب ہوتا ہے اور نہ اس اطاعت وعبادت میں لذت وحلاوت نصیب ہوتی ہے اور روزی کا فکروغم اس کو اس طرح پراگندہ خاطر اور پریشان حال بنا دیتا ہے کہ وہ کوئی بھی نیک عمل یقینی قوت وحالت کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا، لہٰذا توکل کی راہ اختیار کرنا ہر شخص کے لیے لازمی امر ہے کہ اس کے بغیر وہ اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا، جیسا کہ ایک طویل حدیث میں جو آگے آئے گی فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ قوی ہو تو اس کو چاہیے کہ توکل کی راہ اختیار کرے۔ اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور کا وکیل اور اپنی بھلائی و بہتری کا ضامن جان کر بس اسی پر اعتماد و بھروسہ کرے اور جانے کہ اللہ تعالیٰ نے قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہرگز معدوم نہیں ہوگا اور حکم الٰہی کسی بھی حالت میں ادل بدل نہیں سکتا، خواہ بندہ مانگے یا نہ مانگے، نیز اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی روزی کا ضامن ہے، جب کہ اس نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی ضرور دے گا، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آیت (ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا) اور اس بات پر بھی قسم کھائی کہ آیت (فورب السماء والارض انہ لحق) پس غور کرنے کو مقام ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے وعدہ کی صداقت کے جزو ایمان ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے اگر وہ اس کے ضامن ہونے پر اعتماد نہ رکھے اور اس کے وعدہ پر باور نہ کرے تو اس کا ایمان کہاں رہے گا اور وہ کس طرح اللہ کا بندہ کہلانے کا مستحق قرار پائے گا۔ ہر مومن کو چاہیے کہ وہ دنیا، دنیا کے مال و اسباب اور کسب وعمل کو محض حصول رزق کا ایک ظاہری

وسیلہ و بہانہ اور سبب سمجھے، اس سے زیادہ اور کچھ نہ جانے اور یہ یقین رکھے کہ حقیقی رازق صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ اتنی بڑی قدرت کا مالک ہے کہ اس کے نزدیک ظاہری وسائل و اسباب کی چنداں اہمیت نہیں ہے وہ توکل و اعتماد کرنے والوں کو بے سبب و وسیلہ اور بلا کسب و عمل بھی روزی پہنچاتا ہے، جیسا کہ فرمایا آیت (ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ)۔ اسی طرح حصول معاش کے لیے وسائل و ذرائع کو اختیار کرنے اور کسب و عمل میں مشغول ہونے کو بھی اللہ کی طرف سے مقرر کردہ نظام کائنات کا ایک سلسلہ اور رزق پہنچنے کا ایک ظاہری سبب جانے اس پر دل سے اعتماد و بھروسہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان رکھے اور جانے کہ اگر کوئی کسب و عمل نہ کروں گا تو بھی اللہ تعالیٰ روزی پہنچائے گا، یہ توکل کا کم سے کم درجہ ہے جو ایمان کے لیے ضروری ہے اور عام مسلمانوں کا مرتبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، آیت (وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین) اس سے اعلیٰ درجہ تسلیم ہے، یعنی بندہ کا اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دینا، اللہ کے علم پر کفایت کرنا اور اپنے دل میں کسی بھی طرح کا کوئی رد و بدل نہ رکھنا یہ اولیاء اللہ کا مرتبہ ہے اور آیت (وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون) سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ حصول معاش کے لیے اسباب و ذرائع اختیار کرنا اور کسب و عمل میں مشغول ہونا توکل کے منافی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب و ذرائع اور کسب و عمل بھی نظام قدرت کا ایک حصہ ہے اور اللہ کی طرف سے ایک حد تک انسان کو ان چیزوں کا مکلف بھی قرار دیا گیا ہے، البتہ جو چیز توکل کے منافی ہے، وہ بس یہ ہے کہ حصول معاش کے ظاہری، اسباب و ذرائع اور کسب و عمل پر دل سے اعتماد نہ کیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ رزق پہنچنے کا حقیقی سبب یہی چیزیں ہیں اگر انسان کوئی کسب و عمل نہ کرے اور محض اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جائے تو اس کو رزق پہنچ ہی

نہیں سکتا، یہ عقیدہ وخیال ایمان کے منافی ہے اور اس کو شرک خفی کہا گیا ہے۔ لہٰذا جو شخص اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب وعمل میں مشغول ہو لیکن اس کے دل کا اعتماد صرف اللہ پر ہو تو وہ شخص بھی یقیناً مومنین میں سے ہوگا، اگرچہ توکل کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ بندہ اپنے ہاتھ پاؤں کو تمام اسباب و ذرائع سے دور رکھے اپنے تمام معاملات میں اللہ ہی پر اعتماد کرے اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرے بشرطیکہ ہر حالت میں خواہ تنگی ہو یا فراخی، قوت ایمان کے سبب اللہ پر اس کا کامل اعتماد یکساں رہے، غیر اللہ سے امید منقطع رکھے اور اس راہ میں جو بھی رنج ومصیبت پیش آئے اس کو صبر ورضا کے ساتھ برداشت کرکے ریاضت ومجاہدہ اور عبادت میں مشغول رہے اور جو شخص ان امور پر پوری طرح قادر نہ ہو سکے تو ان کے حق میں افضل یہی ہوگا کہ وہ دل سے اللہ پر اعتماد رکھتے ہوئے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب وعمل میں مشغول ہو۔ اسی طرح محض کسل وسستی اور عار کی وجہ سے یا بطور ریا ہاتھ پاؤں کو معطل کردینا اور کسب وعمل سے باز رہنا قطعاً روا نہیں ہے کیونکہ اکثر انبیاء اور اولیاء کا یہی معمول رہا ہے کہ انھوں نے حصول معاش کے لیے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کیا اور کسب وعمل سے باز نہیں رہے کہ جو شخص کسب وعمل کی وجہ سے اپنی دینی زندگی میں کوئی نقصان اور اپنے باطنی احوال میں رخنہ پڑتا ہوا دیکھے تو اس کے لیے بہر صورت یہی ضروری ہوگا کہ وہ سب چیزوں سے تعلق منقطع کرکے بس ذکر وفکر اور ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہے تاکہ واصل بحق ہو۔ متوکل کو ایسے کام و ذریعہ سے باز رہنا کہ جس کے بغیر کار برآری قطعاً ممکن نہ ہو اور سنت اللہ اسی کے مطابق جاری ہو، ہرگز روا نہیں ہے بلکہ حرام ہے، مثلاً کھانا ہاتھ کے ذریعہ کھایا جاتا ہے اور سنت اللہ اس کے مطابق جاری ہے کہ جو شخص کوئی چیز کھانا چاہے اس کو ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں ڈالے،

اب اگر کوئی شخص متوکل یہ گمان کرے کہ اس چیز کو کھانے کے لیے ہاتھ کا ذریعہ اختیار کرنا توکل کے منافی ہے اور اس امید میں بیٹھا رہے کہ یہ چیز خود بخود (اٹھ کر منہ میں جائے گی کھاؤں گا، یہ توکل نہیں ہے بلکہ اس کو محض جنون و حماقت سے تعبیر کیا جائے گا، ایسے امور میں توکل کی کار فرمائی کی بس حد یہ ہے کہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا اسی لیے پیدا کیا ہے کہ اس کو کھایا جائے، سب کا خالق و رازق بھی وہی ہے اور یہ ہاتھ اس عمل یعنی کھانے کا سبب و ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے بس ہاتھ کو کھانے کا ظاہر ذریعہ جان کر کھانے کے لیے استعمال کرے لیکن دل سے اس پر اعتماد نہ کرے اور یہ جانے کہ جن لوگوں کے ہاتھ نہیں ہوتے ان کے کام بھی بحال سر انجام پاتے ہیں جہاں تک کسی ایسے کام کا تعلق ہے کہ جس کی انجام دہی کا ذریعہ اگرچہ ہاتھ ہی ہے لیکن وہ ایسا قطعی ذریعہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام انجام ہی نہ پاسکتا ہو جیسے سفر کے دوران خرچ اور زادراہ تھامنا وغیرہ، تو ایسی صورت میں ہاتھوں کو بطور ذریعہ استعمال کرنے سے باز رہنا روا ہوسکتا ہے کیونکہ ایسا ممکن اور کثیر الوقوع ہے کہ جو لوگ خرچ اور زادراہ لے کر نہیں چلتے ان کا سفر بھی پورا ہو ہی جاتا ہے، تاہم واضح رہے کہ زادراہ اور سفر خرچ پر، بلکہ بقدر ضرورت سفر خرچ اور زادراہ لے کر چلنا سنت ہے اور سلف کے معمولات سے بھی ثابت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد بھروسہ کے سبب سفر خرچ اور زادراہ وغیرہ نہ لینا تو متوکلین کے اعلیٰ درجات میں سے ہے۔ جو شخص عیالدار ہو اور اس کے اہل و عیال حالات کی تنگی پر صبر نہ کرسکتے ہوں اور وہ اس بات کی اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ شخص توکل کے سبب کوئی کسب و عمل نہ کرے اور ذرائع سے اجتناب کرے۔ اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال تک کا اور اپنی ذات کے لیے چالیس روز تک کا بقدر ضرورت غذائی ضروریات کا سمان اکٹھا بھروا کر رکھ لینا

توکل کے منافی نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص از راہ توکل غذائی ضروریات کی چیزیں پہلے سے بھروا کر نہ رکھے اور سب کچھ ترک کر دے بشرطیکہ اللہ پر اس کا پورا اعتماد و اطمینان ہو تو یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کا حامل ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے بڑی زبردست قوت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اتنی قوت و ہمت میسر نہ ہو اور اگر وہ غذائی ضروریات کا سمان اکٹھا بھروا کر نہ رکھنے کی صورت میں طاعت و عبادت میں اطمینان و سکون اور دل جمعی حاصل نہ کرسکتا ہو تو اس کے لیے یہی افضل ہوگا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی غذائی ضروریات کے لیے غلہ وغیرہ اکٹھا بھروا کر رکھ لے۔ رنج و پریشانی اور بیماری کا گلہ شکوہ نہ کرنا اور جو شخص طبیب و معالج نہ ہو اس کے سامنے بلا ضرورت اپنے مرض کو ظاہر نہ کرنا توکل کے لیے شرط ہے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ توکل اسی شخص کو راست آتا ہے جو توحید آشنا اور زہد صفت ہو۔ اس موقع پر توحید سے مراد یہ ہے کہ بندہ یہ جانے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں اور جانے کہ سب کا حقیقی محرک و عامل بس حق تعالیٰ ہے اس کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی جنبش نہ کرسکے اور جہاں بھی جو کچھ بھی آتا جاتا ہے سب کا منبع و مصدر اسی ذات واحد کی مرضی و مشیت ہے، جس شخص کے دل پر یہ بات غالب آجائے گی اس کو بے اختیار توکل حاصل ہو جائے گا۔ یہ تو توکل کے بارے میں کچھ باتیں ہوئی۔ اب "صبر" کے بارے میں جاننا چاہیے کہ صبر ایک ایسی راہ ہے جس کو اختیار کئے بغیر کسی مومن کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ ایمان کی سلامتی اور عبادت میں اطمینان و سکون کے ساتھ مشغولیت کا انحصار "صبر" ہی پر ہے۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا، اہل ایمان کے لیے آفات و مصائب اور رنج و آلام کے ایک گھروندہ کے سوا اور کچھ نہیں، مومن کی

زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کو کسی نہ کسی طرح کی جسمانی اور روحانی اذیت و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو؟ لہٰذا اس صورت میں ہر مومن پر واجب ہے کہ وہ صبر کی راہ اختیار کرے تاکہ اس کا ایمان بھی سلامت رہے اور طاعت و عبادت میں بھی اطمینان وسکون کے ساتھ مشغول رہ سکے، کیونکہ دل گرفتگی رنج خوری جزع وفزع اور تاسف وحسرت کے عالم میں عبادت پورے کیف ونشاط کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کرنے والے کو دنیا وآخرت کی بیشمار بھلائیاں اور سعادتیں عطا کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے مثلاً دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلہ پر اور دیگر مہمات میں فتح وکامرانی نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آیت (فاصبر ان العاقبۃ للمتقین)۔ دوسرے صبر کی وجہ سے بندہ اپنی مراد کو پہنچتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آیت (وتمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا)۔ تیسرے صبر و استقامت کی راہ پر چل کر لوگوں کو قیادت و امامت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ فرمایا۔ (وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا)۔ چوتھے صبر کرنے والا بندہ حق تعالیٰ کی طرف سے تعریف وتوصیف سے نوازا جاتا ہے جیسا کہ فرمایا۔ آیت (انا وجدناہ صابرا نعم العبد انہ اواب)۔ پانچویں صابر بندوں کو بشارت دینے کا حکم فرمایا گیا ہے جیسا کہ فرمایا وبشر الصابرین۔ چھٹے صبر کرنے والے بندوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا آیت (ان اللہ یحب الصابرین)۔ ساتویں جو بندے صبر کرتے ہیں وہ جنت میں بلند تر درجات پائیں گے جیسا کہ فرمایا آیت (اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا)۔ آٹھویں صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام کا اعزاز وشرف عطا ہوا ہے جیسا کہ فرمایا آیت (سلام علیکم بما صبرتم)۔ اور نویں یہ کہ بندے صبر کرتے ہیں اور وہ بے حساب اور بے انتہا اجر وثواب سے نوازے جائیں گے جیسا کہ فرمایا آیت (انما یوفی

الصابرون اجرہم بغیر حساب) پس صبر اتنی بڑی فضیلت اور اتنا عظیم وصف ہے کہ اس پر کار بند رہنے کی ہر مومن کو کوشش کرنا چاہیے۔ اور اس کے حاصل کرنے کو نہایت اہم اور غنیمت جاننا چاہیے اور صبر اصل میں یہ ہے کہ اپنے نفس کو جزع سے روکا جائے اور جزع اس کو کہتے ہیں کہ جب کوئی سخت حالت اور آفت و پریشانی پیش آئے تو اس پر اضطراب و گھبراہٹ کا اظہار کیا جائے اپنے عجز کا رونا رویا جائے۔ اور سختی و پریشانی سے بطریق قطع و حکم گلو خلاصی کا ارادہ کیا جائے۔ لہٰذا ان چیزوں کو ترک کرنا صبر کہلاتا ہے۔ صبر کا وصف حاصل کرنے کا نہایت مفید اور نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی ایسی صورت حال پیش آئے کہ جس کی وجہ سے نفس اضطرب و بے قرار میں مبتلا ہونے لگے۔ اور طبعی طور پر رنج و اذیت محسوس ہو تو یہ سوچنا چاہیے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوا ہے وہ ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا، اس کی وجہ سے جزع و فزع کرنا اور رونا، دھونا، شکوہ و شکایت کرنا ایک قطعی لاحاصل چیز ہے کہ ان باتوں سے اس صورت حال میں کوئی تغیر تبدل، کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کا جو ثواب تلف ہوتا ہے وہ مزید نقصان ہے۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اپنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہیں ایک تو صبر وہ ہے جو نفس کو طاعت و عبادت کی استقامت و پابندی کی محنت و مشقت برداشت کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، دوسرا وہ صبر ہے جو گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت میں اختیار کیا جائے، تیسرا وہ صبر ہے جو دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں سے قطع تعلق کر لینے کی صورت میں اختیار کیا جائے اور چوتھا صبر وہ ہے جو کسی دینی و دنیاوی آفت و مصیبت اور سختی و پریشانی کو برداشت کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص صبر کی ان چاروں قسموں کو اختیار کر لے وہ طاعت عبادت کی راہ پر سکون و استقامت کے ساتھ گامزن رہے گا، گناہوں سے محفوظ مامون

رہے گا، دنیا کی آفات و بلیات سے سلامتی اور آخرت کے عذاب سے نجات پائے گا، علاوہ ازیں بہت زیادہ اجر وثواب سے نوازا جائے گا اور جو شخص مذکورہ بالا صورتوں میں صبر کو اختیار نہیں کرے گا اور جزع وفزع کی راہ پکڑے گا وہ تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اول تو وہ دل جمع اور اطمینان وسکون کے ساتھ عبادت نہیں کرسکے گا اور کچھ اگر کرے گا بھی تو بے صبر کے گناہ اس کو کالعدم کردیں گے۔

توکل اختیار کرنے والوں کی فضیلت

حدیث؛

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یدخل الجنة من أمتي سبعون ألفا بغیر حساب هم الذین لا یسترقون ولا یتطیرون وعلی ربهم یتوکلون متفق علیه (متفق علیه)

ترجمہ؛

حضرت ابن عباس (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ میری امت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگون بد نہیں لیتے ہیں اور (اپنے تمام امور میں جن کا تعلق خواہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے ہو یا اس کو چھوڑنے سے) صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح؛

ستر ہزار کی تعداد سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو مستقل بالذات بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے اس تعداد میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو ان ستر ہزار لوگوں کے متبعین کی حیثیت سے ان

کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی ہے تاکہ یہ روایت اس روایت
کے منافی نہ رہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بے حساب جنت میں جانے والے ان لوگوں میں
ہر ایک کے ساتھ ان کے ستر ستر ہزار متبعین بھی ہوں گے۔" منتر نہیں کراتے" میں منتر سے مراد
یا تو مطلق جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا وغیرہ ہے۔ یا اس سے وہ منتر اور ٹونا ٹوٹکا مراد ہے جو کلمات
قرآنیہ، ادعیہ ماثورہ اور اسماء الٰہی کے بغیر ہوں۔ اسی طرح "شگون بد" نہیں لیتے سے مراد یہ ہے
کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی طرح پرندوں کے اڑ جانے اور آواز وغیرہ سن کر ان سے شگون بد
نہیں لیتے ہیں بلکہ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اللھم لا طیر الا طیرك ولا خیر الا خیرك
ولا الہ غیرك اللھم لا یاتی بالحسنات الا انت ولا یذھب بالسیئات الا
انت۔ صاحب نہایہ نے کہا ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف اولیائے کاملین کی خصوصیات میں سے
ہیں کہ وہ پاک نفس لوگ دنیا کے اسباب و وسائل اور ان کے متعلقات سے بے اعتنائی برتتے
ہیں اور دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی بھی چیز کی طرف مائل و ملتفت نہیں ہوتے اور یہی درجہ ہے
جو خواص کے لیے مخصوص ہے اور اس درجہ تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی لیکن جہاں تک ان
عوام کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ حلال اسباب و ذرائع کو اختیار
کریں اور دوا وغیرہ کے ذریعہ علاج معالجہ کرائیں البتہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنی
ہے کہ جو شخص کسی بیماری وغیرہ کی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ اس پر صبر کرے پھر دعا کے ذریعہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشائش و راحت کا منتظر و متمنی رہے تو یقیناً وہ شخص اولیاء و خواص میں سے
شمار ہونے کا مستحق ہوگا اور جو شخص اس پر صبر کرنے پر قادر نہ ہو اور وہ اس بیماری و مصیبت سے
گلو خلاصی پانے کے ظاہری اسباب و ذرائع اختیار کرنا چاہیے تو اس کو اس بات کی اجازت دے

دی جائے گی کہ وہ دعا تعویذ اور دوا وغیرہ کے ذریعہ اپنی اس بیماری و مصیبت کے دفعیہ کی سعی کرے۔ حاصل یہ کہ جو شخص اپنی طبع حالت و کیفیات اور بطنی حیثیت کے اعتبار سے جس طرح کا ہوگا اس کے حق میں اس کے مطابق فیصلہ ہوگا اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے عنہ نے ایک موقعہ پر اپنا تمام مال و اسباب اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پیش کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی اس پیش کش کو رد نہیں کیا کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابوبکر (رض) کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں یقین و صبر کا وصف بدرجہ کمال موجود ہے اس کے برخلاف جب ایک اور شخص نے کبوتر کے انڈے کے برابر سونا لا کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پیش کیا ہے اور کہا کہ میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے یہ جو کچھ بھی ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے آپ کی نذر کرتا ہوں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہ صرف یہ کہ اس سونے کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اس پر سخت ناراض ہوئے یہاں تک کہ اس کو ایک دھپ بھی مارا۔ یہاں تک ملا علی قاری کے منقولات کا ماحصل نقل کیا گیا۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حدیث میں منتر کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے زمانہ جاہلیت کے ٹونے ٹوٹکے اور مشرکانہ منتر مراد ہیں جن کا کتاب وسنت کی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور جن کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قطعا روا نہیں رکھا تھا کیونکہ ان منتروں کی ساخت اور ان کے الفاظ و معانی کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کو اختیار کرنے والا شرک میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بات کہ منتر سے زمانہ جاہلیت کے منتر مراد ہیں حدیث کے الفاظ لایتطیرون سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تطیر یعنی بدفالی

لینا زمانہ جاہیت کے اہل عرب کا خاص معمول تھا۔ پس جس طرح زمانہ جاہلیت کی دیگر مشرکانہ رسوم وعادات سے اجتناب ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اسی طرح تطیر یعنی بدفالی لینے سے بھی قطعی پرہیز کرنا نہایت لازم ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کے بہت سے مسلمان بھی بر بناء جہل ونادانی بدفالی لینے کی برائی میں مبتلا ہیں باوجود یکہ زمانہ جاہلیت کی ایک مشرکانہ عادت رہی ہے اور اگر اس بات سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو اس سے اجتناب کی ایک بڑی معقول وجہ یہ بھی ہے کہ بدفالی نہ لینے والے کو بڑی فضیلت کا حامل قرار دیا گیا ہے بایں طور کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو بغیر حساب جنت میں شامل کئے جائیں گے، نیز اس سے اجتناب ایک ایسا وصف بھی ہے جس کو توکل کے درجات میں سے شمار کیا جاسکتا ہے۔ اوراس سے بالا تر درجہ وہ ہے جو ہر طرح کے علاج معالجہ جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے اور دیگر تدابیر کو کلیۃ ترک کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کا مقصد حقیقی توکل کے مقام کو ثابت وظاہر کرنا ہوتا ہے چنانچہ توکل کا متعارف مفہوم بھی یہ بیان کیا جاتا ہے اور اسی لیے صوفیہ نے توکل کی وضاحت یہی کی ہے کہ توکل کا مطلب ہے حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتماد وبھروسہ کر کے سبب کسب وعمل اور اسباب ووسائل کو مطلق ترک کردینا۔ یہ دوسرا یا اوسط درجہ ہے۔ جو خواص کا مرتبہ مانا جاتا ہے اس مرتبہ کے لوگ اس اجر وفضیلت کے مستحق قرار پاتے ہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے بلکہ مزید برآں ایک اور عظیم الشان سعادت کی بشارت دی گئی ہے کہ آیت (للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ) اس کے بعد تیسرا درجہ وہ ہے جو اس مقام کے منتہی اور مقربین بارگاہ الٰہی کے لیے مخصوص ہے اس درجہ کے لوگوں کی ظاہری نظر میں اسباب وذرائع کلیۃ ساقط ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں، وہ اگر اسباب وذرائع کو کسی حد تک

اختیار بھی کرتے ہیں تو محض اظہار عبودیت اور مشیت الٰہی کی فرمان برداری کے طور پر اور اس حیثیت سے ان کا اسباب و ذرائع کو اختیار کرنا ان کے حق میں عزیمت (اولویت) کا حکم رکھتا ہے یہ مرتبہ اخص الخواص کا مرتبہ کہلاتا ہے اور وہ انبیاء و اولیاء ہیں کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے فانی اور اللہ کے ساتھ باقی ہیں اور توکل کا یہی سب سے آخری مرتبہ بھی ہے اور اس کی اصل حقیقت بھی، نیز جو بندگان خاص اس مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں، ان کی فضیلت سب سے زیادہ اور ان کا اجر سب سے بڑا ہوتا ہے۔ مذکورہ مسئلے میں عالمگیری نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ کسی نقصان و ضرر اور تکلیف کو دور کرنے والے اسباب و ذرائع تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ کہ جن کا موثر ہونا یقینی ہوتا ہے جیسا کہ پانی پیاس کو اور کھانا بھوک کو دور کرتا ہے دوسرے وہ اسباب جو ظنی ہوتے ہیں جیسے فصد کھلوانا، پچھنے لگوانا، مسہل لینا اور طب کے دوسرے قواعد و ضوابط کہ مثلاً گرمی سے پیدا ہونے والے امراض میں ٹھنڈی دواؤں کے ذریعہ اور ٹھنڈ سے پیدا ہونے والے امراض میں گرم دواؤں کے ذریعہ علاج معالجہ کرنا اور یہ چیزیں طبی نقطہ نظر سے ظاہری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں اور تیسرے وہ اسباب کہ جو موہوم ذریعہ ہوتے ہیں جیسے جسم کو داغنا، دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا اور تعویذ گنڈا وغیرہ۔ پس جو اسباب و ذرائع یقینی درجہ رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا نہ صرف یہ کہ توکل کے لیے شرط نہیں ہے بلکہ اس صورت میں شرعی نقطہ نظر سے بھی حرام ہے جب کہ ان کو ترک کرنے کی وجہ سے موت کے واقع ہو جانے کا خوف ہو، اس کے برخلاف جہاں تک ان اسباب و ذرائع کا تعلق ہے جو موہوم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا ہی توکل کی شرط ہے کیونکہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے اسباب و ذرائع کو ترک کرنے والوں کو "متوکلین" کے زمرہ میں شمار فرمایا ہے، رہی ان اسباب و ذرائع کی بات جو ظنی ہیں اور جو

اطباء وحکماء کے نزدیک ظاہری اسباب کا درجہ رکھتے ہیں تو ان کو اختیار کرنا یعنی طبی اصول وقواعد کے تحت علاج کرانا توکل کے منافی نہیں ہے۔ اس طرح ظنی اسباب، موہوم اسباب کی طرح تو توکل کے خلاف نہیں ہے اور ان کو ترک کرنا یقینی اسباب کو ترک کرنے کی طرح ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض احوال میں اور بعض اشخاص کے حق میں ان کو ترک کرنا افضل ہو جاتا ہے۔ پس یہ ظنی اسباب گویا دو درجوں کے درمیان ایک معتدل درجہ ہے۔

تمام تر نفع ونقصان پہنچانے والا اللہ ہے

حدیث:

وعن ابن عباس قال کنت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما فقال یاغلام احفظ اللہ یحفظك احفظ اللہ تجدہ تجاهك وإذا سألت فاسأل اللہ وإذا استعنت فاستعن باللہ واعلم أن الأمة لو اجتمعت علی أن ینفعوك بشیء لم ینفعوك إلا بشیء قد کتبه اللہ لك ولو اجتمعوا علی أن یضروك بشیء لم یضروك إلا بشیء قد کتبه اللہ علیك رفعت الأقلام وجفت الصحف رواہ أحمد والترمذی.

ترجمہ:

حضرت ابن عباس (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن سفر کے دوران میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سواری پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا لڑکے! اللہ تعالیٰ کے تمام احکام امر ونہی کا خیال رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا خیال رکھے گا اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمان برداری کرتے ہوئے ان چیزوں پر عمل کرو گے جن پر عمل کرنے کا اس نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے اجتناب کرو گے جن سے اجتناب کرنے کا اس نے حکم دیا۔ نیز تم ہر وقت اور ہر معاملہ میں اسی کی رضا و

خوشنودی کے طالب رہو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہارا خیال رکھے بایں طور کہ تمہیں دنیا میں بھی ہر طرح کی آفات اور مصیبتوں سے بچائے گا اور آخرت میں بھی ہر عذاب وسختی سے محفوظ رکھے گا، جیسا کہ فرمایا گیا ہے (ومن کان للہ کان اللہ لہ) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے حق کا خیال رکھو گے تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ پاؤ گے یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کو ہر لمحہ یاد رکھو گے، اس کے نظام قدرت میں غور وفکر کرو گے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو گے تو تم اس کی بے پایاں رحمتوں اور اس کے انعامات کو اپنے سامنے پاؤ گے) جب تم سوال کا ارادہ کرو تو صرف اللہ تعالیٰ کے آگے دست سوال دراز کرو، جب تم (دنیا وآخرت کے کسی بھی معاملہ) میں مدد چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ اور یہ جان لو کہ۔ اگر تمام مخلوق کہ خواہ عوام ہوں یا خواص، انبیاء ہوں یا اولیاء اور ائمہ دین ہوں یا سلاطین دنیا مل کر بھی تمہیں نفع پہنچانا چاہیں (یعنی اگر بفرض محال یہ ساری مخلوق اس بات پر اتفاق کرلے کہ وہ سب مل کر تمہیں کسی دنیاوی یا اخروی معاملہ میں کوئی فائدہ پہنچا دے تو ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچا سکے گی، علاوہ صرف اس چیز کے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اور اگر دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی تمہیں کسی طرح کا کوئی نقصان وضرر پہنچانا چاہیں تو وہ ہرگز تمہیں کوئی نقصان وضرر نہیں پہنچا سکیں گے علاوہ صرف اس چیز کے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے، قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔ (احمد، ترمذی)

"تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پاؤ گے" کے معنی ایک یہ کہ جس کی طرف ترجمہ میں بھی بین القوسین اشارہ کیا گیا ہے، بعض حضرت کے مطابق یہ ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی

یعنی اس کی عبادت وطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبداری پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہو گے تو تمہیں اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے گا اور تمہارے ساتھ معاملات میں مدد اور مشکل کشائی کرے گا اور تمہارے مقاصد عزائم میں کامیابی عطا فرمائے گا (یا یہ کہ اس صورت میں تم اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کو اپنے سامنے پاؤ گے کہ وہ تمہارے تمام معاملات میں تمہاری رعایت کرتے گا اور طرح طرح سے تمہاری مدد و اعانت کرے گا۔ ایک مطلب، جو بہت اونچے مقام کا ضامن ہے، یہ ہے کہ جب تم حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی، اس کی اطات عبادت کی پابندی اور اس کی رضاو خوشنودی کی طلب میں مشغول و مستغرق رہو گے تو اس وقت تمہاری نگاہ معرفت اس کو اپنے سامنے اس طرح پالے گی کہ گویا وہ تمہارے سامنے موجود ہے اور تم مقام احسان اور کمال ایمان کے درمیان اس کا مشاہدہ کر رہے ہو اور بالکل ایسا محسوس کرو گے، جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو بایں حیثیت کہ اللہ کے سوا ہر چیز تمہاری نظر کے سامنے سے بالکل معدوم اور فنا ہو جائے گی، پس اس طرح تمہیں مراقبہ کی کیفیت بھی حاصل ہوگی اور مقام مشاہدہ بھی نصیب ہوگا۔" صرف اللہ کے آگے سوادست دراز کرو" کیونکہ عطاء وبخشش کے تمام خزانے اسی کے پاس اور اسی کے دست قدرت میں ہیں اور دنیا و آخرت کی ہر وہ نعمت و راحت جو بندہ کو پہنچتی ہے اور ہر وہ بلا و سزا جس سے بندہ محفوظ رہتا ہے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پہنچتی ہے یا دفع ہوتی ہے، پھر اس کی رحمت، صرف رحمت ہے نہ کہ اس میں کسی غرض کی آمیزش ہے اور نہ کسی علت و سبب کا دخل، نیز وہ جواد مطلق اور ایسا غنی ہے کہ نہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی ہے اور نہ وہ کبھی محتاج ہوتا ہے لہٰذا صرف وہی ذات اس لائق ہے کہ اپنی ہر امید اس سے وابستہ کی جائے اس کے عذاب کے علاوہ اور کسی سے خوف نہ کھایا جائے، اپنی ہر مشکل میں اور ہر مہم میں صرف اسی کے حضور مدد

کی التجا کی جائے اور تمام معاملات میں صرف اسی پر اعتماد کیا جائے۔اسی لیے حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم دیا کہ جو کچھ بھی مانگنا ہو صرف اللہ سے مانگو،اس کے علاوہ کسی اور کے آگے دست سوال دراز نہ کرو، کیونکہ کوئی اور دینے یا نہ دینے اور نفع پہنچانے یا نقصان دور کرنے پر قادر ہی نہیں ہے، جو ذات خود اپنے کو نفع پہنچانے، یا اپنے نقصان کو دور کرنے اور اپنی موت وحیات کی مالک نہیں ہے وہ کسی دوسرے کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے اور کیا نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔اسی طرح مذکورہ حکم میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اپنی کسی بھی حالت میں اور کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باز نہیں رہنا چاہیے کیونکہ ایک حدیث میں وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اس پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوتا ہے،علاوہ ازیں اپنے خالق کے آگے پھیلانا درحقیقت اس کے حضور اپنی عاجزی وبے کسی اور محتاجگی کا اظہار کرنا ہے جو عبودیت کی شان ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ وابناء آدم حینی لسأل یغضب اللہ تعالیٰ تو اس وقت خفا ہوتا ہے جب تم اس سے سوال نہ کرو اور آدم کے بیٹے اس وقت خفا ہوتے ہیں جب کہ کوئی ان سے سوال کرے۔" اور اگر تمام مخلوق مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے الخ۔کا مطلب یہ ہے کہ ہر نفع نقصان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانو اور ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہی نفع پہنچانے والا بھی ہے اور نقصان پہنچانے والا بھی ہے اور نقصان پہنچانے والا بھی اور وہی دینے والا ہے اور وہی نہ دینے والا بھی کسی ایک فرد بشر کا تو سوال ہی کیا ہے، اگر تمام روئے زمین کی ساری مخلوق مل کر بھی اللہ کی مرضی وحکم کے خلاف کسی شخص کو کوئی نفع یا کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس شخص کو وہ نفع یا نقصان پہنچ جائے۔الہیات کی بعض کتابوں میں بیان

کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔قسم ہے اپنی عزت و جلال کی یقیناً میں اس شخص سے انقطاع کرلیتا ہوں جو میرے علاوہ کسی اور سے اپنی امید وابستہ کرتا ہے اور لوگوں کی نظر میں اس ذلت کی پوشاک پہنا دیتا ہوں یعنی لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل و خوار کر دیتا ہوں، اس کو اپنے قرب سے محروم کر دیتا ہوں اور اپنے وصل سے دور کر دیتا ہوں پس یقین بات یہ ہے کہ میں اس کو حیرانی و پریشانی اور تفکرات کے اندھیروں میں پھینک دیتا ہوں کیا وہ شخص اپنی مشکلات اور پریشانیوں کے وقت میرے علاوہ کسی اور سے امید رکھتا ہے جب کہ پریشانیاں اور مشکلات میرے ہاتھ میں ہیں؟ میں الحی القیوم ہوں وہ شخص فکر و پریشانی کے عالم میں دوسروں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتا پھرتا ہے، جب کہ تمام دروازوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور دروازے بند ہیں؟ میرا دروازہ ہر اس شخص کے لیے کھلا ہوا ہے جو میری طرف آئے اور مجھ سے دعا مانگے۔"قلم اٹھا کر رکھ دیئے ہیں" سے مراد یہ ہے کہ جو احکام صادر ہوتے تھے سب لکھے جا چکے ہیں۔اسی طرح"''اور صحیفے خشک ہو گئے" سے مراد یہ ہے کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اور جس کے حق میں جو کچھ پیش آنا ہے وہ سب تقدیر کی کتاب میں لکھا جا چکا ہے اور وہ کتاب خشک ہو چکی ہے کہ اب اس پر قلم نہیں چلے گی اور جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اس کے بعد اب کچھ نہیں لکھا جائے گا۔حاصل یہ کہ اس دنیا میں جو بھی آتا ہے اور قیامت تک جو بھی آئے گا اس کی تقدیر و قسمت کے فیصلے لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں اور اس کام سے فراغت بھی ہو چکی ہے کہ اب کسی کے حق میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔پس ہر شخص کی تقدیر و قسمت کے بہت پہلے لکھے جانے"قلم اٹھا کر رکھ دینے اور صحیفوں کے خشک ہو جانے" سے تعبیر کیا ہے اور اس میں مشابہت کا پہلو یہ ہے کہ جس طرح کوئی کاتب جب کتاب کو مکمل لکھ کر فارغ ہو جاتا ہے تو قلم اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور

کتاب کو بند کر دیتا ہے اسی طرح کاتب تقدیر بہت پہلے ہی مخلوق کی تقدیریں لکھ کر فارغ ہو چکا ہے اور وہ صحیفہ کہ جس میں تقدیریں لکھی ہوئی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لپیٹ دیا گیا ہے، اس میں کوئی تغیر وتبدل اور کوئی کمی پیشی ممکن نہ رہے اس کتاب کی ابتداء میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس سے فرمایا کہ لکھو قلم نے کہا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا تقدیر لکھو۔ چنانچہ قلم نے وہ سب کچھ لکھا جو اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور جو قیامت تک وقوع پذیر ہوگا۔ اگر یہاں یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ روایت (کہ قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے) قرآن کریم کی اس آیت (یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ) 13۔ الرعد: 39) کے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محو و اثبات بھی دراصل انہی چیزوں میں سے ہے جو مقدر ہو چکی ہیں اور جن کو لکھنے کے بعد قلم رکھ دیئے گئے اور یہ صحیفے خشک ہو گئے کیونکہ قضا (یعنی وہ کلی احکام و فیصلے جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے صادر فرما دیئے تھے) کی دو قسمیں ہیں ایک تو قضائے مبرم (کہ جو اٹل ہے اور جس میں کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں) اور دوسرے قضائے معلق (کہ جو اٹل نہیں ہے اور جس میں تغیر وتبدل ممکن ہے) علاوہ ازیں اس محو و اثبات کا تعلق لوح محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے، یعنی یہ پہلے ہی سے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی کہ فلاں چیز کو اس طرح مٹایا یا باقی رکھا جائے گا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے پس اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ کی محو و اثبات کی نسبت کر کے بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت مقدر امور میں نہ تغیر کہلائے گا نہ تبدل۔ بہرحال اس ارشاد گرامی میں یہ ترغیب ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کرے رضائے مولیٰ پر راضی رہے اور اپنی تدبیر وسعی اور ذاتی قوت و طاقت کو حقیقی موثر ہرگز نہ جانے کیونکہ پیش آنے والی کوئی بھی چیز کہ خواہ وہ سعادت ومسرت ہو یا شقاوت وکلفت،

تنگی وسختی ہو یا فراخی ووسعت، خوشحالی ہو یا بدحالی، نفع ہو یا نقصان اور موت ہو یا حیات، ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم وفیصلہ سے باہر اور اس قضاو قدر الٰہی کے مطابق نہ ہو جس کو کاتب تقدیر نے زمین وآسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا ہے اور جس چیز کا وقوع پذیر ہونا لکھا جا چکا ہے وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہے گی اس کو نہ انسانی حرکت وسکون کا نظام روک سکتا ہے اور نہ تدبیر وسعی، پس خواہ خوشی کی حالت پیش آئے یا ضرر و تکلیف کی، بہر صورت شکر ادا کرنا لازم ہے نیز اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ بندہ اپنے دشمن ومخالف، اپنی تکلیف ومصیبت اور ضرر ونقصان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت کا اسی صورت میں مستحق ہوتا ہے جب کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے پیش آنے والے رنج والم پر صبر کرے اور کسی بھی حالت میں اپنی تقدیر وحالت کا شکوہ نہ کرے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) نے اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں بڑی اچھی بات لکھی ہے ہر مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ قرار دے اور اپنی تمام حرکات وسکنات میں اس کے مطابق عمل کرے، تاکہ دنیا وآخرت میں سالم ومحفوظ رہے اور دونوں جہان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب عزت وسرفرازی سے نوازا جائے بعض روایات میں ان الفاظ تجدہ تجاہک کے بعد یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے۔ تعرف الی اللہ فی الرخاء یعرفك فی الشدائد فان استطعت ان تعمل للہ بالرضاء فی الیقین فافعل فان لم تستطع فان فی الصبر علی ما تکرہ خیرا کثیرا واعلم ان النصر مع الصبر والفرج مع الکرب وان مع العسر یسرا ولن یغلب عسر یسرین یعنی خوشحالی وشادمانی کی حالت میں نعمت شناسی اور طاعت حق کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو پہچانو یعنی اس کی یاد سے غافل نہ

ہواور اس کی شکر گزاری کرتے رہو۔ اگر ایسا کروگے تو اس کے بدلہ میں یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہیں تنگی وسختی کی حالت میں پہنچائے گا، یعنی وہ تمہیں اس تنگی وسختی سے نمٹنے کی طاقت وقوت، اس سے گلو خلاصی کا راستہ اور حاجت براری کی نعمت عطا فرمائے گا (پس اگر تم یقین کے مرتبہ پر رضا وخوشی کے ساتھ اللہ کی خاطر کوئی کام کرسکتے ہو تو اس کام کو یقیناً کرو کیونکہ بلاشبہ بہت بڑا کام ہے اور اگر تم کوئی ایسا کام نہ کرسکو اور نعمت کی شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کرسکو تو جانو کہ آفات ومصائب میں خواہ تنگی وسختی ہو یا وسعت وخوشحالی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی چیز پیش آتی ہے وہ یقیناً نعمت ہی ہوتی ہے اور خواہ ظاہر خواہ باطن کے اعتبار سے اس کے لطف کرم ہی کی ضامن ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کرسکے تو پیش آنے والی تنگی وسخیت پر صبر کرنا چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک بڑی فضیلت رکھتا ہے اور جان لو کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ اطاعت حق اور ترک معصیت پر صابر اور ثابت قدم رہے اور وسعت وکشادگی دراصل رنج والم کے ساتھ ہے یعنی ہر تنگی وسختی کے بعد وسعت وکشادگی آتی ہے اور رنج وغم کے بعد راحت وشادمانی کا دروازہ کھلتا ہے اور بیشک عسرت وسختی کے ساتھ خوش حالی وآسانی بھی ہے یعنی جب کسی آدمی پر سختی وتنگی آتی ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ خوش حالی وآسانی بھی عطا فرماتا ہے اور ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں ہوسکتی یعنی اگر انسان کسی تنگی وسختی میں مبتلا ہو تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ اس کے عوض دو آسانیاں پائے گا ایک تو اسی دنیا میں کہ اللہ تعالیٰ ہر سختی کے بعد آسانی پیدا کرتا ہے اور دوسری آسانی آخرت میں بصورت اجر وثواب حاصل ہوگی جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ سے ثابت ہے جب کہ وہ دنیا میں تنگی وسختی اور مصائب وآلام میں مبتلا ہوئے اور انھوں نے صبر وعزیمت کے ساتھ ان

سخت حالات کو برداشت کیا تو اس کے بعد ان کو پہلے تو اس دنیا میں قدرتی مدد و نصرت کے ذریعہ فتح و کامرانی اور عزت و حشمت اور ترفہ و خوشحالی کی نعمت ملی اور پھر انھیں آخرت میں وہاں جنت کی قیمتی راحتیں، بلند مراتب و درجات اور دیدار مولیٰ کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی۔

ریاکاری کا بیان:

"ریاء" رویت سے مشتق ہے اور صراح میں لکھا ہے کہ ریاء کے معنی ہیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں اچھا بنا کر پیش کرنا۔ اور عین العلم میں لکھا ہے کہ ریاء کا مطلب یہ ہے اپنی عبادت و نی کی کا سکہ جمانا اور اس کے ذریعہ لوگوں کی نظر میں اپنی قدر و منزلت چاہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاء کا تعلق خاص طور پر ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو عبادت و نی کی کے ظاہری عمل کہلاتے ہیں اور جو چیزیں کہ از قسم عبادت نہ ہوں جیسے کثرت مال و متاع، علم و ذہانت کی فراوانی، اشعار وغیرہ کا یاد رکھنا اور نشانہ بازی کی مہارت وغیرہ تو ان میں دکھاوے کے لیے کئے جانے والے کام کو ریاء نہیں کہا جاتا بلکہ وہ افتخار و تکبر (ناز و گھمنڈ) کی ایک قسم کہلاتا ہے اسی طرح نیکی و عبادت کے ظاہری اعمال میں بھی اگر کوئی کام اس صورت میں لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا جائے جب کہ اس کا مقصد عزت و جاہ کی طلب نہ ہو، جیسا کہ بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تلقین و تعلیم، لوگوں کے دلوں کو نیک اعمال کی طرف مائل کرنے اور ان کو اتباع و پیروی کی طرف راغب کرنے کے لیے بعض اعمال اس طرح کرتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں تو یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ریا نہیں کہلائے گا اگرچہ ظاہر میں ان کا وہ عمل ریاء کاری معلوم ہو اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ ریاء الصدیقین خیر من اخلاص المریدین یعنی اونچے درجہ کے مشائخ اور بزرگوں کا ریاء مریدین کے اخلاص یعنی عدم ریاء کاری سے بہتر ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ریاء اصل میں اس چیز

کا نام ہے کہ کسی شخص کی ذات میں واقعتہً کوئی صفت وکمال ہو اور وہ اپنے اس واقعی وصف و کمال پر لوگوں کے سامنے نمایاں کرے اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ اس کے اس وصف وکمال کو جانیں تا کہ ان کی نظر میں قدر ومنزلت اور عزت ووقعت حاصل ہو۔ پس جو شخص کسی ایسے وصف و کمال کو اپنی طرف منسوب کر کے لوگوں پر ظاہر کرے کہ جو واقعتہ اس کی ذات میں نہیں ہے تو اس کو ریاء نہیں بلکہ خالص کذب اور منافقت کہا جائے گا اسی پر قیاس کر کے یہ کہا گیا ہے کہ غیب اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے اس کا وہ عیب بیان کیا جائے تو واقعتا اس کی ذات میں موجود ہو اور اگر اس کی طرف منسوب کر کے کوئی ایسا عیب بیان کیا جائے جو حقیقت کے اعتبار سے اس کی ذات میں نہیں ہے تو اس کو افتراء اور بہتان کہیں گے۔

ریا کی قسمیں:

ریاء کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں اور ان اقسام میں سب سے زیادہ بری اور نہایت قابل نفریں وہ قسم ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قصد اور حصول ثواب کا ارادہ قطعانہ ہو بلکہ واحد مقصد لوگوں کو دکھانا اور ان کی نظر میں قدر ومنزلت حاصل کرنا، جیسا کہ خالص ریاء کار بلکہ دھوکا باز لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں تو نماز پڑھتے ہیں اور مختلف قسم کے اوراد ووظائف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو نہ نماز سے سروکار رکھتے ہیں اور نہ اوراد وظائف سے بلکہ ان بدنصیبوں کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نماز میں بغیر پاکی اور وضو کے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں ریاء کاری کی یہ قسم ارذل ترین اور اللہ تعالیٰ کے سخت غضب وقہر کے نازل ہونے کا باعث ہے اور اس صورت میں کیا جانے والا کوئی بھی عمل قطعی باطل ہوتا ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے اگر وہ عمل فرض ہو تو اس کا کرنا فرض

کے ادا ہو جانے کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ اس کی قضا واجب ہوگی دوسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کرنے میں دونوں چیزیں ہوں یعنی ارادہ ثواب بھی اور ریاء کاری بھی (دکھانے کی نیت) لیکن ریا کا پہلو غالب ہو اور ارادہ ثواب کا پہلو ضعیف ہو، بایں حیثیت کہ اگر اس عمل کو کرنے والا تنہائی میں ہوتا تو اس عمل کو نہ کرتا اور اس کا قصد اس عمل کے صدور کا باعث نہ ہوتا اور اگر بالفرض اس عمل کا ثواب کوئی نہ ہوتا تو بھی محض ریاء کاری کا جذبہ ہی اس عمل کو اختیار کرنے کا باعث بن جاتا، اس قسم کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی قسم کا ہے۔ تیسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں دونوں چیزیں یعنی ریاء کاری کا جذبہ اور حصول ثواب کا ارادہ برابر ہوں، بایں حیثیت کہ اگر بالفرض وہ عمل ان دونوں چیزوں میں سے بھی ایک چیز سے خالی ہوتا تو اس کو اختیار کرنے کا کوئی داعیہ پیدا نہ ہوتا بلکہ اس عمل کی طرف رغبت اسی صورت میں ہوتی جب کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پائی جاتی۔ اس قسم کے بارے میں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نفع نقصان، دونوں برابر ہوں، لیکن احادیث و آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قسم بھی مذموم اور اس صورت میں کیا جانے والا عمل بھی ناقابل قبول ہوتا ہے اور چوتھی قسم وہ صورت ہے کہ جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں، ثواب کی نیت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ، راجح اور غالب ہو اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم نہ تو محض باطل ہے اور نہ اس میں کوئی نقصان ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس صورت میں اختیار کیا جانے والا عمل نیت و ارادہ کے اعتبار سے ثواب اور عتاب دونوں کا یکساں طور پر باعث ہوتا ہے کہ ارادہ و نیت میں جس قدر اخلاص یا عدم اخلاص ہوگا اسی کے مطابق ثواب یا عتاب ہوگا، نیز اس صورت میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ قصد عمل میں ریاء کاری کی

جو آمیزش ہے (جو اگر چہ ثواب کے ارادہ ونیت سے کمتر اور ضعیف ہے) وہ کب پیدا ہوئی ہے ؟اگر ریاء کاری کی آمیزش ابتداء عمل میں ہوئی ہے تو یہ صورت زیادہ بری کہلائے گی اور اگر عمل کے درمیان پیدا ہوئی ہے تو یہ صورت پہلی صورت سے کم برائی کی حامل ہوگی اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد آئی ہے تو یہ صورت دوسرے صورت سے بھی کم تر قرار دی جائے گی اور اس کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا عمل باطل نہیں کہلائے گا۔علاوہ ازیں ایک فرق یہ بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ ریاء کاری کا وہ جذبہ اگر پختہ قصد وعزم کی صورت میں نمودار ہوا ہے تو اس میں زیادہ برائی ہوگی اور اگر محض ایک خیال کی صورت میں پیدا ہو اور اس خیال ہی کی حد تک محدود رہا، آگے کچھ نہ ہوا تو یہ صورت حال یقیناً زیادہ نقصان دہ نہیں کہلائے گی۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ" ریاء" ایک ایسا جذبہ ہے جس سے پوری طرح خلاصی نہایت دشوار ہے اور ہر حالت میں حقیقی اخلاص کا پایا جانا بہت مشکل، اسی لیے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہونا ریاء کے پائے جانے کی علامت ہے، اسی طرح تنہائی میں کوئی عمل کرتے وقت بھی دل میں ریاء کا خیال آجائے تو وہ بھی ریاء ہی کہلائے گا۔اللہ اس سے اپنی پناہ میں رکھے اور بہر صورت اخلاص عطا فرمائے کہ اس کی مدد وتوفیق کے بغیر اس دولت کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔علماء نے ایک خاص صورت وحالت اور بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کوئی نیک کام کرے اور کسی عبادت وطاعت میں مصروف ہو اور لوگ اس کو وہ نیک کام اور عبادت وطاعت کرتا ہوا دیکھ لیں تو اس کو چاہیے کہ اس وقت اپنے اندر اس وقت اس بات پر خوشی ومسرت کے جذبات پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور لطف وعنایت سے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی اور لوگوں کی نظر باعزت بنانے کا یہ سبب پیدا فرمایا کہ گناہوں اور

عیوب کی تو پردہ پوشی فرمائی اور نیک اعمال واخلاق کو آشکارا فرمایا اور ان جذبات مسرت کے ساتھ یہ نیت وقصد رکھے کہ اگر میرے نیک عمل کے اظہار سے دین وطاعات کا چرچہ ہوتا ہے تو لوگ دین کی طرف راغب ہوں گے اور ان کے اندر بھی نیک اعمال کو اختیار کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔

غیر مخلصانہ عمل کی کوئی اہمیت نہیں

حدیث:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله تعالى أنا أغنى الشركاء عن الشرك من عمل عملا أشرك فيه معي غيري تركته وشركه وفي رواية فأنا منه بريء هو للذي عمله.

رواه مسلم. (متفق عليه)

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک کے تئیں تمام شرکاء سے نہایت زیادہ بے نیاز ہوں، (یعنی دنیا کا دستور ہے کہ لوگ اپنے معاملات اور کاروبار میں ایک دوسرے کے اشتراک وتعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں، نیز وہ اس شرکت وتعاون پر راضی ومطمئن بھی ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے درمیان اس درجہ کی مفاہمت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شریک متعلقہ معاملات وکاروبار میں اپنا پورا عمل دخل رکھتا ہے، لیکن میرا معاملہ بالکل جداگانہ ہے کہ میں علی الاطلاق خالق وحاکم ہوں اپنے احکام وفیصلے اور اپنے نظام قدرت میں نہ تو مجھے کسی کے تعاون واشتراک کی حاجت وضرورت ہے اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ

میرے بندے کسی کو میرا شریک قرار دیں اور میرے لیے کئے جانے والے کسی بھی عمل میں میرے علاوہ کسی اور کو مدنظر رکھیں۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک ان کے صرف اسی عمل کا اعتبار ہے جو وہ خالص طور پر میرے لیے کریں۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ذکر شرکاء کے ضمن میں کرنا یعنی اللہ اپنے کو ایک شریک کے ذریعہ تعبیر کرنا محض ان بندوں کے اعتبار سے ہے جو اپنے جہل اور اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی ذات وصفات اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے اور اس طرح وہ اللہ کو بھی ایک "شریک" کا درجہ دیتے ہیں نعوذ باللہ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات سے اپنی بے نیازی اور ناخوشی کا اعلان فرمایا کہ کسی کو اس کا شریک قرار دیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ) جو شخص میری طاعت وعبادت کے طور پر کوئی ایسا عمل کرے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرے تو میں اس شخص کو شرک کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ترکتہ وشرکہ کے بجائے یہ الفاظ ہیں فانا منہ بری ہوللذی عملہ یعنی جو شخص میری عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو میں اس سے اپنی بے نیازی و بیزاری ظاہر کرتا ہوں، وہ شخص یا اس کا وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے وہ عمل کیا ہے۔ (مسلم)

اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خالص ریاء کاری کے جذبہ سے کیا جانے والا عمل تو باطل ہو ہی جاتا ہے لیکن اس عمل کا بھی کوئی فوت ہوجاتا ہے جس میں ریاء کی آمیزش اور اس کا دخل ہوجائے۔ لیکن علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اس عمل کے بارے میں ہوگا جو ریاء کی ان دو قسموں سے تعلق رکھے کہ یا تو اس عمل کو اختیار کرنے میں سرے سے ثواب کی نیت

ہی نہ ہو یا ثواب کی نیت تو ہو مگر ریاء کا قصد اس نیت پر غالب ہو اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد اللہ کے لیے کئے جانے والے کسی بھی عمل کو ریا کی آمیزش اور اس کے دخل سے پاک رکھنے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا اور اس کے امر سے لاپرواہی اختیار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ تنبیہ و سرزنش کرنا ہے۔

ریاکار دین داروں کے بارے میں وعید

حدیث:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج في آخر الزمان رجال يختلون الدنيا بالدين يلبسون للناس جلود الضأن من اللين ألسنتهم أحلى من السكر وقلوبهم قلوب الذئاب يقول الله أبي يغترون أم علي يجترؤون؟ فبي حلفت لأبعثن على أولئك منهم فتنة تدع الحليم فيهم حيران. رواه الترمذي.

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ (میں تمہیں بتاتا ہوں) کہ اخیر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو دین کے نام پر دنیا کے طلب گار ہوں گے (یعنی دینی و اخروی اعمال کے ذریعہ دنیا کمائیں گے از راہ تملق و چاپلوسی اور اظہار تواضع لوگوں پر اثر ڈالنے کے لیے دنبوں کی کھال کا لباس پہنیں گے (تاکہ لوگ انھیں عابد و زاہد، دنیاوی نعمتوں سے بے پروا اور آخرت کے طلبگار سمجھ کر ان کے مرید و معتقد ہوں) ان کی زبانیں تو شکر سے زیادہ شیریں ہوں گی لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی طرح ہوں گے (یعنی ان کی باتیں تو بڑی خوشگوار من پسند اور نرمی و ملائمت سے بھرپور ہوں گی اور ان کی تقریر و

گفتگو سن کر لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہمدرد و بہی خواہ اور غم خوار دوست ہیں اور ان کے دل میں دین و ملت کا بہت درد ہے، لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ اپنے ذاتی اغراض و منافع کے لیے دوستی و دشمنی کرنے اور اہل تقویٰ اور دین و ملت کے حقیقی خدمت گاروں کو نقصان و تکلیف پہنچانے اور دیگر بہیمانہ و حیوانی خصلتوں میں ان کے دل بھیڑیے کے دل کی طرح سخت اور شقی ہوں گے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے فرماتا ہے۔ کیا یہ لوگ میری طرف سے مہلت دیئے جانے اور میرے ڈھیل دینے کے سبب سے مغرور ہو گئے ہیں اور فریب میں مبتلا ہیں (یعنی کیا یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں ان کا معین و مددگار ہوں اور اس دنیا میں جو کامرانیاں اور کامیابیاں نصیب ہیں وہ ان پر میری رحمت کے نازل ہونے کی بنا پر ہیں؟ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم اس قسم کے لوگوں کو اسی طرح ڈھیل دیا کرتے ہیں یا اس جگہ" اغترا" سے مراد اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا اور اپنے افعال بد سے توبہ نہ کرنا ہے اس صورت میں" یختر ون" کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ میرے غضب اور میرے عذاب سے نہیں ڈرتے اور کیا ان میں اتنی جرات ہوگی ہے کہ اعمال صالح کے ذریعہ اور دین کے نام پر لوگوں کو دھوکا دے کر گویا میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان لوگوں پر انھیں میں سے فتنہ و بلا مسلط کر دوں گا (یعنی انھیں لوگوں میں سے ایسے امراء و حکام اور ایسے افراد و گروہ متعین کر دوں گا جو ان کو آفات و مصائب اور طرح طرح کے نقصان و ضرر میں مبتلا کر دیں گے۔ اور وہ آفات مصائب بڑے سے بڑے دانشور عقلمند شخص کو بھی ان آفات مصائب کو دور کرنے، ان پر آشوب حالات سے گلو خلاصی پانے اور ان کے سلسلے میں کسی مناسب و موزوں اقدام و کاروائی کرنے سے" عاجز و حیران کر دیں گے"۔ (ترمذی)

تشریح:

یختلون (خاء کے جزم اور تاء کے زیر کے ساتھ) کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان اعمال کے ذریعہ کہ جو آخرت کے لیے کئے جاتے ہیں، دنیا حاصل کریں گے۔ یا یہ کہ وہ لوگ دین کے بدلہ میں دنیا کمائیں گے اور دینی واخروی مفاد و مصالح پر دنیاوی اور مادی مفاد و منافع کو ترجیح دیں گے۔ اور زیادہ صحیح معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ دین کا لبادہ اوڑھ کر دنیا والوں کو دھوکا دیں گے، بایں طور کہ وہ دنیا کمانے کی خاطر اپنی ظاہری وضع قطع اور اپنے ظاہری اعمال واخلاق کا ایسا دلفریب مظاہرہ کریں گے کہ دنیا والے ان کو سچا عابد زاہد اور دین وملت کا مخلص ہی خواہ سمجھ کر ان کے ساتھ عقیدت ومحبت رکھیں گے اور سادہ لوح مسلمان ان کے مرید و معتقد بن کر ان کی مراد پوری کریں گے۔ مثلاً وہ نماز، روزہ اور دیگر عبادات کے پابند نظر آئیں گے اور اوراد وظائف ذکر و شغل کی محفلیں سجائیں گے اپنے ارد گرد زہد وتقویٰ کی دیواریں کھڑی کئے نظر آئیں گے، موٹے جھوٹے کپڑوں کا لباس پہنیں گے۔ دینداروں کی سی شکل وصورت بنائیں گے ان کی تحریر وتقریر، دین وآخرت کی تلقین وتعلیم موعظت ونصیحت کی باتوں، ملت کی بھی خواہی مسلمانوں کے مفاد اور باہمی ہمدردی وغمگساری سے پر نظر آئے گی، لیکن یہ تمام چیزیں صدق و اخلاص سے خالی ریا وسمعہ کے طور پر ہوں گی، جن کا واحد مقصد مسلمانوں کو بیوقوف بنا کر دنیا سمیٹنا اور صرف ذاتی منافع حاصل کرنا ہوگا۔ پس ایسے لوگوں کی اس ریاء کارانہ زندگی کے خلاف یہ خدائی تنبیہ بیان فرمائی گئی کہ انھیں اس گھمنڈ میں ہرگز نہ رہنا چاہیے کہ ان کی یہ دھوکا کی ٹٹی ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور وہ اپنی اس ریاء کارانہ زندگی کی سزا اسی دنیا میں نہیں بھگتیں گے۔ اللہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کو ضرور مزا چکھاؤنگا، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ میرا غضب وقہر ان پر یقیناً

نازل ہوگا، میں ان پر ایسے امراء وحکام مسلط کردوں گا اور انھیں میں سے کچھ ایسے لوگ اور گروہ کھڑے کردوں گا، جو ان کی ناؤ کو آفات ومصائب، ذلت وخواری اور تباہی و بربادی کے بھنور میں ڈال دیں گے ان کی ریاء کارانہ زندگی کا پردہ چاک کریں گے اور ان کو ایسے ایسے فتنوں میں مبتلا کریں کہ وہ نجات کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے، وہ اپنی اس خود ساختہ شان وشوکت، عزت وعظمت اور جاہ ومنصب کو بچانے کے لیے جس قدر ہاتھ پاؤں ماریں گے اسی قدر ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کے حلقے ان کے گرد تنگ ہوتے جائیں گے اور بڑے بڑے دانشور، عقلمند لوگ بھی ان آفات ومصائب سے گلو خلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں نکال پائیں گے۔

میانہ روی کی فضیلت

حدیث:

وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن لكل شيء شرة ولكل شرة فترة فإن صاحبها سدد وقارب فارجوه وإن أشير إليه بالأصابع فلا تعدوه. رواه الترمذي

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ ہر چیز کے لیے حرص وزیادتی ہے اور پھر حرص وزیادتی کے لیے سستی وسب کی ہے۔ پس اگر عمل کرنے والے نے میانہ روی سے کام لیا اور اعتدال کے قریب رہا اور اس نے افراط وتفریط سے اجتناب کیا تو اس کے بارے میں امید رکھو کہ وہ اپنی مراد پالے گا اور اگر اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا گیا (یعنی اس نے طاعت وعبادت اور اوراد وظائف کی مشغولیت اور دنیاوی نعمتوں ولذتوں میں اجتناب میں اس لیے مبالغہ وکثرت کو اختیار کیا کہ لوگوں میں عابد وزاہد مشہور

ہو اور پھر وہ لوگوں میں عابد و زاہد مشہور بھی ہوگیا) تو تم اس کو عابد و زاہد اور صالح شمار نہ کرو کیونکہ درحقیقت وہ ریاء کاروں میں سے ہے۔ (ترمذی)

......

تشریح:

شرۃ کے معنی ہیں نشاط رغبت اور حرص میں مبتلا ہونا یہاں حدیث میں اس لفظ سے مراد کسی چیز میں افراط اور کسی کام میں حد سے زیادہ انہماک ہے اور" فترۃ" کے معنی ہیں سستی و کمزوری اور کمی۔ مطلب یہ ہے کہ جو عابد ابتداء طاعت و عبادت اوراد وظائف وغیرہ میں حد سے زیادہ مشغول و منہمک رہتا ہے وہ بعد میں سست و کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی طاعت و عبادت وغیرہ کم ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اصولی انداز میں زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کوئی انسان جب کسی چیز کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور کوئی کام کرتا ہے تو شروع میں بہت زیادہ استغراق انہماک دکھاتا ہے اور اس قدر ذوق و شوق بلکہ حرص و لالچ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر محنت و مشقت اور اپنی طاقت و ہمت سے زیادہ مشغولیت اختیار کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں جلد ہی سست و کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنے مقصد کی راہ میں تھکن و بے دلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عابد و زاہد اپنے اعمال و اشغال میں میانہ روی اختیار کرے اور افراط و تفریط کی راہ سے بچ کر اعتدال کی راہ پر کہ جس کو صراط مستقیم کہا جاتا ہے گامزن رہے تو اس کے بارے میں بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو کامل طور پر مراد پانے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ افراط کی راہ پر چلا اور اس نے عبادت و طاعت اور دینی اعمال و اشغال میں اس حد تک غور کیا اور اپنی بے دینی زندگی کو اس طرح نمایاں کیا کہ وہ عابد و زاہد مشہور ہوگیا اور لوگ اس کی عبادت گزاری اور زہد و تقوی کی طرف اشارہ کرنے

لگے تواس کی طرف کوئی التفات نہیں کرنا چاہیے اوراس کو نیک وصالح نہ سمجھنا چاہیے۔واضح رہے کہ لفظ فارجوہ (اس کے بارے میں امید رکھو) اور لفظ ولا تعدوا اس کو عابد وزاہد شمار نہ کرو کے ذریعہ ان دونوں قسم کے لوگوں کی عافیت کی طرف ایک مبہم اشارہ مقصود ہے کیونکہ کسی شخص کے اخروی انجام کا حقیقی علم بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہوسکتا ہے اس کے بارے میں کوئی انسان آخری فیصلہ نہیں کرسکتا لہٰذا مذکورہ الفاظ کے ذریعہ یہ حدیث صرف یہ بتانا چاہتی ہے کہ جو شخص میانہ روی کا راستہ اختیار کرتا ہے صحیح عمل کرتا ہے اور راہ راست سے بھٹکتا نہیں تو بظاہر اس کے بارے میں یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس کی عاقبت سدھر گئی اور وہ نجات پاجائے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ افراط وتفریط کی راہ پر چل کر دنیاوی عزت وجاہ کا طلبگار ہوتا ہے اور گندم نما جوفروشی کا شیوہ اپنا کر فتنہ وفساد کے بیج بوتا ہے تو ظاہر میں اس کو فلاح یاب نہ سمجھو اور اس کا شمار مخلص دینداروں میں نہ کرو۔رہی عاقبت کی بات تو وہاں کا انجام دونوں صورتوں میں غیر واضح ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ خاتمہ کس حالت میں ہو اور آخرت میں کیا معاملہ ہوگا حکم مستوری ومستی ہمہ برخاتمہ است کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گزرد اگرچہ عاقبت کے بارے میں بھی امید یہی رکھنی چاہیے کہ رحمت باری نے جس جس شخص کو اطاعت وعبادت کی توفیق بخشی ہے اور راہ مستقیم پر گامزن کیا ہے اس کی عاقبت ضرور سنورے گی اور اس کا خاتمہ یقیناً ایمان واخلاص پر ہوگا اس کی رحمت کاملہ کا ستور یہی ہے کہ نیکوکاروں کو بری راہ پر کم ہی لگایا جاسکتا ہے جب کہ اکثر یہی ہوتا کہ بدکاروں کو بالآخر نیکی کی طرف کھینچ لیا جاتا ہے۔

فسق وفجور کی کثرت پوری قوم کے لیے موجب ہلاکت ہے

حدیث؛

وعن زينب بنت جحش أن رسول الله صلى الله عليه وسلم دخل يوما فزعا يقول لا إله إلا الله ويل للعرب من شر قد اقترب فتح اليوم من ردم يأجوج ومأجوج مثل هذه وحلق بأصبعيه الإبهام والتي تليها . قالت زينب فقلت يا رسول الله أفنهلك وفينا الصالحون؟ قال نعم إذا كثر الخبث. متفق عليه.

ترجمہ؛

حضرت زینب بنت جحش (رض) سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ہاں ایسی حالت میں تشریف لائے کہ جیسے بہت گھبرائے ہوئے ہیں پھر فرمانے لگے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود عبادت کے لائق نہیں۔ افسوس صد افسوس عرب کے اس شر وفتنہ پر جو اپنی ہلاکت آفرینی کے ساتھ قریب آپہنچا ہے۔ آج یاجوج ماجوج کی دیوار میں اس قدر سوراخ ہوگیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انگوٹھے اور برابر والی انگلی کے ذریعہ حلقہ بنایا، حضرت زینب (رض) کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان صالح وپاکباز لوگ موجود ہوں گے؟ کیا ہمارے درمیان اللہ کے نیک بندوں کے وجود کی برکت ان فتنوں کے پھیلنے اور آفات وبلاؤں کے نازل ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں تمہارے درمیان علماء اور بزرگارن دین کی موجودگی کے باوجود تمہیں ہلاکت و تباہی میں مبتلا کیا جائے گا جب کہ فسق وفجور کی کثرت ہوگی (یعنی جب معاشرہ میں برائیاں بہت

پھیل جائیں گی اور ہر طرف فسق وفجور کا دور دورہ ہوگا تو ان برائیوں اور فسق وفجور کے سبب نازل ہونے والے فتنہ وآلام اور آفات کو صلحاء اور بزرگوں کی موجودگی اور ان کی برکت بھی نہیں روک سکے گی۔ (بخاری ومسلم)

......

تشریح:

"شر" سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مراد اس فتنہ وفساد اور قتل وقتال کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جس کی ابتداء مستقبل میں ہونے والی تھی اور جس کا شکار سب سے پہلے اہل عرب بننے والے تھے، چنانچہ قلب نبوت نے اہل اسلام کو افتراق و انتشار میں مبتلا کرنے والے جن واقعات کا بہت پہلے ادراک کرلیا تھا اور مذکورہ ارشاد کے ذریعہ گویا ان کے بارے میں پیش گوئی فرمادی تھی ان کی ابتداء خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان (رض) کے سانحہ شہادت سے ہوئی اور جن کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب اہل عرب کو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سبب دشمنوں کے مقابلہ پر فتوح حاصل ہوں گی، دوسرے ملکوں پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور مال و دولت کی ریل پیل ہوگی تو اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے خلوص وللہیت میں کمی آجائے گی، حکومت واقتدار اور مال وزر سے رغبت ومحبت پیدا ہوجائے گی، دنیا طلبی وجاہ پسندی اور خود غرضی کا عفریت باہمی مخالفت ومخاصمت اور افتراق وانتشار کے ذریعہ پوری ملت کو متاثر کردے گا۔" حلقہ بنایا" یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی انگلیوں کے ذریعہ حلقہ بنا کر دکھایا کہ اس دیوار میں آج تک کبھی کوئی سوراخ نہیں ہوا تھا لیکن آج اس میں اتنا بڑا سوراخ ہوگیا ہے جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے ذریعہ بنایا گیا حلقہ ہے۔

واضح رہے کہ اس دیوار میں سوراخ کا ہوجانا قربِ قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح کہ عرب اور اہل عرب میں فتنہ وفساد کا بیج پڑ جانا اور برائیوں کے پھیل جانا بھی قیامت کے قریب آجانے کی ایک دلیل ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یاجوج ماجوج کی دیوار میں سوارخ ہوجانے کی بات کہہ کر گویا اس علاقہ سے اٹھنے والے ایک عظیم فتنہ اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پہنچنے والے سخت نقصان کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ تاریخ کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ چنگیزیت کی صورت میں اسی علاقہ سے اٹھا اور جس نے بڑی بڑی اسلامی حکومتوں کو نقصان پہنچایا یہاں تک کہ ہلاکو خان کی سربراہی میں تاتاری ترکوں کے سیلاب نے اسلامی خلافت کو بہا ڈالا، خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کیا بغداد کو لوٹ کر تباہ وتاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور پوری ملت اسلامیہ کو بڑی بڑی جہادوں سے دوچار کیا۔ لفظ "خبث" خ اور ب کے زبر کے ساتھ فسق وفجور اور کفر شرک کے معنی میں ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی بدکاری زنا کے ہیں حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی جگہ آگ لگتی ہے بھڑک اٹھتی ہے تو پھر وہ ہر ایک چیز کو جلا ڈالتی ہے کیا خشک اور کیا تر، ہر ایک کو بھسم کر دیتی ہے۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک جو بھی چیز اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آتی ہے جل کر خاک ہوجاتی ہے، مومن اور کافر، موافق اور مخالف کسی کے درمیان فرق نہیں کرتی، جو شخص بھی اس کی زد میں آجاتا ہے راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے اسی طرح عذاب الٰہی کا معاملہ ہے کہ جب کسی ملک میں، کسی علاقہ میں اور روئے زمین کے کسی حصہ پر برائیوں کا دور دورہ ہوجاتا ہے، بدکاریاں عام ہوجاتی ہیں فواحش کی کثرت ہوجاتی ہے اور فسق وفجور کا غلبہ ہوجاتا ہے اور اس کے

سبب وہاں کے لوگوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے تو پھر کسی کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی، بدکار اور سرکش لوگ تو تباہ و برباد ہوتے ہیں نیکوکار و پاکباز لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ جب قیامت میں ساری مخلوق کو دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اس وقت ہر شخص کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق ہی سلوک ہوگا۔ ایک نسخے میں لفظ خ کے پیش اور ب کے جزم کے ساتھ یعنی خبث منقول ہے جس کے معنی فواحش اور فسوق کے ہیں، ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

موت اور قبر کو یاد رکھو

حدیث:

وعن أبي سعيد قال خرج النبي صلى الله عليه وسلم لصلاة فرأى الناس كأنهم يكتشرون قال أما إنكم لو أكثرتم ذكر هادم اللذات لشغلكم عما أرى الموت فأكثروا ذكر هادم اللذات الموت فإنه لا يأت على القبر يوم إلا تكلم فيقول أنا بيت الغربة وأنا بيت الوحدة وأنا بيت التراب وأنا بيت الدود وإذا دفن العبد المؤمن قال له القبر مرحبا وأهلا أما إن كنت لأحب من يمشي على ظهري إلى فإذ وليتك اليوم وصرت إلى فسترى صنيعي بك. قال فيتسع له مد بصره ويفتح له باب إلى الجنة وإذا دفن العبد الفاجر أو الكافر قال له القبر لا مرحبا ولا أهلا أما إن كنت لأبغض من يمشي على ظهري إلى فإذ وليتك اليوم وصرت إلى فسترى صنيعي بك قال فيلتئم عليه حتى يختلف أضلاعه. قال وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم بأصابعه. فأدخل بعضها في جوف بعض. قال ويقيض له سبعون تنينا لو أن واحدا منها نفخ في الأرض ما أنبتت شيئا ما بقيت الدنيا فينهسنه ويخدشنه حتى يفضى به إلى الحساب قال وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما القبر روضة من رياض الجنة أو حفرة من حفر النار. رواه الترمذي.

حضرت ابوسعید (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کے لیے مسجد شریف تشریف لائے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا کہ گویا لوگ آپس میں کسی بات پر ہنس رہے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔ خبردار تم پر کونسی غفلت طاری ہے کہ اس طرح بے فکری کے ساتھ ہنسنے میں مشغول ہو اگر تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز کا اکثر ذکر کرتے رہو تو وہ تم کو اس چیز یعنی زیادہ ہنسنے اور غافل لوگوں کی طرح کے کلام و گفتگو سے باز رکھے جس کو میں دیکھ رہا ہوں اور وہ یعنی لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز موت ہے پس تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ قبر پر ایسا کوئی دن (یعنی ایسا کوئی وقت اور زمانہ نہیں گزرتا جس میں وہ زبان قال یا زبان حال سے یہ نہ کہتی ہو کہ میں غربت کا گھر ہوں (یعنی میں ایک ایسی دور دراز اور ویران وسنان جگہ کی طرح ہوں جہاں جو بھی آجاتا ہے وہ اپنے عزیز و اقارب اپنے متعلقین اور اپنے گھر والوں سے ناقابل عبور مسافت کی دوری پر جا پڑتا ہے۔ لہذا اے انسان تجھ کو لازم ہے کہ تو دنیا میں اس طرح رہ جس طرح کوئی مسافر اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں سے دور مسافرت کی حالت میں ہوتا ہے۔ میں تنہائی کا گھر ہوں (یعنی ایک ایسا گھر ہوں جس میں تنہائی اور وحشت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، ہاں جو لوگ اللہ رب العزت کی وحدانیت کا نور لے کر آتے ہیں وہ بیشک تنہائی محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہی نوران کا رفیق و دمساز بن جاتا ہے) میں خاک کا گھر ہوں (یعنی میں اس مٹی کا گھروندہ ہوں جو ہر جاندار کی اصل اور بنیاد ہے پس جس کی اصل اور جس کا مرجع مٹی ہو اس کی شان یہی ہے کہ مسکین و خاک نشین رہے، تا کہ مٹی کے ساتھ اس کی مناسبت ہر وقت ہر

وقت تازہ رہے) میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں (پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا) جب کسی مومن بندے کو دفن کیا جاتا ہے تو جس طرح کہ کوئی خوش اخلاق میزبان اپنے کسی عزیز مہمان کی آمد کے وقت کلمات ترحیب کے ذریعے اس کا استقبال کرتا ہے اسی طرح قبر بھی اس بندہ مومن کا استقبال کرتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ خوش آمدید تم ایک اچھی کشادہ آرام کی جگہ اور اپنے ہی مکان میں آئے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے زیادہ پیارے تھے جو مجھ پر چلتے ہیں پس آج جب کہ میں تم پر حاکم وقادر بنائی گئی ہوں اور تم میرے مجبور ومقہور ہوئے ہو تو تم عنقریب میرے اس نیک سلوک کو دیکھو گے۔ جو میں تمہارے ساتھ کروں گی یعنی میں تمہارے لیے کشادہ وفراخ ہو جاؤں گی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس کے بعد وہ قبر اس بندے کے لے کشادہ وفراخ ہو جاتی ہے اور وہ کشادگی وفراخی اس کو اپنی حد نظر تک معلوم ہوتی ہے اور پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے (جس میں سے وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھتا رہتا ہے اسی دروازے سے گزر کر اس تک ٹھنڈی اور مشکبار ہوائیں آتی ہیں اور وہ جنت کے مکانات، حوریں، نہریں میوے اور درخت اور دوسری روح افزا نعمتیں دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے اور جب کوئی بندہ فاسق یا کافر دفن کیا جاتا ہے تو جس طرح کوئی شخص اپنے یہاں آئے ہوئے ناآشنا وغیرہ عزیز اور بن بلائے مہمان کے ساتھ بے رخی اور بے مروتی کا برتا کرتا ہے اسی طرح قبر بھی اس کافر کو جھڑکتی ہے اور کہتی ہے کہ نہ تو تیرا آنا مبارک اور نہ تو اچھی کشادہ آرام کی جگہ اور اپنے مکان میں آیا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا جو مجھ پر چلتے ہیں پس آج جب کہ میں تجھ پر حاکم وقادر بنائی گئی ہوں اور تو میرا مجبور ومقہور ہوا ہے تو

جلد ہی دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اور پھر قبر اس کو دباتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں۔ ابو سعید (رض) کہتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان پسلیوں کی صورت حال دکھانے کے لیے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا اور بتایا کہ اس طرح قبر کے دبانے کی وجہ سے اس کافر کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اس کافر پر ستر اژدھا مسلط کر دیئے جاتے ہیں اور وہ ایسے اژدھا ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اژدہا بھی زمین پر پھنکار مار دے تو وہ زمین جب تک کہ دنیا باقی ہے سبزہ اگانے کے قابل نہ رہے، وہ اژدھا اس کافر کو کاٹتے اور نوچتے ہیں۔ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اس بندہ کو قیامت کے دن حساب کے لیے نہ لے جایا جائے۔ حضرت ابوسعید (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا اس میں کوئی شک نہیں کہ قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ (ترمذی)

تشریح:

لذت کو فنا کر دینے والی چیز کو بہت یاد کیا کرو" یہ درحقیقت غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کے لیے ایک بڑی اور موثر نصیحت ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ موت کو یاد کرنا غافل کے دل کو زندہ کرتا ہے، حضرت شیخ عارف باللہ مولانا نورالدین علی متقی (رح) کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک تھیلی نما چیز بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے جس پر" موت" کا لفظ لکھا ہوا ہوتا تھا، جب کوئی شخص ان کا مرید ہوتا تو وہ اس تھیلی کو اس مرید کی گردن میں لٹکا دیتے تھے تا کہ اس کے دل پر

ہر وقت یہ احساس طاری رہے کہ موت بالکل قریب ہے، دور نہیں ہے۔ حضرت شیخ (رح) گویا اس طریقہ سے سالکین طریقت کی تربیت فرماتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی وقت غافل نہ ہوں اور بیداری کے ساتھ طاعت وعبادت اور ذکر اللہ میں لگے رہیں۔ اسی طرح ایک بہت نیک اور اللہ ترس بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے اعیان سلطنت میں سے کسی ایک کو اس خدمت پر مامور رکھتے تھے کہ وہ ہر وقت ان کے پیچھے کھڑا رہے اور الموت الموت کہتا رہے تاکہ دل کو اللہ کی طرف سے غافل ہونے کا موقع ہی نہ ملے اور ہر طرح کی روحانی بیماری کا علاج ہوتا رہے۔ فانہ لم یات الخ کے ذریعے گویا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حکم کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا چاہیے" اور میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں" یعنی میں ایک ایسا مکان ہوں جس میں آنے والا انسان کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن جاتا ہے، پس اے انسان، تیرے لیے یہ بات کیسے مناسب ہوسکتی ہے کہ تو کھانے پینے کی چیزوں کو لذت اور عمدگی کو جو یا ہو اور تیری خواہش وارادہ ایک ایسے جسم کو اعلیٰ قسم کے طعام ومشروبات کے ذریعے بنانے اور لذت پہنچانے میں منہمک ہو جس کو آخر کار فنا ہو جانا ہے اور حقیر کیڑے مکوڑے کی خوراک بننا ہے ہاں جو چیز یہاں تیرے لیے فائدہ مند ہوسکتی ہے وہ صرف نیک عمل ہے، اگر اچھے اعمال کا سرمایہ لے کر میری آغوش میں آئے گا تو یقیناً تجھے فائدہ پہنچے گا۔ اسی وجہ سے قبر کو اعمال کا صندوق کہا گیا ہے۔ بعض حضرات نے حجر میں پیدا ہونے والے کیڑوں کے بارے میں یہ تحقیق بیان کی ہے کہ جب جسم میں سڑاند پیدا ہوتی ہے تو اس سڑاند اور بدبو سے کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور اس جسم کو کھا کھا کر زندہ رہتے ہیں، پھر جب وہاں ہڈیوں کے ڈھانچہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا تو وہ کیڑے آپس میں ایک دوسرے کو کھانا شروع

کر دیتے ہیں یہاں تک کہ آخر میں ایک کیڑا باقی رہ جاتا ہے اور پھر وہ بھی بھوک کی وجہ سے مر جاتا ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ قبروں میں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے اور زمین کے کھانے سے انبیاء، شہداء اور اولیاء کے اجسام محفوظ رہتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے۔حدیث (ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء) اور شہداء کے حق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آیت (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم) رہی بات ان علماء باعمل کی جن کو اولیاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو جب شہداء کو یہ فضیلت حاصل ہے تو ان علماء کو بدرجہ اولیٰ حاصل ہوگی کیونکہ ان کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند شہداء کے خون سے افضل ہے۔" بندہ فاسق" سے فسق وفجور میں اکمل ترین فرد، یعنی کافر مراد ہے۔اس کا قرینہ مقابلہ کا لفظ مومن ہے۔نیز ایک قرینہ اس کے حق میں قبر کا یہ کہنا بھی ہے کہ تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا جو مجھ پر چلتے ہیں۔اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں فاسق سے کافر مراد لیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے آیت (اَفَمَن ٭ ان مُؤمِناً ٭ مَن ٭ انَ فَاسِقاً) 32۔السجدہ 18 :) علاوہ ازیں یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ قرآن وحدیث کا اسلوب اور معمول بھی یہی ہے کہ برزخ وآخرت کے بارے میں جب کوئی حکم وفیصلہ بیان کیا جاتا ہے تو اس کے دو ہی فریق ہوتے ہیں ایک تو مومن اور دوسرا کافر جہاں تک فاسق مومن کا تعلق ہے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے اور یہ سکوت اختیار کرنا یا تو اس کی پردہ پوشی کے نقطہ نظر سے ہوتا ہے یا اس لیے کہ اس کو خوف ورجا کے درمیان رکھا جائے نہ کہ اس کا مقصد اس کو دونوں مرتبوں یعنی کفر وایمان کے درمیان ایک الگ تیسرے مرتبہ پر رکھنا ہے جیسا کہ معتزلہ نے غلط گمان کیا ہے۔" اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں" میں" ستر" کا عدد

یا تو تحدید کے لیے ہے کہ اس متعین تعداد میں اژدھے اس پر مسلط کئے جاتے ہیں یا اس عدد سے کثرت مراد ہے جس کا مقصد اس مفہوم کو ادا کرنا ہے کہ اس پر بہت زیادہ اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں۔ایک دوسری روایت سے اس دوسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے جو کہ قبر میں کافر پر عذاب کئے جانے کے سلسلے میں منقول ہے اور جس میں فرمایا گیا ہے کہ کافر پر اس کی قبر میں ایک کم سو اژدھے مسلط ہوں گے۔

مختلف زمانوں کے بارے میں پیشن گوئی؛

حدیث؛

وعن أبي عبيدة ومعاذ بن جبل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إن هذا الأمر بدأ نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم كان جبرية وعتوا وفسادا في الأرض يستحلون الحرير والفروج والخمور يرزقون على ذلك وينصرون حتى يلقوا الله رواه البيهقي في شعب الإيمان. (حسن)

ترجمہ؛

حضرت عبیدہ بن جراح اور حضرت معاذ بن جبل (رض) جو دونوں اونچے درجہ کے صحابہ میں سے ہیں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ امر (یعنی دین اسلام) نبوت و رحمت کے ساتھ ظاہر ہوا (یعنی دین اسلام سب سے پہلے جس زمانہ میں ظاہر ہوا وہ زمانہ نزول وحی اور رحمت و نورانیت کا زمانہ ہے) پھر اس دین اسلام کا جو زمانہ آئے گے وہ خلاف و رحمت کا زمانہ ہوگا، پھر اس دین اسلام کا جو زمانہ آئے گا وہ کاٹ کھانے والی بادشاہت کا زمانہ ہوگا اور پھر اس دین کا جو زمانہ آئے گا وہ ظلم و جور،

قہر وتکبر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا۔اس وقت لوگ ریشمی کپڑوں کو جائز جان کر استعمال کریں گے،عورتوں کی شرمگاہوں کو اور شراب کی تمام انواع واقسام کو حلال قرار دیں گے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ان کو رزق دیا جائے گا اور کفار اور ان کے مخالفین کے مقابلہ پر ان کی مدد کی جائے گی یہاں تک وہ روز جزا اللہ تعالیٰ سے جا ملیں گے (یعنی لوگ اگرچہ اتنی سخت بدعملیوں اور اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہوں گے اور اس اعتبار سے وہ عذاب الٰہی کے مستوجب اور ہلاکت وتباہی کے مستحق ہوں گے۔مگر حق تعالیٰ کی اس رحمت کے سبب کہ جو امت مرحومہ کے لیے مخصوص ہے ان کو یہاں عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس میں شاید حق تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہو مثلاً یہ کہ ان سے مخلوق الٰہی کے نظم ونسق اور انتظام مملکت کا وہ کام لیا جانا مقصود ہوگا جس کی اہلیت وصلاحیت وہی رکھیں گے یا یہ کہ اگر وہ لوگ خود فاسق و بدکار ہوں گے لیکن ان کے ہاتھوں دین کی اصلاح و درستی کا کوئی انجام پانا مقدر ہوگا۔اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح:

لفظ" بدا" الف کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں" ظاہر ہوا" اور بعض نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ ہے جس کے معنی شروع ہونے کے ہیں اس صورت میں گویا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ امر یعنی دین اسلام کا ابتدائی زمانہ وحی سے شروع ہوا اور ذات رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت تک باقی رہا۔اس ارشاد گرامی اسلامی تاریخ کے ان ادوار اور زمانوں کے بارے میں پیش گوئی فرمائی گئی ہے جس سے مسلمانوں کا کارواں گزرا یا گزرے گا۔پہلا زمانہ تو وہ ہوگا جس میں دین اسلام کی ابتداء اور اس کا ظہور ہوا ہے اور جو نزول وحی کے

وقت سے شروع ہو کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آخر زندگی تک باقی رہا یہ زمانہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سراسر رحمت ونورانیت اور خیر سعادت کا زمانہ تھا ذات رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی موجودگی کی وجہ سے دین میں کسی رخنہ اندازی، احکام شریعت میں کسی ابہام وتشکیک، مسلمانوں کی نظریاتی وعملی زندگی میں کسی گمراہی وضلالت اور عام حالات میں کسی فتنہ وفساد کے پیدا ہونے کا کوئی خوف تک نہ تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد جو زمانہ آیا وہ خلافت کا زمانہ تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحبت ورفاقت سے فیض اٹھائے ہوئے اور ذات رسالت پناہ کے تربیت یافتہ افراد میں سے سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ باعظمت اور ایمان وعمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل انسان حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نائب وخلیفہ بنے، مسلمانوں کی زمام کاران کے ہاتھوں میں آئی اور وہ دین وملت کے معاملات کے والیونگہبان بنے ان پاک نفس حضرات نے یکے بعد دیگر مسند خلافت پر متمکن رہ کر جتنے دنوں تک مملکت وملت کا نظم ونسق چلایا وہ پورا زمانہ گویا پھر ایک مرتبہ رحمت ونورانیت کا زمانہ رہا کہ خلفاء راشدین اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طور پر مسلمانوں پر سایہ فگن اور خیر وبرکت کے نزول کا باعث بنے رہے اور ان کے زمانہ میں نیکیوں اور بھلائیوں کا دور دورہ رہا مسلمان اخلاص وایثار اور عمل کردار کی پختگی کا نمونہ بنے رہے اور ان کے طفیل میں یہ زمین عام طور پر امن وسکون اور اطمینان وعافیت کا گہوارہ رہی۔ وہ زمانہ کہ جس کو خلافت ورحمت کا زمانہ کہا گیا ہے تیس سال کے شب وروز پر مشتمل تھا ان تیس سالوں میں ساڑھے انتیس سال تو چاروں خلفاء راشدین کے مجموع زمانہ خلافت کے ہیں اور باقی چھ ماہ کا عرصہ وہ ہے جس میں حضرت حسن (رض) مسند خلافت پر متمکن رہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق (رض) حضور (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد ربیع الاول 11ھ میں خلیفہ رسول مقرر ہوئے اور جمادی الثانی 13ھ میں وفات پائی۔ حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے اپنے مرض الموت میں صاحب الرائے مسلمانوں کے مشورہ سے حضرت عمر فاروق (رض) کو اپنا جانشین نامزد فرمادیا تھا، چنانچہ حضرت عمر (رض) نے جمادی الثانی 13ھ میں خلافت کا منصب سنبھالا اور آخر ذی الحجہ 23ھ تک اس منصب پر فائز رہے، 27 ذی الحجہ کو ایک نصرانی غلام ابولؤلؤ (اصل نام فیروز) نے آپ کو نماز فجر کی امامت کی حالت میں خنجر سے حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا تھا جس کی وجہ سے جانبر نہ ہوسکے اور یکم محرم الحرام 24ھ کو فوت ہو کر مدفون ہوئے۔ حضرت عمر (رض) نے اپنے آخری دنوں میں پانچ جلیل القدر اور ممتاز صحابہ حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر بن عوام، حضرت طلحہ، حضرت علی اور حضرت عثمان غنی (رض) کو نامزد فرمادیا تھا کہ یہ حضرات آپس میں مشورہ کر کے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنالیں، چنانچہ ان حضرات نے کافی غوروخوض اور باہمی مشورہ کے بعد حضرت عثمان بن عفان (رض) کو اپنا امیر اور تیسرا خلیفہ منتخب کرلیا۔ حضرت عثمان (رض) کی خلافت محرم 24ھ سے شروع ہوئی اور ذی الحجہ 30ھ تک رہی جب کہ اس ماہ کی 18 تاریخ کو خلافت کے باغیوں اور بلوائیوں کی ایک بڑی جماعت نے آپ کو مکان میں محصور کر کے بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا۔ حضرت عثمان (رض) کی شہادت کے ایک ہفتہ بعد 25 ذی الحجہ 35ھ کو حضرت علی بن ابی طالب (رض) کے ہاتھ پر مدینہ منورہ میں عام بیعت ہوئی اور اس طرح وہ چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے اور رمضان 40ھ کو ان کی خلافت کا دور ختم ہوا جب کہ عبدالرحمن بن ملجم کے زخمی کر دینے کی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔ حضرت علی (رض) کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کے بڑے

صاجزادے حضرت امام حسن (رض) کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی خلافت قائم ہوئی، لیکن حضرت امیر معاویہ (رض) کی طرف سے آویزش جو سلسلہ حضرت علی (رض) کے زمانہ میں شروع ہوا تھا وہ ان کی وفات کے بعد اور زیادہ بڑھ گیا اور جب سیادت و امارت کے مسئلہ پر مسلمانوں میں افتراق و انتشار بڑھنے لگا اور مخالف فریقوں کے درمیان کشت وخون کا خطرہ زیادہ سنگین ہوگیا تو حضرت امام حسن (رض) نے حضرت امیر معاویہ (رض) کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ انھوں نے ربیع الاول 41ھ تک خلافت کی۔ 41ھ تک کا تیس سالہ دور وہ زمانہ ہے جس کو اس حدیث میں خلافت و رحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے اور اس زمانہ میں ان خلفاء راشدین نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نائب وخلیفہ ہونے کی حیثیت سے اخلاص و دیانت اور عدل و انصاف کے ساتھ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسوہ حسنہ کو مشعل راہ بنا کر دین اسلام کی خدمات انجام دیں، مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی قیادت وسیادت کی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا اور اسلام کی عظمت وشوکت کا جھنڈا بلند کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس خلافت کی اس حدیث میں فضیلت بیان کی گئی ہے اور جو واقعتاً ذات رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نیابت تھی اس میں امیر معاویہ (رض) کا کوئی حصہ نہیں ہے کہ ان کا دور حکمرانی اس زمانہ سے الگ ہے۔ جس کو خلافت و رحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے۔ "عض" کے معنی کاٹنے کے ہیں اور "عضوض" (عین کے زبر کے ساتھ) اسی لفظ سے نکلا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے اور ایک روایت میں ملوکا عضوضا (عین کے پیش کے ساتھ) منقول ہے جو عض (عین کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے اور جس کے معنی خبیث، شریر اور بدخلق کے ہیں مطلب یہ ہے کہ خلافت و رحمت کے زمانہ کے بعد جو دور آئے گا وہ ملوکیت بادشاہت کا دور ہوگا

اور ایسے ایسے لوگ ملک کے بادشاہ حکمران اور مسلمانوں کے سردار وحاکم بن بیٹھیں گے جن کے دلوں میں نہ اللہ کا خوف اور مواخذہ آخرت کا ڈر ہوگا اور نہ مخلوق اللہ کے تئیں ہمدردی ومروت اور عدل وانصاف کا احساس ہوگا اس لیے وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے لوگوں پر ظلم وجبر کریں گے ان کو ناحق سزاؤں اور عقوبتوں میں مبتلا کریں گے اور ان کو طرح طرح سے ستائیں گے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ بات غالب واکثریت کے اعتبار سے کہی گئی ہے یعنی اکثر بادشاہ حکمران ایسے ہوں گے اور چونکہ شاذ ونادر پر حکم نہیں لگایا جاتا کہ النادر کالمعدوم اس لیے یہ اشکال پیدا نہیں ہوسکتا کہ حدیث میں خلافت راشدہ کے بعد کے حکمرانوں اور بادشاہوں کے زمانہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے کیا اس کا اطلاق ان حکمرانوں کے رانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو عدل و انصاف، مذہب وملت کی خدمت گزاری اور اللہ ترسی کے اوصاف سے پوری طرح آراستہ تھے ؟ مثال کے طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور حکمرانی ہے، انھوں نے جس عدل وانصا کے ساتھ حکمرانی کی اور ان کا دور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں جس طرح خیر وبھلائی کا باعث بنا اس کی بنیاد پر عمر ثانی کہا گیا ہے حاصل یہ کہ خلاف راشدہ کے بعد جن لوگوں نے مسلمانوں پر حکمرانی کی اور جو لوگ بادشاہ بنے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کا دور حکمرانی مذہب وملت کے حق میں مفید ثابت ہوا اور اپنے عوام کے لیے خیر وبرکت اور راحت واطمینان کا باعث بنے وہ استثنائی حکم رکھتے ہیں۔ ”ظلم وجور، قہر وتکبر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا“ کا مطلب یہ ہے کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اور زیادہ سخت ہوگا، نااہل لوگ تخت حکومت پر بیٹھیں گے، ظلم اور زیادتی اور انتشار وبدامنی کا دور دورہ ہوگا، عالم لوگوں کی جان ومال اور عزت آبرو غیر محفوظ ہوگی ہر طرف لوٹ مار، قتل وغارتگری کا بازار گرم ہوگا اور انسانیت کو تباہ کرنے والی

ہر طرح کی برائیاں روئے زمین پر پھیل جائیں گی ۔ چنانچہ جیسا کہ ہم اپنے زمانہ میں دیکھ رہے ہیں یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے، کیونکہ حکومت و اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو آئین جہانبانی سے ناواقف ہیں، جنہوں نے ظلم و جور کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور مسلم مما لک جہاں مذہب و ملت کے اصولوں کی فرمان برداری ہونی چاہیے وہاں طاغوتی طاقتیں برسر حکومت ہیں ظالم و جابر لوگوں نے زور زبردستی اور مکر و فریب کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کرلیا ہے وہ نہ قیادت و سیادت کے اصول و شرائط کو پورا کرتے ہیں، نہ اپنے عوام کی دینی و دنیاوی بھلائی و بہتری سے انھیں کوئی تعلق ہے وہ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے فتنہ و فساد کے بیج بوتے ہیں تباہ کن سازشیں کرتے ہیں عوام پر نت نئے ظلم ڈھاتے ہیں جو بندگان خاص انھیں راہ راست دکھانا چاہتے ہیں ان کو طرح طرح کی صعوبتوں میں مبتلا کرتے ہیں، کلیدی عہدوں اور مناسب پر اہل و لائق افراد کی بجائے موقع پرست، خود غرض اور نااہل لوگوں کو فائز کرتے ہیں، علماء و صلحاء اور اکابرین دین، جو ہر طرح کی عزت احترام کے مستحق ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی طرف کوئی توجہ و التفات نہیں کی جاتی بلکہ مختلف ذرائع اور اقدامات کے ذریعہ ان کی ہتک کی جاتی ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی پاداش میں ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاتا ہے ۔ اور یہ کہ تقریباً تمام ہی مسلم حکمرانوں نے دین کے دشمنوں کے خلاف تو جہاد کے فریضہ کو ترک کردیا، البتہ اپنی حکمرانی کی خاطر اور ملک گیری کی ہوس میں خود مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنی تلواروں کو ان کے خون سے رنگین کیا۔ اور اسی وجہ سے بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص ان حکمرانوں اور بادشاہوں کو عادل کہے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ غرضیکہ ان حکمرانوں اور بادشاہ کی وجہ سے روئے زمین پر فتنہ و فساد روز افزوں ہوتا

گیا خود غرضی، موقع پرستی، بدانتظامی اور عام بدامنی وانتشار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ تاریخ ایسے حکمرانوں کے سیاہ کارناموں سے شرمسار ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے ان شہروں کو تاراج کرنے اور وہاں کے لوگوں کا قتل عام کا باعث بنے، جہاں بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور مشائخ تھے، جہاں کمزور اور ضعیف لوگ بچے اور عورتیں تھیں اور جن کو قتل کرانے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں تھی، مزید ستم یہ کہ اس شہر کے لوگ ملت حنیفہ سے تعلق رکھتے تھے اور اہل سنت والجماعت میں شامل تھے اور ان کا قتل عام کرنے والے مدعی سلطنت اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ہم دین وشریعت کے حامی ومددگار ہیں اور اہل علم وبزرگان دین کی تعظیم کرتے ہیں۔ علماء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر مسلمان دشمنان دین کے کسی ایسے قلعہ کو فتح کریں جس میں ہزاروں اہل حرب اور دشمنان دین پائے جائیں لیکن ان ہزاروں میں کوئی ایک مجہول الحال ذمی بھی موجود ہو تو محض اس ذمی کی وجہ سے مفتوح قلعہ میں قتل عام کرنا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ مگر وہ حکمران اور بادشاہ حشر کے دن آخر کیا جواب دیں گے جنہوں نے محض اپنے اقتدار اور اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لیے مسلمانوں تک کا قتل عام کرایا ہے اور ان کے شہروں وآبادیوں کو چشم وزدن میں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے نالائق ونااہل مسلم حکمرانوں ہی کی وجہ سے ایسے ایسے فتنہ وفساد رونما ہوئے اسلامی سلطنتوں میں اس قدر تباہیاں آئیں اور اتنا زیادہ کشت وخون ہوا کہ روئے زمین پناہ مانگنے لگی، یہاں تک کہ حرمین شریفین بھی ان فتنہ وفساد سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان مقدس شہروں میں اتنے تباہ کن اور بھیانک واقعات رونما ہوئے کہ قلم کو مجال بیان نہیں اور ان کی تفصیل کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور اپنے دین کا بہترین کارساز اور اپنے نبی (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) اوراس کی امت کا حامی و مددگار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آنے والا ہر سال، بلکہ ہر دن اور بلکہ ہر لمحہ پہلے کی بہ نسبت بد سے بدتر ہی گزر رہا ہے۔

فتنوں کا بیان

جب فتنوں کا ظہور ہو تو گوشہ عافیت تلاش کرو

حدیث؛

وعنه قال كان الناس يسألون رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الخير و كنت أسأله عن الشر مخافة أن يدركني قال قلت يا رسول الله إنا كنا في جاهلية وشر فجاءنا الله بهذا الخير فهل بعد هذا الخير من شر ؟ قال نعم قلت وهل بعد ذلك الشر من خير ؟ قال نعم وفيه دخن. قلت وما دخنه ؟ قال قوم يستنون بغير سنتي ويهدون بغير هديي تعرف منهم وتنكر. قلت فهل بعد ذلك الخير من شر ؟ قال نعم دعاة على أبواب جهنم من أجابهم إليها قذفوه فيها. قلت يا رسول الله صفهم لنا. قال هم من جلدتنا ويتكلمون بألسنتنا. قلت فما تأمرني إن أدركني ذلك ؟ قال تلزم جماعة المسلمين وإمامهم. قلت فإن لم يكن لهم جماعة ولا إمام ؟ قال فاعتزل تلك الفرق كلها ولو أن تعض بأصل شجرة حتى يدركك الموت وأنت على ذلك. متفق عليه. وفي رواية لمسلم قال يكون بعدي أئمة لا يهتدون بهداي ولا يستنون بسنتي وسيقوم فيهم رجال قلوبهم قلوب الشياطين في جثمان إنس. قال حذيفة قلت كيف أصنع يا رسول الله إن أدركت ذلك ؟ قال تسمع وتطيع الأمير وإن ضرب ظهرك وأخذ مالك فاسمع وأطع.

ترجمہ؛

حضرت حذیفہ (رض) کہتے ہیں کہ لوگ تو اکثر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خیر و نفع کی اور بھلائی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شر و برائی

کے بارے میں دریافت کیا کرتا تھا اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں میں کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤ (یعنی دوسرے صحابہ تو عبادت وطاعت کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نیک عمل اور اچھے کام کرسکیں یا یہ کہ وہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے رزق میں وسعت وخوشحالی کی دعا کرتے تھے تاکہ انھیں اطمینان و فراغت حاصل ہو اور اپنی دنیا کو آخرت کی فلاح وکامیابی کا ذریعہ بناسکیں لیکن ان کے برخلاف میرا معمول دوسرا تھا، میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گناہ اور برائیوں کے بارے میں پوچھا کرتا تھا کہ ان سے اجتناب کرسکوں یا یہ کہ ان فتنوں کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہوسکتے ہیں اور جو نہ صرف اخروی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کے برے اثرات دنیاوی خوشحالی اور رزق کی وسعت پر بھی پڑتے ہیں اور پوچھنے کی بناء یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں میں ان فتنوں میں مبتلا نہ ہوجاؤں یا ان کے برے اثرات و اسباب مجھ تک نہ پہنچ جائیں چنانچہ اہل علم سے برائیوں کی واقفیت حاصل کر کے ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا ایک بہترین طریق ہے۔اسی لیے حکماء اور اطبا بلکہ بعض فضلاء نے اس طریق کو بطور اصل اختیار کیا ہے کہ ازالہ مرض سلسلہ میں پرہیز کو ملحوظ رکھنا دوا استعمال کرنے سے زیادہ بہتر ہے نیز کلمہ توحید بھی اسی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ماسوی اللہ کی نفی کی گئی ہے اس کے بعد الوہیت کو ثابت کیا گیا) حضرت حذیفہ (رض) نے بیان کیا کہ اپنی مذکورہ عادت کے مطابق ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ اسلام سے قبل جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے صدقہ میں ہمیں یہ ہدایت بخشی یعنی اسلام کی روشنی عطا فرمائی جس کی وجہ سے کفر ضلالت کے اندھیرے دور ہوگئے اور ہم گمراہیوں اور برائیوں کے جال سے باہر آگئے تو کیا اس

ہدایت وبھلائی کے بعد کوئی اور برائی و بدی پیش آنے والی ہے؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں! (اس بھلائی کے بعد بھی برائی پیش آنے والی ہے)۔ میں نے عرض کیا تو کیا اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہوگا کہ جس کی وجہ سے دین وشریعت کا پھر بول بالا ہوجائے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں! اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہوگا لیکن اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہوگا لیکن اس برائی کے بعد جو بھلائی آئے گی اس میں کدورت ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس بھلائی کی کدورت کیا ہوگی؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ میں نے کدورت کی جو بات کہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو میرے طریقہ اور میری روش کے خلاف طریقہ و روش اختیار کریں گے۔ لوگوں کو میرے بتائے ہوئے راستہ کے خلاف راستہ پر چلائیں گے۔ اور میری سیرت اور میرے کردار کے خلاف سیرت و کردار اپنائیں گے تم ان میں دین دار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔ میں نے عرض کیا، کیا اس بھلائی کے بعد پھر کوئی برائی پیش آئے گی؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مخلوق کو اپنی طرف بلائی گے جو شخص ان کے بلاوے کو قبول کر کے دوزخ کی طرف جانا چاہے گا اس کو وہ دوزخ میں دھکیل دیں گے یعنی جو شخص ان کے بہکاوے میں آ کر ان گمراہیوں میں مبتلا ہوگا جو دوزخ کے عذاب کا مستوجب بناتی ہیں تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ان کے بارے میں وضاحت فرمائیے کہ وہ کون لوگ ہوں گے آیا وہ مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے یا غیر مسلم ہوں گے؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ وہ ہماری قوم، ہمارے ابناء جنس اور ہماری ملت کے لوگوں میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں گفتگو

کریں گے (یعنی وہ لوگ عربی زبان رکھنے والے ہوں گے یا یہ مراد ہے کہ ان کی گفتگو قرآن و حدیث کے حوالوں سے مزین اور پند و نصائح سے آراستہ ہوگی اور بظاہر ان کی زبان پر دین و مذہب کی باتیں ہوں گی مگر ان کے دل نیکی و بھلائی سے خالی ہوں گے) میں نے عرض کیا کہ تو پھر میرے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے (یعنی اگر میں ان لوگوں کا زمانہ پاؤں تو مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ کتاب وسنت پر عمل کرنے والے مسلمانوں کی جماعت کو لازم جاننا اور ان کے امیر کی اطاعت کرنا یعنی اہل سنت کے راستہ کو اختیار کرنا اور اہل سنت کا جو امام و مقتدا ہو اس کی اطاعت و رعایت کو ملحوظ رکھنا میں نے عرض کیا کہ اور اگر مسلمانوں کی کوئی مسلمہ جماعت ہی نہ ہو؟ اور نہ ان کا کوئی متفقہ امیر و مقتدا ہو بلکہ مسلمان مختلف جماعتوں میں منقسم ہوں اور الگ الگ مقتداؤں کے پیچھے چلتے ہوں تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایسی صورت میں تمہیں ان سب فرقوں اور جماعتوں سے صرف نظر کر کے یک سوئیا ختیار کر لینی چاہیے اگر چہ اسیک سوئیکے لیے تمہیں کسی درخت کی جڑ میں پناہ کیوں نہ لینی پڑے جنگلوں میں چھپنا کیوں نہ پڑے اور اس کی وجہ سے سخت سے سخت مصائب و شدائد برداشت کیوں نہ کرنا پڑے اور ان جنگلوں میں گھاس پھوس کھانے پر قناعت تک کی نوبت کیوں نہ آجائے یہاں تک اسیک سوئیکی حالت میں موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے بعد ایسے امام یعنی امیر بادشاہ اور قائد رہنما ہوں گے جو عقیدہ و فکر اور علم کے اعتبار سے میری سیدھی راہ پر نہیں چلیں گے اور کردار و عمل کے اعتبار سے میری روش اور میرا طریقہ نہیں اپنائیں گے یا یہ معنی ہیں کہ وہ کتاب

وسنت پر عمل نہیں کریں گے اور اس زمانہ میں ایسے بھی پیدا ہوں گے جو روپ اور بدن تو آدمیوں جیسا رکھیں گے لیکن ان کے دل شیطانوں کے سے ہوں گے یعنی وہ لوگ فسق وگمراہی شقاوت سخت دلی، شکوک وشبہات پیدا کرنے، فریب دینے عقل کے نکمے ہونے اور فاسد خواہشات رکھنے میں انسانیت کی ساری حدوں کو پار کرجائیں گے اور اس اعتبار سے ان کی شکل کو صورت آدمیوں جیسی ہونے کے باوجود ان کی سیرت اور ان کی باطنیت شیطان کی سی ہوگی۔ حضرت حذیفہ (رض) کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کرعرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر میں اس زمانہ کو پاؤں تو کیا کرو؟ آپ نے فرمایا۔ مسلمانوں کا امیر ومقتدا جو کچھ کہے اس کو سننا اور امیر کی اطاعت کرنا (بشرطیکہ اس اطاعت کا تعلق کسی معصیت سے نہ ہو) اگرچہ تمہاری پشت پر مارا جائے اور تمہارا مال چھین لیا جائے تب بھی سننا اور طاعت کرنا۔

تشریح

لفظ" شر" سے مراد فتنہ، ارکان اسلام میں سستی وکوتاہی واقع ہوجانا، برائی کا غلبہ پالینا اور بدعت کا پھیلنا ہے اور خیر سے مراد اس کے برعکس معنی ہیں۔" ہم لوگ جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے" کے ذریعہ حضرت حذیفہ (رض) نے بعثت نبوی سے قبل کے زمانہ کی طرف اشارہ کیا جب توحید کا آفتاب جہالت کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا، نبوت ورسالت کی روشنی نمودار نہیں ہوتی تھی۔ اور احکام الٰہی پر عمل آوری کا راستہ نظروں سے اوجھل تھا۔ فی جاہلیۃ وشر میں وشر کا لفظ عطف تفسیری ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ جاہلیت کی وضاحت بیان کرنا مقصود ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس جملہ میں وشر کے بعد تخصیص کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔" دخن" جس کا ترجمہ کدورت کیا گیا ہے۔ دخان (دھواں) کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح فضا میں پھیلا ہوا

دھواں صاف وشفاف چیزوں کو مکدر اور دھندلا بنا دیتا ہے اسی طرح اس وقت جو بھلائی بھی سامنے آئے گی وہ بدی اور برائی کے گرد وغبار سے آلودہ ہوگی، بایں طور کہ لوگوں کے دلوں میں صفائی اور خلوص نہیں ہوگا جو اس اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا۔ اور عقیدے صحیح اور اعمال صالح نہیں ہوں گے، امراء وسلاطین کا نظم مملکت اس عدل وانصاف پر مبنی نہیں ہوگا جو پہلے زمانہ میں پایا جاتا تھا مسلمانوں کے قائد ورہنما مخلص (بے غرض اور دین وملت کے سچے خادم نہیں ہوں گے، برائیوں کا ظہور ہوگا، بدعتیں پیدا ہوں گی بدکار لوگ نیکو کاروں کے ساتھ اہل بدعت، اہل سنت کے ساتھ خلط ملط رہیں گے۔" تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی " کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھلائی اور برائی دونوں کے ساتھ خلط ملط رکھنے کی وجہ سے متضاد اور مختلف اعمال وکردار اور طور طریقوں کے حامل ہوں گے؟ ان کی زندگی میں منکر یعنی بری باتوں کا چلن بھی ہوگا اور معروف یعنی اچھے کاموں کا عمل دخل بھی ہوگا۔ پس یہ جملہ بھی اسی مفہوم کو واضح کرتا ہے جو ماقبل کے جملوں نعم وفیہ دخن ویستنون بغیر سنتی سے مراد لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے وضاحت کی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اسلام وہدایت کی روشنی کے بعد پیش آنے والی جس پہلی برائی یا فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ فتنہ وفساد مراد ہے جو حضرت عثمان غنی (رض) کے سانحہ شہادت کے وقت رونما ہوا اور پھر پیش آنے والی دوسری بھلائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے مراد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ خلافت ہے، نیز منہم وتنکر یعنی تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔ میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے وہ امراء وسلاطین مراد ہیں جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد حکمراں ہوئے چنانچہ ان میں سے بعض ایسے حکمران گزرے جو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور اپنے نظام سلطنت میں بھی کتاب

وسنت کی ہدایت کو رہنما بناتے تھے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ یا یہ کہ بعض ان میں سے ایسے تھے جو کبھی تو اچھے کام کرتے تھے اور کبھی خواہشات نفسانی میں پڑ کر برے کام کرتے تھے، اس وقت ان کے سامنے آخرت کا مفاد اور دار آخرت کے لیے تیاری کا جذبہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کا اصل مفاد اپنی ذاتی اغراض کو پورا کرنا اور ہر صورت اپنے اقتدار اور اپنی حکمرانی کو باقی رکھنا ہوتا تھا۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ پہلی برائی سے مراد وہ فتنہ وفساد ہے جو حضرت عثمان غنی (رض) کے قتل کی صورت میں اور ان کے بعد رونما ہوا اور دوسری بھلائی سے وہ صلح صفائی ہے جو حضرت امیر معاویہ (رض) اور حضرت حسن (رض) کے درمیان ہوئی اور دخن یعنی کدورت سے مراد وہ افسوناک واقعات، حادثات ہیں جو حضرت امیر معایہ (رض) کے زمانے میں بعض امراء کے ذریعہ رونما ہوئے جیسے عراق میں زیاد کا فتنہ وفساد۔" جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر بلائیں گے" یعنی ان مفاد پرست خود غرض اور گمراہ افراد کا ایک گروہ ہوگا جو لوگوں کو طرح طرح کے فریب اور مختلف لالچ اور بہلادوں کے ذریعہ گمراہی کی طرف بلائیں گے اور ان کو ہدایت و راستی سے دور رکھے گا۔ پس حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گمراہی کی دعوت دینے والوں کی دعوت کو اور جن کو دعوت دی جائے گی ان کی طرف سے اس دعوت کو قبول کئے جانے کو ایک ایسا سبب قرار دیا ہے جس کے ذریعہ دعوت دینے والے، دعوت قبول کرنے والوں کو جہنم میں دھکیل دیں گے اس طرح وہ لوگ ان کی مکرو فریب دعوت کا شکار ہو کر جہنم میں پہلے جائیں گے، نیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گویا مکرو فریب کی تمام اقسام اور تمام صورتوں کو جہنم کے دروازوں کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف

بلائیں گے ان سے وہ جاہ پسند اور حکومت و اقتدار کے طلبگار مراد ہیں جو ملک و قوم پر اپنا تسلط قائم کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے گروہ بنائیں گے اور عام لوگوں کو طرح طرح کے فریب دے کر اپنے گرد جمع کریں گے تاکہ ان کی اجتماعی طاقت کے ذریعہ ملی سیادت اور ملک و حکومت پر قبضہ کر سکیں، جیسا کہ خوارج اور روافض جیسے گمراہ فرقے اس ناپاک مقصد کے لیے پیدا ہوئے حالانکہ امارت و سیادت اور امانت و ولایت کی کوئی بھی شرط و خصوصیت ان میں موجود نہیں پائی جائے گی۔ ایک بات یہ بھی قابل وضاحت ہے کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلائیں گے۔ تو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہونا، مال کار کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے یعنی گمراہی کی طرف ان لوگوں کے بلانے کا مآل کار چونکہ یہ ہوگا کہ جو لوگ ان کے بلانے پر ان کی طرف چلے جائیں گے وہ دوزخ کے عذاب کے مستوجب بنیں گے۔ اس لیے گمراہی کی طرف ان کے بلانے کو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر بلانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس یہ ارشاد گرامی اسلوب کے اعتبار سے قرآن کریم اس آیت کی طرح ہے کہ (اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا) 4۔ النساء 10 :) مسلم کی روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں مسلمانوں کا باقاعدہ نظم سلطنت قائم ہے اور مسلمانوں کا امیر و امام موجود ہے تو وہاں کے سیاسی حالات میں تمہارے لیے کتنی ہی تنگی و سختی کیوں نہ ہو اور اس امیر و امام کی طرف سے تمہارے مال اور تمہاری جان کے تئیں ظلم ہی کیوں نہ ہوتا ہو یا تمہیں مارا پیٹا اور تمہارا مال و اسباب چھینا کیوں نہ جاتا ہو، تم اس امیر و امام کے خلاف علم بغاوت ہرگز بلند نہ کرنا اور فتنہ و فساد کے دروازے نہ کھولنا بلکہ صبر و تحمل کی راہ اختیار کئے رہنا اور سخت سے سخت حالات میں

بھی امام وقت سے بغاوت کر کے دین وملت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا سبب نہ بننا رہی بات یہ کہ اگر وہ امیر و امام مشروع امور کے ارتکاب کا حکم دے؟ تو اس صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ہاں اگر ان مشروع امور کے ارتکاب کے لیے کہا جائے کہ حکم عدولی کی صورت میں بھی اولیٰ کو اختیار کرنے کا جواز باقی رہتا ہے یعنی حکم عدولی کی صورت میں جان جانے کا خوف ہو تو غیر مشروع امر کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے۔لیکن اگر کوئی شخص جان کی بازی لگا کر بھی غیر مشروع امر کے ارتکاب سے انکار کرے تو یہ سب سے اچھی بات ہو گی۔اور اس سب سے اعلیٰ درجہ کو اختیار کرنے کا جواز ہے۔آخر میں فاسمع واطع کے الفاظ جو دوبارہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ان سے اس حکم کو موکد کرنا مقصود ہے کہ اپنے کو امام وقت کی اطاعت سے علیحدہ نہ کیا جائے اور سرکشی و بغاوت کے ذریعہ ملک وملت میں انتشار و تفریق کا فتنہ نہ اٹھایا جائے۔

خلافت راشدہ کی مدت کے بارے میں پیش گوئی

حدیث:

وعن سفينة قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول الخلافة ثلاثون سنة ثم تكون ملكا. ثم يقول سفينة أمسك خلافة أبي بكر سنتين وخلافة عمر عشرة وعثمان اثنتي عشرة وعلي ستة. رواه أحمد والترمذي وأبو داود.

ترجمہ:

حضرت سفینہ (رض) جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آزاد کردہ غلام تھے۔کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔خلافت کا زمانہ تیس سال کا ہوگا۔اس کے بعد وہ خلافت بادشاہت میں بدل جائے گی حضرت سفینہ (رض) نے یہ حدیث

بیان کرنے کے بعد راوی سے یا عام لوگوں کو خطاب کر کے کہا کہ حساب کر کے دیکھو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو تیس سال کی مدت بیان فرمائی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر (رض) کی خلافت کا زمانہ دو سال۔ حضرت عمر (رض) کی خلافت کا زمانہ دس سال، حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ بارہ سال اور حضرت علی کی خلافت کا زمانہ چھ سال (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) تشریح "خلافت" سے مراد خلافت حق ہے یا وہ خلافت مراد ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ اور جس کی بنیاد قرآن وسنت کی ہدایت اور رہنمائی اور دین وشریعت کے آئین حکمرانی کی اتباع پر ہو، چنانہ اس خلافت کا صحیح مصداق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اول کی خلافت ہے جس کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور جس کی مدت تیس سال ہوئی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی شرح مشکوۃ میں اس روایت کو نقل کرتے ہوئے "ملکا" کے بعد "عضوضا" کا لفظ بھی نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ خلافت کٹ کھنی بادشاہت میں بدل جائے گی، یعنی خلافت کا دور ختم ہو جانے کے بعد بادشاہت کا دور شروع ہو جائے گا اور بادشاہت بھی ایسی کہ لوگ اس کی سختیوں اور ظالمانہ کاروایوں سے امن نہیں پائیں گے اور عدل وانصاف کا نظام اور دین پروری کا ماحول جیسا کہ ہونا چاہیے، جاری نہیں ہوگا، یہ اور بات ہے کہ اس دور کے حکمران گزرے ہوئے خلفاء کی جانشینی کا دعویٰ رکھنے کی وجہ سے اور مجازا اس بادشاہت پر خلافت ہی کا اطلاق کریں اور اپنے کو خلیفہ کہلائیں اور گو ان کو امیرالمومنین کہنا کوئی خلاف حقیقت بات بھی نہ ہو کیونکہ نظم مملکت اور ظاہری قانون کے مطابق وہ مسلمانوں کے امیر وحاکم بہرحال ہوں گے لیکن حقیقی خلافت کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بس تیس سال تک رہے گی، چنانہ خلفاء راشدین کہ

جن کا دور خلافت حقیقی خلافت کا واقعی مصداق تھا، تیس ہی سال پر مشتمل ہے۔ شرح عقائد میں اس حدیث کے تعلق سے ایک اشکال وارد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خلافت کا دور صرف تیس سال فرمایا ہے جب کہ خلفاء راشدین کے بعد کے زمانے میں خلفاء عباسیہ بلکہ بنو امیہ میں سے بعض خلفاء جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت پر مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی علماء اور اہل عمل وعقد کا اتفاق رہا ہے تو کیا ان کے دور خلافت کو خلافت نہیں کہا جاسکتا اس کا جواب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس خلافت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خلافت کاملہ کہ جس میں دین وشریعت اور عدل وانصاف میں ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو، تیس سال رہے گی، اس کے بعد کی خلافت کی شکل وصورت میں تبدیلی آئے گی، ہاں کچھ دور ایسے بھی آئیں گے جس میں اس خلافت کے طرز کو اختیار کیا جائے گا ورنہ عام طور پر جو بھی خلافت قائم ہوگی وہ بس نام ہی کی خلافت ہوگی، اصل کے اعتبار سے بادشاہت ہوگی، واضح رہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور حکمرانی شروع ہوا جس کو انھوں نے اگرچہ خلافت ہی کا نام دیا مگر حقیقت میں وہ بادشاہت تھی، حضرت امیر معاویہ (رض) اس دور کے سب سے پہلے حکمران ہیں ان کا دور حکمرانی اگرچہ خلافت راشدہ کی طرح دین وملت کے حق میں حقیقی خلافت کا نمونہ نہیں رہا مگر ان کی خلافت وحکومت میں بادشاہت کی وہ تمام خرابیاں بھی نہیں تھیں جو ان کے جانشینوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئی نیز انھوں نے اپنے دور حکمرانی کو کسی نہ کسی حد تک خلافت راشدہ کے نہج پر رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے بعد بنو امیہ کا اکثر دور حکمرانی مسلمانوں کی باہمی آویزش وخلفشار قتل وغارت گری، دین وشریعت کی صریح خلاف ورزی اور ظلم وناانصافی کی بہت زیادہ مثالوں سے بھرا ہوا تھا، اس دور کی ابتداء

یزید بن معاویہ کے دور سے ہوتی ہے، یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید حکمران ہوا، اس کے بعد ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، ولید بن یزید بن عبدالملک، ابراہیم بن ولید بن عبدالملک اور مروان بن محمد بن مروان بالترتیب یکے بعد دیگرے خلیفہ وحکمران ہوتے رہے مروان بن محمد بن مروان، بنوامیہ میں سے آخری حکمران تھا، اس کے بعد خلافت بنوامیہ سے نکل کر بنوعباس میں پہنچ گئی۔ حدیث کے راوی حضرت سفینہ (رض) نے تیس سال کا جو حساب بیان کیا ہے وہ تخمینا ہے اور اس بات پر مبنی ہے کہ انھوں نے کسور کو بیان نہیں کیا، چنانچہ صحیح روایات اور مستند تاریخی کتابوں میں خلافت راشدہ کی تیس سالہ مدت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق (رض) کی خلافت کا زمانہ دو سال چار ماہ، حضرت عمر فاروق (رض) کی خلافت کا زمانہ دس سال چھ ماہ، حضرت عثمان غنی کی خلافت کا زمانہ چند روز کم بارہ سال اور حضرت علی مرتضی (رض) کی خلافت کا زمانہ چار سال نو ماہ رہا ہے۔ اس طرح چاروں خلفاء کی مجموع مدت خلافت انتیس سال سات ماہ ہوتی ہے اور پانچ مہینے جو باقی رہے وہ حضرت امام حسن (رض) کی خلافت کا زمانہ ہے، پس حضرت امام حسن (رض) بھی خلفاء راشدین میں سے ہوئے (رضی اللہ عنہم)

خلافت راشدہ کے بعد پیش آنے والے روح فرسا واقعات کے بارے میں پیشگوئی

حدیث؛

وعن أبي ذر قال كنت رديفا خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما على حمار فلما جاوزنا بيوت المدينة قال كيف بك يا أبا ذر إذا كان بالمدينة جوع تقوم عن فراشك ولا تبلغ مسجدك حتى يجهدك الجوع؟ قال قلت الله ورسوله أعلم. قال تعفف يا أبا ذر. قال كيف بك يا أبا ذر إذا كان بالمدينة موت يبلغ البيت العبد حتى إنه يباع القبر بالعبد؟ .

قال قلت الله ورسوله أعلم. قال تصبر يا أباذر. قال كيف بك يا أباذر إذا كان بالمدينة قتل تغمر الدماء أحجار الزيت؟ قال قلت الله ورسوله أعلم. قال تأتي من أنت منه. قال قلت وألبس السلاح؟ قال شاركت القوم إذا. قلت فكيف أصنع يا رسول الله؟ قال إن خشيت أن يبهرك شعاع السيف فألق ناحية ثوبك على وجهك ليبوء بإثمك وإثمه. رواه أبو داود.

••••••

ترجمہ:

حضرت ابوذر (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن کسی سفر کے موقع پر میں گدھے پر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے سوار تھا (یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابوذر (رض) کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، گویا یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ (رض) اور رفقاء کے ساتھ کس قدر تواضع ومحبت اور حسن وسلوک کا رویہ اختیار فرماتے تھے، نیز اس سے حضرت ابوذر (رض) کی اس خصوصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کس قدر قریب کا مقام حاصل تھا اور وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرمودات کو نہایت توجہ وہوشیاری کے ساتھ سنتے اور اچھی طرح یاد رکھتے تھے، بہرحال، حضرت ابوذر (رض) نے فرمایا کہ) جب ہم مدینہ کے گھروں سے یعنی آبادی سے باہر نکل گئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابوذر (رض) اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں بھوک کا دور دورہ ہوگا (یعنی خاص طور پر تمہیں اس قدر اسباب معیشت حاصل نہیں ہوسکیں گے کہ تم اپنا پیٹ بھی بھرسکو، یا یہ کہ اس وقت مدینہ میں قحط پھیل جائے گا اور تم لوگوں کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملے گا یہاں تک کہ تم اپنے بستر سے اٹھ کر اپنی مسجد تک پہنچنے میں بھی مشکل محسوس کروگے اور بھوک کی شدت تمہیں سخت پریشانی اور اذیت میں مبتلا کردے

گی (یعنی بھوک کی وجہ سے تم پر اس قدر ضعف غالب ہو جائے گا کہ تم اپنے گھر سے نکل کر نماز پڑھنے کے لیے مسجد تک جانے میں بھی سخت مشکل اور دقت محسوس کرو گے۔ حضرت ابوذر (رض) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہتر جانتے ہیں (یعنی میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کیا کروں گا، ہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہدایت فرمائیے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ ابوذر! پارسائی اختیار کرنا، یعنی اس بھوک پر صبر کرنا ضبط وتحمل کے ساتھ اس سخت حالت کا مقابلہ کرنا اپنے آپ کو حرام ومشتبہ مال سے محفوظ رکھنا، طمع ولالچ لرکھنے اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے اور مخلوق کے سامنے ذلت ورسوائی اختیار کرنے سے اجتناب کرنا، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ ابوذر! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب قحط یا کسی وبا کے پھیل جانے کی وجہ سے مدینہ میں موت کی گرم بازاری ہوگی اور مکان (یعنی قبر) کی قیمت غلام تک پہنچ جائے گی (یعنی کثرت اموات سے یہ حال ہوگا کہ لوگوں کو اپنے مردے دفن کرنے کے لیے قبر کی جگہ ملنی مشکل ہو جائے گی اور ایک قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر پہنچ جائے گی۔ چنانچہ آگلے جملے کے ذریعے اسی بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں فرمایا کہ یہاں تک کہ قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر فروخت ہوگی) حضرت ابوذر (رض) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں (آپ ہی ہدایت فرمائیے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابوذر! صبر کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا اور پھر فرمایا ابوذر! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں قتل عام ہوگا اور اس کا خون احجار الزیت کو ڈھان لے گا؟ حضرت ابوذر (رض) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں (آپ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی فرمائیے کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے؟) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم اس کے پاس چلے جانا، جس سے تم تعلق رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ، تو کیا میں اس وقت ہتھیار باندھ لوں اور فتنہ پھیلانے والی جماعت کے خلاف برسر پیکار ہو جاؤں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اس طرح تو تم بھی جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! پھر مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ اگر تمہیں خوف ہو کہ تلوار کی چمک تم پر غالب آجائے گی (یعنی تم یہ دیکھو کہ کوئی شخص تمہیں مار ڈالنے کے لیے اپنی تلوار سے تم پر وار کرنا چاہتا ہے) تو اس وقت تم اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا۔ تاکہ وہ تمہارا گناہ (یعنی تمہارے قتل کا گناہ) اور اپنا گناہ لے کر واپس ہو۔ (ابوداؤد)

......

تشریح:

"تصبر" بات تفعل سے امر کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں یہ لفظ مضارع کا صیغہ منقول ہے جو امر کے معنی ہیں اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ تم اس آفت و بلا پر صبر کرنا جزع و فزع سے اجتناب کرنا، تقدیر الٰہی پر راضی و شاکر رہنا۔ اور مدینہ سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ "احجار الزیت" نواح مدینہ میں بجانب غرب ایک جگہ کا نام تھا، وہاں کی زمین نہایت پتھریلی تھی اور وہ پتھر بھی اس قدر سیاہ اور چمکدار تھے کہ جیسے کسی نے ان پر زیتون کا تیل مل دیا ہو، اسی مناسبت سے اس جگہ کو احجار الزیت کہا جاتا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ارشاد گرامی" ابوذر! اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب مدینہ میں قتل عام ہو گا الخ" کے ذریعے بطور پیشگوئی اس خونچکاں واقعہ کی طرف اشارہ کیا جو مسلمانوں کے قتل عام کی صورت میں مدینہ منورہ پیش آیا اور واقعہ حرہ کے نام

سے مشہور ہوا، مستند کتابوں میں اس واقعہ کی جو تفصیل مذکور ہے وہ اتنی لرزہ خیز، اتنی دردناک اور اتنی بھیانک ہے کہ نہ تو اس کو بیان کرنے کا زبان وقلم کو یارا ہے اور نہ کوئی آسانی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور سننے کی تاب لاسکتا ہے۔ تاہم اجمالی طور پر اتنا بتادینا ضروری ہے کہ جب بدبخت یزید ابن معاویہ کی فوج نے میدان کربلا میں حضرت امام حسین (رض) کو نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کردیا تو پورے عالم اسلام میں زبردست تہلکہ مچ گیا اور یزید کے خلاف عام مسلمانوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے ادھر اس کی بدکاریوں، بے اعتدالیوں اور بدمست زندگی کے واقعات نے اس کی طرف لوگوں کو پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا چنانچہ اہل مدینہ نے متفقہ طور پر اس کی خلافت وحکومت سے بیزاری کا اظہار اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا، جب یزید کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مسلم بن عقبہ کی کمان میں ایک بہت بڑا لشکر اہل مدینہ پر چڑھائی کے لئے بھیج دیا، اہلِ مدینہ نے بڑی بہادری اور بے جگری کے ساتھ یزید کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اول تو تربیت یافتہ فوج اور دیگر وسائل و ذرائع کی کمی کی وجہ سے اور دوسرے مسلم بن عقبہ جیسے ہوشیار وتجربہ کار کمانڈر کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے شکست کھا گئے پھر تو مسلم بن عقبہ اور اس کی فوج نے شہر میں گھس کر قتل عام اور خونریزی کا بازر گرم کردیا اور قتل عام لوٹ مار کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، ہزاروں مسلمان نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ قتل کردیئے گئے جن میں صحابہ کرام اور تابعین کی بھی بہت بڑی تعداد تھی، شہر مقدس اور مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حرمت کو پامال کیا گیا اور دیگر ناقابل بیان تباہیوں اور بربادیوں کا بازار گرم کیا گیا۔ صرف مدینہ ہی کی پامالی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد یزید کی وہ فوج مکہ کی طرف روانہ ہوئی جہاں کے لوگوں نے بہت پہلے سے حضرت عبداللہ بن زبیر کو خلیفہ تسلیم کر رکھا تھا،

یزیدی لشکر نے مکہ مکرمہ میں بھی بے پناہ تباہی مچائی اور خانہ کعبہ تک کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔اسی سال یزید کی موت ہوئی۔"تم اس کے پاس چلے جانا جس سے تعلق رکھتے ہو" کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت جو لوگ تمہارے دین و مسلک کے ہوں اور تمہارے خیالات و اعمال کے موافق ہوں ان کے پاس چلے جانا۔اور قاضی (رح) نے اس جملے کی یہ مراد بیان کی ہے کہ تم اپنے اہل و اقارب کے پاس چلے جانا اور یہ کہ اپنے گھر میں بیٹھے رہنا۔اور طیبی (رح) نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم اپنے اس امام و امیر کی طرف رجوع کرنا جس کی تم اتباع فرمان برداری کرتے ہو۔یہ مطلب زیادہ صحیح اور حضرت ابو ذر (رض) کے اس جملے"تو کیا میں ہتھیار باندھ لوں" کے زیادہ مناسب ہے۔"اس طرح تم بھی جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے" کا مطلب، جو طیبی کے منقولات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ فتنہ و فساد پھوٹ پڑا ہو اور قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو مسلح اور ہتھیار بند ہونا گویا اس خونریزی میں شرکت کرنا اور فتنہ پردازی کے گناہ گاروں کی صف میں شامل ہونا ہے لہذا تم نہ ہتھیار باندھنا اور نہ کسی کے خلاف جنگ میں شریک ہونا بلکہ اپنے امام و مقتدا اور صلح جو امن پسند لوگوں کے ساتھ رہنا یہاں تک کہ تم صلح جوئی اور امن پسندی کی راہ میں فلاح یاب۔لیکن اس وضاحت پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف تو حضرت ابو ذر (رض) کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے امام و امیر کے ساتھ رہیں جو یقیناً اس وقت قتل و قتال اور خونریزی میں ایک فریق کی حیثیت رکھے گا دوسری طرف یہ حکم دیا گیا کہ وہ قتل و قتال سے دور رہیں۔تو یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کس طرح ممکن ہوں گی؟ اس کا جواب ابن ملک نے اس طرح دینے کی کوشش کی ہے کہ شریعت کا حکم تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ناحق اور از راہ ظلم، خونریزی کا ارتکاب کرنا چاہے تو اس کا دفاع کرنا

اور اس کی فساد انگیزی کو طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی سعی کرنا واجب ہے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو یہ فرمایا کہ اس وقت ہتھیار بند ہونا، گویا فتنہ پردازوں کی جماعت کا شریک کار ہونا ہے، تو اس کا اصل مقصد خونریزی کی بُرائی کو واضح کرنا اور اس کے تباہ کن اثرات کے خلاف آگاہ و متنبہ کرنا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر خونریزی و غارت گری کے لیے آنے والا دشمن اگر مسلمان ہو تو طاقت کے ذریعے اس کا دفاع کرنا اور اس سے لڑنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے مقابلہ آرائی کی صورت میں فتنہ وفساد کے زیادہ بڑھ جانے کا خوف نہ ہو اور اگر وہ دشمن، کوئی غیر مسلم ہو تو پھر اس کا ہر ممکن ذریعے سے مقابلہ کرنا اور اس کے ساتھ ہر صورت میں لڑنا واجب ہے۔ "اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر قتل وقتال کرنے والے لوگ تم پر حملہ بھی کریں تو تم ان سے نہ لڑو۔ بلکہ ان کے حملے کے وقت کسی بھی ذریعے سے اپنے آپ کو غافل اور غیر متعلق بنالو تاکہ تمہیں اس حملے سے خوف محسوس نہ ہو۔ اس سے گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ تم ان لوگوں سے اس حالت میں بھی نہ لڑنا اور ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا جب کہ وہ تم سے لڑنا اور تمہیں قتل کرنا چاہیں بلکہ تمہارے لیے فلاح کا راستہ یہی ہوگا کہ اس وقت تم مظلوم بن جانا اور اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں شہید ہو جانے پر تیار کر لینا کیونکہ وہ لوگ بہر حال مسلمان ہوں گے اور مسلمان کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ تمہیں قتل کریں گے تو وہ ان کا عمل ہوگا اور اللہ خود ان سے نپٹ لے گا۔ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس ارشاد کا اصل مقصد مسلمانوں کی باہمی خونریزی کی برائی اور اس سے بچنے کی فضیلت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ چاہے اپنی جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑے مگر کسی مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا گوارہ نہ کرنا چاہیے ورنہ جہاں

تک مسئلہ کا تعلق ہے، یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فتنہ کا سر کچلنے کے لیے اور ناحق خونریزی پر آمادہ شخص کا دفاع کرنے کے لیے لڑنا جائز ہے اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ واقعہ حرہ ٦٣ھ میں پیش آیا جب کہ حضرت ابوذر (رض) کی وفات حضرت عثمان غنی (رض) کی خلافت کے آخری زمانے میں ٣٢ھ میں ہو چکی تھی، پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ تو منکشف ہو گیا تھا کہ مدینے میں ایسا المناک واقعہ پیش آئے گا لیکن یہ منکشف نہیں ہوا تھا کہ یہ واقعہ کب پیش آئے گا۔ چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوذر (رض) کو اس کے متعلق باخبر کیا اور گویا یہ وصیت فرمائی کہ اگر وہ خونریزی تمہارے سامنے پیش آئے اور تمہاری زندگی اس وقت تک باقی رہے تو صبر و ثبات کی راہ اختیار کرنا اور اس خونریزی میں ہرگز شامل نہ ہونا جہاں تک بھوک کی حالت اور کثرت اموات کے واقعہ کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ مدینہ والوں کو ان دونوں باتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو اور حضرت ابوذر (رض) کی زندگی ہی میں یہ دونوں پیشگوئیاں بھی پوری ہو گئی ہوں جیسا کہ عام الرماد میں پیش آنے والی صورت حال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ قتل عام اور خونریزی کے فتنہ کی طرح یہ دونوں باتیں بھی حضرت ابوذر (رض) کی وفات کے بعد ظاہر ہوئی ہیں۔

قیامت کی علامتوں کا بیان

حدیث؛

وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اتخذ الفيء دولا والأمانة مغنما والزكاة مغرما وتعلم لغير الدين وأطاع الرجل امرأته وعق أمه وأدنى صديقه وأقصى أباه وظهرت الأصوات في المساجد وساد القبيلة فاسقهم وكان زعيم القوم أرذلهم وأكرم الرجل مخافه شره وظهرت القينات والمعازف وشربت الخمور ولعن آخر هذه الأمة أولها فارتقبوا عند ذلك ريحا حمراء وزلزلة وخسفا ومسخا وقذفا وآيات تتابع كنظام قطع سلكه فتتابع. رواه الترمذي.

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" جب مالم غنیمت کو دولت قرار دیا جانے لگے اور جب زکوۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم کو دین کے علاوہ کسی اور غرض سے سکھایا جانے لگے اور جب مرد بیوی کی اطاعت کرنے لگے اور جب ماں کی نافرمانی کی جانے لگے اور جب دوستوں کو تو قریب اور باپ کو دور کیا جانے لگے اور جب مسجد میں شوروغل مچایا جانے لگے اور جب قوم و جماعت کی سرداری، اس قوم و جماعت کے فاسق شخص کرنے لگیں اور جب قوم و جماعت کے زعیم وسربراہ اس قوم و جماعت کے کمینہ اور رذیل شخص ہونے لگیں اور جب آدمی کی تعظیم اس کے شر اور فتنہ کے ڈر سے کی جانے لگے اور جب لوگوں میں گانے والیوں اور ساز و باجوں کا دور دورہ ہوجائے اور جب شرابیں پی جانی لگیں اور جب اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں کو برا کہنے لگیں اور ان پر لعنت بھیجنے لگیں تو اس وقت تم ان چیزوں کے جلدی ظاہر ہونے کا انتظار کرو سرخ یعنی تیز وتند اور شدید ترین طوفانی

آندھی کا زلزلہ کا، زمین میں دھنس جانے کا، صورتوں کے مسخ وتبدیل ہوجانے کا اور پتھروں کے برسنے کا، نیز ان چیزوں کے علاوہ قیامت اور تمام نشانیوں اور علامتوں کا انتظار کرو، جو اس طرح پے درپے وقوع پذیر ہوں گی جیسے (مثلاً موتیوں کی) لڑی کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس کے دانے پے درپے گرنے لگیں۔" (ترمذی)

تشریح:

اس حدیث میں کچھ ان برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اگرچہ دنیا میں ہمیشہ موجود رہی ہیں اور کوئی بھی زمانہ ان برائیوں سے خالی نہیں رہا ہے، لیکن جب معاشرہ میں یہ برائیاں کثرت سے پھیل جائیں اور غیر معمولی طور پر ان کا دور دورہ ہوجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کا سخت ترین عذاب خواہ وہ کسی شکل وصورت میں ہو، اس معاشرہ پر نازل ہونے والا اور دنیا کے خاتمہ کا وقت قریب تر ہوگیا ہے۔ دول اصل میں دولۃ یا دولۃ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی انقلاب زمانہ کے ہیں اور ہر اس چیز کو بھی" دولت" کہتے ہیں جو کبھی کسی کے لیے ہو اور کبھی کسی کے لیے اسی وجہ سے اس لفظ کا مال وزر اور حلیہ واقتدار پر ہوتا ہے! نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ لفظ دولۃ (دال کے پیش کے ساتھ) تو اس چیز کا اسم ہے جو از قسم مال کسی شئی کو حاصل کرے یعنی مال غنیمت اور دال کے زبر کے ساتھ یعنی دولۃ کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پلٹنا یعنی سختی و پریشانی اور تنگدستی کی حالت کا ختم ہوجانا اور اطمینان وراحت اور خوشحالی کا آجانا بہر حال مال غنیمت کو دولت قرار دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے ذریعہ دشمنوں سے جو مال حاصل ہوتا ہے اور جس کو" مال غنیمت" کہا جاتا ہے وہ شرعی طور پر تمام غازیوں اور مجاہدوں کا مشترک حق ہے اور اس مال کو ان تمام حقداروں پر، خواہ وہ کسی بھی حیثیت وحالت کے ہوں،

تقسیم کرنا واجب ہے، لیکن اگر اسلامی لشکر وسلطنت کے اہل طاقت وثروت اور اونچے عہدے دار اس مال غنیمت کو شرع حکم کے مطابق تمام حقداروں کو تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے درمیان تقسیم کر کے بیٹھ جائیں اور محتاج وضرورت منداور چھوٹے لوگوں کو اس مال سے محروم رکھ کر اس کو صرف اپنے مصرف میں خرچ کرنے لگیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اس مال غنیمت کے تمام حقداروں کا مشترکہ حق نہیں سمجھتے بلکہ اپنی ذاتی دولت سمجھتے ہیں۔" امانت کو مال غنیمت شمار کرنے" سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس امانتیں محفوظ کرائی جائیں وہ ان امانتوں میں خیانت کرنے لگیں اور امانت کے مال کو غنیمت کی طرح اپنا ذاتی حق سمجھنے لگیں جو دشمنوں سے حاصل ہوتا ہے۔" زکوۃ کو تاوان سمجھنے" کا مطلب یہ ہے کہ زکوۃ کا ادا کرنا لوگوں پر اس طرح شاق اور بھاری گذرنے لگے کہ گویا ان سے ان کا مال زبردستی چھینا جا رہا ہے اور جیسے کوئی شخص تاوان اور جرمانہ کرتے وقت سخت تنگی اور بوجھ محسوس کرتا ہے۔ علم کو دین کے علاوہ کسی اور غرض سے سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ علم سکھائے اور علم پھیلانے کا اصل مقصد دین وشریعت پر عمل اور اخلاق وکردار کی اصلاح وتہذیب انسانیت اور سماج کی فلاح وبہبود اور اللہ ورسول کا قرب وخوشنودی حاصل کرنا نہ ہو بلکہ اس گے ذریعہ دنیا کی عزت، مال ودولت، جاہ منصب اور ایوان اقتدار میں تقرب حاصل کرنا مقصود ہو۔" مرد کا بیوی کی اطاعت کرنا" یہ ہے کہ خاوند، زن مرید ہو جائے اور اس طرح بیوی کا حکم مانے اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے لگے کہ اس کی وجہ سے اللہ کے حکم وہدایت کی صریح خلاف ورزی ہو۔" ماں کی نافرمانی کرنے" سے مراد یہ ہے کہ ماں کی اطاعت وفرمان برداری کا جو حق ہے اس سے لاپرواہ ہو جائے اور کسی شرعی وجہ کے بغیر اس کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھائے واضح رہے کہ یہاں صرف ماں کی تخصیص

اس اعتبار سے ہے کہ اولاد کے لیے چونکہ باپ کی بہ نسبت ماں زیادہ مشقت اور تکلیف برداشت کرتی ہے اس لیے وہ اولاد پر باپ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔" دوستوں کو قریب اور باپ کو دور کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنا وقت باپ کی خدمت میں حاضر رہنے، اس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور اس کی دیکھ بھال میں صرف کرنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ مجلس بازی کرنے، ان کے ساتھ گپ شپ اور سیر وتفریح کرنے میں صرف کرے اور اپنے معمولات وحرکات سے ایسا ظاہر کرے کہ اس کو باپ سے زیادہ دوستوں کے ساتھ تعلق وموانست ہے۔"مسجد میں شور وغل کرنے" سے مراد یہ ہے کہ مسجدوں میں زور زور سے باتیں کی جائیں، چیخ و پکار کے ذریعہ مسجد کے سکون میں خلل ڈالا جائے اور اس کے ادب واحترام سے لاپرواہی برتی جائے! واضح رہے کہ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ مسجد میں آواز کو بلند کرنا حرام ہے، خواہ اس کا تعلق ذکر اللہ سے کیوں نہ ہو۔"کسی قوم وجماعت کا سردار اس قوم کے فاسق ہونے۔" سے مراد یہ ہے کہ قیادت وسیادت اگر ایسے لوگوں کے سپرد ہونے لگے جو بدکردار، بدقماش اور بے ایمان ہو تو یہ بات پوری قوم کے لیے تباہی کی علامت ہوگی! واضح رہے کہ قوم، جماعت کے حکم میں شہر اور گاؤں اور محلہ بھی شامل ہیں! اسی طرح اگر کسی قوم وجماعت کے زعما ان لوگوں کو قرار دیا جانے لگے جو اپنی قوم وجماعت کے کمینہ، بے کردار اور رذیل ترین ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم وجماعت کی تباہی کے دن آگئے ہیں۔" آدمی کی تعظیم، اس کے فتنہ وشر کے ڈر سے کی جانے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی تعظیم واحترام کا معیار اس کی ذاتی فضیلت وعظمت پر نہ ہو بلکہ اس کی برائی اور اس کے شر کا خوف ہو۔یعنی کسی شخص کی اس لیے تعظیم کی جائے وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے یا ستانے کی طاقت رکھتا ہے، جیسے کسی فاسق وبدقماش شخص کو اقتدار وغلبہ حاصل ہو جائے

اور لوگ اس کی عزت اور اس کی تعظیم کرنے پر مجبور ہوں۔" گانے والیوں" سے مراد کنجریاں، ڈومنیاں اور نائنیں وغیرہ ہیں! اور" قینات" قنۃ کی جمع ہے، جس کے اصل معنی گانے والی لونڈی کے ہیں، اسی طرح" باجوں" سے مراد ہر قسم کے ساز و باجے اور گانے بجانے کے آلات ہیں جن کو شرعی اصطلاح میں" مزامیر" کہا جاتا ہے جیسے ڈھولک، ہارمونیم، طبلہ، سارنگی اور شہنائی وغیرہ۔" شرابوں" جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہاں شراب کی تمام انواع و اقسام اور دیگر دوسری نشہ آور اشیاء بھی مراد ہیں۔" جب اس امت کے پچھلے لوگ، اگلے لوگوں کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔" میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ برائی اسی امت کے ساتھ مخصوص ہے، گزشتہ امتوں کے لوگوں میں اس برائی کا چلن نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے رافضی لوگ اس برائی میں مبتلا ہیں کہ وہ ان گذرے ہوئے اکابر یعنی صحابہ تک کے بارے میں زبان لعن وطعن دراز کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔ آیت (وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ) 9۔التوبہ 100 :)

" جن لوگوں نے سبقت کی (یعنی سب سے) پہلے (ایمان لائے) مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے خوش ہے!۔" اور ایک آیت میں یہ فرمایا کہ : آیت (لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ) 48۔ الفتح 18 :) "(اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مومن آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوا۔" کس قدر بدنصیبی اور شقاوت کی بات ہے کہ جن بندگان خاص سے اللہ تعالیٰ راضی وخوش ہوا ان سے ناراضگی و ناخوشی ظاہر کی جائے اور ان کے خلاف ہفوات بکے جائیں۔؟ ان بندگان خاص کے مناقب و

فضائل سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں، وہ پاک نفوس ایسی عظیم ہستیاں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اللہ کے دین کو قبول کیا، قبول ایمان میں سبقت حاصل کی، نہایت سخت اور صبر آزما حالت میں اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدد وحمایت کی، اللہ کے دین کا پرچم سر بلند کرنے کے لیے اپنی جانوں کی بازیاں لگائیں، جہاد کے ذریعہ اسلام کی شوکت بڑھائی، بڑے بڑے شہر اور ملک فتح کیئے، کسی واسطہ کے بغیر سید الامام (علیہ الصلوۃ والسلام) سے دین کا علم حاصل کیا، شریعت کے احکام ومسائل سیکھے، دین کی بنیاد یعنی قرآن کریم کو سب سے زیادہ جانا اور سمجھا اور مقدس ہستیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ امت کے تمام لوگوں کو یہ تلقین فرمائی کہ ان کے حق میں یوں گویا ہوں۔ آیت (رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ) 59۔ الحشر 10 :) "اے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش جنہوں نے قبول ایمان میں ہم پر سبقت حاصل کی ہے۔" لیکن ان (رافضیوں) کے وہ لوگ کہ جو یا تو ایمان کی روشنی کھو چکے ہیں، یا دیوانے ہو گئے ہیں، ان مقدس ہستیوں اور امت کے سب سے افضل لوگوں کے بارے میں صرف زبان لعن وطعن دراز کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ محض اپنے گندے خیالات ونظریات اور سڑے ہوئے فہم کی وجہ سے یہ کہہ کر ان پاک نفسوں کی طرف کفر کی بھی نسبت کرتے ہیں کہ ابو بکر، عمر اور عثمان (رض) نے بلا استحقاق خلافت پر قبضہ کیا کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد خلافت کے اصل مستحق علی تھے۔ اللہ ان عقل کے اندھوں کو چشم بصیرت دے، آخر وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس امت کے اگلے پچھلے تمام لوگوں نے اس بات کو غلط اور باطل قرار ہے اور قرآن وسنت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے

بعد خلافت اول حضرت علی کا حق تھا نیز صحابہ کرام میں سے جن لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں ان سے اختلاف کیا، انھوں نے نعوذ باللہ کسی بری غرض کے تحت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کا اختلاف ان کی اجتہادی رائے کے تحت تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خطاء اجتہادی میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن اس کی وجہ سے بھی ان پر لعن کرنا اور ان کے حق میں گستاخانہ باتیں منہ سے نکالنا نہایت ناروا، بلکہ صریح زیادتی ہے، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت راہ حق سے بھٹک جانے کی وجہ سے کی اور وہ "فسق" کے مرتکب ہوئے تو بھی ان کو آخر کس بنا پر برا بھلا کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے انھوں نے مرنے سے پہلے اپنی غلط روی سے توبہ کر لی ہو یا اگر توبہ بھی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے یہ غالب امید رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی رحمت کے صدقہ میں اور ان کی گزشتہ خدمات کے بدلے میں ان کو مغفرت سے نواز دے گا چنانچہ ابن عسا کر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا) میرے (بعض) صحابہ (اگر) ذلت یعنی لغزش کا شکار ہوں گے (تو) اللہ تعالیٰ ان کو میری صحبت اور میرے ساتھ تعلق رکھنے کی برکت سے بخش دے گا۔" اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ اکثر وبیشتر صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے پروردگار کی رحمت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت کے امیدوار رہتے ہیں تو کیا وہ لوگ جو اس امت کے سب سے افضل اور سب سے بڑے لوگوں کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کے حق میں یہ نیک گمان رکھا جائے کہ اگر ان سے کوئی لغزش ہوئی بھی ہوگی تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے درجہ کی عظمت

اور ان کے شرف صحابیت کی برکت سے ان سے درگذر فرمائے گا؟ مرتبہ صحابیت کے تقدس وشرف کو داغدار کرنے والے نادانو! سوچو کہ تم اپنی زبان کو کن مقدس ہستیوں کی شان میں گستاخی کر کے گندا کر رہے ہو اور تمہارا یہ طرز عمل رحمۃ للعلمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کس قدر تکلیف پہنچا رہا ہوگا!؟ کیا تم اس بات سے بے خبر ہو کہ نیک بخت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے خود کے عیوب ان کو دوسروں کی عیب جوئی سے باز رکھیں؟ کیا تم اس فرمان رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت کے منکر ہو کہ اپنے مرے ہوئے لوگوں کو برائی کے ساتھ یاد نہ کرو۔" کیا رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی نہیں ہے کہ جب تمہارے سامنے میرے صحابہ کا ذکر ہو تو اپنی زبان کو قابو میں رکھو؟ اگر تم ذرا بھی ایمان وعقل کا دعوی رکھتے ہو تو سنو کہ سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے۔" ابو بکر وعمر کی محبت، ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان دونوں سے بغض وعداوت رکھنا کفر کی علامت ہے) انصار کی محبت ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان سے بغض وعداوت، کفر ہے، اہل عرب کی محبت، ایمان کی ایک شاخ ہے اور ان سے بغض و عداوت کفر ہے جس نے میرے صحابہ کو برے الفاظ سے یاد کیا وہ اللہ کی لعنت کا مستوجب ہوا اور جس نے ان کے بارے میں میرے حکم کی پاسداری کی، میں قیامت کے دن اس کی پاسداری کروں گا۔" اے اللہ بس تو ہی ان لوگوں کو عقل سلیم اور چشم بصیرت عطا کر کے راہ ہدایت دکھا سکتا ہے، جو جہالت و نادانی اور تعصب کی وجہ سے تیرے محبوب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محبوب صحابہ اور ساتھیوں کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور ان کے حق میں زبان لعن وطعن دراز کر کے خود کو دوزخ کی آگ کا ایندھن بناتے ہیں۔

امام مہدی کے ظہور کے پیشگوئی

حدیث؛

وعن أم سلمة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال یکون اختلاف عند موت خلیفة فیخرج رجل من أهل المدینة هاربا إلی مکة فیأتیه الناس من أهل مکة فیخرجونه وهو کاره فیبایعونه بین الرکن والمقام یبعث إلیه بعث من الشام فیخسف بهم بالبیداء بین مکة والمدینة فإذا رأی الناس ذلك أتاه أبدال الشام وعصائب أهل العراق فیبایعونه ثم ینشأ رجل من قریش أخواله کلب فیبعث إلیهم بعثا فیظهرون علیهم وذلك بعث کلب ویعمل الناس بسنة نبیهم ویلقی الإسلام بجرانه فی الأرض فیلبث سبع سنین ثم یتوفی ویصلی علیه المسلمون. رواه أبو داود.

ترجمہ؛

حضرت ام سلمہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتی ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ (آخر زمانہ میں) جب خلیفہ (یعنی اس وقت کی حکومت کے سربراہ) کا انتقال ہوگا تو (دوسرے سربراہ کے انتخاب یانامزدگی کے سوال پر اصحاب الرائے لوگوں کے درمیان) اختلاف ونزاع اٹھ کھڑا ہوگا، اسی دوران اہل مدینہ میں سے ایک شخص (مدینہ سے) نکل کر مکہ کی طرف بھاگ جائے گا، مکہ کے لوگ جب اس شخص کے مرتبہ وحیثیت کو پہچانیں اور جانیں گے تو اس کے پاس آئیں گے اور اس کو (گھر سے) باہر نکال کر لائیں گے (تاکہ اس کو اپنا سربراہ اور حاکم بنائیں) وہ شخص اگرچہ (فتنہ کے خوف سے) یہ منصب قبول کرنے کو پسند نہیں کرے گا مگر لوگ (منت سماجت کر کے اس کو تیار کریں گے اور اس کے ہاتھ پر

بیعت کرلیں گے، یہ بیعت (خانہ کعبہ میں) حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان عمل میں آئے گی، اس کے بعد اس کے مقابلہ پر شام (کے بادشاہ) کی طرف سے ایک لشکر بھیجا جائے گا لیکن وہ لشکر مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع مقام بیداء پر زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور پھر جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ (شام کا لشکر مکہ پہنچنے سے پہلے ہی زمین بوس کردیا گیا ہے، تو ملک شام کے ابدال اور عراق کے عصائب اس شخص کی خدمت میں پہنچیں گے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے پھر قریش میں سے ایک شخص اٹھے گا جس کے ننھیال قبیلہ کلب کی مدد حاصل کرے گا لیکن اس شخص کا لشکر اسی قریشی کے لشکر پر غالب آجائے گا پھر وہ شخص لوگوں کے درمیان ان کے پیغمبر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روش اور ان کے طریقہ کے مطابق (ملک وملت کا) نظم ونسق چلائے گا اور مسلمانوں کا دین اپنی گردن زمین پر رکھدے گا وہ شخص سات سال تک قائم وبرقرار رہے گا، پھر جان بحق ہوجائے گا اور مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔" (ابوداؤد)

حدیث میں جس ہستی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حضرت امام مہدی (رض) کی ذات گرامی مراد ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ابوداؤد نے اس روایت کو باب المہدی میں نقل کیا ہے۔ مدینہ سے مراد یا تو مدینہ طیبہ ہے، یا وہ شہر مراد ہے جہاں مذکورہ خلیفہ یا سربراہ حکومت کا انتقال ہوگا اور اس کے جانشین کے انتخاب پر لوگوں میں اختلاف ونزاع پیدا ہوجائے گا اس موقع پر حضرت امام مہدی (رض) کا مکہ بھاگ جانا، مذکورہ اختلاف ونزاع کے فتنہ سے بچنے کے لیے ہوگا اور مکہ چلے جانے کو ترجیح اس لیے دیں گے کہ وہ شہر مقدس نہ صرف یہ کہ ہر اس شخص کے لیے

جائے امن ہے جو اس میں پناہ لینے کا طالب ہو بلکہ سکون و عافیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنے کی سب سے بہتر جگہ ہے۔ بیداء اصل میں جنگل اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور مکان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہاں حدیث میں بیداء سے ایک مقام مراد ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ شام کے لشکر سے مراد سفیانی کا لشکر ہے، نیز اس لشکر کا امام مہدی کے خلاف محاذ آرائی کے لیے آنا دراصل سفیانی حکومت کا پیدا کردہ ایک فتنہ ہوگا جو حضرت امام مہدی کے ظاہر ہونے کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے اس بارے میں تقریباً تواتر کے ساتھ متعدد احادیث منقول ہیں ان میں سے ایک صحیح حدیث وہ ہے جس کو امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ۔ وہ سفیانی (جو آخر زمانہ میں شام کے علاقوں پر قابض و حکمران ہوگا) نسلی طور پر خالد ابن یزید ابن معاویہ ابن ابو اسوی کی پشت سے تعلق رکھتا ہوگا، وہ بڑے سر اور چیچک زدہ چہرے والا ہوگا، اس کی آنکھ میں ایک سفید دھبہ ہوگا، دمشق کی طرف اس کا ظہور ہوگا اس کے تابعداروں کی جماعت زیادہ تر قبیلہ کلب سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہوگی، لوگوں کا خون بہانا اس کی خاص عادت ہوگی، یہاں تک کہ وہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو ہلاک کر دیا کرے گا، وہ جب حضرت امام مہدی کے ظہور کی خبر سنے گا تو ان سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر بھیجے گا جو شکست کھا جائے گا، اس کے بعد وہ سفیانی بذات خود ایک لشکر لے کر حضرت امام مہدی کے مقابلہ کے لیے چلے گا لیکن وہ مقام بیداء پر پہنچ کر اپنے تمام لشکر والوں کے ساتھ زمین میں دھنس جائے گا اور کوئی بھی شخص زندہ نہیں بچے گا صرف ایک وہ شخص بچ جائے گا جو حضرت امام مہدی کو سفیانی اور اس کے لشکر کے عبرتناک حشر کی خبر پہنچائے گا۔" ابدال" اولیاء اللہ کے ایک گروہ کو کہتے ہیں جن کی برکت سے

اللہ تعالیٰ اس کائنات کے نظام کو برقرار اور استوار رکھتا ہے دنیا میں کل ابدال کی تعداد ستر رہتی ہے، اس میں چالیس ابدال تو شام میں رہتے ہیں اور تیس ابدال باقی ملکوں میں ان اولیاء اللہ کو ابدال اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی ادلی بدلی ہوتی رہتی ہے، یعنی جب ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے بدلے میں کوئی دوسرا مقرر کردیا جاتا ہے یا ان کو ابدال اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ ایسی مقدس ہستیاں ہیں جو عبادت و ریاضت کے ذریعہ اپنے اندر سے تمام بری عادتیں اور ناپسندیدہ خصلتیں ختم کردیتے ہیں اور ان کے بدلے میں اچھی عادتیں اور اعلیٰ اخلاق پیدا کرلیتے ہیں ! اس مقدس گروہ کے بارے میں احادیث میں ذکر آیا ہے گو سیوطی نے سنن ابوداؤد کی شرح میں لکھا ہے کہ ابدال کا ذکر صحاح ستہ میں نہیں آیا ہے علاوہ ابوداؤد کی اس حدیث کے جو یہاں نقل ہوئی ہے، اس حدیث کو حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے، تاہم سیوطی نے صحاح ستہ کے علاوہ دوسری مستند و معتبر کتابوں سے ایسی بہت سی احادیث کو جمع الجوامع میں نقل کیا ہے جن میں ابدال کا ذکر ہے، ان میں سے اکثر احادیث میں چالیس کا عدد مذکور ہے اور بعض میں تیس کا انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ابدال نے جو یہ اعلیٰ درجہ پایا ہے وہ بہت زیادہ نماز روزہ کرنے کی وجہ سے نہیں پایا ہے اور نہ ان عبادتوں کی وجہ سے ان کو تمام لوگوں سے ممتاز کیا گیا ہے بلکہ انھوں نے اتنا اعلیٰ درجہ سخاوت نفس، سلامتی دل اور مسلمانوں کی خیر خواہی رکھنے کی وجہ سے پایا ہے نیز آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔علی ! میری امت میں ایسے لوگوں کا وجود کہ جو ابدال کی صفت کے حامل ہوں، سرخ گندھک سے بھی زیادہ نادر ہے یعنی جس طرح سرخ گندھک بہت کمیاب چیز ہے اسی طرح دنیا میں ابدال بھی کم ہیں۔" ایک اور حدیث میں، جو حضرت معاذ بن

جبل (رض) سے منقول ہے، یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص میں تین صفتیں یعنی رضا بالقضاء، ممنوعات سے کلی احتراز اور اللہ کے دین کی خاطر غصہ کرنا، پائی جائیں اس کا شمار ابدال کی جماعت میں ہوتا ہے؟ نیز امام غزالی (رح) نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ جو شخص روزانہ تین مرتبہ یہ دعا پڑھنے کا التزام رکھے اس کے لیے ابدال کا درجہ لکھا جاسکتا ہے، دعا یوں ہے : آیت (اللھم اغفرلا مۃ محمد، اللھم ارحم امۃ محمد، اللھم تجاوز عن امۃ محمد۔" اے اللہ ! امت محمدی کی مغفرت فرما، اے اللہ امت محمدی پر رحم فرما، اے اللہ امت محمدی کے گناہوں سے درگذر فرما۔" حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے اندر سے تمام انسانی واخلاقی برائیاں بدل ڈالے اپنے نفس کو پوری طرح پاکیزہ اورمہذب بنالے اور مخلوق الٰہی کا خیر خواہ ہوجائے، تو اس کا شمار ابدال کی جماعت میں ہوگا۔" عصائب" بھی اولیاء اللہ کے ایک گروہ کا نام ہے جیسا کہ ابدال ! حضرت علی کرمہ اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ ابدال شام کے ملک میں رہتے ہیں، عصائب عراق کے ملک میں اور نجبا مصر کے ملک میں (ابدال اور عصائب کی طرح نجباء بھی اولیاء اللہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے) نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ" عصائب" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے معاشرہ میں سب سے زیادہ، عابد وزاہد اور نیک ہوں یہ وضاحت غالباً لغوی معنی کے اعتبار سے ہے، کیونکہ لغت میں" عصب القوم" قوم کے نیک ترین لوگوں کو کہتے ہیں۔ قبیلہ کلب کی لشکر آرائی اور اس کی طرف سے قتل وقتال کا واقع ہونا آخر زمانہ میں ایک" فتنہ" کے طور پر ظاہر ہوگا اور یہ فتنہ بھی حضرت امام مہدی (رض) کے ظہور کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔" اور مسلمانوں کا دین اپنی گردن پر رکھ دے گا" کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام قائم اور پائیدار ہوجائے گا' شریعت کی فرماں روائی پورے سکون و اطمینان کے ساتھ جاری ہوجائے گی اور تمام مسلمان

آسودگی واطمینان کے ساتھ زندگی گذاریں گے واضح رہے کہ" جران" اونٹ کی گردن کے اس اگلے حصہ کو کہتے ہیں جو ذبح کی جگہ سے نحر کی جگہ تک ہوتا ہے، اونٹ جب چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہے اور آرام لینے کے لیے بیٹھتا ہے تو اپنی گردن کے اس حصہ کو زمین پر دراز کردیتا ہے جس سے اس کو بہت راحت ملتی ہے پس یہاں دین کو اونٹ کی گردن سے تشبیہ دینے کا مقصد اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ حضرت امام مہدی کے زمانہ میں اسلام کو ثبات وقرار مل جائے گا کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی خلفشار نہیں ہوگا، باہمی مخالفت ومناقشت اور جنگ وجدال کا نام ونشان تک مٹ جائے گا، دین واسلام کی برتری، احکام سنت کی پابندی اور ملی نظام کی خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔

جھوٹے مہدیوں کا رد:

اس موقع پر یہ بتادینا ضروری ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس بات کا دعوی کیا ہے کہ وہ مہدی ہیں ان میں سے بعض لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے" مہدی" کے لغوی معنی'' ہدایت کرنے والا، مراد لیتے ہوئے اپنے کو" مہدی" کہا یا کہلوایا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی تردیدی بات نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ اگر وہ واقعہ ہدایت وراستی کی روشنی پھیلانے والے تھے اور ان کے ذریعہ مخلوق اللہ دین وآخرت کی صحیح رہنمائی حاصل کرتی تھی تو لغوی طور پر ان کو" مہدی" کہا جاسکتا ہے لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے محض دنیا والوں کو فریب میں مبتلا کرنے اور اپنی شخصیت کو غلط طور پر لوگوں کا مرجع ومقتدا بنانے کے لیے خود کو" مہدی موعود" کہا یا کہلوایا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بالکل جھوٹے اور مکار تھے، چنانچہ ایسے لوگوں نے مکروفریب کے جال پھیلا کر اور سادہ لو، مسلمانوں کو ورغلا کر اپنے تابعداروں کی جماعت تیار کی اور بعضوں نے تو

اوباش اور بدقماش افراد تک کو خرید کر اپنے گرد جمع کیا اور ان کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اپنے" مہدی موعود" ہونے کا پروپیگنڈہ کرایا بلکہ بعض شہروں اور ملکوں میں فتنہ وفساد پھیلایا، لڑائی جھگڑا کرایا اور آخر کار ان کا انجام بہت برا ہوا کہ صحیح العقیدہ مسلمانوں نے ان کی بھرپور مدافعت کی اور انھیں تہ تیغ کرکے ان شہروں اور ملکوں کے لوگوں کو ان کے فتنہ وفساد سے نجات دلائی! خود ہمارے ہندوستان میں ایسے ہی گمراہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی ہے جو اپنے کو" مہدویہ " کہلاتی تھی اس جماعت کے لوگ بہت جاہل اور پست خیال تھے ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ" مہدی موعود" ہمارے پیشوا کی صورت میں ظاہر ہوا پھر وفات پا گیا اور خراسان کے ایک شہر میں دفن کر دیا گیا! ان کی گمراہیوں میں سے ایک بڑی گمراہی، ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جو شخص ہمارے نظریہ وخیال کا عقیدہ نہ رکھے اور ہماری بات سے متفق نہ ہو وہ کافر ہے۔ اسی بنا پر اس زمانہ میں مکہ کے چاروں مسلک کے علماء نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ صاحب اقتدار مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان گمراہ لوگوں کو قتل کر دیں اسی طرح شیعہ حضرات کا یہ اعتقاد اور قول بھی بالکل فاسد ہے کہ" مہدی موعود" دراصل محمد ابن حسن عسکری ہیں جن کا انتقال نہیں ہوا ہے بلکہ وہ نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، وہ امام زماں ہیں اور اپنے وقت پر ظاہر ہو کر اپنی امامت اور حاکمیت کا اعلان کریں گے اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ قول بھی سرے سے غلط اور باطل ہے، اس کی تردید میں علم کلام کی کتابیں دلائل سے بھری ہوئی ہیں، علاوہ ازیں کتاب عروہ الوثقی میں یہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ حضرت محمد ابن حسن عسکری کا انتقال ہو گیا ہے۔"

قیامت آنے کی دس بڑی نشانیاں

حدیث:

عن حذيفة بن أسيد الغفاري قال اطلع النبي صلى الله عليه وسلم علينا ونحن نتذاكر. فقال ما تذكرون؟. قالوا نذكر الساعة. قال إنها لن تقوم حتى تروا قبلها عشر آيات فذكر الدخان والدجال والدابة وطلوع الشمس من مغربها ونزول عيسى بن مريم ويأجوج ومأجوج وثلاثة خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزيرة العرب وآخر ذلك نار تخرج من اليمن تطرد الناس إلى محشرهم. وفي رواية نار تخرج من قعر عدن تسوق الناس إلى المحشر. وفي رواية في العاشرة وريح تلقي الناس في البحر. رواه مسلم.

ترجمہ:

حضرت حذیفہ ابن اسید غفاری (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ آپس میں قیامت کا ذکر کر رہے تھے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری طرف آنکلے اور پوچھا کہ تم لوگ کس چیز کا ذکر کر رہے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے ہیں تب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" یقیناً قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیوں کو نہ دیکھ لوگے، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دس نشانیوں کو اس ترتیب سے ذکر فرمایا ۱ دھواں ۲ دجال ۳ دابہ الارض ٤ سورج کا مغرب کی طرف سے نکلنا ٥ حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نازل ہونا ٦ یاجوج ماجوج کا ظاہر ہونا اور (چھٹی، ساتویں اور آٹھویں نشانی کے طور پر، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین خسوف کا (یعنی تین مقامات پر زمین کے دھنس جانے کا) ذکر فرمایا ایک تو مشرق کے علاقہ میں، دوسرے مغرب کے علاقہ میں اور تیسرے جزیرہ عرب کے علاقہ

اور دسویں نشانی، جو سب کے بعد ظاہر ہوگی، وہ آگ ہے جو یمن کی طرف سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو گھیر ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائے گی اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ وہ ایک ایسی آگ ہوگی جو (یمن کے مشہور شہر عدن کے آخری کنارے سے نمودار ہوگی اور لوگوں کو ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائے گی نیز ایک روایت میں دسویں نشانی کے طور پر یمن کی طرف سے یا عدن کے آخری کنارے سے آگ کے نمودار ہونے کے بجائے) ایک ایسی ہوا کا ذکر کیا گیا ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔" (مسلم)

حدیث میں قیامت کی جن دس بڑی نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں پہلی نشانی کے طور پر دھویں کا ذکر ہے، چنانچہ وہ ایک بڑا دھواں ہوگا جو ظاہر ہو کر مشرق سے مغرب تک تمام زمین پر چھا جائیگا اور مسلسل چالیس روز تک چھایا رہے گا اس کی وجہ سے تمام لوگ سخت پریشان ہو جائیں گے، مسلمان تو صرف دماغ وحواس کی کدورت اور زکام میں مبتلا ہوں گے مگر منافقین وکفار بیہوش ہو جائیں گے اور ان کے ہوش وحواس اس طرح مختل ہو جائیں گے کہ بعضوں کو کئی دن تک ہوش نہیں آئے گا واضح رہے کہ قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آیت (فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ) 44۔ الدخان 10 :) تو حضرت حذیفہ (رض) اور ان کے تابعین کے قول کے مطابق اس آیت میں اسی دھویں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن حضرت ابن مسعود اور ان کے تابعین کے نزدیک اس آیت میں دھویں سے مراد غلہ کا وہ قحط ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں قریش مکہ پر نازل ہوا تھا اور جس کا حقیقی سبب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ بدعا تھی کہ اے اللہ! تو ان لوگوں پر (جو سرکشی

اور اسلام دشمنی میں حد سے بڑھ گئے ہیں سات سال کا قحط نازل فرما جیسا کہ تو نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں مصریوں پر نازل فرمایا تھا، چنانچہ اس بددعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو سخت ترین غذائی قحط میں مبتلا کیا یہاں تک کہ وہ چمڑے، و مردے اور دوسری الا بلا چیزیں کھانے لگے تھے اس عرصہ میں انھیں فضا میں دھوئیں کی مانند ایک چیز نظر آتی تھی جس کو وہ اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے جیسا کہ کوئی بھوکا ضعف و کمزوری کی شدت کے سبب اپنی آنکھوں کے آگے تاریکی محسوس کرتا ہے اور فضا میں بھری ہوئی ہوا اس کو دھوئیں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، ویسے بھی جب کسی علاقہ میں قحط سالی پھیل جاتی ہے تو بارش نہ ہونے کی وجہ سے پورے ماحول میں خشکی اور گرد و غبار کی جو کثرت ہو جاتی ہے وہ فضا کو اس طرح مکدر کر دیتی ہے کہ چاروں طرف دھوئیں کی صورت میں اندھیرا معلوم ہونے لگتا ہے۔

"دابۃ الارض" سے مراد ایک عجیب الخلقت اور نادر شکل کا جانور ہے جو مسجد حرام میں کوہ صفا و مروہ کے درمیان سے برآمد ہوگا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ان الفاظ واخرجنا لھم دابۃ من الارض کے ذریعہ کیا گیا ہے! علماء نے لکھا ہے کہ وہ جانور چوپایہ کی صورت میں ہوگا جس کی درازی ساٹھ گز کی ہوگی اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس عجیب الخلقت جانور کی شکل یہ ہوگی کہ چہرہ انسانوں کی طرح پاؤں اونٹ کی طرح گردن گھوڑے کی طرح سرین ہرن کی طرح سینگ بارہ سنگے کی طرح اور ہاتھ بندر کی طرح ہوں گے! نیز اس کے نمودار ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ کوہ صفا جو کعبہ کی مشرقی جانب واقع ہے، یکا یک زلزلہ سے پھٹ جائے گا اور اس میں سے یہ جانور نکلے گا، اس کے ہاتھ میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں حضرت سلیمان کی انگشتری ہوگی تمام شہروں اور علاقوں میں اتنی تیزی کے ساتھ دورہ کرے گا کہ کوئی فرد بشر

اس کا پیچھا نہ کر سکے گا اور دوڑ میں اس کا مقابلہ کر کے اس سے چھٹکارا نہ پا سکے گا جہاں جہاں جائے گا ہر شخص پر نشان لگاتا جائے گا جو صاحب ایمان ہوگا اس کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عصاء سے چھوئے گا اور اس کی پیشانی پر" مومن" لکھ دے گا اور جو کافر ہوگا اس پر حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی انگشتری سے سیاہ مہر لگا دے گا اور اس کے منہ پر کافر لکھ دے گا! بعض حضرات نے کہا ہے کہ دابۃ الارض تین مرتبہ نکلے گا ایک دفعہ تو حضرت امام مہدی کے زمانہ میں پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں اور پھر آخری دفعہ آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے بعد۔ آفتاب کے مغرب کی طرف سے نکلنے کے سلسلے میں وضاحت آگے آنے والی ایک حدیث کی تشریح میں بیان ہوگی! آسمان سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نزول حضرت امام مہدی کے ظہور کے بعد ہوگا، چنانچہ آپ ایک دن شام کے وقت آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی سفید منارہ پر اتریں گے اور پھر دجال کو تلاش کر کے اس کو دروازہ لد پر قتل کریں گے" لد" شام میں ایک موضع کا نام ہے اور بعض حضرات نے اس کو فلسطین کے ایک موضع کا نام بتایا ہے واضح رہے کہ یہاں حدیث میں جن دس نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترتیب کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ان میں سے سب سے پہلے جس نشانی کا ظہور ہوگا وہ دھواں ہے، اس کے بعد دجال نکلے گا پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان سے نازل ہوں گے، پھر یاجوج ماجوج نکلیں گے، پھر دابۃ الارض نکلے گا اور پھر آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا یہ بات اس لیے کہی جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر اہل ایمان کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا کیونکہ سارے کفار مسلمان ہوں گے ان کا ایمان مقبول ہوگا، اس کے برخلاف اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کی جانب سے آفتاب کا طلوع ہونا، دجال

کے نکلنے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نازل ہونے سے پہلے ہوگا تو ظاہر ہے کہ جو کفار حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں مسلمان ہوں گے ان کا ایمان مقبول قرار نہ پائے کیونکہ آفتاب مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا اور اس وقت کسی کافر کا ایمان قبول کرنا معتبر نہیں ہوگا جب کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں ایمان قبول کرنے والے تمام لوگوں کا ایمان معتبر ہوگا اور وہ مسلمان مانے جائیں گے! پس حدیث میں مذکورہ نشانیوں کو جس ترتیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہ ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے کی اصل ترتیب نہیں ہے اور نہ یہاں اصل ترتیب کا ذکر کرنا مراد ہے بلکہ اصل مقصد ان نشانیوں کو ایک جگہ ذکر کرنا ہے سو بلا لحاظ ترتیب ان کو ایک جگہ ذکر کر دیا گیا لہٰذا یہ اشکال وار نہیں ہوسکتا کہ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نزول آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے واقعہ سے پہلے ہوگا تو یہاں نزول آفتاب کے بعد کیوں ذکر کیا گیا" یاجوج ماجوج" دراصل دو قبیلوں کے نام ہیں جو یافث ابن نوح کی اولاد میں سے ہیں، یہ دونوں قبیلے بہت وحشی مگر طاقتور تھے ان کا خاص مشغلہ لوٹ مار اور زمین پر فساد پھیلانا تھا، یہ قبیلے جس گھاٹی میں رہا کرتے تھے اس کو ذوالقرنین نے ایک ایسی دیوار سے جس کی بلندی اس گھاٹی کے دونوں طرف کے پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچتی ہے اور موٹائی ۶۰ گز کی ہے، بند کرا دیا تھا تاکہ لوگ ان قبیلوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکیں، جب قیامت آنے کو ہوگی اور یاجوج ماجوج کے نکلنے کا وقت آئے گا تو دیوار ٹوٹ جائے گی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین خسوف کا ذکر فرمایا" کے بارے میں ابن مالک نے کہا ہے کہ عذاب الٰہی کے طور پر زمین کا دھنس جانا مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں واقع ہوچکا ہے لیکن احتمال ہے کہ یہاں حدیث میں جن

تین خسوف کا ذکر فرمایا ہے وہ پہلے واقع ہو چکنے والے خسوف کے علاوہ ہوں گے اور ان سے بھی زیادہ سخت ہوں گے۔" اور لوگوں کو ہانک کر زمین حشر کی طرف لے جائے گی" میں زمین حشر سے مراد ملک شام کا وہ علاقہ ہے جہاں وہ آگ لوگوں کو لے جا کر چھوڑے گی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس آگ کی ابتداء ملک شام سے ہوگی، یا یہ کہ ملک شام کو اس قدر وسیع و فراخ کر دیا جائے گا کہ پورے عالم کے لوگ اس میں جمع ہو جائیں گے بہر حال حدیث کے اس جملہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس آگ کا لوگوں کو ہانکنا، حشر کے بعد ہوگا۔ اگر زمین حشر سے مراد میدان حشر لیا جاتا تو یقیناً یہ مفہوم پیدا ہوتا اور اس پر اعتراض بھی واقع ہوتا لیکن جب یہاں '' میدان حشر" مراد ہی نہیں ہے تو پھر کوئی اعتراض بھی پیدا نہیں ہوسکتا! نیز ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ وہ آگ حجاز کی سرزمین سے نمودار ہوگی، جب کہ یہاں حدیث میں اس کا یمن کی جانب سے نمودار ہونا بیان کیا گیا ہے) لہٰذا قاضی عیاض نے یہ کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ قیامت کی نشانی کے طور پر جس آگ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک نہیں دو ہوں گی اور وہ دونوں، لوگوں کو گھیر کر ہانک کر زمین حشر (یعنی ملک شام) کی طرف لے جائیں گی۔ یا یہ کہ وہ آگ تو ایک ہی ہوگی جو ابتداء میں یمن کی جانب سے نکلے گی لیکن اس کا ظہور حجاز کی سرزمین سے ہوگا۔ اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں بخاری کی جو روایت ہے اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے سب سے پہلی علامت وہ آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق کی طرف سے گھیر ہانک کر مغرب کی طرف لے جائے گی جب کہ حقیقت میں وہ آگ سب سے آخری علامت ہوگی جیسا کہ یہاں حدیث میں مذکور ترتیب سے بھی واضح ہوتا ہے، پس اس تضاد کو اس تاویل کے ذریعہ دور کیا جائے گا کہ آگ کی سب سے آخری نشانی مذکورہ آگ

ہوگی اور بخاری کی روایت میں آگ کو جو سب سے پہلی نشانی قرار دیا گیا ہے تو وہ اس اعتبار سے کہ آگ، قیامت کی ان نشانیوں میں سے سب سے پہلی نشانی ہوگی جن کے بعد دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی بلکہ ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ہی صور پھونکا جائے گا، ان کے برخلاف یہاں حدیث میں جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک نشانی کے بعد بھی دنیا کی چیزیں باقی رہیں گی۔ ایک ایسی ہوا کا ذکر کیا گیا ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی یہ روایت بظاہر اس روایت کے خلاف ہے جس میں آگ کا ذکر ہے پس ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت و یکسانیت پیدا کرنے کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اس دوسری روایت میں لفظ ناس (لوگوں) سے مراد کفار ہیں اور ان کو ہانکنے والی آگ ہوا کے سخت جھکڑ کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی تا کہ ان کفار کو سمندر میں دھکیلنے کا عمل زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پورا ہو، نیز مذکورہ آگ جس کا پانی آگ کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا، چنانچہ قرآن کریم ان الفاظ واذا البحار سجرت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ تبدیل ہو جائے گا چنانچہ قرآن کریم کے ان الفاظ میں اسی حقیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے برخلاف مومنین کے لیے جو آگ ہوگی وہ محض ان کو ڈرانے کے لیے ہوگی اور کوڑے کی طرح اس کا کام یہ ہوگا کہ انھیں ہانک کر زمین حشر اور موقف اعظم کی طرف لے جائے۔

ہر نبی نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے

حدیث:

وعن أنس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من نبی إلا أنذر أمتہ الأعور الکذاب ألا إنہ أعور وإن ربکم لیس بأعور مکتوب بین عینیہ ك ف ر . متفق علیہ.

ترجمہ:

حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" ایسا کوئی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہیں گزرا جس نے اپنی امت کو جھوٹے کانے (دجال سے نہ ڈرایا ہو آگاہ رہو، دجال کانا ہوگا اور تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے، نیز اس دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر (یعنی کفر کا لفظ) لکھا ہوگا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح:

ایسا کوئی نبی نہیں گزرا الخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دجال کے ظاہر ہونے کا متعینہ وقت کسی پر بھی ظاہر نہیں فرمایا بس اس قدر معلوم ہے کہ وہ قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا اور چونکہ قیامت آنے کا متعین وقت کسی کو نہیں معلوم ہے اس لیے دجال کے ظاہر ہونے کا متعین وقت بھی کسی کو نہیں معلوم۔ ک ف ر سے کفر کا لفظ مراد ہے، چنانچہ مصابیح اور مشکوۃ کے نسخوں میں یہ تینوں حرف اسی طرح علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے ہیں اور اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گویا دجال کے چہرے پر کفر کا لفظ اسی طرح لکھا ہوگا نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دجال دراصل تباہی و ہلاکت یعنی کفر کی طرف بلانے والا اور کفر کے پھیلنے کا باعث ہوگا نہ کہ فلاح ونجات کی طرف

بلانے والا ہوگا،اس سے بچنا اور اس کی اطاعت نہ کرنا واجب ہوگا درحقیت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے کہ دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان کفر کا لفظ نمایاں ہوگا جس سے ہر صاحب ایمان کو اس کے مکروفریب سے بچنے میں آسانی ہوگی۔

دجال کی جنت اور دوزخ

حدیث؛

وعن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا أحدثكم حديثا عن الدجال ما حدث به نبي قومه؛ إنه أعور وإنه يجيء معه بمثل الجنة والنار فالتي يقول إنها الجنة هي النار وإني أنذركم كما أنذر به نوح قومه. متفق عليه. (متفق عليه)

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" آگاہ رہو کہ دجال کے بارے میں ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی قوم کو نہیں بتائی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ دجال کانا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ جنت و دوزخ کی مانند دو چیزیں لائے گا پس وہ جس چیز کو جنت کہے گا حقیقت میں وہ آگ ہوگی لہذا میں تمہیں اس دجال سے ڈراتا ہوں جیسا کہ نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو اس سے ڈرایا تھا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح؛

مطلب یہ ہے کہ دجال کے پاس چونکہ بڑی زبردست طلسماتی طاقت ہوگی اس لیے وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا باغ اور آگ کا پھندا لیے پھرے گا جس کو وہ اپنی جنت اور دوزخ سے تعبیر

کرے گا! یا جنت سے مراد آسائش و راحت کے سامان یا اس کے الطاف وعنایات ہیں اور دوزخ سے مراد رنج وکلف کی چیزیں اور اس کی ایذارسانیاں ہیں۔ ”حقیت میں وہ آگ ہوگی۔“ کی وضاحت ایک شارح نے یہ کی ہے کہ کسی شخص کا دجال کی اس جنت میں داخل ہونا اور اس کو قبول کرنا درحقیت عذاب الٰہی میں گرفتار ہونا اور دوزخ میں جانے کا راستہ اختیار کرنا ہے اسی پر قیاس کر کے دوسرا جزیوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دجال جس چیز کو دوزخ کہے گا حقیقت میں وہ بہشت ہوگی، یعنی جو شخص اس کی اطاعت نہیں کرے گا اور اس کی وجہ سے وہ اس کو اپنی دوزخ میں ڈالے گا وہ شخص درحقیقت دجال کی تکذیب کرنے اور اس کے آگے جھکنے سے انکار کردینے کے سبب بہشت میں داخل ہوگا! ایک وضاحت تو یہ ہے، لیکن زیادہ قریبی مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دجال جس چیز کو اپنی جنت اور جس چیز کو اپنی دوزخ بتائے گا اور ان میں جن لوگوں کو داخل کرے گا وہ دونوں کے لیے بالکل برعکس ثابت ہوں گی اور ان کا فعل الٹا ہوجائے گا یعنی جن لوگوں کو تکلیف واذیت میں مبتلا کرنے کے لیے اپنی دوزخ میں ڈالے گا وہ ان کے لیے رنج وتکلیف کے بجائے اطمینان وراحت کی جگہ بن جائے گی اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے ہے القبر روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النار (قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے) یعنی قبر کا ماحول اور اس کا فعل بندوں کے اعتبار سے مختلف ہوجاتا ہے، جس بندے سے اللہ خوش ہوتا ہے اس کے لیے اس کی قبر رنج وکلفت کی آلام گاہ ہوجاتی ہے اور اس کے قبیل سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یانار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم (اے آگ تو ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی کا سبب بن جا) نیز یہی حال اس مکدر دنیا کا ہے جس کو ”قید خانہ“ کہا گیا ہے

لیکن یہی قید خانہ اپنی تمام تر سختیوں اور تنگیوں کے باوجود ان عارفین اور اہل اللہ کے لیے جنت کا روپ اختیار کر لیتا ہے جو مقام رضا پر فائز ہوتے ہیں اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر یہاں کی ہر تنگی و سختی کو صبر و عزیمت اور خوش دلی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ولمن خاف مقام ربہ جنتن ۔کہ ان مردان حق آگاہ کے لیے دو جنتیں ہیں، ایک تو یہی دنیا ان کے لیے جنت بن جاتی ہے اور ایک جنت انھیں عقبیٰ میں ملے گی اسی لیے عارفین کی نظر میں دنیا بالکل برعکس معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک دنیا کی نعمت وراحت درحقیقت نقمت یعنی عذاب ہوتی ہے اور یہاں کی نقمت حقیقت میں نعمت ہوتی ہے ۔واضح رہے کہ حدیث کا اصل مقصد چونکہ لوگوں کو دجال کی فریب کاریوں سے ڈرانا ہے اس لیے اس موقع پر صرف پہلے جز، یعنی دجال کی جنت کی حقیقت کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا، اگرچہ بعض دوسری حدیثوں میں دوسرے جزء یعنی اس کی دوزخ کی حقیقت کو بھی صریح بیان فرمایا گیا ہے پس مفہوم کے اعتبار سے اس موقع پر پوری عبارت گویا یوں ہوگی کہ" پس وہ جس چیز کو جنت کہے گا حقیقت میں وہ آگ ہوگی اور جس چیز کو دوزخ کہے گا حقیقت میں وہ جنت ہوگی ۔دجال کے سلسلے میں عمومی طور پر ہر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر کرنے کے بعد پھر آخر میں خاص طور پر حضرت نوح (علیہ السلام) کا ذکر کرنا اس حقیقت کی بناء پر ہے کہ مشاہیر انبیاء میں انھیں کی ذات مقدم ہے۔

دجال کے طلسماتی کارناموں اور یاجوج موج کا ذکر

حدیث؛

وعن النواس بن سمعان قال ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدجال فقال إن یخرج وأنا فیکم فأنا حجیجہ دونکم وإن یخرج ولست فیکم فامرؤ حجیج نفسہ واللہ

خليفتي على كل مسلم إنه شاب قطط عينه طافيه كأني أشبهه بعبد العزى بن قطن فمن أدركه منكم فليقرأ عليه فواتح سورة الكهف. وفي رواية فليقرأ عليه بفواتح سورة الكهف فإنها جواركم من فتنته إنه خارج خلة بي الشام والعراق فعاث يمينا وعاث شمالا يا عباد الله فاثبتوا. قلنا يارسول الله وما لبثه في الأرض؟ قال أربعون يوما يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر أيامه كأيامكم. قلنا يارسول الله فذلك اليوم الذي كسنة أتكفينا فيه صلاة يوم. قال لا اقدروا له قدره. قلنا يارسول الله وما إسراعه في الأرض؟ قال كالغيث استدبرته الريح فيأتي على القوم فيدعوهم فيؤمنون به فيأمر السماء فتمطر والأرض فتنبت فتروح عليهم سارحتهم أطول ما كانت ذرى وأسبغه ضروعا وأمده خواصر ثم يأتي القوم فيدعوهم فيردون عليه قوله فينصرف عنهم فيصبحون ممحلين ليس بأيديهم شيء من أموالهم ويمر بالخربة فيقول لها أخرجي كنوزك فتتبعه كنوزها كيعاسيب النحل ثم يدعو رجلا ممتلئا شبابا فيضربه بالسيف فيقطعه جزلتين رمية الغرض ثم يدعوه فيقبل ويتهلل وجهه يضحك فبينما هو كذلك إذ بعث الله المسيح بن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهروذتين واضعا كفيه على أجنحة ملكين إذا طأطأ رأسه قطر وإذا رفعه تحدر منه مثل جمان كاللؤلؤ فلا يحل لكافر يجد من ريح نفسه إلا مات ونفسه ينتهي حيث ينتهي طرفه فيطلبه حتى يدركه بباب لد فيقتله ثم يأتي عيسى إلى قوم قد عصمهم الله منه فيمسح عن وجوههم ويحدثهم بدرجاتهم في الجنة فبينما هو كذلك إذ أوحى الله إلى عيسى إني قد أخرجت عبادا لي لا يدان لأحد بقتالهم فحرز عبادي إلى الطور ويبعث الله يأجوج ومأجوج (وهم من كل حدب ينسلون) فيمر أوائلهم على بحيرة طبرية فيشربون ما فيها ويمر آخرهم ويقول لقد كان بهذه مرة ماء ثم يسيرون حتى ينتهوا إلى جبل الخمر وهو جبل بيت المقدس فيقولون لقد قتلنا من في الأرض هلم فلنقتل من في السماء فيرمون بنشابهم إلى السماء فيرد الله عليهم نشابهم مخضوبة دما ويحصر نبي الله وأصحابه حتى يكون رأس الثور لأحدهم خيرا من مائة دينار لأحدكم اليوم فيرغب نبي الله عيسى وأصحابه فيرسل الله عليهم النغف في رقابهم فيصبحون فرسى كموت نفس

واحدة ثم يهبط نبي الله عيسى وأصحابه إلى الأرض فلا يجدون في الأرض موضع شبر إلا ملأه زهمهم ونتنهم فيرغب نبي الله عيسى وأصحابه إلى الله فيرسل الله طيرا كأعناق البخت فتحملهم فتطرحهم حيث شاء الله. وفي رواية تطرحهم بالنهبل ويستوقد المسلمون من قسيهم ونشابهم وجعابهم سبع سنين ثم يرسل الله مطرا لا يكن منه بيت مدر ولا وبر فيغسل الأرض حتى يتركها كالزلفة ثم يقال للأرض أنبتي ثمرتك وردي بركتك فيومئذ تأكل العصابة من الرمانة ويستظلون بقحفها ويبارك في الرسل حتى إن اللقحة من الإبل لتكفي الفئام من الناس واللقحة من البقر لتكفي القبيلة من الناس واللقحة من الغنم لتكفي الفخذ من الناس فبينا هم كذلك إذ بعث الله ريحا طيبة فتأخذهم تحت آباطهم فتقبض روح كل مؤمن وكل مسلم ويبقى شرار الناس يتهارجون فيها تهارج الحمر فعليهم تقوم الساعة رواه مسلم إلا الرواية الثانية وهي قوله تطرحهم بالنهبل إلى قوله سبع سنين. رواها الترمذي.

••••••

ترجمہ:

حضرت نواس ابن سمعان (رض) کہتے کہ (ایک دن) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دجال (کے نکلنے) اس کی فریب کاریوں اور اس کے فتنہ میں لوگوں کے مبتلا ہونے) کا ذکر فرمایا اگر دجال نکلے اور (بالفرض) میں تمہارے درمیان موجود ہوں تو میں اس سے تمہارے سامنے جھگڑوں اور دلیل کے ذریعہ اس پر غالب آؤں) اور اگر دجال اس وقت نکلا جب میں نہ ہوں گا تو پھر تم میں سے ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے اس سے جھگڑنے والا ہوگا اور میرا وکیل وخلیفہ ہر مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ ہے دجال جوان ہوگا اس کے بال گھونگریالے ہوں گے اور اس کی آنکھ پھولی ہوگی گویا میں اس کو قطن کے بیٹے عبدالعزی سے تشبیہہ دے سکتا ہوں پس تم میں سے جو شخص اس کو پائے اس کو چاہیے کہ وہ اس کے سامنے سورت کہف کی ابتدائی آیتیں

پڑھے" اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے یہ الفاظ ہیں کہ اس کو چاہیے کہ وہ۔۔۔اس کے سامنے سورت کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے کیونکہ وہ آیتیں تمہیں دجال کے فتنہ سے مامون و محفوظ رکھیں گی (جان لو) دجال اس راستہ سے نمودار ہوگا جو شام اور عراق کے درمیان ہے اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا (پس) اے اللہ کے بندو! (اس وقت جب کہ دجال نکلے) تم (اپنے دین پر) ثابت قدم رہنا" راوی کہتے ہیں کہ) ہم نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! وہ کتنے دنوں زمین پر رہے گا؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چالیس دن، (اور زمانہ کی طوالت کے اعتبار سے ان میں سے) ایک دن تو ایک سال کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک مہینے کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے دونوں کے مطابق (یعنی ہمیشہ کے دنوں کی طرح) ہوں گے" ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ان دنوں میں سے جو ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس روز ہماری ایک دن کی نماز کافی ہوگی؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نہیں بلکہ نماز پڑھنے کے لیے ایک دن کا حساب لگانا ہوگا۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! زمین پر کتنا زیادہ تیز چلے گا (یعنی اس کی رفتاری کی کیا کیفیت ہوگی؟) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ اس مہینہ یعنی ابر کی مانند تیز رفتار ہوگا جس کے پیچھے ہوا ہو! وہ ایک ایک قوم کے پاس پہنچے گا اور اس کو اپنی دعوت دے گا (یعنی اپنی اتباع کی طرف بلائے گا اور برائی کے راستہ پر لگائے گا) لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے یعنی اس کے فریب میں آ کر اس کی اتباع کرنے لگیں) پھر وہ (اپنے تابعداروں کو نوازنے کے لئے) ابر کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو ابر بارش برسائے گا اور زمین کو سبزہ اگانے کا حکم دے گا تو زمین سبزہ اگائے گی۔

پھر جب شام کو اس قوم کے (وہ) مویشی آئیں گے جو چرنے کے لیے صبح کے وقت جنگل و بیابان گئے تھے تو ان کے کوہان بڑے بڑے ہو جائیں گے اور ان کی کوکھیں (خوب کھانے پینے کی وجہ سے) تن جائیں گی پھر اس کے بعد دجال ایک اور قوم کے پاس پہنچے گا اور اس کو اپنی دعوت دے گا (یعنی اپنی خدائی کی طرف بلائے گا اور کہے گا کہ مجھے اپنا پروردگار تسلیم کرو) لیکن اس قوم کے لوگ اس کی دعوت کو رد کر دیں گے (یعنی وہ اس کی بات کو قبول نہیں کریں گے اور اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے اور وہ ان کے پاس سے چلا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اس قوم کی طرف سے پھیر دے گا) پھر اس قوم کے لوگ قحط و خشک سالی اور تباہ حالی کا شکار ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ مال و اسباب سے و بالکل خالی ہاتھ ہو جائیں گے، اس کے بعد دجال ایک ویرانہ پر سے گزرے گا اور اس کو حکم دے گا وہ اپنے خزانوں کو نکال دے چنانچہ وہ ویرانہ دجال کے حکم کے مطابق اپنے خزانوں کو اگل دے گا اور) وہ خزانے اس طرح اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں گے جس طرح شہد کی مکھیوں کے سردار ہوتے ہیں، پھر دجال ایک شخص کو جو جوانی سے بھرپور یعنی نہایت قوی و توانا جوان ہوگا اپنی طرف بلائے گا اور (اس بات سے غصہ ہو کر کہ وہ اس کی الوہیت سے انکار کر دے گا، یا محض اپنی طاقت و قدرت ظاہر کرنے اور اپنے غیر معمولی کارناموں کی ابتداء کے لئے) اس پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارے گا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے جیسا کہ تیر نشانے پے پھینکا جاتا ہے (یعنی اس کے جسم کے وہ دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ پر جا کر گریں گے جتنا فاصلہ تیر چلانے والے اور اس کے نشانے کے درمیان ہوتا ہے اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس کی تلوار کا ہاتھ اس کے جسم پر اس طرح پہنچے گا جس طرح تیر اپنے نشانے پر پہنچتا ہے) اس کے بعد دجال

اس نوجوان (کے جسم کے ان ٹکڑوں) کو بلائے گا، چنانچہ وہ زندہ ہو کر دجال کے طرف متوجہ ہوگا اور اس وقت اس کا چہرہ نہایت بشاش، روشن اور کھلا ہوا ہوگا غرضیکہ دجال اسی طرح کی فریب کاریوں اور گمراہ کرنے والے کاموں میں مشغول ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم (علیہ السلام) کو نازل فرمائے گا جو دمشق کے شرقی جانب کے سفید منارہ پر سے اتریں گے، اس وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوں گے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے (آسمان سے نازل ہوں گے وہ جس وقت اپنا سر جھکائیں گے تو پسینہ ٹپکے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے سر سے چاندی کے دانوں کی مانند قطرے گریں گے جو موتیوں کی طرح ہوں گے، یہ ناممکن ہوگا کہ کسی کافر تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے سانس کی ہوا پہنچے اور وہ مر نہ جائیں (یعنی جو بھی کافر ان کے سانس کی ہوا پائے گا مر جائے گا) اور ان کے سانس کی ہوا ان کی حد نظر تک جائے گی پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ وہ اس کو باب لد پر پائیں گے اور قتل کر ڈالیں گے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے دجال کے مکر و فریب اور فتنہ سے محفوظ رکھا ہوگا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان لوگوں کے چہروں سے گرد و غبار صاف کریں گے اور ان کو ان درجات و مراب کی بشارت دیں گے جو وہ جنت میں پائیں گے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اسی حال میں ہوں گے کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس یہ وحی آئے گی کہ میں نے اپنے بہت سے ایسے بندے پیدا کئے ہیں جن سے لڑنے کی قدرت و طاقت کوئی نہیں رکھتا۔لہٰذا تم میرے بندوں کو جمع کر کے کوہ طور کی طرف لے جاؤ اور ان کی حفاظت کرو، پھر اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو ظاہر کرے گا جو ہر بلند

زمین کو پھلانگتے ہوئے اتریں گے اور دوڑیں گے، (ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی کہ جب ان سب سے پہلی جماعت بحیرہ طبریہ کو خالی دیکھ کر) کہے گی کہ اس میں کبھی پانی تھا اس کے بعد یاجوج ماجوج آگے بڑھیں گے یہاں تک کہ جبل خمر تک پہنچ جائیں گے اور پھر کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو ختم کر دیا ہے، چلو آسمان والوں کا خاتمہ کر دیں، چنانچہ وہ آسمان کی طرف اپنے تیر پھینکیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے لوٹا دے گا (تا کہ وہ اس بھرم میں رہیں کہ ہمارے تیر واقعتہً آسمان والوں کا کام تمام کر کے واپس آئے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دے دی جائے گی اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ تیر فضا میں پرندوں کو لگیں گے اور ان کے خون سے آلودہ ہو کر واپس آئیں گے، پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دجال کا فتنہ زمین ہی تک محدود نہیں رہیں گا بلکہ زمین کے اوپر بھی پھیل جائے گا) اس عرصہ میں اللہ کے نبی اور ان کے رفقاء یعنی حضرت عیسیٰ اور اس وقت کے مومن کوہ طور پر روکے رکھے جائیں گے اور (ان پر اسباب معیشت کی تنگی وقلت اس درجہ کو پہنچ جائے گی کہ) اس کے لیے بیل کا سر تمہارے آج کے سو دیناروں سے بہتر ہوگا (جب یہ حالت ہو جائے گی تو) اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے لیے دعا وزاری کریں گے، پس اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں نغف یعنی کیڑے پڑ جانے کی بیماری بھیجے گا جس کی صورت میں ان پر اللہ کا قہر اس طرح نازل ہوگا کہ سب کے سب ایک ہی وقت موت کے گھاٹ اتر جائیں گے) اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی (اس بات سے اگاہ ہو کر) پہاڑ سے زمین پر آئیں گے اور انھیں زمین پر ایک بالشت کا ٹکڑا بھی ایسا نہیں ملے گا جو یاجوج ماجوج کی چربی اور بدبو سے خالی ہو (اس مصیبت کے دفعیہ کے لئے) حضرت

عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تب اللہ تعالیٰ بختی اونٹ کی گردن جیسی لمبی لمبی گردنوں والے پرندوں کو بھیجے گا جو یاجوج ماجوج کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیں گے" اور مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں، تیروں اور ترکشوں کو سات سال تک چلاتے رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ایک زوردار بارش بھیجے گا جس سے کوئی بھی مکان خواہ وہ مٹی کا ہو یا پتھر کا اور خواہ صوف کا ہو، نہیں بچے گا وہ بارش زمین کو دھو کر آئینہ کی مانند صاف کردے گی پھر زمین کو حکم دیا جائے گا کہ اپنے پھلوں" یعنی اپنی پیداوار کو نکال اور اپنی برکت کو واپس لا، چنانچہ (زمین کی پیداوار اس قدر بابرکت اور باافراط ہوگی کہ) دس سے لے کر چالیس آدمیوں تک کی پوری جماعت ایک انار کے پھل سے سیر ہو جائے گی اور اس انار کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے، نیز دودھ میں برکت دی جائے گی، (یعنی اونٹ اور بکریوں کے تھنوں میں دودھ بہت ہوگا) یہاں تک کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے لیے کافی ہوگی، دودھ دینے والی ایک گائے لوگوں کے ایک قبیلہ کے لیے کافی ہوگی اور دودھ دینے والی ایک بکری آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے لیے کافی ہوگی۔ بہر حال لوگ اسی طرح کی خوش حال اور امن وچین کی زندگی گزار رہے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک خوشبودار ہوا بھیجے گا جو ان کی بغل کے نیچے کے حصہ کو پکڑے گی (یعنی اس ہوا کی وجہ سے ان کی بغلوں میں ایک درد پیدا ہوگا) اور پھر وہ ہوا ہر مومن اور ہر مسلمان کی روح قبض کرلے گی اور صرف بدکار شریر لوگ دنیا میں باقی رہ جائیں گے جو آپس میں گدھوں کی طرح مختلط ہو جائیں گے اور ان ہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔ اس پوری روایت کو مسلم نے نقل کیا ہے علاوہ دوسری روایت کو ان الفاظ تطرحھم بالنھبل تا سبع سنین کے کہ اس کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح:

" تو میں اس سے تمہارے سامنے جھگڑوں ۔" میں اس طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات میں دجال کا ظہور ہوتا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دلیل وحجت کے ذریعہ اس پر غالب آنے کے لیے اپنی امت میں سے کسی معاون ومددگار کی مدد کا محتاج نہیں تھے! بہرحال مذکورہ بالا جملہ کی وضاحت کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ بات خود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معلوم تھی کہ دجال کا ظہور زمانہ نبوی کے بعد ہوگا جیسا کہ دوسری احادیث اور دیگر دلائل وقرائن سے واضح ہے لیکن اس کے باوجود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذکورہ جملہ ارشاد فرمانا دراصل دجال کے ظاہر ہونے کی حقیقت کو زیادہ یقین کے ساتھ بیان کرنے اور موکد کرنے، اس کے ظہور کے وقت مبہم ہونے کی طرف اشارہ کرنے اور جن لوگوں کا دجال سے سابقہ پڑنے والا ہے ان کو اس کے فتنہ سے چوکنا کرنے کے پیش نظر تھا۔" تو پھر تم میں سے ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے اس سے جھگڑنے والا " کا مطلب یہ ہے کہ دجال کے ظاہر ہونے کے وقت جو مسلمان اس دنیا میں ہوں گے ان میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کے شر سے بچنے کے لیے شرعی وقطعی اور عقلی دلائل کے ذریعہ اس سے بحث ومباحثہ کرے اور اس پر غالب آئے لیکن یہ بات فرض کر لینے کے بعد کہ دجال بحث ومباحثہ کو سننے اور دلائل کو تسلیم کرنے والا ہوگا ورنہ اس جملہ کے اصل معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت ہر مومن کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ دجال کی تکذیب کرے، اس کی بات کو قبول کرنے اور اس کو تکلیف واذیت پہنچانے کی صورت اختیار کر کے اس کے شر سے اپنے کو بچائے ۔" میرا وکیل و خلیفہ ہر مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ ہے" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ میرے بعد اللہ

تعالیٰ ہر مومن و مسلمان کا حافظ و ناصر ہوگا اور دجال کے فتنہ سے بچنے میں مدد دے گا پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کامل یقین رکھنے والا مومن ہمیشہ مدد و نصرت پاتا ہے اگرچہ ان کے درمیان نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) و امام موجود نہ ہو، اس اعتبار سے حدیث فرقہ امامیہ کے خلاف مضبوط دلیل ہے۔ "دجال جوان ہوگا" سے یہ ثابت ہوا کہ ابن صیاد پر دجال کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، ان الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ سفید بالوں کی صورت میں کسی شخص کو جو وقار حاصل ہوتا ہے اس سے دجال محروم ہوگا۔ "عبد العزی ابن قطن" ایک یہودی کانا تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی مشرک تھا کیونکہ "عزی" ایک بت کا نام ہے۔ اس کی طرف عبد یعنی بندہ کی نسبت رکھنے والا مشرک ہی ہوسکتا ہے، اس کی تائید بعض حضرات کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ اس عبد العزی قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں مرچکا تھا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دجال کو عبد العزی کے ساتھ تشبیہ دی تو اس میں جزم کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ "گویا" کا لفظ اظہار شک کے لیے نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی عبد العزی، اس کا تعارف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عالم کشف یا خواب میں حاصل ہوا تھا اس لیے اس کے ساتھ دجال کو تشبیہ دیتے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کانے کا لفظ استعمال فرمایا جیسا کہ کسی خواب کو بیان کرنے کا یہی اسلوب معتبر ہے۔ سورت کہف کی ابتدائی آیتوں سے مراد شروع سے ان یقولون الا کذبا تک کی آیتیں ہیں آیتوں کو دجال کے سامنے پڑھنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ان میں جو مضامین مذکورہ ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت، اس کی کتاب اور آیات بینات کے ثبوت اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت اور رسول کی اس اعجازی

شان پر دلالت کرتے ہیں جس کی برکت سے دجال کے محیر العقول کارنامے ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں گے اور اس کی اتباع کرنے والے ہلاکت وتباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں پائیں گے! طیبی (رح) نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ سورت کہف کی ابتدائی آیتیں یہ خاصیت رکھتی ہیں کہ ان کا پڑھنے والا دجال کے فتنہ سے امن وحفاظت میں رہے گا جیسا کہ اصحاب کہف نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی طاقت سے شر وفتنہ سے امان ونجات پائی تھی واضح رہے کہ بعض احادیث میں ان آیتوں کو رات میں سوتے وقت بھی پڑھنا منقول ہے! مسلم کی دوسری روایت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فانھا جوارکم من فتنتہ (کیونکہ وہ آیتیں تمہیں دجال کے فتنہ سے محفوظ ومامون رکھیں گی) تو اکثر صحیح نسخوں میں" جوار" کا لفظ جیم کے زیر اور آخر میں ر کے ساتھ ہے، جس کے معنی اس پروانہ راہ داری کے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی شخص سفر کرتا ہے اور راستہ میں اس کو کوئی روک ٹوک نہیں کرتا پھر بعض شروح میں" جوار" جیم کے زبر اور پیش کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ جیم کے زیر کے ساتھ ہی فصیح ہے اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حصن حصین میں سورت کہف کے تعلق سے متعدد روایتیں منقول ہیں مثلا ایک روایت میں یہ ہے کہ جس شخص نے سورت کہف پڑھ لی اس کو اس کے پاس سے لے کر مکہ مکرمہ تک کی نورانیت حاصل ہوتی ہے اور دس شخصوں نے اس سورت کی آخری دس آیتیں پڑھیں اور پھر اس کے زمانہ میں دجال نکل آئے تو دجال اس پر تسلط پانے میں ناکام رہے گا ایک اور روایت میں یہ ہے کہ جس شخص نے سورت کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھ لیں وہ دجال سے محفوظ ہو گیا ان آخری دونوں روایتوں میں دس آیتوں اور تین آیتوں کی صورت میں جو ظاہری تضاد ہے اس کو ختم کرنے کے لیے یوں تو بہت سے اقوال ہیں لیکن زیادہ واضح قول یہ ہے کہ

سورت کہف کا کم سے کم حصہ کہ جس کا پڑھنا دجال کے شر سے محفوظ رکھے گا تین آیتیں ہیں اور ان تین آیتوں کو حفظ کر لینا اولی ہے لہٰذا یہ بات زیادہ حصہ مثلا دس آیتوں کے پڑھنے یا اس کو حفظ کرنے کے منافی نہیں ہے۔" اور وہ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔" سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دجال جن شہروں اور علاقوں سے گزرے گا صرف انہی جگہوں پر فتنہ وفساد پھیلانے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ وہ اپنے دائیں بائیں اور ادھر ادھر، جہاں خود نہیں جا سکے گا اپنے لشکر اور اپنے تابعداروں کی جماعت بھیجے گا، اس طرح اس کے فتنہ وشر سے کوئی مومن امن میں نہیں ہوگا اور ایسی کوئی جگہ باقی نہیں بچے گی جہاں اس کا فتنہ نہ پہنچے۔ اے اللہ کے بندوں، تم ثابت قدم رہنا۔" یہ خطاب ان مومنین سے ہے جو دجال کے زمانہ میں ہوں گے، یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بات اپنے صحابہ کرام سے فرمائی کہ اگر بالفرض تم دجال کا زمانہ پاؤ تو اس وقت دین پر مضبوطی سے قائم رہنا۔" چالیس دن" کے سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ یہاں مسلم کی روایت میں تو دجال کی مدت قیام چالیس دن فرمائی گئی ہے جب کہ آگے آنے والی ایک حدیث میں یہ مدت چالیس سال بیان کی گئی ہے پس بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ چالیس سال بیان کرنے والی حدیث صحت واسناد کے اعتبار سے اس درجہ کی نہیں ہے کہ اس کو مسلم کی اس روایت کے معارض قرار دیا جا سکے اور بالفرض اس کو اس درجہ کی صحیح حدیث بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں حدیثوں میں جو الگ الگ دو مدتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک مدت تو وہ ہے جس میں دنیا والوں پر اس کا ظہور ہی نہیں ہوگا بلکہ اس دنیا میں اس کی موجودگی غیر معلوم ہوگی اور دوسری مخصوص مدت ہے جس کے دوران دنیا والوں پر ظاہر رہے گا اور انھیں تعین کے ساتھ اس کی موجودگی کا علم ہوگا۔" نماز پڑھنے کے لیے

ایک دن حساب لگانا ہوگا۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب طلوع فجر کے بعد اتنا وقت گزر جائے جو عام دنوں کے اعتبار سے فجر اور ظہر کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت ظہر کی نماز پڑھی جائے اور جب ظہر کے بعد اتنا وقت گزر جائے جو عام دنوں میں ظہر اور عصر کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت عصر کی نماز پڑھی جائے اور جب عصر کے بعد اتنا وقت گزر جائے، جو عام دنوں میں عصر، مغرب کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت مغرب کی نماز پڑھی جائے۔ اسی حساب سے عشاء و فجر کی نماز پڑھی جائے۔ غرضیکہ پانچوں نمازیں اس اندازے اور حساب سے پڑھی جائیں گی یہاں تک کہ وہ دن، ایک برس کے برابر ہو کر گزر جائے نیز یہی اندازہ اور حساب ان دنوں میں اختیار کیا جائے گا جو ایک مہینہ اور ایک ہفتہ کے برابر ہوں گے واضح رہے کہ مذکورہ دنوں کی طوالت کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اتنے ہی طویل ہوں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ شب و روز کی گردش کو مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل کرسکتا ہے اس بارے میں بعض حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ وہ دن حقیقت میں اس قدر طویل نہیں ہوں گے بلکہ ہجوم افکار اور کثرت آلام کی بنا پر اس قدر طویل معلوم ہوں گے تو یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے اس کی سب سے بڑی دلیل صحابہ کرام کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مذکورہ سوال کرنا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انھیں یہ جواب دینا کہ نماز پڑھنے کے لیے ایک دن کا حساب لگانا ہوگا نیز بعض حضرات جو یہ اشکال ظاہر کرتے ہیں کہ نماز تو وقتوں یعنی سورج کے طلوع و غروب وغیرہ کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے اور جب اس طلوع و غروب وغیرہ کا وقت ہی نہیں ہوگا تو نمازیں کس طرح پڑھی جائیں گی؟ تو یہ اشکال بالکل لغو ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز شارع کا حکم ہے جب شارع (علیہ السلام) نے اس مخصوص دن کے لیے مذکورہ حکم ارشاد فرما دیا ہے تو پھر کسی کو

چون وچرا کی کیا گنجائش ہے علامہ توربشتی وغیرہ نے اس موقع پر مذکورہ اشکال کے اور جواب بھی لکھے ہیں، اہل علم مرقات میں دیکھ سکتے ہیں۔" ان کے کوہان بڑے بڑے ہوجائیں گے۔" میں کوہان" ذری" کا ترجمہ ہے جو" ذروہ" کی جمع ہے، جس کے اصل معنی بلندی، بلند جگہ کے ہیں، اسی اعتبار سے اونٹ کے کوہان پر بھی ذروۃ کا اطلاق ہوتا ہے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جو جانور چرنے کے لیے جنگل گئے ہوں گے وہ بہت فربہ ہوکر واپس آئیں گے۔" پھر اس قوم کے لوگ قحط وخشک سالی اور تباہ حالی کا شکار ہوجائیں گے" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مومن چونکہ دجال کی بات کو قبول کرنے اور اس کی پیروی سے انکار کردیں گے اس لیے وہ دجال کی طرف سے طرح طرح کی سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیے جائیں لیکن وہ ان تمام سختیوں اور مصائب کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کریں گے اور اپنے دین وعقیدہ پر قائم رہیں گے اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برکت سے ان مومنوں کو اولیاء کاملین کی صفات وخصوصیات عطاء فرمادے گا۔ فتتبعہ کنوزہا کیعا سیب النحل (وہ خزانے اس طرح اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے جس طرح شہد کی مکھیوں کے سردار ہوتے ہیں" یعاسیب" اصل میں" یعسوب" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں شہد کی مکھیوں کا سردار، حاصل یہ کہ جس طرح" یعسوب" آگے ہوتا ہے اور شہد کی مکھیاں اس کے ساتھ پیچھے پیچھے ہوتی ہیں اس طرح دجال کے ساتھ خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہوں گے اور سردار کے تعلق کی مناسبت سے قوم و جماعت کے سربراہ کو بھی" یعسوب" کہا جاتا ہے، جیسا کہ دیلمی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ علی یعسوب المومنین والمال یعسوب المنافقین یعنی علی مومنوں کے سردار ہیں کہ تمام مومن ان کی اتباع کرتے ہیں اور ان کی امان وپناہ میں رہتے

ہیں) اور مال منافقوں کا سردار ہے (کہ منافق مال وزر کے پیچھے رہتا ہے اور اس کی امان و پناہ میں رہنا چاہتا ہے) نیز حضرت ابوبکر کی مدح میں بھی منقول ہے کہ حضرت علی نے ان کے مرثیہ میں فرمایا تھا کنت للدین یعسوب (یعنی اے ابوبکر آپ تو دین کے رئیس سردار تھے۔" جو دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اتریں گے۔" اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دمشق میں اتریں گے، لیکن ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بیت المقدس میں، ایک روایت میں اردن میں اترنا منقول ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمانوں کی اجتماع گاہ میں اتریں گے واضح رہے کہ جس روایت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا بیت المقدس میں اترنا منقول ہے وہ ابن ماجہ کی ہے اور اسی کو راجح قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ حقیقت میں یہ دوسری روایتوں کے منافی نہیں ہے اس وجہ سے کہ بیت المقدس، دمشق کے جانب مشرق میں واقع ہے، بیت المقدس مسلمانوں کا اجتماع گاہ بھی ہے اور بیت المقدس اردن ہی کا علاقہ ہے، صرف ایک چیز رہ جاتی ہے وہ یہ کہ بیت المقدس میں سفید منارہ نہیں ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اترنے سے پہلے المقدس میں منارہ بھی بن سکتا ہے۔ بین مہزدتین (اس وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوں گے) لفظ مہزدتین دال سے بھی منقول ہے اور ذال سے بھی اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ آسمان سے اترنے کے وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے جسم پر جو دو کپڑے ہوں گے وہ زعفران سے یا عصفر (زرد رنگ کی ایک گھاس) سے رنگے ہوئے ہوں گے۔ واذا رفعه تحدر منه مثل جمان اللؤلؤ۔ (اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے بالوں سے چاندی کے دانوں کی مانند قطرے گریں گے جو موتیوں کی طرح ہوں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ان سے

ٹپکنے والے پسینہ کے قطرے اس قدر صاف اور سفید ہوں گے جیسا کہ موتیوں کی طرح چاندی کے دانے ہوتے ہیں۔ نہایہ میں لکھا ہیں کہ لفظ جمان عذاب کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں چاندی کے بنے ہوئے بڑے بڑے موتی اس کا واحد جمانتہ ہے! طیبی (رح) کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پسینہ کے قطروں کو پہلے تو بڑائی میں جمان کے ساتھ تشبیہ دی اور پھر صفائی اور خوشنمائی کے اعتبار سے جمان کو موتی کے ساتھ تشبیہ دی! اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ لفظ" جمان" میم کی تشدید کے ساتھ تو چھوٹے موتی کو کہتے ہیں اور جمان جیم کی تشدید کے بغیر، ان دانوں کے کہتے ہیں جو چاندی کے بنائے گئے ہوں اور یہاں یہی دوسرے معنی مراد ہیں اور حاصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جب اپنا سر جھکائیں گے تو ان کے سر کے بالوں میں نورانی قطرے ظاہر ہوں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو وہ قطرے ٹپک پڑیں گے یہ گویا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شادابی وتازگی اور ان کے جمال واطراوت سے کنایہ ہے۔" یہ ناممکن ہوگا کہ کسی کافر تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے سانس کی ہوا پہنچے اور وہ مر نہ جائے" اس جملہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم میں خود دجال شامل کیوں نہیں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دجال کو اس حکمت ومصلحت کے پیش نظر اس حکم سے مستثنی رکھا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھوں قتل ہو اور وہ اس کے خون سے آلودا اپنا نیزہ لوگوں کو دکھائیں تاکہ مومنین کے ذہن میں دجال کا ساحر وفریب کار ہونا ظاہر ہو اور اپنی آنکھوں سے اس کے فریب کا پردہ چاک ہوتے دیکھ لیں یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سانس کی ہوا سے کافروں کا مرجانا ان کی ایک ایسی کرامت ہوگی جو ان کے آسمان سے اترنے کے وقت یا اس کے کچھ بعد تک ظاہر رہے گی اور پھر جب وہ دجال کی طرف متوجہ ہوں گے تو یہ کرامت اٹھا

لی جائے گی، چنانچہ کسی کرامت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اور ہر وقت ظاہر رہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ کرامت ان کے معمول کے مطابق ہر آنے والے سانس کی نہیں ہوگی بلکہ اس کا تعلق صرف اس مخصوص سانس سے ہوگا جس سے کسی کافر کو مارنا مقصود ہوگا سبحان اللہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی اعجازی شان کے کیا کہنے، ایک وہ وقت تھا جب وہ اپنی پھونک سے مردہ کو زندہ کر دیتے تھے اور ایک وقت ہوگا کہ ان کے سانس کی ہوا سے زندہ لوگ موت کے گھاٹ اتریں گے۔ لد (لام کے پیش اور دال کی تشدید کے ساتھ) شام کے ایک پہاڑ کا نام ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ لد بیت المقدس کے ایک گاؤں کا نام ہے اور بعض حضرات کے نزدیک وہ فلسطین کے ایک گاؤں کا نام ہے۔" حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان لوگوں کے چہروں سے گرد و غبار صاف کریں گے" ہوسکتا ہے کہ چہروں سے گرد و غبار کا صاف کرنا اپنے ظاہری معنی پر محمول ہو، کہ واقعۃ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) از راہ لطف و کرم ان لوگوں کے چہروں سے گرد و غبار صاف کریں گے، یا اس جملہ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان لوگوں کے دلوں سے دجال کا خوف دور کریں گے اور ان کو راحت و اکرام کے اسباب فراہم کر کے ان کی تعب و کلفت کو ختم کریں گے۔" بحیرہ طبریہ" اضافت کے ساتھ ہے اور لفظ" بحیرہ" اصل میں بحرۃ کی تصغیر ہے جس کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے جیسے سمندر یا بڑا دریا، چنانچہ بحیرہ کے معنی چھوٹے دریا یعنی جھیل کے ہیں، بحیرہ طبریہ اس جھیل کو کہتے ہیں جو دس کوس لمبی ہے اور شام کے علاقہ طبریہ میں واقع ہے۔" جبل خمر" ایک پہاڑ کا نام ہے خمر اصل میں گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں یا اس زمین کو کہتے ہیں جو درختوں اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہو، چنانچہ اس پہاڑ پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بہت ہیں

اس لیے اس کو جبل خمر کا نام دیا گیا۔" ان کے لیے بیل کا سر تمہارے آج کے سو دیناروں سے بہتر ہوگا" کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ لوگوں کو اشیاء کی قلت اور بے تحاشا گرانی اس طرح گھیرے گی کہ معمولی چیز بڑی سے بڑی قیمت پر مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مثلاً جانور کے تمام اعضاء میں سب سے سستا کلہ کا گوشت سمجھا جاتا ہے مگر اس وقت ان لوگوں کے نزدیک اسی کلہ کا گوشت ایک سو دینار میں بھی بہت غنیمت معلوم ہوگا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسرے اجزاء کے گوشت کی اہمیت ان کے نزدیک کیا ہوگی اور وہ کس قدر بیش قیمت ہوں گے۔" وہ پرندے ان کی لاشوں کو" نہبل" میں ڈال دیں گے) یہ لفظ نون کے زبرہ کے جزم اور ب کے زبر کے ساتھ" نہبل" ہے اور مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں اسی طرح منقول ہے، یہ دراصل ایک جگہ کا نام ہے جو بیت المقدس کے علاقہ میں واقع ہے،لیکن مجمع البحار میں کو مانی سے منقول ہے کہ یہ لفظ میم کے ساتھ" منہل" ہے۔جس کے معنی زمین میں گہرے گڑھے کے ہیں ! قاموس میں لام کے باب اور میم کی فصل میں لفظ" منھل" کی معنی پہاڑ سے گرپڑنے کے لکھے ہیں نیز کہا ہے کہ ترمذی نے دجال سے متعلق حدیث میں فطرحھم بالنہبل (یعنی" نھبل" کا لفظ ذکر کیا ہے جب کہ زیادہ صحیح میم کے ساتھ" منہل" ہے۔جس سے کوئی بھی مکان خواہ وہ مٹی کا ہو یا پتھر اور صوف کا ہو نہیں بچے گا۔" میں مٹی اور پتھر کے مکان سے شہری علاقے اور صوف (یعنی خیموں اور چھپر) کے مکان سے دیہاتی اور جنگلی علاقے مراد ہیں، حاصل یہ کہ وہ بارش ہر جگہ اور ہر علاقہ میں برسے گی، ایسی کوئی جگہ نہیں ہوگی جہاں اس بارش کا پانی نہ پہنچے اور کوئی دیوار و خیمہ وغیرہ اس پانی کو کسی بھی جگہ سے روک نہیں سکے گا! واضح رہے کہ لفظ" لا یکن" ی کے زبر اور کاف کے پیش کے ساتھ کن سے بھی منقول ہے اور ی کے پیش کاف کے زبر کے ساتھ" اکنان" سے بھی

نقل کیا گیا ہے، ویسے دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی حفاظت و پوشیدگی۔" اور اس انار کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔" کے بارے میں ایک شارح نے کہا ہے کہ" چھلکے'' سے انار کے اوپر کا آدھا چھلکا مراد ہے اصل میں" قحف" اس گول ہڈی (یعنی کھوپڑی) کو کہتے ہیں جو دماغ کے اوپر ہوتی ہے اور لکڑی کے پیالہ کو بھی" قحف" کہتے ہیں لہٰذا اس مشابہت کی وجہ سے حدیث میں انار کے چھلکے کو" قحف" سے تعبیر کیا گیا ہے۔" الفأ ام من الناس" (لوگوں کی ایک بڑی جماعت) میں لفظ" فأ ام" دجال کے وزن پر ہمزہ کے ساتھ ہے اور عام بول چال میں ہمزہ کو ی سے بدل دیتے ہیں، بہر حال یہ لفظ" آدمیوں کی جماعت۔" کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد لوگوں کی اتنی بڑی جماعت ہے جس پر" قبیلہ" سے زیادہ لوگوں کا اطلاق ہو، جیسا کہ" قبیلہ کا اطلاق، لوگوں کی اس جماعت پر ہوتا ہے جو" فخذ" سے زیادہ ہو اور" فخذ" یہاں ف کے زبر اور خ کے جزم کے ساتھ ہے، جس کے معنی صرف عزیز و اقربا کی جماعت کے ہیں اور اس کا اطلاق لوگوں کی اس جماعت پر ہوتا ہے جو" بطن" سے کم ہو اور" بطن" کا اطلاق" قبیلہ، سے بھی کم جماعت پر ہوتا ہے! ویسے فخذ" خ" کے زیر کے ساتھ بلکہ خ کے جزم کے ساتھ بھی) کے معنی" ران" کے آتے ہیں۔" اور پھر وہ ہوا ہر مومن ہر مسلمان کی روح قبض کر لے گی" میں ہوا کی طرف روح قبض کرنے کی نسبت مجازی ہے، حقیقت میں روح کو قبض کرنے کا کام ملک الموت (یعنی موت کے فرشتے) کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ارواح قبض کرتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بیان ہو چکی ہے کہ مومن اور مسلم دونوں ایک ہی ہیں، جو مومن ہے وہ مسلمان ہے اور جو مسلمان ہے وہ مومن ہے، البتہ ان دونوں کے درمیان جو لطیف فرق علماء نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مومن تو تصدیق قلبی کے اعتبار سے کہتے ہیں جس کا تعلق باطن سے ہوتا ہے اور مسلمان ظاہری انقیاد

اطاعت کے اعتبار سے کہتے ہیں، لہٰذا یہاں ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے سے مراد تاکید بھی ہے اور تعمیم بھی اس حکم کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہ رہے۔" جو آپس میں گدھوں کی طرح مختلط ہو جائیں گے" کے بارے میں بعض شارحین نے کہا ہے کہ یہاں اختلاط سے مراد جماع کرنا یعنی وہ لوگ بے حیاء اور بے لحاظ ہو کر علانیہ لوگوں کے سامنے جماع کریں گے جیسا کہ گدھے کرتے ہیں چنانچہ" ھرج" کا لفظ جماع کے معنی میں بھی آتا ہے۔" اور انہی لوگوں پر قیامت قائم ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو اس وقت اس دنیا میں صرف وہی بدکار و اشرار لوگ (یعنی کفار و فجار ہوں گے، ان کے برعکس لوگ یعنی مومنین و صالحین نہ اس وقت اس دنیا میں موجود ہوں گے اور نہ ان پر قیامت قائم ہوگی۔

دجال کے کارناموں کا ذکر

حدیث:

وعن أبي سعيد الخدري قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج الدجال فيتوجه قبله رجل من المؤمنين فيلقاه المسالح مسالح الدجال. فيقولون له أين تعمد؟ فيقول أعمد إلى هذا الذي خرج. قال فيقولون له أو ما تبارك وتعالى ؤمن بربنا؟ فيقول ما بربنا خفاء. فيقولون اقتلوه. فيقول بعضهم لبعض أليس قد نهاكم ربكم أن تقتلوا أحدا دونه. قال فينطلقون به إلى الدجال فإذا رآه المؤمن قال يا أيها الناس هذا الدجال الذي ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال فيأمر الدجال به فيشبح. فيقول خذوه وشجوه فيوسع ظهره وبطنه ضربا. قال فيقول أو ما تؤمن بي؟ قال فيقول أنت المسيح الكذاب. قال فيؤمر به فيؤشر بالمنشار من مفرقه حتى يفرق بين رجليه. قال ثم يمشي الدجال بين القطعتين ثم يقول له أتؤمن بي؟ فيقول ما ازددت إلا بصيرة. قال ثم يقول يا أيها الناس إنه لا يفعل بعدي بأحد من الناس. قال فيأخذه الدجال ليذبحه

فیجعل ما بین رقبته إلی ترقوته نحاسا فلا یستطیع إلیه سبیلا قال فیأخذه بیدیه ورجلیه فیقذف به فیحسب الناس أنما قذفه إلی النار وإنما ألقی فی الجنة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم هذا أعظم الناس شهادة عند رب العالمین . رواه مسلم .

ترجمہ

ابوسعید خدری (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دجال نکلے گا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص (اس کا شر رفع کرنے کے لئے) اس کی طرف روانہ ہوگا (راستہ میں) اس شخص کو کچھ مسلح لوگ ملیں گے جو دجال کے محافظ ہوں گے، یہ لوگ اس مسلمان سے پوچھیں گے کہ کہاں جارہے ہو؟ وہ کہے گا کہ میں اس شخص کی طرف جارہا ہوں جو وہاں (فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے) نکلا ہے یعنی دجال! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (یہ سن کر) دجال کے محافظ اس سے کہیں گے کہ تو ہمارے رب (دجال) پر ایمان کیوں نہیں لے آتا وہ شخص جواب دے گا کہ ہمارے پروردگار کی صفات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں دجال کے آدمی (یہ سن کر آپس میں کہیں گے کہ اس شخص کو مار ڈالو (جو ہمارے رب پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہے) لیکن بعض لوگ آپس ہی میں پھر یہ کہیں گے کہ کیا ہمارے رب دجال نے اس سے منع نہیں کیا کہ ہم کسی کو اس کے حکم کے بغیر نہ ماریں آخر کار وہ لوگ اس مسلمان شخص کو دجال کے پاس لے جائیں گے) اور وہ علامات کے ذریعہ اس کو پہچان لے گا) تو کہے گا کہ لوگو! جان لو، یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اپنی احادیث کے ذریعہ) فرمایا تھا (کہ فلاں فلاں علامتوں کے ساتھ آخر زمانے میں نکلے گا) آنحضرت نے فرمایا" دجال اس شخص کی بات سنتے ہی آگ بگولا ہوجائے گا اور اس کو چت لٹانے کا حکم

دے گا (اور بعض حضرات نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل یعنی اوندھا لٹانے کا حکم دے گا جیسا کہ مجرم کو سزاء مارنے کے لیے اوندھا لٹا دیا جاتا ہے) چنانچہ اس شخص کو چت لٹا دیا جائے گا کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ پر پلپلا ہو جائے گا اور پھیل جائے گا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے بعد دجال کہے گا کہ کیا تو اب بھی مجھ پر ایمان نہیں لائے گا؟ وہ شخص کہے گا کہ (ہرگز نہیں) تو جھوٹا ہے پھر (دجال کی طرف سے اس شخص کو چیرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے) کا حکم دیا جائے گا اور (اس حکم کے مطابق) اس کو آرے سے سر کی طرف سے چیرا جائے گا یہاں تک کہ اس کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دجال (اپنے کارنامہ پر اتراتا ہوا، ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان ٹہلتا پھرے گا اور پھر کہے گا کہ کھڑا ہو جا، وہ مسلمان شخص (زندہ ہو کر) بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے گا تب دجال کہے گا کہ اب تو مجھ پر ایمان لے آئے گا؟ وہ شخص جواب دے گا کہ (ہرگز نہیں) اب تو میرا یقین اور پختہ ہو گیا اور میری بصیرت اور زیادہ بڑھ گئی ہے (یعنی تو نے جس طرح مجھے پہلے تو قتل کیا اور پھر دوبارہ زندہ کر دیا اس سے مجھے کامل یقین ہو گیا ہے تو جھوٹا دجال ہی ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" اس کے بعد وہ مسلمان شخص (وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کر کے) کہے گا کہ لوگو! اچھی طرح جان لو) اس دجال نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے (یعنی پہلے قتل کرنا اور پھر دوبارہ زندہ کر دینا) اب کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر دجال اس شخص کو پکڑ کر ذبح کرنا چاہے گا مگر ہنسلی کی ہڈی تک اس کی گردن کو تانبے کا بنا دیا جائے گا (یعنی اس کی پوری گردن تانبے کی طرح سخت اور ٹھوس ہو جائے گی تا کہ اس پر تلوار وغیرہ اثر انداز ہی نہ ہو

سکے، شرح السنہ میں معمر کا یہ قول ہے کہ مجھ تک جو روایت پہنچی ہے اس میں یوں ہے کہ اس شخص کی گردن پر تانبے کا تختہ رکھدیا جائے گا) جس کی وجہ سے وہ اس کو قتل نہیں کر سکے گا، اس کے بعد جھنجھلا کر) اس شخص کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر پکڑ کر اس کو اٹھائے گا اور (اپنی آگ میں) پھینک دے گا، لوگ تو یہی خیال کریں گے کہ اس کو آگ میں پھینکا گیا ہے لیکن حقیقت میں وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا (یہ بیان کرنے کے بعد) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ شخص اللہ رب العلمین کے نزدیک شہادت کے اعتبار سے بہت بڑے درجہ کا حامل ہوگا۔" (مسلم)

••••••

تشریح:

مسلمانوں میں سے ایک شخص، کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ حضرت خضر (علیہ السلام) ہوں گے! اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خضر (علیہ السلام) زندہ ہیں اور اس دنیا میں موجود ہیں، تاہم اس مسئلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ فقہاء ومحدثین کی اکثریت اور بعض صوفیا کا قول یہ ہے کہ وہ مرچکے ہیں، جب کہ صوفیاء کی اکثریت اور بعض فقہا کا کہنا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور نووی نے کہا ہے کہ یہی بات صحیح ہے۔ لفظ" مسالح" (میم کے زبر اور لام کے زیر کے ساتھ) اصل میں "مسلحۃ" کی جمع ہے جس کے لغوی معنی سرحد دیدبانی کی جگہ کے ہیں اور عرف عام میں اس کا اطلاق ان ہتھیار بند اور مسلح لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنی سرحدوں اور آقاؤں کی حفاظت کرتے ہیں، چنانچہ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔" ہمارے پروردگار کی صفات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رب ہونے کی دلیلیں بالکل ظاہر اور واضح ہیں جیسے پیدا کرنا اور رزق دینا وغیرہ، نیز وہ تمام کمال کی صفات رکھتا ہے کہ ان میں کسی بھی طرح کے نقص

اور عیب کا ذرہ برابر شائبہ تک نہیں جب کہ دجال میں نقص وعیب کی چیزیں ہیں اور اس کا ناقص وعیب دار ہونا بالکل ظاہر ہے، لہٰذا جس ذات میں ربوبیت اور کمال کی واضح دلیلیں موجود ہوں اور اس کا شریک بندہ ناقص کیسے ہوسکتا ہے اور اس اعتبار سے رب ہونا صرف اسی ذات پاک کو سزاوار ہے نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور کو۔ فیشج فیقول خذوہ شجوہ فیوسع ظھرہ وبطنہ ضربا۔ (چنانچہ اس شخص کو چت لٹادیا جائے گا الخ) میں لفظ" یوسع" واو کے جزم اور سین کے تخفیف کے ساتھ) وسع سے ہے اور بعض نسخوں میں اس لفظ کو واوَ کے زبر اور سین کی تشدید کے ساتھ" توسیع" سے مشتق ہونا صحیح قرار دیا گیا ہے اسی طرح" یشج" کا لفظ" تشیج" سے مجہول کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی کسی چیز کو چوڑا کرنے کے ہیں، اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ" چت یا پیٹ کے بل لٹانا" کیا گیا ہے، نیز لفظ" شجوہ" (جیم کی تشدید کے ساتھ امر کا صیغہ ہے جس کے معنی سر کو زخمی کرنا ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی شرح میں کہا گیا ہے یہ قول زیادہ صحیح ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ جس طرح" یشج" کے لفظ" تشیج" سے مشتق کہا گیا ہے اس طرح" شجوہ" بھی اسی باب سے امر کا صیغہ ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ" یشج" اور" شجوہ" دونوں لفظ" شج" سے مشتق ہیں جو سر کے زخم i" کے معنی میں ہے۔ " اس کے دونوں پیروں کے درمیان سے اس کے دو ٹکڑے کردیئے جائیں گے" یعنی اس کو سر سے لے کر پیر تک چیر کر پورے جسم کے دو ٹکڑے کردیئے جائیں گے! واضح رہے کہ لفظ" فیوشر" کے بارے میں احتمال ہے کہ ہمزہ کے ساتھ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ واوَ کے ساتھ ہو اسی طرح" میشار" کا لفظ ہمزہ کے ساتھ منقول ہے اور ی کے ساتھ بھی دونوں صورتوں میں اس کے معنی" آرہ" کے ہیں یعنی وہ آلہ جس کے ذریعہ کسی چیز کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، ویسے " منشار" یعنی نون کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے! لفظ مفرق کے معنی ہیں سر کا وہ حصہ جو بیچوں بیچ ہو

جس کو" مانگ" کہتے ہیں۔" اب کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔" یہ گویا اس بات کی اطلاع ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس (دجال) کو ڈھیل دینے کے لیے جو اتنی زبردست طاقت وقدرت عطا کردی تھی کہ وہ جس کو چاہے مار دے اور پھر دوبارہ اس کو زندہ کردے تو وہ طاقت وقدرت اس سے سلب کرلی گئی ہے لہٰذا اب کسی کو اس سے ڈرنے اور خوف زدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن حقیقت میں وہ جنت میں پھینکا گیا ہوگا" میں" جنت" سے مراد یا تو دنیاوی وجسمانی راحت وسکون کی جگہ ہے جیسے کوئی باغیچہ وآرامگاہ وغیرہ، یا یہ مراد ہے کہ دجال اس شخص کو اس آگ میں پھینکے گا جو وہ اپنے ساتھ لیے پھرے گا لیکن وہ آگ اس شخص کے لیے ٹھنڈی ہوجائے گی اور سلامتی کا باعث بن جائے گی جیسا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے نمرود کی آگ ٹھنڈک وراحت پہنچانے کا ذریعہ بن گئی تھی، بہرصورت مطلب یہ ہے کہ دجال کے ہاتھوں اس شخص کی دوبارہ موت واقع نہیں ہوگی خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے۔" یہ شخص اللہ رب العلمین کے نزدیک شہادت کے اعتبار سے بہت بڑے درجہ کا حامل ہوگا" میں اس شخص کو شہید اس کی پہلی موت کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے جو دجال کے ہاتھوں (آرہ سے چیرے جانے کی صورت میں) واقع ہوگی اگرچہ بعد میں وہ زندہ ہوجائے گا یا وہ اس اعتبار سے شہید ہوگا کہ دجال اس کو ذبح کرنے کا قصد کرے گا اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ" شہادت" حق تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہونا اور گواہی دینا مراد ہو۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کا ذکر

حدیث؛

عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذي نفسي بيده ليوشكن أن ينزل فيكم ابن مريم حكما عدلا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويفيض المال حتى لا يقبله أحد حتى تكون السجدة الواحدة خيرا من الدنيا وما فيها . ثم يقول أبو هريرة فاقرؤا إن شئتم وإن من أهل الكتاب إلا ليؤمنن به قبل موته الآية .متفق عليه

ترجمہ؛

ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یقیناً عیسیٰ ابن مریم (آسمان سے تمہارے درمیان اتریں گے جو ایک عادل حاکم ہوں گے وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے۔ سور کو مار ڈالیں گے (یعنی اس کو پالنا اور کھانا مطلق حرام وممنوع اور اس کو مار ڈالنا مباح کر دیں گے) جزیہ کو اٹھا دیں گے (ان کے زمانہ میں) مال و دولت کی فراوانی ہوگی یہاں تک کہ کوئی اس کا خواہشمند نہ رہے گا۔ اور اس وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوگا" (اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد) حضرت ابوہریرہ (رض) کہا کرتے تھے کہ اگر تم اس بات میں کوئی شک وشبہ رکھتے ہو اور دلیل حاصل کرنا) چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو (وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ) 4۔ النساء 159 :) یعنی کوئی اہل کتاب (خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی) ایسا باقی نہیں رہے گا جو عیسیٰ (علیہ السلام) پر ان کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے گا۔" (بخاری ومسلم)
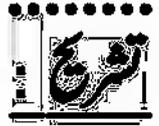
"صلیب" اصل میں دو مثلث لکڑیوں کا نام ہے جو جمع کی شکل میں ہوتی ہیں اور یہ شکل ایسا ظاہر کرتی ہے جیسے کسی شخص کو سولی پر لٹکا رکھا ہو۔ عیسائیوں کا عقیدہ چونکہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا اور پھر اللہ نے ان کو زندہ کر کے اپنے پاس آسمان پر بلا لیا اس اس لیے انھوں نے سولی کی اس شکل کو اپنا مذہبی نشان بنا لیا ہے اور یہ مذہبی نشان ان کی ہر چیز میں نمایاں رہتا ہے اور جس طرح اہل ہنود اپنے گلے میں زنار ڈالتے ہیں اسی طرح عیسائی بھی سولی کا یہ نشان اپنے گلے میں لٹکاتے ہیں بعض تو اس نشان پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تصویر تک بنوا لیتے ہیں تاکہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر چڑھائے جانے کی یادگار مکمل صورت میں رہے لہذا" وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے" سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)، نصرانیت (یعنی عیسائی مذہب) کو باطل اور کالعدم قرار دیدیں گے اور شریعت محمدی ہی کو جاری و نافذ قرار دیں گے کہ ان کا ہر حکم و فیصلہ ملت حنفیہ کے مطابق ہوگا۔ جزیہ کو اٹھا دیں گے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور اس کے شرعی دستور کی جو ایک شق یہ ہے کہ اس کی حدود مملکت میں اگر کوئی غیر مسلم رہنا چاہے تو وہ ایک مخصوص ٹیکس جس کو جزیہ کہتے ہیں ادا کر کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ رہ سکتا ہے اور اس کو" ذمی" کہا جاتا ہے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جزیہ کی یہ شق ختم کر دیں گے اور یہ قانون نافذ کریں گے کہ ان کی مملکت اسلامی کا شہری صرف مسلمان ہو سکتا ہے چنانچہ وہ حکم دیں گے کہ جتنے ذمی ہیں وہ سب مسلمان ہو جائیں ان کی حکومت کسی سے بھی دین حق کے علاوہ اور کوئی چیز قبول نہیں کرے گی اور چونکہ اس وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی برکت سے ہر شخص کا ذہن و فکر خیر کی طرف

مائل ہوگا اس لیے تمام غیر مسلم ایمان لے آئیں گے پس اس جملہ کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ عیسائیت اور اس کے احکام وآثار کو بالکل مٹادیں گے اور صرف اسلامی شریعت کو جاری و نافذ قرار دیں گے! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ذمیوں سے جزیہ اس لیے اٹھائیں گے کہ ان کے زمانہ میں مال و دولت کی فراوانی اور اہل حرص کی کمی کی وجہ سے ایسا کوئی محتاج وضرورتمند نہیں رہے گا جو ان سے جزیہ کا مال لینے والا ہو اس کی تائید آگے کی عبارت (ان کے زمانہ میں) مال و دولت کی فراوانی ہوگی الخ سے ہوتی ہے۔ حتی لا یقبلہ احد حتی تکون السجدۃ الخ میں پہلا حتی تو یفیض المال سے متعلق ہے اور دوسرا "حتی" ان تمام مضامین سے متعلق ہے جو پہلے مذکور ہوئے ہیں یعنی صلیب توڑ ڈالنا وغیرہ! پس مطلب یہ ہے کہ دین اسلام اس طرح پھیل جائے گا اور اطاعت وعبادت کے ذریعہ آپس میں میل ومحبت اس طرح پیدا ہوجائے گی کہ ایک سجدہ دنیا کی تمام متاع سے بہتر اور قیمتی سمجھا جائے گا! یوں تو ہر زمانہ میں اور ہر وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہوتا ہے یہ صرف حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کی خصوصیت نہیں ہے لیکن یہ بات صرف اسی لیے کہی گئی ہے کہ اس زمانہ میں عبادت واطاعت دراصل انسان کی طبیعت کا جز اور نفس کا تقاضا بن جائے گی اور لوگ طبعی طور پر بھی ایک سجدہ کو دنیا کی تمام متاع سے زیادہ پسندیدہ اور بہت سمجھنے لگیں گے! تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرا "حتی" بھی "یفیض" سے متعلق ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی اور ہر شخص اس طرح مستغنی و بے نیاز ہوجائے گا کہ کسی کو اس (مال و دولت) کی کوئی رغبت وخواہش ہی نہیں رہے گی اور جب یہ صورت حال ہوگی تو مال کو خرچ کرنے کی فضیلت و پسندیدگی بھی جاتی رہے گی اور اصل ذوق ولگاؤ نماز سے

باقی رہے گا کہ لوگ ایک سجدہ میں جو کیف و بھلائی محسوس کریں گے وہ دنیا کی کسی بھی چیز میں نہیں پائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے جس آیت کریمہ کا ذکر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نازل ہونے کے بعد جب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین کا دور دورہ ہو جائے گا اور تمام لوگوں کے درمیان سے دینی و مذہبی اختلاف و منافرت کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہود و نصاری کا وہ اختلاف و نفرت بھی کالعدم ہو جائے گا جو وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تئیں رکھتے ہیں۔ اور وہ (یہود و نصاری) بھی اس ایمان و عقیدے کے حامل ہو جائیں گے جو مسلمان کا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی ایک بندی مریم کے بیٹے ہیں واضح رہے کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری سے مراد وہ یہود و نصاری ہیں جو اس زمانہ میں ہوں گے! اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے جو بیان کی گئی اور حضرت ابوہریرہ (رض) نے اسی اعتبار سے اس آیت کو حدیث کے مضمون کی دلیل قرار دیا ہے۔ دوسری جو تفسیر بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے ایسا کوئی شخص نہیں جو اپنے مرنے سے پہلے (نزع کی حالت میں) ایمان نہ لاتا ہو لیکن اس وقت کا ایمان لانا کوئی اعتبار نہیں رکھتا اس تفسیر کی روشنی میں ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الا لیؤمنن بہ میں بہ کی ضمیر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا اللہ سبحانہ کی طرف راجع ہو اگر آیت کی یہی تفسیر مراد لی جائے تو پھر حاصل یہ نکلے گا کہ ہر کافر مرنے سے پہلے (نزع کی حالت) اضطراری طور پر ایمان لاتا ہے لیکن اس وقت کا ایمان چونکہ کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اس لیے چاہیے کہ وہ (کافر اس وقت سے پہلے ہی بقصد و اختیار ایمان قبول کرنے پر آمادہ ہو۔

قیامت سے پہلے کیا ہوگا؟

حدیث؛

وعن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج الدجال فيمكث أربعين لا أدري أربعين يوما أو شهرا أو عاما فيبعث الله عيسى ابن مريم كأنه عروة بن مسعود فيطلبه فيهلكه ثم يمكث في الناس سبع سنين ليس بين اثنين عداوة ثم يرسل الله ريحا باردة من قبل الشام فلا يبقى على وجه الأرض أحد في قلبه مثقال ذرة من خير أو إيمان إلا قبضته حتى لو أن أحدكم دخل في كبد جبل لدخلته عليه حتى تقبضه قال فيبقى شرار الناس في خفة الطير وأحلام السباع لا يعرفون معروفا ولا ينكرون منكرا فيتمثل لهم الشيطان فيقول ألا تستجيبون؟ فيقولون فما تأمرنا؟ فيأمرهم بعبادة الأوثان وهم في ذلك دار رزقهم حسن عيشهم ثم ينفخ في الصور فلا يسمعه أحد إلا أصغى ليتا ورفع ليتا قال وأول من يسمعه رجل يلوط حوض إبله فيصعق ويصعق الناس ثم يرسل الله مطرا كأنه الطل فينبت منه أجساد الناس ثم ينفخ فيه أخرى فإذا هم قيام ينظرون ثم يقال يا أيها الناس هلم إلى ربكم وقفوهم إنهم مسؤولون. فيقال أخرجوا بعث النار. فيقال من كم؟ كم؟ فيقال من كل ألف تسعمائة وتسعة وتسعين قال فذلك يوم يجعل الولدان شيبا وذلك يوم يكشف عن ساق. رواه مسلم.

ترجمہ؛

حضرت عبداللہ ابن عمر (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" دجال نکلے گا اور چالیس تک رہے گا حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم، اس موقع پر چالیس سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مراد کیا تھی آیا چالیس دن یا چالیس مہینے اور یا چالیس سال پس اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھیجے گا جو گویا عروہ ابن مسعود کی شکل وصورت کے ہوں گے (یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) شکل وصورت میں عروہ ابن مسعود کے مشابہ ہوں

گے) وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اس کو مار ڈالیں گے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دنیاوالوں میں سات سال تک رہیں گے اور اس عرصہ میں دو شخصوں کے درمیان بھی کوئی دشمنی وعداوت نہیں ہوگی پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا (جو اہل ایمان کو موت کے آغوش میں پہنچا دے گی چنانچہ اس وقت روئے زمین پر ایسا کوئی شخص باقی نہیں رہے گا جس کے دل میں رائی برابر بھی نیکی یا ایمان میں سے کچھ ہوا اور وہ ہوا اس کی روح قبض نہ کرے یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص (بالفرض) پہاڑ کے اندر بھی چلا گیا ہوگا تو وہ ہوا پہاڑ میں داخل ہو کر اس شخص کا پیچھا کریگی اور اس کی روح قبض کر کے چھوڑے گی" آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے بعد (روئے زمین پر) صرف بدکار وشریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کے مانند سبک رو اور تیز رفتار اور درندوں کی مانند مضبوط وسخت ہوں گے وہ نہ تو نیکی وبھلائی سے واقف ہوں گے اور نہ برائی و بدکاری سے اجتناب کریں گے پھر شیطان (کسی معزز وقابل تکریم انسان کی شکل وصورت اختیار کر کے ان کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ (تم لوگ جس طرح فسق وفجور میں مبتلا ہو اس پر) کیا تم کو شرم وحیا نہیں آتی ہے گویا یہ شیطان کا مکر و تلبیس ہوگا کہ وہ اس حیلے سے ان کو بت پرستی کی طرف لائے گا) وہ لوگ شیطان سے کہیں گے تم بتاؤ ہم کیا کریں (یعنی ہمارے بارے میں جو تمہارا مقصود ہے اس کو ظاہر کرو تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کریں) پس شیطان ان کو بت پوجنے کا حکم دے گا یعنی شیطان ان کو اس فریب میں مبتلا کرے گا کہ تم لوگ وسیلہ اختیار کرنے کے طور پر بتوں کو پوجنے لگو تاکہ اللہ تم سے راضی ہو چنانچہ کفار یہی کہا کرتے تھے کہ ہم بتوں کو محض اللہ کو خوش کرنے کے لیے پوجتے ہیں اور قرآن نے ان کی اس خام خیالی کی خبر ان الفاظ میں دی ہے ما نعبدھم الا لیقربونا الی

اللہ زلفا و یقولون ہولاء شفعاؤ نا عند اللہ۔ بہر حال وہ لوگ شیطان کے کہنے کے مطابق بت پرستی کرنے لگیں گے اور ان کے اعمال و اخلاق انتہائی پست ہو جائیں گے لیکن ان کے ان برے اعمال کے باوجود ان کے رزق میں فراوانی اور کثرت ہوگی اور وہ عیش و عشرت کی زندگی گزراتے ہوں گے پھر قیامت قائم کرنے کے لئے) صور پھونکا جائے گا اور جو بھی شخص اس کی آواز سنے گا وہ شخص اپنی گردن کو ایک جانب سے جھکائے گا اور دوسری جانب سے بلند کرے گا اس صور کی آواز کو سب سے پہلے سننے والا وہ شخص ہوگا جو اپنے اونٹ (کو پانی پلانے) کے حوض کو لیپ پوت رہا ہوگا اور وہ اسی حالت میں مرجائے گا۔ اور دوسرے تمام لوگ بھی اسی طرح اپنے اپنے کام میں مشغولیت کے دوران ہی مرجائیں گے (یعنی کسی کو بھی اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ وہ جس کام میں مشغول ہے اس سے فارغ ہی ہو جائے) اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا جو شبنم کی طرح ہوگی (یعنی ہلکی بارش جس کو پھوار بھی کہا جاسکتا ہے اور اس بارش کے ذریعہ لوگوں کے بدن اگ آئیں گے (جو قبروں میں گل چکے ہوں گے) پھر چالیس برس کے بعد) دوسرا صور پھونکا جائے گا جس کو سن کر تمام لوگ (جو اپنی قبروں اور زمین کے نیچے سے زندہ ہو کر نکلیں گے) یکبارگی اٹھ کھڑے ہوں گے اور قیامت کے ہول ناک منظر کو دیکھیں گے پھر ان سب سے کہا جائے گا کہ لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ اور فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان سب کو روکے رکھو، ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ان سے حساب لیا جائے گا پھر (پروردگار کی طرف سے) فرشتوں کی طرف سے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا جائے گا کہ کتنے لوگوں میں سے کتنے لوگوں کو الگ کیا جائے؟ یعنی جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجا جانا ہے ان کا تناسب کیا ہے اور ان کو کتنے لوگوں میں سے کس مقدار کے حساب سے

الگ کیا جائے فرشتوں سے کہا جائے گا ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو دوزخ میں بھیجنے کے لیے الگ کرلو یہ کہہ کر آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا اور یہ وہ دن ہے جس میں امر عظیم کو ظاہر کیا جائے گا۔" (مسلم)

تشریح

مجھے نہیں معلوم اسی موقع پر" چالیس" سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کیا مراد تھی الخ) کے سلسلہ میں مختصر طور پر اتنا بتادینا کافی ہے کہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، دجال کی ٹھہرنے کی مدت بعض روایتوں میں چالیس سال اور بعض میں چالیس دن یا چالیس رات آئی ہے اور اسی موقع پر یہ بھی وضاحت کی جاچکی ہے کہ ان روایتوں میں مطابقت کی صورت کیا ہے۔" دو شخصوں کے درمیان بھی کوئی دشمنی وعداوت نہیں ہوگی" کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دنیا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا وہ زمانہ باہمی انس ورواداری، اخوت ومحبت اور یگانگت ویک جہتی سے بھرپور ہوگا۔ اس وقت تمام لوگ ایمان واخلاق کی کامل صفات کے حامل ہوں گے اور پورا معاضرہ اس طرح اعلی انسانی واخلاقی قدروں پر استوار ہوگا کہ کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوگا۔ کوئی کسی کے درپے آزار نہیں ہوگا۔ کسی کے دل میں کوئی بغض وکینہ اور حسد نہیں ہوگا بلکہ تمام لوگ ایک دوسرے کے دوست ورفیق اور ایک دوسے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوں گے! واضح رہے کہ اس دنیا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ٹھہرنے کی مدت جو سات سال بیان کی گئی ہے وہ دجال کو قتل کرنے کے بعد اس دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت ہے ورنہ یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اس دنیا میں ان کی کل مدت حیات پینتالیس سال ہوگی۔" جو پرندوں کی مانند سبک رو اور تیز رفتار الخ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ برائی وبدکاری کے کاموں

اور جنسی خواہشات کی تکمیل میں اس طرح سبک رو اور تیز رفتار ہوں گے جیسے پرندے ہوتے ہیں اور ظلم وتشدد کرنے، فتنہ وفساد پھیلانے اور لوگوں کے جان ومال کو ہلاک وبرباد کرنے میں اس طرح شقی القلب اور سخت مزاج ہوں گے جس طرح درندے ہوتے ہیں! پس اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ علم ودانائی حلم ومروت اور دوسرے انسانی واخلاقی اوصاف سے بالکل خالی ہوں گے بلکہ ان کے دل و دماغ اور مزاج وطبیعت پر ظلم وشقاوت، دست درازی، وحشت ودرندگی اور ہلاکت خیزی کا غلبہ ہوگا" وہ اپنی گردن کو ایک جانب سے جھکالے گا آلخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس صور کی آواز اتنی زیادہ خوفناک اور ڈراونی ہوگی کہ اس کی دہشت سے لوگوں کے دل پھٹ جائیں گے اور جسمانی قوت وہمت معطل وبیکار ہو کر رہ جائے گی جس کا اثر گردن پر پڑے گا اور وہ ڈھلک جائے گی جیسا کہ خوف و دہشت کے وقت ہوتا ہے کہ سر اس طرح ایک طرف کو ڈھلک جاتا ہے کہ گردن کی ایک جانب تو جھک جاتی ہے اور اس کے مقابل کی دوسری جانب اوپر اٹھ جاتی ہے۔" ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو الخ" سے معلوم ہوا کہ ایک ہزار لوگوے میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائے گا اور باقی سب دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔گویا جنت میں جانے والوں کا تناسب فی ہزار ایک شخص ہوگا! نیز زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ" ہر ہزار شخص میں سے نو سو ننانوے لوگوں سے مراد کافر ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے چنانچہ آگے باب الحشر میں حضرت ابوسعید خدری (رض) کی ایک روایت آرہی ہے اس میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ دوزخیوں کی یہ جماعت یاجوج وماجوج کے لوگوں پر مشتمل ہوگی۔" یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا یہ جملہ دراصل قیامت کے دن کی درازی وطوالت یا اس دن کی شدت وہولناکی سے کنایہ ہے جیسا کہ مصائب وآلام اور غم وشدائد کے زمانہ

میں بوڑھاپا بہت جلد آجاتا ہے۔اسی طرح یہ وہ دن ہے جس میں امر عظیم کو ظاہر کیا جائے گا" ہی سخت ترین خوف وہولناکی اور شدت ومحبت سے کنایہ ہے واضح رہے کہ کشف ساق (جس کا ترجمہ امر عظیم کو ظاہر کیا جانا) کیا گیا ہے کے معنی اہل عرب میں یہی مشہور ہیں اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کسی شخص پر کوئی بہت سخت مشکل و پریشانی آتی ہے اور اس پریشانی سے نجات پانے کے لیے اس کو بہت زیادہ کوشش اور سعی کرنا ہوتی ہے تو وہ اپنی پنڈلی کے اوپر سے کرتہ کا دامن وغیرہ اٹھالیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی پنڈلی کھل جاتی ہے اس اعتبار سے" کشف ساق اہل عرب کا ایک محاورہ بنا ہوا ہے جو کسی کام کی اہمیت ونزاکت اور اس کام کے سلسلے میں پیش آنے والی صعوبتوں اور سختیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے! یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہے کہ یوم یکشف عن ساق۔ کے الفاظ قرآن کریم میں بھی آئے ہیں اور حدیث میں مذکورہ جملہ کی صورت میں قرآن کے انھی الفاظ کو پیش کیا گیا ہے چنانچہ اس کی تفسیر کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن اکثر حضرات کے نزدیک اس کی زیادہ صحیح تاویل یہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی۔

حشر کا بیان

" حشر" کے اصل معنی ہیں جمع کرنا، اکٹھا کرنا، ہانکنا! چنانچہ قیامت کے دن کو یوم الحشر (حشر کا دن) اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ اس دن تمام مردے اپنی قبروں وغیرہ سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور سب کو اس جگہ پر جمع کیا جائے گا جس کو" محشر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔واضح رہے کہ حشر دو ہوں گے، ایک تو مذکورہ بالا معنی میں قیامت آنے کے بعد اور دوسرے حشر کا تعلق قیامت سے پہلے علامات قیامت سے ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے کہ ایک آگ مشرق کی طرف سے نمودار ہوگی جو لوگوں کو گھیر کر زمین شام کی طرف لے جائے گی اور وہاں اکٹھا کر دے گی

! یہاں عنوان باب میں " حشر" کے پہلے معنی مراد ہیں، اگر چہ اس باب میں بعض ایسی احادیث بھی نقل ہوں گی جو بظاہر دونوں معنی کا احتمال رکھتی ہیں، اسی لیے علماء کے ان کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں کہ بعض حضرات نے ان کو دونوں معنی پر محمول کیا ہے اور بعض نے ان کے خلاف کہا ہے اور زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ان احادیث کا محمول پہلے ہی معنی ہیں۔

میدان حشر میں ہر شخص ننگے بدن، ننگے پاؤں اور غیر مختون آئے گا

حدیث؛

وعن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال إنكم محشورون حفاة عراة غرلا ثم قرأ (كما بدأنا أول خلق نعيده وعدا علينا إنا كنا فاعلين) وأول من يكسى يوم القيامة إبراهيم وإن ناسا من أصحابي يؤخذ بهم ذات الشمال فأقول أصيحابي أصيحابي فيقول إنهم لن يزالوا مرتدين على أعقابهم مذ فارقتهم. فأقول كما قال العبد الصالح (و كنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم) إلى قوله (العزيز الحكيم) . متفق عليه .

ترجمہ؛

حضرت ابن عباس (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا " تمہیں (قیامت کے دن) اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ تم ننگے پاؤں ننگے بدن اور بے ختنہ ہو گے" اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (بطور دلیل واستشہاد) یہ آیت پڑھی (كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ) 21۔ الانبیاء 104 :) یعنی جس طرح ہم نے ان کو ابتداء پیدائش میں (ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ ماں کے پیٹ سے) پیدا کیا تھا اسی طرح ان کو دوبارہ (قیامت کے دن پیدا کریں گے یعنی قبروں سے اٹھائیں گے یہ وعدہ (کہ ہم ان کو دوبارہ پیدا کریں گے) ہم پر

لازم ہے اور یقیناً ہم (نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا) کرنے والے ہیں پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ہیں (پھر فرمایا) اور (اس وقت جب کہ لوگوں کو میدان حشر سے جنت اور دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا، میں دیکھوں گا کہ) میرے کچھ صحابہ کو پکڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف (یعنی دوزخ کی طرف) لے جایا جارہا ہے، میں یہ دیکھ کر بطریق حیرت واستعجاب اور ان کو نجات دلانے کے لیے کہونگا کہ یہ میرے صحابی ہیں یہ میرے صحابی ہیں (ان کو کہاں لے جاتے ہو؟) خداوند تعالیٰ فرمائے گا۔ (بیشک یہ تمہارے صحابی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ) جب سے تم ان سے جدا ہوئے، یہ برابر دین سے برگشتہ اور پھرے رہے (اس لیے ان کو دوزخ میں بھیجا جارہا ہے) میں (یہ سن کر) وہی کہوں گا جو بندہ صالح یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ وکنت علیہم شہیدا مادمت فیہم ۔العزیز الحکیم تک یعنی جب تک میں ان کے درمیان رہا، میں ان کے احوال سے واقف رہا الخ۔" (بخاری ومسلم)

تشریح

" اور بے ختنہ ہوں گے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسم وبدن کے تمام اجزاء یک جا ہو کر مل جائیں گے اور پورا جسم اسی طرح کا ہو جائے گا جیسا کہ اس دنیا میں تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ ختنہ کی وہ کھال جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے اور جو اس دنیا میں ضائع کر دیئے جانے کے قابل ہے جب وہ قیامت کے دن اپنی جگہ (یعنی ختنہ کے مقام پر) واپس آ کر جسم کا حصہ بن جائے گی تو دوسرے اجزاء جیسے بال اور ناخن وغیرہ بطریق روئی پیدا ہوں گے اور اپنی اپنی جگہ لگ جائیں گے! پس یہ

حقیقت نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ کے کمال علم اور کائنات کے ایک ایک جزو کل پر اس کے محیط ہونے کی دلیل ہے بلکہ اشیاء ممکنات کے تعلق سے اس کی قدرت کاملہ کی لامتناہی وسعتوں کی بھی علامت ہے۔ سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ہیں" حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو یہ فضیلت محض اس لیے حاصل ہوگی وہ ان لوگوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جو فقراء اور ضرورت مندوں کو کپڑے پہناتے ہیں اور ان کی ستر پوشی کرتے ہیں یا یہ کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) وہ سب سے پہلے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے لباس کیا گیا تھا جب کہ انھیں نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تھا بس ان کی یہ مخصوص نوعیت کی فضیلت ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ان کی آفضیلت کو ثابت نہیں کرتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو سب سے پہلے لباس پہنایا جانا ان کے اعزاز و اکرام کے طور پر ہوگا کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روحانی اور دینی باپ ہیں علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو جو اولیت حاصل ہوگی وہ حقیقی ہے یا اضافی؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ اولیت حقیقی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے یعنی ان کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ اور تمام لوگوں میں سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا! اس کی تائید اسی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جن کپڑوں میں دفن کیا گیا ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کے دن انھیں کپڑوں میں اٹھ کر (میدان حشر میں) آئیں گے نیز جامع صغیر میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے ترمذی کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ انا اول من تنشق عنہ الارض فا کسی حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن یمین العرش

لیس احد من الخلائق یقوم ذلك المقام غیری۔ " (قیامت کے دن) سب سے پہلے میں زمین سے پھٹ کر اٹھونگا اور جنت کا لباس پہنوں گا اور پھر عرش کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور اس جگہ مخلوقات میں سے میرے علاوہ کسی اور کو کھڑا ہونا نصیب نہیں ہوگا۔"" میں وہی کہوں گا جو بندہ صالح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تھا الخ یعنی جس طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت کے دن اپنی قوم کی گمراہی اور بدعقیدگی و بدعملی سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور اپنی گمراہ قوم کے معاملہ کو حق تعالیٰ کے عدل و انصاف پر چھوڑ دیں گے اسی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ پروردگار! میری امت کے یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں میری موجودگی کے درمیان ایمان و عمل کی سیدھی راہ پر گامزن تھے اور میں ان کا نگہبان و ذمہ دار تھا۔ لیکن جب میں بھی دنیا سے اٹھ گیا تو انھوں نے اپنے نفس اور شیطان کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہی کو اختیار کرلیا، اب ان کا معاملہ تیرا اوپر موقوف ہے تیری عادل و منصف بارگاہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے وہ سراسر عادلانہ اور منصفانہ ہوگا! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تعلق سے قرآن کریم کی جو آیت پڑھی وہ پوری یوں ہے (وَ كُنۡتُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا مَّا دُمۡتُ فِيۡهِمۡ فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِىۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ وَاَنۡتَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ۱۱۷ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۱۱۸) 5۔ المائدہ 108 :-117) یعنی (قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ نصاریٰ کو سنانے اور ان کو شرمندہ کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے فرمائے گا کہ کیا تم نے اپنی قوم کو عقیدہ تثلیث یعنی تین اللہ ماننے کی تلقین و تبلیغ کی تھی تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی برأت کا اظہار

کریں گے اور کہیں گے کہ میں نے تو ان کو صرف تیری بندگی کرنے کی تلقین و تبلیغ کی تھی اور) جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا ان پر مطلع رہا (اور ان کی نگہبانی کرتا رہا کہ یہ لوگ صحیح عقیدہ عمل کی روشنی سے دور نہ جا پڑیں) لیکن جب آپ نے مجھے (اس دنیا) سے اٹھا لیا (اور ان کے اوپر سے میری نگہبانی ختم ہوگی تو) پھر صرف آپ ان کے احوال پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری واقفیت رکھتے ہیں اب اگر (ان کی بدعقیدگی و بدعملی کے لئے) آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر ان کو معاف فرما دیں تو بیشک زبردست حکمت والے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں حدیث میں "صحابہ" سے مراد وہ صحابہ نہیں ہیں جن کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں بھی اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی آپ سے نسبت حاصل رہی اور ان ہی کو حقیقت میں "صحابہ" کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے بارے میں یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد ان میں سے کوئی بھی صحابی مرتد نہیں ہوا اور نہ کسی نے عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی گمراہی اختیار کی جس کی بنا پر انھیں دوزخی کہا جاسکے لہٰذا" صحابہ کرام" سے مراد وہ اجڈ دیہاتی ہیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں مشرف باسلام ہو گئے تھے لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب اور اسود وغیر کے اتباع کرنے کے سبب مرتد ہو گئے تھے۔

حساب، قصاص اور میزان کا بیان

حساب" کے معنی ہیں گننا، شمار کرنا! اور یہاں سے مراد ہے قیامت کے دن بندوں کے اعمال و کردار کو گننا اور ان کا حساب کرنا! واضح رہے کہ حق تعالیٰ کی علیم وخبیر ذات کو سب کچھ معلوم ہے اور بندہ اس دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے وہ اس پر روشن وعیاں ہے لیکن قیامت کے دن بندوں

کے اعمال و کردار کا حساب اس لیے ہوگا تا کہ ان پر حجت قائم ہو اور تمام مخلوق پر روشن ہو جائے کہ دنیا میں کس نے کیا کیا ہے اور کون کس درجہ کا آدمی ہے ! پس قیامت کے دن کا یہ حساب قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا واجب ہے۔ ”قصاص“ کے معنی بدلہ و مکافات کے ہیں یعنی جس شخص نے جیسا کیا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی کرنا! مثلاً اگر کسی شخص نے کسی شخص کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی قتل کرنا اور اگر کسی شخص نے کسی شخص کو زخمی کیا ہے تو اس کے بدلہ میں اس کو بھی زخمی کرنا قصاص کہلاتا ہے قیامت کے دن، جان کا بدلہ جان، زخم اور تکلیف ہوگا اور دنیا میں جس نے جس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہوگا کہ خواہ اس کو آزردہ کیا ہو اور خواہ کوئی بھی جسمانی اور روحانی اذیت پہنچائی ہو اور وہ چیونٹی یا مکھی ہی کیوں نہ ہو، تو قیامت کے دن اس سے اس کا بدلہ لیا جائے گا اگرچہ وہ مکلف نہ ہو چنانچہ تمام حیوانات کو بھی قیامت کے دن اسی لیے اٹھایا جائے گا تا کہ ان کو بھی ایک دوسرے کا بدلہ دلوایا جا سکے مثلاً اگر کسی سینگ والی بکری نے کسی بے سینگ بکری کو مارا ہوگا تو اس دن اس کو قصاص یعنی بدلہ دینا ہوگا۔ ”میزان“ اس چیز سے تعبیر ہے جس کے ذریعہ بندوں کے اعمال کی مقدار و حیثیت جانی جا سکے اور جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ چیز میزان یعنی ترازو ہی کی شکل میں ہوگی جس کے دو پلے ہوں گے اور ایک زبان ہوگی اور دونوں پلوں کے درمیان مشرق و مغرب جیسا فاصلہ ہوگا اس میزان کے ذریعہ بندوں کے اعمال تولے جائیں گے یعنی ایک پلے میں نیکیوں کے اعمال نامے اور دوسرے پلے میں برائیوں کے اعمال نامے رکھے جائیں گے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حسنات یعنی نیک اعمال کو اچھی صورتوں میں اور سیأت یعنی برے عمل کو بری صورتوں میں ڈھال دیا جائے گا اور ان دونوں کو تولا جائے گا لیکن بعض روایتوں میں پہلا قول ہی زیادہ

صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جو نصوص ہیں ان کا ظاہری مفہوم اسی پر دلالت کرتا ہے۔

آسان حساب اور سخت حساب؟

حدیث؛

عن عائشة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لیس أحد یحاسب یوم القیامة إلا هلك .قلت أولیس یقول الله (فسوف یحاسب حسابا یسیرا) فقال إنما ذلك العرض ولکن من نوقش فی الحساب یهلك. متفق علیه.

ترجمہ؛

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن جس سے حساب لیا جائے گا وہ تباہ ہو جائے گا (یعنی جو بھی شخص سخت حساب اور داروگیر سے دو چار ہوگا اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوگا نیز یہاں "تباہ ہونے" سے مراد عذاب میں مبتلا ہونا ہے حضرت عائشہ صدیقہ (رض) کہتی ہیں کہ (جب میں نے یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اشاد ایک کلیہ کے طور پر سنا تو میرے ذہن میں اشکال پیدا ہوا اور اسی اشکال کو دور کرنے کے لئے) میں نے عرض کیا کہ "کیا اللہ تعالیٰ نے اہل نجات کے حق میں یہ نہیں فرمایا کہ (فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا) 84۔الانشقاق 8 :) یعنی (جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا" پس قریب ہوگا کہ اس کا حساب آسان ہو" (اور جب حساب آسان ہوگا اواس کے تباہ ہونے کے کیا معنی ہوں گے؟) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (میرے اس اشکال کو دور کرنے کے لئے) فرمایا۔" یہ آسان حساب صرف پیش کرنا اور بیان محض ہے لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا (یعنی جس کو سخت باز پرس اور داروگیر سے گزرنا

پڑے گا) اور وہ یقیناً تباہ ہوگا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح

"آسان حساب صرف پیش کرنا اور بیان محض ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ پس قریب ہوگا کہ اس کا حساب آسان ہو۔" تو آسان حساب ہونے سے مراد ہے کہ اس کے اچھے اور برے اعمال اس کو بتلا دیئے جائیں گے مثلاً اس سے کہا جائے گا کہ تو نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے اور برے اعمال پر مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جس شخص کے حساب میں دار و گیر اور باز پرس کا دخل ہو جائے گا، اس سے ایک ایک چیز اور ہر چھوٹے بڑے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا اور اس پر محاسبہ و مواخذہ کی سخت کارروائی نافذ کی جائے گی تو اس شخص کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں ہوگا پس وہ تباہ ہو جائے گا اور حقیقت میں حساب یہی ہے۔ اس بات کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مذکورہ بالا حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اس کلیہ کو ظاہر کرتا ہے کہ جو بھی شخص حساب کے مرحلہ سے گزرے گا وہ یقیناً عذاب میں مبتلا ہوگا لیکن قرآن کی مذکورہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حساب کے مرحلہ سے گزرنے والوں میں سے بعض لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اس سے گویا قرآن کی آیت اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے؟ لہٰذا اس ظاہری تضاد کو رفع کرنے کے لیے خود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں" حساب" سے مراد صرف عرض ہے یعنی ان لوگوں کے سامنے (کہ جن کو نجات یافتہ قرار دینا مقصود ہوگا ان کے اعمال کی فہرست کھول کر رکھ دی جائے گی، چنانچہ انھوں نے جو برے اعمال کئے ہوں گے وہ ان کا اعتراف و اقرار کریں

گے اور حق تعالیٰ اپنا فضل و کرم ظاہر کرتے ہوئے ان کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرمائے گا اس کے برخلاف حدیث میں " حساب " سے مراد واقعی محاسبہ و مواخذہ اور دار و گیر ہے جس کو " حساب میں مناقشہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس محاسبہ و دار و گیر کی بنیاد اظہار عدل ہوگا۔ بزار وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا " جس شخص نے یہ تین اچھی باتیں ہوں گی اس سے اللہ تعالیٰ آسان حساب لے گا اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا (اور وہ تین اچھی باتیں یہ ہیں کہ تم اس شخص کو (اخلاقی جسمانی اور مالی مدد پہنچاؤ جو تمہیں اپنی مدد سے محروم رکھے تم اس شخص کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرو جو تمہارے اوپر ظلم کرے اور تم اس شخص کے ساتھ حسن سلوک کرو جو تمہارا مقاطعہ کرے۔

حوض اور شفاعت کا بیان

حوض کے معنی : لغت میں " حوض کے معنی ہیں " پانی جمع ہونا اور بہنا۔ اسی لیے جو گندا خون عورتوں کو ہر مہینہ آتا ہے۔ " حیض " کہلاتا ہے اور یہ لفظ بھی " حوض " ہی سے مشتق ہے یہاں حوض سے وہ " حوض " (ہز) مراد ہے جو قیامت کے دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے مخصوص ہوگا اور جس کی صفات و خصوصیات اس باب میں نقل ہونے والی احادیث سے معلوم ہوں۔ قرطبی (رح) نے لکھا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے دو حوض ہوں گے۔ ایک حوض تو میدان محشر میں پل صراط سے پہلے عطا ہوگا اور دوسرا حوض جنت میں ہوگا اور دونوں کا نام کوثر ہوگا۔ واضح رہے کہ عربی میں " کوثر " کے معنی ہیں خیر کثیر یعنی بیشمار بھلائیاں اور نعمتیں! پھر زیادہ صحیح یہ ہے کہ میدان حشر میں جو حوض عطا ہوگا وہ " میزان " کے مرحلہ سے پہلے ہی ہوگا پس لوگ اپنی قبروں سے پیاس کی حالت میں نکلیں گے اور پہلے حوض پر آئیں گے۔ اس

کے بعد میزان (یعنی اعمال کے تولے جانے) کا مرحلہ پیش آئے گا۔اسی طرح میدان حشر میں
ہر پیغمبر کا اپنا حوض ہوگا جس پر اس کی امت آئے گی چنانچہ اس وقت تمام پیغمبر آپس میں فخر کا
اظہار کریں گے کہ دیکھیں کس کے حوض پر زیادہ لوگ آتے ہیں ہمارے حضرت (صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ میرے حوض پر آنے والوں کی تعداد سب سے
زیادہ ہوگی۔شفاعت کے معنی" شفاعت کا مطلب ہے گناہوں کی معافی کی سفارش کرنا!" چنانچہ
حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں گناہ گار اور مجرم بندوں
کے گناہوں اور جرموں کے معاف کئے جانے کی درخواست پیش کریں گے اس لیے عام طور پر"
شفاعت" کا لفظ اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا! ویسے" شفاعت" کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے
اصل معنی جوڑا (جفت) کرنے، کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ ملانے کے ہیں وتر (بمعنی طاق)
کے مقابلہ پر شفع (بمعنی جفت) کا لفظ آتا ہے وہ اس معنی کے اعتبار سے ہے۔اسی طرح زمین یا
مکان میں ہمسائیگی کی وجہ سے جو حق خرید حاصل ہوتا ہے اس کو بھی" شفعہ" اسی معنی کی مناسبت
سے کہا جاتا ہے۔پس" شفاعت" میں بھی یہ معنی اس اعتبار سے موجود ہیں کہ شفاعت کرنے والا
جرم وگناہ کرنے والے کی معافی کی درخواست پیش کر کے گویا خود کو اس مجرم وگناہ گار) کے ساتھ
ملاتا ہے۔شفاعت کی دو قسمیں جن لوگوں نے اس دنیا میں کبیرہ اور صغیرہ گناہ کیے ہوں گے ان
کے حق میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت کا قبول ہونا اور اس پر ایمان لانا
واجب ہے۔واضح رہے کہ شفاعت کی مختلف نوعیتیں ہوں گی۔اور وہ تمام نوعیتیں آنحضرت (صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کے لیے ثابت ہیں چنانچہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو صرف
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات سے مخصوص ہوں گی اور بعض ایسی ہیں جن میں

دوسروں کے ساتھ مشارکت ہوگی لیکن شفاعت کا دروازہ چونکہ سب سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کھولیں گے اس لیے حقیقت میں تمام شفاعتیں لوٹ کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی طرف منسوب ہوں گی اور علی الاطلاق تمام شفاعتوں کے والی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہیں۔شفاعت کی سب سے پہلی قسم" شفاعت عظمٰی" ہے اور یہ وہ شفاعت ہے جو تمام مخلوق کے حق میں ہوگی۔اور یہ شفاعت کرنے کا شرف صرف ہمارے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاصل ہوگا۔انبیاء کرام صلواۃ اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کسی کو اس شفاعت کی مجال وجرأت نہیں ہوگی اور اس شفاعت عظمٰی" سے مراد ہے تمام میدان حشر کے لوگوں کو راحت دینے، وقوف کی طوالت وشدت کو ختم کرنے، حساب کتاب اور پروردگار کے آخری فیصلے کو ظاہر کرنے اور تمام لوگوں کو محشر کی ہولناکیوں، شدتوں اور سختیوں سے چھٹکارا دینے کی سفارش کرنا اس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوگی! شفاعت کی دوسری قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ایک طبقہ کو حساب کتاب کے بغیر جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا۔آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کے لیے اس شفاعت کا ثبوت بھی منقول ہے بلکہ بعض حضرات کے نزدیک یہ شفاعت بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔شفاعت کی تیسری قسم وہ ہے جس کی مدد سے ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جن کے نامہ اعمال میں ثواب اور گناہ مساوی طور پر ہوں گے۔شفاعت کی چوتھی قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جو اپنے گناہ اور جرائم کی سزا بھگتنے کے لیے دوزخ کے مستوجب قرار پائیں گے۔ چنانچہ آنحضرت ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے اور ان کو جنت میں داخل کرائیں گے! شفاعت کی پانچویں قسم وہ ہے جس کے ذریعہ کچھ لوگوں کے درجات ومراتب

اوران کے اعزاز واکرام میں ترقی اوراضافہ کرنا مقصود ہوگا شفاعت کی چھٹی قسم وہ ہے جو ان گناہ گاروں کے حق میں ہوگی جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا اور وہ اس شفاعت کے بعد وہاں سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے، اس شفاعت کا حق مشترکہ ہوگا یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ دوسرے انبیاء، ملائکہ، علماء اورشہدا بھی اپنے اپنے طور پر اوراپنے اپنے لوگوں کے لیے یہ شفاعت کریں گے۔شفاعت کی ساتویں قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ان لوگوں کے عذاب میں تخفیف کرانا مقصود ہوگا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب ودوزخ کے مستوجب قرار دیئے جاچکے ہوں گے۔شفاعت کی نویں قسم وہ ہے جو صرف اہل مدینہ کے حق میں ہوگی اورشفاعت کی دسویں قسم وہ ہے جو امتیاز واختصاص کے طور پر صرف ان لوگوں کے حق میں کی جائے گی۔جنہوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ اقدس کی زیارت کا شرف حاصل کیا جائے گا۔علماء نے کہا ہے کہ شفاعت کے متعدد مواقع ومحل ہوں گے، شفاعت کا سب سے پہلا موقع تو وہ ہوگا جب لوگوں کو درگاہ رب العزت میں پیش کرنے کے لیے میدان محشر میں لاکھڑا کردیا جائے گا۔اس وقت لوگ خوف وخجالت کے پسینے میں غرق ہوں گے، ہر ایک پر ہیبت ودہشت چھائی ہوگی ہر شخص مواخذہ وعذاب کے خوف سے کانپ رہا ہوگا اس وقت شفیع المذنبین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شفاعت کریں گے تاکہ لوگوں کو کچھ اطمینان وراحت مل جائے اوروہ بیٹھ کر دم لے سکیں پھر جب درگاہ رب العزت سے حکم ہوگا کہ ان سب کو لے جایا جائے اور حساب لیا جائے تو اس موقع پر بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درخواست کریں گے کہ ان کو حساب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور یوں ہی معاف فرمادیا جائے اوراگر سب کا حساب ضروری لیا جانا ہو تو سرسری حساب پر اکتفا کرلیا جائے، حساب میں سختی وشدت اور سخت بازپرس نہ کی جائے،

کیونکہ جو بھی سخت حساب سے دو چار ہوگا، اس کا عذاب سے بچنا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ پھر حساب کے بعد جو لوگ مستوجب عذاب قرار پائیں گے، ان کو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو یہ موقع بھی شفاعت کا ہوگا تا آنکہ ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شفاعت کریں گے اور ان کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں پہنچوائیں گے۔ غرضیکہ ان ہول ناکی مواقع پر شروع سے لے کر آخر تک رسول مختار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت اور غفار و کریم پروردگار کی رحمت و عنایت سے عفو و کرم کی بہت کچھ امید رکھنی چاہیے۔ ویسے جو کچھ بھی فیصلہ صادر ہو۔

حوضِ کوثر کی فضیلت

حدیث:

وعن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حوضی مسیرۃ شہر وزوایاہ سواء ماؤہ أبیض من اللبن وریحہ أطیب من المسك وكیزانه كنجوم السماء من یشرب منها فلا یظمأ أبدا. متفق علیہ.

ترجمہ:

حضرت عبد اللہ بن عمرو (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "یعنی حوض کوثر، ایک ماہ کی مسافت کے بقدر دراز ہے اور اس کے چاروں کنارے برابر ہیں (یعنی لمبائی چوڑائی میں وہ مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی بو مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور اس کے آب خورے (اپنی چمک و دمک اور کثرت و زیادتی کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اور جو شخص اس کا پانی پی لے گا اس کو پھر کبھی پیاس نہ لگے

گی۔(بخاری ومسلم)

تشریح:

اس کو پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔" اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں پانی یا کسی بھی مشروب کا پینا پیاس کی وجہ سے نہیں بلکہ حصول لذات کے لیے ہوگا جیسا کہ جنت میں کوئی چیز کھانا، بھوک کی بنیاد پر نہیں بلکہ ازراہ تنعم ہوگا کیونکہ جنت تو وہ نظام ہے جہاں کسی کو نہ بھوک لگے گی اور نہ پیاس، قرآن کریم میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا ہے، وان لک ان لا تجوع فیہا ولا تعری وانک لا تظموٴا فیہا ولا تضحی یعنی یہاں جنت میں تو تمہارے لیے (یہ آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے رہوگے اور نہ ننگے ہوگے بلاشبہ تم نہ یہاں پیاسے ہوگے اور نہ دھوپ میں تپوگے۔

شفاعتِ امم رسول ﷺ کی خصوصیت:

حدیث:

وعن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم قال يحبس المؤمنون يوم القيامة حتى يهموا بذلك فيقولون لو استشفعنا إلى ربنا فيريحنا من مكاننا فيأتون آدم فيقولون أنت آدم أبو الناس خلقك الله بيده وأسكنك جنته وأسجد لك ملائكته وعلمك أسماء كل شيء اشفع لنا عند ربك حتى يريحنا من مكاننا هذا. فيقول لست هناكم. ويذكر خطيئته التي أصاب أكله من الشجرة وقد نهي عنها ولكن ائتوا نوحا أول نبي بعثه الله إلى أهل الأرض فيأتون نوحا فيقول لست هناكم ويذكر خطيئته التي أصاب سؤاله ربه بغير علم ولكن ائتوا إبراهيم خليل الرحمن. قال فيأتون إبراهيم فيقول إني لست هناكم ويذكر ثلاث كذبات كذبهن ولكن ائتوا موسى عبدا آتاه الله التوراة وكلمه وقربه نجيا. قال فيأتون موسى فيقول إني لست هناكم ويذكر خطيئته التي أصاب قتله النفس ولكن ائتوا عيسى عبد الله ورسوله وروح الله وكلمته قال فيأتون عيسى فيقول

لست هنا كم ولكن ائتوا محمدا عبدا غفر الله له ما تقدم من ذنبه وما تأخر . قال فيأتوني فأستأذن على ربي في داره فيؤذن لي عليه فإذا رأيته وقعت ساجدا فيدعني ما شاء الله أن يدعني فيقول ارفع محمد وقل تسمع واشفع تشفع وسل تعطه . قال فأرفع رأسي فأثني على ربي بثناء تحميد يعلمنيه ثم أشفع فيحد لي حدا فأخرج فأخرجهم من النار وأدخلهم الجنة ثم أعود الثانية فأستأذن على ربي في داره . فيؤذن لي عليه فإذا رأيته وقعت ساجدا . فيدعني ما شاء الله أن يدعني ثم يقول ارفع محمد وقل تسمع واشفع تشفع وسل تعطه .
قال فأرفع رأسي فأثني على ربي بثناء وتحميد يعلمنيه ثم أشفع فيحد لي حدا فأخرج فأخرجهم من النار وأدخلهم الجنة ثم أعود الثالثة فأستأذن على ربي في داره فيؤذن لي عليه فإذا رأيته وقعت ساجدا فيدعني ما شاء الله أن يدعني ثم يقول ارفع محمد وقل تسمع واشفع تشفع وسل تعطه . قال فأرفع رأسي فأثني على ربي بثناء وتحميد يعلمنيه ثم أشفع فيحد لي حدا فأخرج فأخرجهم من النار وأدخلهم الجنة حتى ما يبقى في النار إلا من قد حبسه القرآن أي وجب عليه الخلود ثم تلا هذه الآية (عسى أن يبعثك الله مقاما محمودا) قال وهذا المقام المحمود الذي وعده نبيكم متفق عليه . (متفق عليه)

ترجمہ:

حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔قیامت کے دن (میدان حشر میں) مومنین کو روک دیا جائے گا (یعنی سب کو کسی ایک جگہ اس طرح محصور کر دیا جائے گا کہ کوئی شخص بھی کسی طرح کی نقل وحرکت نہیں کر سکے گا اور ہر شخص سکتے کی سی کیفیت میں ٹھہرا رہے گا) یہاں تک کہ سارے لوگ اس (محصور ہو جانے) کی وجہ سے سخت فکر وتردد میں پڑ جائیں گے، پھر وہ آپس میں تذکرہ کریں گے کہ کاش ہمیں کوئی ایسا شخص مل جاتا جو ہمارے پروردگار سے ہماری شفاعت کرتا اور ہمیں اس سختی و پریشانی سے چھٹکارا دلاتا اور پھر (کچھ لوگ سب کی نمائندگی کرتے ہوئے) حضرت آدم (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے اور

ان سے کہیں گے کہ آپ آدم (علیہ السلام) ہیں، تمام لوگوں کے باپ، آپ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے (بلاکسی واسطہ وسیلہ کے) اپنے ہاتھ سے (یعنی اپنی قدرت کاملہ سے) پیدا کیا، آپ (علیہ السلام) کو جنت کی سکونت عطا فرمائی اپنے فرشتوں سے (تحیہ کا) سجدہ آپ (علیہ السلام) کو کرایا اور آپ (علیہ السلام) کو ہر چیز کے نام سکھائے : براہ کرام آپ (علیہ السلام) اپنے پروردگار سے (کہ جس نے آپ (علیہ السلام) کو اتنی زیادہ فضیلتیں اور اعزاز بخشے ہیں) ہماری سفارش کر دیجئے کہ وہ ہم کو اس (سخت ہول ناک اور پریشان کن) جگہ سے نکال کر راحت و اطمینان بخشے حضرت آدم (علیہ السلام) (یہ سن کر کہیں گے) کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں (یعنی میں یہ مرتبہ (درجہ نہیں رکھتا کہ آج کے دن بارگاہ کبریائی میں شفاعت کرنے کا حوصلہ کروں) پھر حضرت آدم (علیہ السلام) اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انھوں نے (گیہوں کا) درخت کھانے کی صورت میں کی تھی درآنحالیکہ ان کو اس درخت کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا تھا، (اس کے بعد وہ کہیں گے کہ) تم لوگوں کو نوح (علیہ السلام) کے پاس جانا چاہیے (وہ تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) کیونکہ وہ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا تھا) وہ لوگ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لیے درخواست کریں گے) حضرت نوح (علیہ السلام) جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انھوں نے بے جانے بوجھے اللہ تعالیٰ سے (اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے بچانے کی درخواست کرنے کی صورت میں کی تھی (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگوں کو ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس" جو اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست ہیں، جانا چاہیے! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ

لوگ (یہ سن کر) ابراہیم خلیل اللہ کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں اور وہ دنیا میں تین مرتبہ اپنے جھوٹ بولنے کا ذکر کریں گے (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ جو اللہ کے ایسے بندے ہیں جن کو اللہ نے (اپنی عظیم الشان کتاب) توراۃ عطا کی) اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو ان کا تابع بنایا اور جن کو اللہ نے براہ راست اپنی ہم کلامی کے شرف سے نوازا اور ان کو اپنا کمال قرب عطا فرما کر اپنا محرم اسرار بنایا۔" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کے لیے درخواست کریں گے) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ان کو جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! اور وہ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو ایک قبطی کو قتل کرنے کی صورت میں سرزد ہو گئی تھی (یعنی انھوں نے طیش میں آ کر ایک قبطی کو مکا مار دیا تھا جس سے اس کا کام تمام ہو گیا تھا۔ پھر وہ مشورہ دیں گے کہ تمہیں عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جانا چاہئے جو اللہ کے بندے اور رسول (علیہ السلام) ہیں۔ وہ سراسر روحانی ہیں (کہ جسمانی مادہ کے بغیر محض اللہ کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ لوگ (یہ سن کر) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئینگے (اور ان سے شفاعت کے لیے کہیں گے) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں! البتہ تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ جو اللہ کے ایسے بندے ہیں جن کے اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں (یقیناً وہی تم لوگوں کی شفاعت کریں گے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" تب لوگ

(شفاعت کی درخواست لے کر) میرے پاس آئیں گے اور میں (ان کی شفاعت کے لیے تیار ہو جاؤں گا اور مقصد کی خاطر) دررب العزت پہنچ کر اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اپنی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت مرحمت فرمائے گا! میں جب اس کے حضور میں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو اس کی ہیبت وخوف کے مارے اور اس کی تعظیم کرنے کے لئے) سجدہ میں گر پڑوں گا اور اللہ تعالیٰ جتنا عرصہ مناسب سمجھے گا اتنے عرصہ کے لیے مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، تم (جس کے حق میں چاہو) شفاعت کرو، تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی، اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا پھر (دوسری جماعتوں کے حق میں شفاعت کرنے کے لئے) میں دوبارہ دررب العزت پر حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں اس کے حضور میں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑونگا اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہیے گا مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا، پھر فرمائے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد وثنا بیان کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لیے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی، اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا اور پھر میں تیسری مرتبہ بارگاہ رب العزت پر حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا،

مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور جب میں پروردگار کے حضور پہنچ کر اس کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا۔ پھر فرمائے گا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا سر اٹھاؤ، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی۔ شفاعت کرو میں قبول کروں گا اور مانگو میں دوں گا۔" (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وتعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا اس کی حمد وثنا بیان کروں گا پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لیے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ اس کے بعد میں (درگاہ رب العزت سے) باہر آؤں گا اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہ جائے گا جن کو قرآن نے روکا ہوگا (یعنی اس آخری شفاعت کے بعد دوزخ میں وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جن کے بارے میں قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، چنانچہ حدیث کے اس جملہ کی وضاحت حضرت انس کے نیچے کے روای حضرت قتادہ جو جلیل القدر تابعی ہیں ان الفاظ میں کی ہے کہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ بس وہ لوگ دوزخ میں باقی رہ جائیں گے جو (قرآن کے حکم کے بموجب) ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب دوزخ کے مستوجب قرار پا چکے ہیں (اور وہ کفار ہیں) پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (یا حضرت انس یا حضرت قتادہ نے اس بات کو مستند کرنے کے لئے) قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی (عَسٰٓي اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا) 17۔ الاسراء 79:) امید ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مقام محمود میں جگہ دے گا۔ اور پھر (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یا حضرت انس نے یا حضرت قتادہ نے) یہ فرمایا کہ (

یہی وہ مقام محمود ہے، جس کا وعدہ اللہ نے تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کیا ہے۔"
(بخاری ومسلم)

تشریح:

"وہ پہلے نبی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے۔۔الخ۔ کے سلسلہ میں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) سے پہلے تین نبی حضرت آدم (علیہ السلام)، حضرت شیث (علیہ السلام) اور حضرت ادریس (علیہ السلام) دنیا میں آچکے تھے۔ تو حضرت نوح (علیہ السلام) دنیا والوں کی طرف آنے والے پہلے نبی کیونکر ہوئے!؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلے تینوں نبی جب دنیا میں آئے تو تمام روئے زمین صرف اہل کفر کی آماجگاہ نہیں تھی بلکہ اس دنیا میں اہل ایمان بھی موجود تھے اور گویا ان تینوں نبیوں کے مخاطب اہل ایمان اور اہل کفر دونوں تھے، ان کے برخلاف جب حضرت نوح (علیہ السلام) دنیا والوں میں آئے تو تمام روئے زمین پر صرف کافر ہی کافر تھے اہل ایمان کا وجود نہیں تھا، اس اعتبار سے حضرت نوح (علیہ السلام) دنیا میں آنے والے پہلے نبی ہیں جن کا واسطہ صرف کافروں سے تھا، اس اشکال کے کچھ اور جواب بھی علماء نے لکھے ہیں لیکن وہ زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ اس مقام پر خاص نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ جب تمام لوگ ابتدائی اور سب سے پہلے حضرت آدم کے پاس اور پھر یکے بعد دیگرے ایک ایک نبی کے پاس جائیں گے یہاں تک کہ آخر میں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کریں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی درخواست قبول کرلیں گے تو سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا کہ وہی ان لوگوں کے دلوں میں کسی شفاعت کرنے والے کے پاس جانے کا

خیال ڈالے گا اور پہلا خیال حضرت آدم (علیہ السلام) کے بارے میں ہوگا کہ وہی ان کے دلوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خیال ڈال دے اور وہ ایک ایک نبی کے پاس جانے کے بجائے صرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچ کر شفاعت کی درخواست کریں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی شفاعت کردیں تو یہ احتمال باقی رہے گا کہ دوسرے بھی شفاعت کرنے جرات رکھتے ہوں گے اور اگر کسی اور نبی سے بھی شفاعت کی درخواست کی جاتی تو وہ بھی شفاعت کردیتا، لیکن جب وہ لوگ ایک ایک نبی کے پاس جا کر ان سے شفاعت کی دراخوست کریں گے اور ہر ایک شفاعت سے انکار کردے گا اور پھر آخر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کی جائے گی جس کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبول کرکے ان کا مقصد پورا کردیں گے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے عالی مرتبہ ہونا اور بارگاہ کبریائی میں کمال قرب رکھنا واضح طور پر ثابت ہوجائے گا اور ہر ایک پر یہ عیاں ہوجائے گا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مرتبہ و درجہ کا کوئی اور نہیں ہے۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام مخلوق، حتی کہ انسانوں فرشتوں اور تمام انبیاء تک پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ شفاعت جو اتنا بڑا درجہ اور اتنا اہم کام ہے کہ کوئی بھی، خواہ وہ فرشتہ یا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اس کی جرات وحوصلہ نہیں کرے گا صرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کریں گے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی جس لغزش کا ذکر کیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح کو مسلسل جھٹلانے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی سزا میں دنیا والوں پر پانی کا عذاب نازل ہوا اور تمام روئے زمین پر ہلاکت خیز پانی ہی پانی پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں اور اپنے ماننے

والوں کی ایک مختصر تعداد کو لے کر ایک کشتی میں بیٹھ گئے تاکہ وہ سب طوفانی سیلاب کی ہلاکت خیزی سے محفوظ رہیں، اس وقت انھوں نے اپنے بیٹے کو جو کافروں کے ساتھ تھا، بلایا اور کہا کہ کافروں کے ساتھ وہ بھی غرق ہوگیا، اس موقع پر حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنے اس بیٹے کے حق میں غرقابی سے نجات کی دعا مانگی تھے اور بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کیا تھا کہ۔ رب ان ابنی من اہلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین۔" میرے پروردگار! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، (اس کو نجات دے) بیشک آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور آپ احکم الحاکمین ہیں، اللہ تعالیٰ سے حضرت نوح (علیہ السلام) کی یہ درخواست چونکہ ایک ایسا امر تھا جس کو انھوں نے جانے بوجھے بغیر ظاہر کیا تھا اور اس بات کی تحقیق نہیں کر لی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی دعا مانگنی چاہیے یا نہیں، اس لیے ان پر بارگاہ الٰہی سے عتاب نازل ہوا کہ نوح ہم سے وہ چیز نہ مانگو جس کی حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے اور جس کے بارے میں تم نہیں جانتے کہ وہ چیز مانگی جانی چاہیے یا نہیں۔! اور وہ دنیا میں تین مرتبہ جھوٹ بولنے کا ذکر کریں گے" حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنی جن باتوں کو" جھوٹ" سے تعبیر کریں گے حقیقت میں ان پر" جھوٹ" کا اطلاق نہیں ہوسکتا، گو ظاہری حیثیت کے اعتبار سے وہ جھوٹ کی سی صورت رکھتی ہوں، لیکن انبیاء جس عالی مرتبہ کے ہوتے ہیں اور ان کا جو اونچا مقام ہوتا ہے اس کے پیش نظر ان کی اس طرح کی باتوں کو بھی جو ان کے مقام سے فروتر ہوں، بارگاہ رب العزت میں نظر انداز نہیں کیا جاتا اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ حسنات الا برار سئیات المقربین (بعض باتیں نیکوں کے حق میں تو نیکیاں ہوتی ہیں لیکن مقربین کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔" رہی یہ بات کہ وہ تین باتیں کیا تھیں جن کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام)" جھوٹ" کے طور پر اپنی لغزش بتائیں گے، تو ان میں

سے ایک تو یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم اپنے کسی میلہ میں تماشہ دیکھنے آبادی سے باہر جانے لگی تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ارادہ کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور جب یہ سب لوگ چلے جائیں گے تو ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ان کے بت توڑ دوں گا جن کو یہ پوجتے ہیں اور میری بار بار کی تلقین وتنبیہ کے باوجود بت پرستی سے باز نہیں آتے، چنانچہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگوں کو جانا ہو تو جاؤ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ میں بیمار ہوں، ظاہر ہے کہ وہ دیکھنے میں جسمانی طور پر بیمار نہیں تھے اور ان کا یہ کہنا کہ" میں بیمار ہوں" بظاہر جھوٹ سمجھا جاسکتا ہے، لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان کی یہ بات "جھوٹ" میں شمار نہیں کی جاسکتی کیونکہ جب انھوں نے یہ بات کہی تھی تو یہ مراد رکھ کر کہی تھی کہ تمہارے کفر وشرک اور تمہاری غلط حرکتوں نے میرے دل کو دکھی کر دیا ہے اور میں تمہارے غم میں اندورنی طور پر بیمار ہوں، دوسری بات یہ تھی کہ قوم کے لوگوں کے میلے میں چلے جانے کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا اور جب ان لوگوں نے واپس آکر دیکھا کہ آپ نے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ ان کا یہ جواب بھی اپنی ظاہری حیثیت میں ایک جھوٹ نظر آتا ہے، لیکن یہاں بھی وہی صورت حال ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ بات اس مراد کے ساتھ کہی تھی کہ یہ جو بڑا بت ہے یہ تمہاری عبادات وتعظیم کے لیے ایک ممتاز ومنفرد حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کا وجود اس بات کا باعث بنا کہ میں دوسرے چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑ دوں یا اس بات سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا مقصد ان لوگوں کا مذاق اڑانا اور ان کو شرمندہ کرنا تھا کہ جس بت کو تم سب سے بڑا مانتے ہو اور سب سے زیادہ اس کی عبادت کرتے ہو، اس کی لاچاری اور بے وقعتی کا یہ عالم ہے کہ اس کے ساتھی بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا

گیا مگر وہ کسی بت کو بچا نہیں سکا ایسی صورت میں کیا یہ بت تمہاری پرستش کا مستحق ہوسکتا ہے! اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ ایک شخص تو بہت زیادہ خوشخط ہو اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص بہت زیادہ بدخط ہو اور وہ بدخط شخص خوشخط شخص کی کسی لکھی ہوئی تحریر کو دیکھ کر کہے کہ کیا یہ تحریر تم نے لکھی ہے اور خوشخط شخص اس کے جواب میں کہے کہ جی نہیں، یہ تو تم نے لکھی ہے، ظاہر ہے کہ اس جواب کے ذریعہ وہ یہی واضح کرتا ہے کہ تم تو اتنی اچھی تحریر ہرگز نہیں لکھ سکتے، پھر یہاں میرے علاوہ اور کون لکھنے والا ہوسکتا ہے! تیسری بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنی بیوی یعنی حضرت سارہ کو ایک بدکار کافر کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے کہا تھا کہ یہ عورت میری بہن ہے یہ بات بھی بظاہر "جھوٹ" کے دائرہ میں آتی ہے، لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ایک مومن کی مومنہ بیوی بہرحال اس کی دینی بہن ہوتی ہے اور یہ بات کہنے سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مراد بھی یہی تھی کہ یہ عورت میری دینی بہن ہے، تو اس پر جھوٹ کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے، ویسے یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی چچازاد بہن بھی تھیں، اس اعتبار سے بھی ان کا سارہ کو بہن کہنا کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف آئیے، دوسرے انبیاء کے برخلاف حضرت عیسیٰ شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے اپنے کسی عذر کو بیان نہیں کریں گے اور نہ اپنی کسی لغزش کا ذکر کریں گے، اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ حضرت عیسیٰ اس وقت اپنا عذر بیان کرنے میں توقف شاید اسی لیے کرینگے کہ وہ اس تہمت کی وجہ سے جو عیسائیوں کی طرف سے ان کو اللہ کا بیٹا کہے جانے کی صورت میں ان پر تھوپی گئی ہے، اس درجہ شرمندہ و نادم ہوں گے کہ وہ اپنی خاموشی ہی کو زبان حال سے عذر بنالیں گے ویسے بعض روایتوں میں ان کے کچھ عذر نقل بھی کئے گئے ہیں،

بہر حال اصل بات یہ ہے کہ شفاعت کا درجہ صرف ہمارے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاصل ہوگا جو سید المرسلین اور امام النبیین ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء اور رسول صلوت اللہ علیہم اجمعین شفاعت کے مقام پر کھڑا ہونے اور بارگاہ رب العزت میں شفاعت کرنے سے عاجز و قاصر ہیں، ان کو یہ بلند بالا مرتبہ عطا ہی نہیں ہوا ہے، لہٰذا شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے انھیں کونسی عذر بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی اور وہ سب یا ان میں سے کچھ انبیاء کوئی عذر بیان کئے بغیر یہی کہیں گے کہ ہم اس عظیم الشان امر کے اہل نہیں ہیں۔" جن کے اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں۔" اس جملہ کے سلسلہ میں واضح رہے کہ تمام ہی انبیاء معصوم عن الخطا یعنی گناہوں سے محفوظ ہیں چہ جائیکہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بدرجہا اولی اس سے پاک و منزہ ہیں کہ کسی گناہ کی نسبت بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہو، پس یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں یہ کہنا کہ" ان کے سارے اگلے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں۔" یہ معنی رکھتا ہے؟ اس کے بارے میں علماء نے مختلف باتیں کہی ہیں اور اس جملہ کی متعدد تاویلیں منقول ہیں، لیکن زیادہ واضح تاویل یہ ہے کہ یہ جملہ دراصل بارگاہ رب العزت کی جانب سے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم اعزاز اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برتر فضیلت کے اظہار کا ذریعہ ہے قطع نظر اس امر کے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس کی بخشش کی جائے! اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کوئی امر مطلق اور بادشاہ اپنے کسی خاص مصاحب کو ہر حالت میں اپنا مطیع و فرمان بردار پرکھ لیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس سے بہت زیادہ خوش

ہوتا ہے تو اپنے دوسرے مصاحبوں اور رعایا کے لوگوں کے درمیان اس خاص مصاحب کی امتیازی اور مخصوص حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں معاف کیا خواہ تم نے کچھ ہی کیا ہو اور آئندہ تم جو کرو وہ بھی معاف، تم پر کوئی مواخذہ اور گرفت نہیں۔" اور میں دررب العزت پر پہنچ کر اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔" یہ جملہ حدیث کی اس عبارت۔" کا آزاد ترجمہ ہے اگر اس عبارت کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یوں ہوگا کہ پس میں اپنے پروردگار کے پاس اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔" اس صورت میں کہا جائے گا کہ" اس کے مکان" سے مراد اس کی طرف سے عطا ہونے والے اجر وثواب کی جگہ یعنی جنت ہے۔" لیکن یہ مراد گنجلک ہے، زیادہ واضح تاویل وہ ہے جو علامہ تورپشتی نے بیان کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ" پروردگار کے پاس اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے" سے مراد یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے یہ اجازت مانگیں گے کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس مقام میں داخل ہونے کی اجازت عطا کرے جہاں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے جہاں پہنچ کر جو بھی عرض ودعا کی جائے، اس کا منظور ومقبول ہونا یقینی ہے اور جہاں پہنچ کر کھڑے ہونے والے اور پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہے اور یہ وہ مقام ہے جس کو مقام محمود" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو مقام شفاعت" بھی کہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ پروردگار تو مکان ولامکان کی قید سے پاک ہے۔ اس کو جہاں بھی پکارا جائے اور جس جگہ بھی اس سے عرض ودعا کی جائے وہ وہیں موجود ہے اور وہیں سنتا اور دیکھتا ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہوگی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میدان حشر میں جس جگہ لوگوں کی شفاعت کی درخواست قبول کریں گے وہاں سے

چل کر اس مقام خاص پر بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کریں گے اور پھر عرض و معروض کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موقف (یعنی میدان حشر کہ جہاں لوگ ٹھہرے ہوں گے) دراصل ایک ایسے ملکی نظام کی طرح ہوگا جو کسی باقاعدہ اور مہذب حکومت کے تحت ہو، جہاں ہر شخص کے مرتبہ و درجہ کے مطابق طریق کار اور نظم عمل کا (اصول کارفرما ہو، چنانچہ اس وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) "شافع" کی حیثیت رکھیں گے اور "شافع" کا یہ حق ہے کہ وہ اعزاز و اکرام کی جگہ آ کر کھڑا ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں یہ بات ڈالے گا کہ وہ اس جگہ سے چل کر جو خوف و ہولناکی اور وحشت و گھبراہٹ سے گھری ہوگی، اس جگہ آئیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعزاز و اکرام کا مقام ہے، تاکہ آپ وہاں اطمینان اور دلجمی کے ساتھ عرض و معروض کر سکیں۔ اور اس حمد و تعریف کے ساتھ کہ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا۔۔ الخ۔ سے حضور نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس وقت میں جن الفاظ، جس اسلوب اور جس انداز میں اللہ رب العزت کی تعریف و توصیف بیان کروں گا وہ کیا ہوگا۔ اس وقت اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے وہ سب کچھ مجھے اسی وقت سکھایا اور بتایا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اس موقع اور اس مقام کی مناسبت سے جس قدر وسعت و گہرائی رکھ سکتی ہے اس کا ادراک یہاں کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی اعتبار سے اس مقام کو" مقام حمد" اور مقام محمود کہتے ہیں۔ حدیث کے اس جزو سے یہ بات ہوئی کہ جو شخص کسی سے سفارش کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ پہلے اس (اس سفارش قبول کرنے والے کی تعریف و توصیف کرے تاکہ اس کا قرب اور اس کی توجہ حاصل کر سکے اور قبول سفارش سے نوازا جائے۔" پھر میں شفاعت کروں گا" کے ضمن میں قاضی نے لکھا ہے کہ حضرت انس اور حضرت ابوہریرہ (رض) ایک روایت میں یہ منقول ہے

کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی خوب خوب حمد و ثنا کریں گے اور پھر اس حمد و ثناء کے بعد شفاعت کی اجازت پا کر امتی امتی کہنا شروع کریں گے۔" اور میرے لیے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سامنے یہ متعین فرما دے گا کہ ایسے ایسے گنہگاروں کی شفاعت کرو، مثلاً وہ فرمائے گا کہ اپنی امت کے ان لوگوں کی شفاعت کرو جو زناکار تھے، یا جو بے نمازی تھے اور یا جو شراب نوش تھے، چنانچہ میں اسی تعین کے ساتھ شفاعت کروں گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے زانیوں کے حق میں تمہاری سفارش قبول کی، پھر فرمائے گا کہ میں نے بے نمازیوں کے حق میں تمہاری شفاعت قبول کی۔ اسی پر دوسرے طبقوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کے شروع میں تو یہ مذکور ہے کہ شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کو میدان حشر میں محصور کیا گیا ہوگا اور وہاں کی تنگی و سختی اور کرب و ہولناکی سے تنگ آ کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سفارش چاہیں گے تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انھیں اس جگہ کی پریشانیوں اور ہولناکیوں سے نجات دلائیں لیکن یہاں حدیث کے اس جزو میں جب بارگاہ الٰہی میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت کرنے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت قبول ہونے کا ذکر آیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسے شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوزخ میں بھیجا جا چکا ہوگا!؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک تو یہ کہ شاید اہل ایمان کے دو طبقے ہوں گے ایک طبقہ کو تو (جو اپنے گناہوں

کے سبب سزا کا مستوجب ہوگا) میدان حشر میں محصور کئے بغیر دوزخ میں بھیج دیا جائے گا اور یہی طبقہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شفاعت کی درخواست کرے گا، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شفاعت کے ذریعہ اس طبقہ کو اس بدترین حالت سے کہ جس میں وہ گرفتار ہوگا نجات دلا کر جنت میں پہنچوائیں گے اور پھر اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طبقہ کے حق میں جماعت جماعت کر کے شفاعت فرمائے گے جو دوزخ میں ڈالا جاچکا ہوگا اور متعدد دفعوں میں ان کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کروائیں گے! اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حدیث میں یہاں صرف اسی ایک طبقہ کا ذکر فرمایا اور اختصار کلام کے طور پر دوسرے طبقہ کے ذکر کو حذف فرمادیا کیونکہ اس ایک طبقہ کو نجات دلانے کے ذکر سے دوسرے طبقہ کو نجات دلانے کے ذکر سے دوسرے طبقہ کو نجات دلانا بطریق اولی مفہوم ہو جاتا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں یہاں "نار" (یعنی آگ) کا لفظ منقول ہے جس کا ترجمہ "دوزخ" کیا گیا ہے "لیکن ہوسکتا ہے کہ "نار" یعنی آگ سے مراد "دوزخ" نہ ہو بلکہ وہ سخت حبس، تپش اور گرمی مراد ہو جو میدان حشر میں سورج کے بہت قریب آجانے کی وجہ سے وہاں محسوس کی جائے گی اور "نکلوانے" سے مراد اس سخت تپش اور گرمی سے لوگوں کو چھٹکارا دلانا ہو، اس صورت میں حدیث کی اس عبارت فاخرجہم من النار وادخلہم الجنۃ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں شفاعت قبول ہونے کے بعد درگاہ رب العزت سے باہر آؤں گا اور لوگوں کو سخت ترین تپش اور گرمی سے چھٹکارا دلا کر جنت تک پہنچواؤں گا یہ جواب اگرچہ ایک ایسی وضاحت ہے جس پر مجازی اسلوب کا اطلاق ہوسکتا ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی جواب حقیقت امر کے بہت قریب ہے اور حدیث کے اصل موضوع کے نہایت مناسب ہے، کیونکہ

اس ارشاد گرامی میں جس شفاعت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے " شفاعت عظمیٰ " مراد ہے جس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک ارشاد ادم ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ۔ کے بموجب مقام محمود اور لوائے ممدود سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس شفاعت عظمیٰ کا اصل مقصد تمام مخلوق کو میدان حشر کی پریشانیوں اور ہولناکیوں سے چھٹکارا دلانا، جہاں وہ حساب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور ان کا حساب جلد کرنا ہوگا، نیز یہی وہ شفاعت ہے جو صرف آنحضرت کے لیے مخصوص ہے، اس کے بعد پھر خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، دوسرے انبیاء، اولیاء علماء، صلحا، شہدا اور فقراء کی طرف سے متعدد شفاعتیں ہوں گی جن کی تفصیل ابتدائے باب میں بیان ہو چکی ہے۔ یہی وہ مقام محمود ہے۔۔ الخ۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں حضور کے لیے جس " مقام محمود " کا وعدہ کیا ہے وہ اسی " شفاعت عظمیٰ " کا مقام ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا کسی اور کو عطا نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ اس مقام کی صفت لفظ "محمود" کے ساتھ یا تو اس اعتبار سے ہے کہ اس مقام پر کھڑا ہونے والا اس کی تعریف کرے گا اور اس کو پہچانے گا، یا اس اعتبار سے ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس مقام پر کھڑے ہو کر اللہ سبحانہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کریں گے اور یا اس اعتبار سے ہے کہ وہ مقام عطا ہونے کی وجہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف و توصیف تمام اولین و آخرین مخلوق کی زبان پر ہوگی۔

رسول ﷺ کی اپنی امت سے محبت؛

حدیث؛

وعن عبدالله بن عمرو بن العاص أن النبي صلى الله عليه وسلم تلا قول الله تعالى في إبراهيم :[رب إنهن أضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فإنه مني]وقال عيسى :[إن تعذبهم فإنهم عبادك]فرفع يديه فقال "اللهم أمتي أمتي" . وبكى فقال الله تعالى :"يا جبريل اذهب إلى محمد وربك أعلم فسله ما يبكيه؟" . فأتاه جبريل فسأله فأخبره رسول الله صلى الله عليه وسلم بما قال فقال الله لجبريل اذهب إلى محمد فقل :[إنا سنرضيك في أمتك ولا نسوؤك". رواه مسلم

ترجمہ؛

عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اپنی مجلس میں لوگوں کے سامنے) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں (یہ بیان کرنے کے لیے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق بارگاہ رب ذوالجلال میں کیا عرض کریں گے) یہ آیت پڑھی (رَبِّ اِنَّ ✕ نَّ اَضْلَلْنَ ✕ ثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّ ✕ مِنِّیْ ✕ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّ ✕ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) 14۔ابراہیم 36 :)اور پوری آیت کا ترجمہ یوں ہے کہ میرے پروردگار! یہ بت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں، پس ان لوگوں میں سے جنہوں نے میری اطاعت قبول کی ہے، یعنی توحید، اخلاص اور توکل کو اختیار کیا وہ میرے اپنے اور میرے تابعدار ہیں اور جنہوں نے میری نافرمانی کی ہے تو، تو معاف کرنے والا رحیم ہے) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (اسی سلسلہ میں) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تعلق سے یہ آیت پڑھی (جس میں یہ بیان ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے حق میں پروردگار سے کیا

عرض کریں گے (اِنۡ تُعَذِّبۡ ※ ھُمۡ فَاِنَّ ※ ھُمۡ عِبَادُ ※) 5۔المائدہ 118 :) (اور آیت کا بقیہ حصہ یہ ہے وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَ ※ ھُمۡ فَاِنَّ ※ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَ ※ یۡمُ) پوری آیت کا ترجمہ یوں ہے" اگر تو ان کو عذاب میں مبتلا کرے تو بہر حال وہ تیرے ہی بندے ہیں" یعنی تو ان کا مطلق مالک ہے وہ تیرے حکم کے خلاف کر ہی کیا سکتے ہیں اور ان کو عذاب میں مبتلا کرنے سے تجھے کون روک سکتا ہے۔" اگر تو ان کو بخش دے تو بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔" یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں ہے، تو جو چاہے حکم کر سکتا ہے، کوئی بھی تیرے حکم کو پس پشت ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا پھر یہ کہ تیری حکمت و دانائی میں بھی ذرہ برابر شبہ نہیں، تو ہر ایک کے بارے میں وہی حکم کرتا ہے جس کا وہ مستحق و مستوجب ہوتا ہے اور ہر چیز کو وہی جگہ دیتا ہے جہاں کا وہ سزاوار ہے) اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ پروردگار میری امت کو بخش دے، میری امت پر رحم فرما اور (یہ دعا کرتے ہوئے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رونے لگے۔ (فورا) اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ اور حالانکہ اے جبرائیل تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے (اس کو کچھ مطلق دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) مگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دلجوئی اور پروردگار کی عنایت و توجہ کے اظہار کی خاطر) ان سے پوچھو کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیوں روتے ہیں (یہ حکم سنتے ہی) حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رونے کا سبب پوچھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آپنے الفاظ میں انھیں بتا دیا (کہ اپنی امت کے بارے میں خوف الٰہی نے مجھ پر رقت طاری کر دی ہے) پھر (حضرت جبرائیل (علیہ السلام) بارگاہ کبریائی میں واپس گئے اور صورت حال عرض کی اور

تب) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ اور کہو کہ (جب وقت آئے گا تو) ہم یقیناً آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے بارے میں راضی وخوش کر دینگے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہرگز رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔" (مسلم) تشریح : " (یہ دعا کرتے ہوئے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رونے لگے۔" یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی اپنی امت کے حق میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شفاعت کو یاد کیا اور اس کا ذکر کیا تو پھر فورا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خود اپنی امت کا خیال آگیا اور اس خوف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر رقت طاری ہوگئی کہ نامعلوم میری امت کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا کہیں ان کو تو عذاب الٰہی میں مبتلا نہیں کیا جائے گا، چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بارگاہ الٰہی میں اپنی امت کی بخشش ومغفرت کی دعا فرمائی۔" آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی امت کے بارے میں راضی وخوش کر دیں گے۔" اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی وخوش کس صورت میں ہوں گے، اس کے متعلق روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔" میں اس وقت تک راضی وخوش نہیں ہونگا جب تک اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک ایک فرد کو بخش نہیں دے گا۔" سبحان اللہ اس امت کے لیے اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے، ضرورت صرف یہ ہے کہ حقیقی معنی میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتی بنا جائے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایمان کے عقیدے کو ہر حالت میں درست رکھا جائے، مشکل جو ہے صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔ خاک او پاش بادشاہی کن آن او پاش ہر چہ خواہی کن اس حدیث سے کئی اہم باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی امت سے کس درجہ کا تعلق ہے اور

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت پر کتنے زیادہ شفیق ومہربان ہیں، نیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے لوگوں کی صلاح وفلاح کی طرف کس طرح ہر وقت متوجہ رہتے تھے، دوسری اور سب سے بڑی بات اس امت مرحومہ کے لیے بشارت عظمی ہے کہ اللہ تعالی نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وعدہ فرمالیا ہے کہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے بارے میں راضی وخوش کر دیں گے اور تیسری بات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عظیم المرتبیت ظاہر ہونا ہے۔

جنت کا ذکر

حدیث:

عن أبي هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"قال الله تعالى :أعددت لعبادي الصالحين ما لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر .واقرؤوا إن شئتم :(فلا تعلم نفس ما أخفي لهم من قرة عين) متفق عليه

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا!" میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز تیار کر رکھی ہے کہ (آج تک) نہ کسی آنکھ نے اس (جیسی کسی چیز) کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے (اس جیسی خوبیوں کا) سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں (اس کی ماہیت کا تصور تک آیا ہے اگر تم اس بات کی تصدیق چاہو تو یہ آیت پڑھو :(فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ) 32۔ السجدہ 17 :) (بخاری ومسلم) کوئی بھی شخص نہیں جانتا (جو بندے شب بیداری کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے

ہیں) ان کے لیے کیا چیز چھپا رکھی گئی ہے جو آنکھ کی ٹھنڈک کا سبب ہے۔"

تشریح
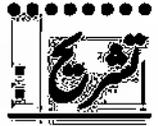
"۔۔۔نہ کسی آنکھ نے الخ کے بارے میں بھی یہ احتمال ہے کہ اس چیز (یعنی جنت) کے مظاہر شکل وصورت آوازیں اور خاطر داریاں مراد ہوں، مطلب یہ کہ وہاں جو اعلیٰ مناظر ہوں گے اور وہاں جو نظر افروز شکلیں اور صورتیں دکھائی دیں گی ان جیسے مناظر اور جیسی شکلیں اور صورتیں اس دنیا میں نہ دیکھی گئی ہیں اور نہ کبھی دیکھیں جا سکتی ہیں، اسی طرح وہاں کی آوازوں میں جو مٹھاس، نغمگی اور دلکشی ہوگی، ایسی میٹھی، نغمیہ ریز اور دلکش آوازیں اس دنیا میں آج تک نہ کسی کان نے سنی ہیں اور نہ کبھی سنی جا سکتی ہیں اور ایسے ہی وہاں جو خاطر ومدارت ہوں گی، جو نعمتیں اور لذتیں حاصل ہوں گی، ان کا تصور بھی اس دنیا میں آج تک کسی انسان کے دل میں نہیں آیا ہوگا اور نہ کبھی اس کا کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔ آیت میں جس چیز کو آنکھ کی ٹھنڈک سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے فرحت وشادمانی، چین وراحت اور مقصود مراد پانا ہے! واضح رہے کہ (آنکھ کی ٹھنڈک) میں لفظ قرۃ دراصل قر سے نکلا ہے جس کے معنی ثبات وقرار کے ہیں۔ چنانچہ آنکھ جب اپنی محبوب چیز کو دیکھتی ہے تو قرار پا جاتی ہے اور اس طرح مطمئن ہو جاتی ہے کہ کسی اور طرف مائل نہیں ہوتی اس کے برخلاف جب آنکھ کسی غیر پسندیدہ اور ناگوار چیز کو دیکھتی ہے اور اس کی محبوب شی سامنے نہیں ہوتی تو وہ پریشان اور کھوئی سی رہتی ہے اور کسی ایک سمت قرار پانے کے بجائے ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیتی ہے ایسے ہی فرحت وسرور اور راحت واطمینان کی حالت میں آنکھوں کو عجیب طرح کا کیف وسکون اور آرام ملتا ہے جب کہ خوف وغم کی حالت میں وہ متحرک ومضطرب ہو جاتی ہیں۔ یا یہ کہ" قرۃ" کے لفظ" قر" سے مشق ہے جے جس کے معنی"

ٹھنڈک اور خشکی" کے ہیں اس صورت میں کہا جائے گا کہ آنکھ کی ٹھنڈک سی مراد وہ مخصوص لذت وکیف ہے جو محبوب اور پسندیدہ چیز کو دیکھ کر اور اپنا مقصود و مطلوب پا کر آنکھ محسوس کرتی ہے، اس کے برخلاف آنکھ جب کسی غیر پسندیدہ اور ناگوار چیز اور دشمن کو دیکھتی ہے اور مطلوب و مقصود کے انتظار میں ہوتی ہے تو گویا اس وقت وہ ایک خاص جلن اور سوزش محسوس کرتی ہے! اسی مناسبت سے" پیاری اولاد" کو قرۃ العین یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا جاتا ہے! نیز ایک حدیث میں جو یوں آیا ہے کہ جعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز رکھی گئی ہے تو اس میں بھی لفظ قرۃ کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

جنت الفردوس کا سوال کرو؛

وعن عبادة بن الصامت قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"في الجنة مائة درجة ما بين كل درجتين كما بين السماء والأرض والفردوس أعلاها درجة منها تفجر أنهار الجنة الأربعة ومن فوقها يكون العرش فإذا سألتم الله فاسألوه الفردوس" رواه الترمذي

ترجمہ؛

حضرت عبادہ بن صامت (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: " جنت میں سو درجے ہیں ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ زمین وآسمان کے درمیان ہے اور فردوس صورۃ اور معنی وہ اپنے درجات (کی بلندی) کے اعتبار سے سب جنتوں سے اعلی و برتر ہے اور اسی فردوس سے بہشت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں اور فردوس ہی کے اوپر عرش الٰہی ہے پس جب تم اللہ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگو (جو

سب سے اعلی و برتر ہے)" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور مجھے یہ حدیث نہ تو صحیین میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں۔

تشریح :

" سو درجے" میں سو کا عدد تعین و تحدید کے لیے نہیں بلکہ "کثرت" کے اظہار کے لیے بھی ہو سکتا ہے اس کی تائید حضرت عائشہ صدیقہ (رض) کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو بیہقی نے نقل کیا ہے اور جس میں جنت کے درجات کی تعداد قرآن کی آیتوں کے برابر بیان کی گئی ہے روایت کے الفاظ یہ ہیں عدد درج الجنت عدد ای القرآن فمن دخل الجنة من اهل القرآن فليس فوقه درجة اور یہ بھی ممکن ہے کہ "سو" سے یہ خاص عدد ہی مراد ہو اور اس کے ذریعہ جنت کے کثیر درجات میں صرف ان سو درجوں کا بیان کرنا مقصود ہو، جن میں سے ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ مذکور فاصلہ سے کم یا زیادہ ہوگا دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جنت میں ایک درجہ وہ ہے جس تک اصحاب ہموم کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچے گا" فردوس" جنت کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں بایں طور مذکور ہے کہ :(اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ 10الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ 11) 23۔ المؤمنون 11 :-10) " یہی (پاک طینت پاک کردار) لوگ (جن کا پچھلی آیتوں میں ذکر ہوا) وارث بنیں گے (یعنی فردوس کی میراث حاصل کریں گے (اور) اس میں ہمشہ ہمیشہ رہیں گے" چاروں نہروں" سے مراد پانی، دودھ شہد اور شراب کی وہ نہریں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں کیا گیا ہے۔" فيها انهار من ماء غير اسن وانهار من لبن لم يتغير طعمه وانهار من خمر لذة

للشاربین وانہار من عسل مصفی۔" جنت میں بہت سی چیزیں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہ ہوگا اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلہ ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں شہد کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں شہد کی ہیں جو بالکل صاف وشفاف ہوگا۔" فردوس ہی کے اوپر عرش الہٰی ہے" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فردوس سب جنتوں سے افضل اور اوپر ہے کہ اس کے اوپر بس عرش الہٰی ہے۔ اسی لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے امت کو تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگو تا کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے بہتر جنت تمہیں حاصل ہو۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر

وعن أبي هريرة قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"إن أول زمرة يدخلون الجنة على صورة القمر ليلة البدر ثم الذين يلونهم كأشد كوكب دري في السماء إضاءة قلوبهم على قلب رجل واحد لا اختلاف بينهم ولا تباغض لكل امرء منهم زوجتان من الحور العين يرى مخ سوقهن من وراء العظم واللحم من الحسن يسبحون الله بكرة وعشيا لا يسقمون ولا يبولون ولا يتغوطون ولا يتفلون ولا يتمخطون آنيتهم الذهب والفضة وأمشاطهم الذهب ووقود مجامرهم الألوة ورشحهم المسك على خلق رجل واحد على صورة أبيهم آدم ستون ذراعا في السماء. رواه مسلم

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : " جو لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے (یعنی انبیاء علیہم السلام) وہ چودھویں رات کے چاند

کی طرح روشن ومنور ہوں گے اور ان کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے (یعنی علماء، اولیاء، شہدا اور صلحاء) وہ اس ستارے کی مانند روشن وچمکدار ہوں گے جو آسمان پر بہت تیز چمکتا ہے (اور چاند وسورج سے کم لیکن اور ستاروں سے زیادہ روشن ہوتا ہے) تمام جنتیوں کے دل ایک شخص کے دل کی مانند ہوں گے (یعنی ان کے درمیان اس طرح باہمی ربط واتفاق ہوگا کہ وہ سب ایک دل اور ایک جان ہوں گے) نہ تو ان میں کوئی باہمی اختلاف ہوگا اور نہ وہ ایک دوسرے سے کوئی بغض وعداوت رکھیں گے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کے لیے حور عین میں سے دو دو بیویاں ہوں گی (جو اتنی زیادہ حسین وجمیل اور صاف شفاف ہوں گی کہ) ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا ہڈی اور گوشت کے باہر سے نظر آئے گا۔ تمام جنتی صبح وشام (یعنی ہر وقت) اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کریں گے وہ نہ تو بیمار ہوں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ پھریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ (رینٹھ سنکیں گے، ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن "اگر" ہوگا۔ ان کا پسینہ مشک کی طرح خوشبودار ہوگا اور سارے جنتی ایک شخص کی سی عادت وسیرت کے ہوں گے (یعنی سب کے سب یکساں طور پر خوش خلق وملنسار اور ایک دوسرے سے گہرا ربط وتعلق رکھنے والے ہوں گے) نیز وہ سب شکل وصورت میں باپ آدم (علیہ السلام) کی طرح ہوں گے اور ساٹھ گز اونچا قد رکھتے ہوں گے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح

"حور" اصل میں حوراء، کی جمع ہے اور حوراء اس حسین وجمیل عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کی سفیدی وسیاہی بہت زیادہ سفید وسیاہ ہو، عین عنا! کی جمع ہے جس کے معنی" بڑی بڑی آنکھوں والی" ہے آگے دوسری فصل کے آخر میں ایک روایت آئے گی جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب

سے ادنیٰ درجہ کا جنتی وہ ہوگا۔ جس کے بہتر ۷۲ بیویاں ہوں گی، جب کہ یہاں دو بیویوں کا ذکر ہے؟ لہٰذا ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے کہا جائے گا کہ یہاں حدیث میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حورعین میں سے دو بیویاں ایسی ہونگی جن کا حسن و جمال سب سے زیادہ ہوگا یہاں تک کہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کا گودا باہر سے نظر آئے گا، ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ ہر جنتی کو اس نوعیت کی دو بیویوں کے علاوہ اور بہت سی بیویاں بھی ملیں۔" ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن اگر، ہوگا۔" کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دنیا میں تو انگیٹھیوں کا ایندھن کوئلہ وغیرہ ہوتا ہے اور یہاں خوشبو حاصل کرنے کے لیے اگر چلایا جاتا ہے لیکن جنت میں انگیٹھیوں کا ایندھن ہی اگر، ہوگا۔ واضح رہے کہ وقود (واؤ کے پیش کے ساتھ) کے معنی ہیں وہ ایندھن (یعنی لکڑیاں وغیرہ) جس سے آگ جلائی جائے مجامیر اصل میں مجمر کے جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جس میں آگ سلگانے کے لیے آگ رکھی جائے یعنی انگیٹھی یا عود سوز، یوں تو یہ لفظ میم کے زیر کے ساتھ ہے لیکن میم کے زبر کے ساتھ بھی منقول ہے۔ الوۃ (الف کے زبر اور پیش کے ساتھ) آگر کی لکڑی کو کہتے ہیں جس کو دھونی دینے کے لیے جلایا یا سلگایا جاتا ہے۔ علی خلق رجل میں لفظ "خلق" خ کے پیش کے ساتھ ہے اور ترجمہ میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس صورت میں علی صورۃ ابیھم ایک علیحدہ جملہ ہوگا جس کا مقصد جنتیوں کی سیرت کو بیان کرنے کے بعد ان کی شکل وصورت کو بیان کرنا ہے، لیکن بعض روایتوں میں یہ لفظ خ کے زبر کے ساتھ منقول ہے، جس کا با مطلب ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ سب (جنتی لوگ) ایک شخص کی سی شکل و صورت رکھیں گے، حسن وخوبصورتی میں یکساں ہوں گے اور ایک ہی عمر والے ہوں گے، یعنی سب کے سب تیس تیس یا تینتیس تینتیس سال کی عمر کے نظر آئیں گے۔

دوزخ کی آگ کی گرمی

حدیث؛

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "نار كم جزء من سبعين جزءا من نار جهنم" قيل: يا رسول الله إن كانت لكافية قال: "فضلت عليهن بتسعة وستين جزءا كلهن مثل حرها". متفق عليه.

ترجمہ؛

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمہاری (دنیا کی) آگ دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو دنیا کی آگ ہی (عذاب دینے کے لئے) کافی تھی (پھر اس سے بھی زیادہ حرارت وتپش رکھنے والی آگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دوزخ کی آگ کو یہاں (دنیا) کی آگ انہتر حصہ بڑھا دیا گیا ہے اور ان انہتر حصوں میں سے ہر ایک حصہ تمہاری (دنیا کی) آگ کے برابر ہے۔

تشریح:

دنیا کی آگ کا دوزخ کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ جو درجہ حرارت رکھتی ہے دوزخ کی آگ اس سے ستر درجہ حرارت زیادہ گرم ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ستر کے عدد سے مراد دنیا کی آگ کا مقابلہ پر دوزخ کی آگ کی گرمی کی شدت و زیادتی کو بیان کرنا ہو نہ کہ یہ خاص عدد ہی مراد ہے گویا اصل مفہوم یہ ہوگا کہ دوزخ کی آگ تمہاری دنیا کی آگ کے مقابلہ پر بہت زیادہ درجہ حرارت رکھتی ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

سے جوسوال کیا گیا، اس کے جواب میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو فرمایا وہ گویا از راہ تاکید اسی جملہ کی تکرار تھی جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شروع میں فرمایا تھا اور اس سے جواب کا حاصل یہ نکلا کہ بیشک کسی کو جلانے کے لیے یہ دنیا کی آگ ہی بہت ہے کہ اگر تم کسی انسان کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لیے اس آگ میں ڈال دو تو وہ جل کر کوئلہ ہو جائے گا مگر دوزخ کی آگ جس عذاب الٰہی کے لیے تیار کی گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کی حرارت و گرمی اس دنیا کی آگ کی حرارت و گرمی سے بہت زیادہ ہو تا کہ اللہ کا عذاب دنیا والوں کے عذاب سے ممتاز رہے اور دوزخ کی اس آگ میں جلنے والوں کو معلوم ہو کہ ان کے اللہ کا عذاب اتنا شدید اور اتنا سخت ہے کہ اگر دنیا میں کوئی شخص انھیں وہاں کی آگ میں جلاتا تو وہ عذاب اس عذاب الٰہی کے مقابلے پر ہیچ ہوتا حاصل یہ کہ دوزخ کی آگ دراصل عذاب الٰہی ہے جیسا کہ اس کا اضاف عذاب میں ذکر ہوتا ہے اس لیے اس کو دنیا کی بہ نسبت کہیں زیادہ درجہ حرارت رکھنا ہی چاہیے۔

دوزخیوں کی حالت :

حدیث:

وعن أبي الدرداء قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :"يلقى على أهل النار الجوع فيعدل ما هم فيه من العذاب فيستغيثون فيغاثون بطعام من ضريع لا يسمن ولا يغني من جوع فيستغيثون بالطعام فيغاثون بطعام ذي غصة فيذكرون أنهم كانوا يجيزون الغصص في الدنيا بالشراب فيستغيثون بالشراب فيرفع إليهم الحميم بكلاليب الحديد فإذا دنت من وجوههم شوت وجوههم فإذا دخلت بطونهم قطعت ما في بطونهم فيقولون :ادعوا خزنة جهنم فيقولون :ألم تك تأتيكم رسلكم بالبينات؟

قالوا :بلى.قالوا :فادعوا وما دعاء الكافرين إلا في ضلال" قال :"فيقولون :ادعوا مالكا فيقولون :يا مالك ليقض علينا ربك" قال :"فيجيبهم إنكم ماكثون". قال الأعمش :نبئت أن بين دعائهم وإجابة مالك إياهم ألف عام.قال :"فيقولون: ادعوا ربكم فلا أحد خير من ربكم فيقولون :ربنا غلبت علينا شقوتنا وكنا قوما ضالين ربنا أخرجنا منها فإن عدنا فإنا ظالمون" قال :"فيجيبهم :اخسؤوا فيها ولا تكلمون" قال :"فعند ذلك يئسوا من كل خير وعند ذلك يأخذون في الزفير والحسرة والويل". قال عبد الله بن عبد الرحمن :والناس لا يرفعون هذا الحديث.رواه الترمذي

حضرت ابودرداء (رض) کہتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دوزخیوں پر بھوک اس طرح مسلط کردی جائے گی کہ اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ دوزخی پہلے سے گرفتار ہوں گے چنانچہ وہ بھوک کی اذیت سے بے تاب ہو کر فریاد کریں گے اور ان کی فریاد رسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی جو نہ فربہ کرے گی نہ بھوک کو دفع کرے گا پھر وہ پہلے کھانے کو لاحاصل دیکھ کر دوسری مرتبہ فریاد کریں گے اور اس مرتبہ ان کی فریاد رسی گلے میں پھنسی جانے والے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی اس وقت ان کو یہ یاد آئے گا کہ جب (دنیا میں) کھاتے وقت ان کے گلے میں پھنس جاتی تھی تو اس کو وہ کسی پینے والی چیز سے نیچے اتارتے تھے چنانچہ وہ اپنے گلے میں پھنسے ہوئے کھانے کو اتارنے کے لیے کسی پینے والی چیز کی التجاء کریں گے تب ان کو تیز گرم پانی دیا جائے گا جس کو زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھایا جائے گا یعنی جن برتنوں میں وہ تیز گرم پانی ہوگا وہ زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھائے جائیں گے اور اٹھانے والے یا تو فرشتے ہوں گے یا براہ راست دست قدرت ان کو

اٹھا کر دوزخیوں کے منہ کو لگائے گا اور جب گرم پانی کے وہ برتن ان کے مونہوں تک پہنچے گے تو ان کے چہروں (کے گوشت) کو بھون ڈالیں گے اور جب ان برتنوں کے اندر کی چیز (جو ان کو پینے کے لیے دی جائے گی جیسے پیپ پیلا پانی وغیرہ) ان کے پیٹ میں داخل ہوگی تو پیٹ کے اندر کی چیزوں (یعنی آنتوں وغیرہ) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی پس اس صورت حال سے بیتاب ہوکر" وہ دوزخی (جہنم پر) متعین فرشتوں سے کہیں گے اے دوزخ کے سنتریو! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ کم سے کم ایک ہی دن کے لیے ہمارے اوپر مسلط اس عذاب کو ہلکا کر دے دوزخ کے سنتری جواب دیں گے کہ (اب ہم سے دعا کے لیے کہتے ہو) کیا اللہ کے رسول خدائی معجزے اور واضع دلیلیں لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے (اور تم سے یہ نہ کہتے تھے کہ کفر و سرکشی کی راہ چھوڑ کر اللہ کے اطاعت و فرمان برداری کا راستہ اختیار کرلو تا کہ کل آخرت میں دوزخ کے سخت عذاب سے محفوظ رہ سکو؟) وہ کہیں گے کہ بیشک اللہ کے رسول ہمارے پاس آئے تھے اور ان کی تعلیمات ہم تک پہنچی تھی، لیکن وائے افسوس ہم گمراہی میں پڑے رہے اور ایمان و سلامتی کی راہ اختیار نہ کر سکے دوزخ کے سنتری کہیں گے کہ پھر تو تم خود ہی دعا کرو اور اپنا معاملہ سمجھو ہم تو تمہاری شفاعت کرنے سے رہے اور کافروں کی دعا زیان کاری و بے فائدگی کے علاوہ کچھ نہیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دوزخی جب جہنم کے سنتریوں سے دعا و شفاعت کرنے میں ناکام ہوجائیں گے اور انھیں سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا تو وہ یقین کرلیں گے کہ ہمیں عذاب الٰہی سے نجات ملنے والی نہیں ہے پھر کیوں نہ موت ہی مانگی جائے چنانچہ وہ آپس میں کہیں گے کہ مالک یعنی داروغہ جنت سے مدد کی درخواست کرو! اور پھر وہ التجاء کریں گے کہ اے مالک اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمیں موت

دے دے تاکہ ہمیں آرام مل جائے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دوزخیوں کی التجاء سن کر مالک خود اپنی طرف سے یا پروردگار کی طرف جواب دے گا کہ اس دوزخ سے نجات یا موت کا خیال چھوڑ دو تمہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں اور اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے" حضرت اعمش (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام نے (بطریق مرفوع یا موقوف) مجھ سے بیان کیا کہ مالک سے ان دوزخیوں کی التجاء اور مالک کی طرف سے ان کو جواب دینے کے درمیان ایک ہزار برس کا وقفہ ہوگا یعنی وہ دوزخی مالک سے التجاء کرنے کے بعد ایک ہزار سال تک جواب کا انتظار کرتے رہیں گے اور اس دوران بھی اس عذاب میں مبتلا رہیں گے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر وہ دوزخی (آپس میں) کہیں گے کہ اب ہمیں براہ راست اپنے پروردگار ہی سے نجات کی التجا کرنی چاہیے کیونکہ وہی قادر مطلق رحیم و کریم اور غفار ہے) ہمارے حق میں بھلائی و بہتری کرنے والا اس پروردگار سے بہتر اور کوئی نہیں چنانچہ وہ التجا کریں گے کہ ہمارے پروردگار ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم (توحید کے راستہ سے) بھٹک گئے تھے اے پروردگار ہمیں دوزخ (اور یہاں کے عذاب) سے رہائی عطا فرمادے اگر ہم اس کے بعد بھی کفر وشرک کی طرف جائیں تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کو جواب دے گا دور رہو کم بختو کتوں کی طرح ذلیل وخوار رہو) ایسے دوزخ میں پڑے رہو اور رہائی اور نجات کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرو تمہاری گلو خلاصی ہرگز نہیں ہوسکتی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آخر کار وہ دوزخی ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور تب وہ حسرت اور نالہ وفریاد کرنے لگے گیں حضرت عبداللہ بن عبدالرحمن جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ اس حدیث کو مرفوع قرار

نہیں دیا جاتا لیکن ترمذی نے اس حدیث کو مرفوع نقل کیا ہے جیسا کہ روایت کی ابتداء سے معلوم ہوتا ہے۔

تشریح:
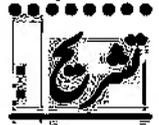
اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی۔۔۔الخ۔کا مطلب یہ ہے کہ ان پر جو بھوک مسلط کی جائے گی اس کی دردناکی دوزخ کے اور تمام عذاب کی دردناکیوں کے برابر ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ بھوک کی آگ دوزخ کی مانند ہے۔اور ان کی فریاد رسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی۔جب وہ دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کچھ کھانے کو مانگیں گے تو ان کو کھانے کے لیے ضریع دیا جائے گا واضح رہے کہ ضریع ایک خاردار جھاڑ کو کہتے ہیں جو حجاز میں ہوتا ہے، یہ ایک ایسی زہریلی اور کڑوی گھاس ہوتی ہے جس کے پاس کوئی جانور بھی نہیں پھٹکتا اور اگر کوئی جانور اس کو کھالیتا ہے تو مرجاتا ہے۔بہر حال یہاں حدیث میں ضریع سے مراد آگ کے کانٹے ہیں جو ایلوے سے زیادہ کڑوے مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔فربہ کرے گا اور نہ بھوک دفع کرے گا۔یہ دراصل قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔(لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۔ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۔) 88۔الغاشیۃ 7 :-6) (اور) ان (دوزخیوں) کو ایک خاردار جھاڑ کے سوا اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جو نہ تو کھانے والوں کو فربہ کرے گا اور نہ ان کی بھوک کو دفع کرے گا۔گلے میں پھنس جانے کے ذریعہ فریاد رسی" کا مطلب یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ان کو کھانے کے لیے ہڈی یا آگ کے کانٹے وغیرہ کی طرح کی ایسی چیزیں دی جائیں گی۔جو گلے میں جا کر پھنس جائیں گی کہ نہ حلق سے نیچے اتر سکیں گی اور نہ باہر آسکیں گی پس حدیث کے اس جملہ میں

اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔ (اِنَّ لَدَیْنَاۤ اَنْکَالًا وَّ جَحِیْمًا 12 وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِیْمًا 13) 73۔ المزمل 13 :-12) "حقیقت یہ ہے کہ (کفر و شرک کرنے والوں کے لئے) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور (دوزخ کی) بھڑکتی آگ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا ہے اور دردناک عذاب ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ وما دعا الکافرین الافی ضلال۔ (اور کافروں کی دعا زیاں کاری و بے قاعدگی کے علاوہ کچھ نہیں) بھی دراصل قرآن ہی کے الفاظ ہیں اور ان کی دعا کو زیاں کاری سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس وقت ان کے حق میں کوئی بھی دعا و شفقت کارگر نہیں ہوگی، خواہ وہ خود دعا کریں اور گڑگڑائیں یا کسی اور سے دعا و شفاعت کرائیں لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ کافر و مشرک کی دعا اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن و حدیث کے ان الفاظ سے بعض حضرات نے نتیجہ اخذ کیا ہے، حقیقت حال تو یہ ہے کہ اس دنیا میں شیطان تک کی درخواست جو اس نے اپنی عمر کی درازی کے لیے کی تھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے پھر کافر کی دعا قبول کیوں نہیں ہوسکتی، بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے۔ غلبت علینا شقوتنا (ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا) میں شقوۃ شین کے زبر اور قاف کے جزم کے ساتھ ہے اور یہ لفظ شقاوۃ (شین کے زبر کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی "بدبختی" جو سعادت" (نیک بختی) کی ضد ہے مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تقدیر کہ جس میں ہمارا خاتمہ بد لکھ دیا گیا، پوری ہو کر رہی اور ہم خود اپنی بدبختی کا شکار ہوگئے۔ اگر ہم اس کے بعد بھی کفر و شرک کی طرف جائیں۔۔۔ الخ۔ کافر دوزخیوں کا یہ کہنا بھی مکر و کذب پر مبنی ہوگا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ ولو ردوا لعادوا لما نہوا عنہ وانہم لکذبون۔ اور اگر یہ لوگ پھر (دنیا میں) واپس بھی بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں

گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ یاخذون فی الزفیر والحسرۃ والویل (حسرت و نالہ و فریاد کرنے لگیں گے) میں لفظ زفیر کے اصل معنی ہیں۔ گدھے کا سانس اندر لے جانا جیسا کہ شہیق کے معنی گدھے کا سانس باہر نکالنا یا یہ کہ جب گدھا رینگنا شروع کرتا ہے تو پہلے اس کی آواز باریک اور چھوٹی نکلتی ہے جس کو زفیر" کہا جاتا ہے اور آخر میں اس کی آواز تیز اور بڑی ہو جاتی ہے کہ اس کو شہیق سے تعبیر کیا جاتا ہے، حدیث کے ان الفاظ میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ لہم فیہا زفیر و شہیق۔" دوزخ میں گدھے کی چھوٹی اور بڑی آواز کی طرح ان دوزخیوں کی چیخ و پکار پڑی رہے گی۔" بہر حال حدیث کے اس آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی جب بارگاہ الٰہی کا جواب سن لیں گے تو وہ بالکل مایوس و نا امید ہو جائیں گے کہ دوزخ کے سنتریوں کو پکارنا کچھ سود مند نہ ہو دروغہ دوزخ سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے موت ہی دلوا دے اس کا بھی فائدہ نہ ہوا آخر میں بارگاہ الٰہی میں روئے گڑ گڑائے وہاں بھی کوئی بات قبول نہیں ہوئی، اب کہاں جائیں، کس کے سامنے فریاد کریں۔ ایسے میں وہ بے معنی آوازوں اور بے ہنگم صداؤں میں نالہ و فریاد اور چیخ و پکار کرنے لگیں گے جیسا کہ مایوسی کے عالم میں ہوتا ہے۔

»اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ خَائِفٌ مُسْتَجِیْرٌ فَأَجِرْنِیْ مِنْ عَذَابِكَ، وَسَائِلٌ فَقِیْرٌ ,فَارْزُقْنِیْ مِنْ فَضْلِكَ ,لَا مِنْ ذَنْبٍ فَأَعْتَذِرُ، وَلَا ذُوْ قُوَّةٍ فَأَنْتَصِرُ، وَلٰكِنْ مُذْنِبٌ مُسْتَغْفِرٌ«

آمین یارب العلمین

ابو صہیب نثار

۱۴۳۴